جنوری ۱۹۵۸ء

جوش ملیح آبادی — فضل احمد کریم فضلی — شان الحق حقی

اشرف صبوحی — آغا بابر — مقبول احمد سید

ڈاکٹر محمد صادق — جلیل قدوائی — اقبال عظیم

پاکستانی خواتین کی سرگرمیاں

تعلیم بالغاں کے مرکز پاکستان میں جابجا کھولے جا رہے ہیں
(ایک زیر تعلیم خاتون)

کراچی میں امور خانگی کی تربیت کا کالج
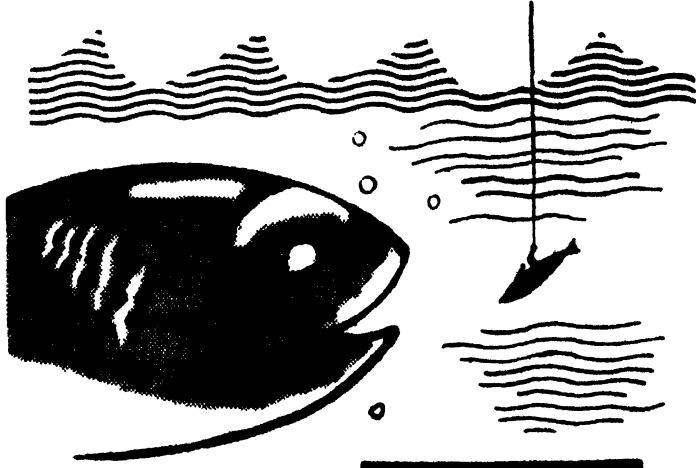
نزلے کا شکار ہوتے دیر نہیں لگتی!

آپ نزلہ، زکام اور کھانسی سے کتنا ہی بچیں
یہ اکثر بیٹھے بٹھائے ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً
موسم کی تبدیلی کے وقت تو گویا ان پر سے ہر
روک ٹوک اُٹھ جاتی ہے۔
ہر وقت چوکنے رہیئے اور ان کی روک
تھام سُعالین سے کیجیے۔

سُعالین

کھانسی، نزلہ اور زکام کی خصوصی دوا

ہمدرد

حسن اور تازگی کیلئے
Treet
ٹریٹ ٹائیلٹ صابن
استعمال کیجئے

اداریہ:	آپس کی باتیں		۶
مقالات:	یادِ رفتگاں	جوش ملیح آبادی	۷
	آزاد کا سفرِ ایران	ڈاکٹر محمد صادق	۱۰
غزلیں:	فضل احمد کریم فضلی		۱۳
	جلیل قدوائی •	اقبال عظیم	۱۴
نئی آوازیں:	غزلیں، دوہے، گیت (حالی)	شان الحق حقی	۲۶
افسانے ڈرامہ:	دل بہشت (ڈرامہ)	آغا بابر	۱۵
	احساس (بنگالی افسانہ)	سید مقصود علی	۲۱
		مترجمہ: ابو سعید نورالدین	
	یادیں (افسانہ)	مزمل اللہ خاں	۲۴
فن:	جشنِ ثقافت		۲۸
نظمیں:	دودِ چراغِ محفل	جمیل نقوی	۳۱
	مونس	مقبول احمد سید	۳۱
	یہ چاندنی، یہ سفر	انور علی انور	۳۲
	آدم	ڈاکٹر وزیر آغا	۳۲
رپورتاژ:	سرحد کا مغنی دریا	عارف حجازی	۳۳
فکاہیہ:	افسانہ نگار (شادی سے پہلے، شادی کے بعد)	اشرف صبوحی	۳۷
خواتین:	پاکستانی خواتین کی ترقی		۴۵
مصور فیچر:	صنعتی ترقیاتی کارپوریشن		۴۱
افق تا افق:	نیا نظامِ تعلیم (اقتباسات)	ڈاکٹر سید عبداللہ	۴۷
نقد و نظر:	ر۔خ		۵۲
ہماری ڈاک:			۵۵
سرورق:	دیہاتی منظر	رنگین عکس: آفتاب	

ماہِ نو

جلد ۱۰ — شمارہ ۱۰

جنوری — ۱۹۵۸ء

مدیر

رفیق خاور

نائب مدیر

ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

۱۹۵۷ء اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ ختم ہوا۔ اس کے آخری ایام ابھی ہماری کے لئے یادگار رہیں گے کیونکہ ان میں انسان کی حکمت عملی سے پہلی دفعہ زمین سے کہیں دور، نادیدہ فضاؤں میں دو مصنوعی سیارے گردش کرنے لگے اور بنی آدم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ خبر نہیں یہ دور آگے چل کر اپنے ساتھ کیا کیا انکشافات لائے اور کیا کیا انقلابات رونما ہوں۔ یہ تجربہ جو اپنے اندر ایک طلسمی کشش لئے ہوئے ہے، تخیل کو کچھ اس طرح برانگیختہ کرتا ہے کہ ہم لامکاں کی بے حد و کراں پہنائیوں میں کھو جاتے ہیں اور کسی عہد میں، جو ممکن ہے زیادہ دور نہ ہو، سیارہ بہ سیارہ آمد و رفت کا تصور کرتے ہیں۔ آج ہم میں سے اکثر یہی سوچنے لگ گئے ہیں کہ دیکھئے زمان و مکاں کی تسخیر کا جو خواب ہم نہ جانے کب سے دیکھتے چلے آئے ہیں، وہ جوہری توانائی اور اس قسم کی دوسری سائنسی دریافتوں سے کس کس طرح شرمندۂ تعبیر ہوتا جا رہا ہے۔ بہرحال اب ہمارے لئے اس نئی کائناتی فضا کے ضمن میں غور و فکر ناگزیر ہو گیا ہے۔

★

اس سے کچھ کم پیمانے پر، خود ہماری موجودہ دنیا میں، فاصلے اس قدر مٹ چکے ہیں کہ وہ ملک بھی جو ہزارہا میل دور ہیں، ایک دوسرے سے قریب آ گئے ہیں اور قوموں میں وسیع پیمانہ پر ربط و ضبط شروع ہو گیا ہے۔ پاکستان بھی اس عالمگیر رجحان میں شریک ہے، چنانچہ یہاں متعدد بین الاقوامی اجتماعات اور ثقافتی، سماجی اور صنعتی نمائشیں منعقد ہوتی رہی ہیں۔ حال ہی میں بین الاقوامی جشنِ ثقافت، جس کی تفصیلی کیفیت آپ اس شمارہ میں دیکھیں گے۔ اس روز افزوں میل جول کا تازہ ترین مظہر ہے۔ اس پندرہ روزہ جشن میں مشرق و مغرب کے کتنے ہی ممالک شریک ہوئے جنہوں نے اپنے فنی کمالات کا عمدہ مظاہرہ کیا۔ ہمارے جرمن اور امریکی مہمانوں کے فنی مظاہرے اپنی مخصوص مغربی وضع کے ساتھ ایسی ندرت کے حامل تھے جس سے خود بخود نئے نئے خیالات سوجھتے اور نئی نئی راہیں اختیار کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ چینی طائفہ کے مظاہروں کو خاص طور پر پسند کیا گیا۔ ان میں نفاست، شائستگی اور شوخیٔ تصور کے ساتھ ساتھ مشرقی حجاب کو بھی کافی دخل تھا۔ چینی فن کاروں نے جس طرح مقامی سنگیت اور مغربی پاکستان کے لُڈی ناچ کو ایک دو دن ہی میں اپنایا اور پیش کیا، وہ ان کی طبعی صلاحیت اور غیر معمولی قدرتِ فن کی علامت ہے۔ اس موقع پر پاکستانی فن کاروں کا اظہارِ کمال بھی کچھ کم جاذبِ توجہ نہیں رہا۔ انہوں نے کلاسیکی موسیقی اور رقص کے معیاری نمونوں کے علاوہ ایسے تجربے بھی پیش کئے جن سے نئی نئی راہیں اختیار کرنے کا شوق اور سلیقہ ظاہر ہوتا ہے۔

★

اس مہینے مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کی برسی ہے۔ اس کی مناسبت سے ہم اردو کے اس مایۂ ناز انشا پرداز پر ایک مضمون شائع کر رہے ہیں جس میں ان کے دوبارہ سفرِ ایران پر نئی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر اب تک زیادہ تر قیاس آرائی ہی سے کام لیا گیا ہے۔ جو شواہد اس مضمون میں پیش کئے گئے ہیں (بالمخصوص وہ دستاویز جس کی نقل اس میں درج ہے) ان سے بات فیصلہ کن صورت اختیار کر لیتی ہے۔

★

اس شمارہ میں ہم ایسے نئے لکھنے والوں کے "اوّلیں افسانہ" کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں جن کا ابھی تک کوئی افسانہ کہیں شائع نہیں ہوا، تاکہ نئے نئے جوہروں کو اُبھرنے کا موقع ملے۔ جو اصحاب اس مقابلے میں شریک ہوں وہ افسانہ ارسال کرتے وقت یہ وضاحت کر دیں کہ یہ کہیں سے ماخوذ یا ترجمہ نہیں، اور یہ بھی کہ قبل ازیں ان کا کوئی افسانہ شائع نہیں ہوا۔ اپنا نام اور پتہ خوشخط تحریر کریں اور آسانی سے ممکن ہو تو اپنے اور اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں تھوڑی سی معلومات بھی بہم پہنچائیں۔

★

یادِ رفتگاں

جوش ملیح آبادی

میری یہ بڑی خوش قسمتی ہے اور بدبختی بھی کہ میں نے اس وقت ہوش سنبھالا جبکہ ہماری پرانی تہذیب دم توڑ رہی تھی، اور نئی تہذیب کی ولادت کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا۔ خوش قسمتی تو اس لحاظ سے تھی کہ ہر چند میرے بزرگوں والا لکھنؤ اس وقت باقی نہیں رہا تھا، لیکن ابھی اس کی رنگ اُڑی ہوئی زریں محراب میں کچھ ایسی شمعیں روشن تھیں جنہیں دیکھ کر مرحوم لکھنؤ کی تہذیب کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا اور بدبختی اس لحاظ سے تھی کہ ان اکابر کی صحبتوں میں شریک ہونے اور ان کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اب میں اپنے دور کے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، جن میں اپنے بزرگوں کا کوئی جوہر باقی نہیں رہا ؎

ان آنکھوں کا یہی ہے لیکھ
وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ

میرے خاندان میں سب سے پہلے معلوم شاعر میرے پردادا احسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں بہادر گویا تھے۔ اور ان کے بعد سے یہ سلسلہ میرے دادا اور میرے باپ سے ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا ہے۔

میری پیدائش اس عبوری دور میں ہوئی جب حالی، امیر اور داغ کے چراغ موت کی ہوا سے جھلملا رہے تھے اور میرے ہوش سنبھالتے ہی اُن بجھے ہوئے چراغوں کا دھواں ہوا میں لہرا کر فضا میں تحلیل ہو چکا تھا۔ بچپن میں لکھنؤ کے جس ممتاز غزل گو شاعر کو سب سے پہلے میں نے دیکھا وہ ضامن علی صاحب جلال تھے۔ جن سے امیر و داغ کے بعد میرے والد اصلاح لیا کرتے تھے۔ حضرت جلال کی عمر اس وقت ستر بہتّر سے متجاوز ہو گی۔ وہ دُبلے پتلے آدمی اور دمے کے مریض تھے۔ اُن کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ اور ایسا کہ ان کی پیری میں بھی ایک بانکپن کی آن نکلتی تھی۔

حضرتِ جلال کی یہ ایک خاص شان تھی کہ وہ کسی شاعر کو خطرے میں نہیں لاتے تھے، چنانچہ ایک روز جب کہ وہ میرے والد کے ساتھ حسین آباد کی طرف گاڑی میں گذر رہے تھے تو گاڑی جس وقت شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد کے سامنے سے گذرنے لگی۔ جلال نے میرے والد سے مسجد کی جانب اشارہ کر کے پوچھا " خان صاحب یہ کیا ہے؟" والد نے مسکرا کر فرمایا " جناب والا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" جلال نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا "آپ اس کا نام تو لیجیے"۔ والد نے ہنس کر فرمایا: "مسجد"۔

یہ سنتے ہی جلال صاحب کے چہرے سے ایک خاص قسم کا جلال ٹپکنے لگا، اور مسجد کی جانب دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے ایک عجیب ولولے کے ساتھ فرمانے لگے کہ خاں صاحب اس خانۂ خدا کی حُرمت کو گواہ کر کے دعویٰ کرتا ہوں کہ جلال کا سا شاعر نہ کبھی تھا نہ آج ہے، نہ کل پیدا ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالباً تعشق کے بعد جلال ہی وہ پہلے غزل گو تھے جنہوں نے لکھنؤ کی لفظی رعایت والی مصنوعی غزل گوئی سے روگردانی کر کے غزل کو جذباتی سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے زبان کو بھی بہت کچھ مانجھ دیا تھا، لیکن متروکات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیا تھا کہ اگر وہ دراز ہو جاتا تو اردو کے گیسو مختصر ہو کر پٹوں میں تبدیل ہو جاتے!

میرے باپ کی یہ سنتِ جاریہ تھی کہ وہ اپنے ہندوستان کے تمام دوستوں کے پاس ہر سال آموں کے ٹوکرے بطور تحفہ روانہ فرمایا کرتے تھے، لیکن شعرائے لکھنؤ کی خدمت میں آموں اور دوسرے پھلوں کے ساتھ غلہ اور گھی بھی روانہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حسب دستور ایک روز والد نے اپنے ایک سپاہی محمد شیر خاں کی معرفت حضرتِ جلال کی خدمت میں جب گھی بھیجا تو وہ شام کے قریب تمتماتے چہرے کے ساتھ آئے، والد کو سلام کیا، اور واپس شدہ گھی کے ظرف کو اسٹول پر رکھ کر خاموشی کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ محمد شیر خاں ہمارے تمام سپاہیوں میں سب سے زیادہ

کٹیلے کڑوے اور تیکھے تھے اور ان کے متعلق والد فرمایا کرتے تھے کہ محمد شیر خاں اُن آدمیوں میں سے ہیں کہ اگر ان کی ایک ایک بوٹی بھی کاٹ ڈالی جائے پھر بھی وہ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کریں گے یعنی وہ قائل ہو جانے اور اپنی غلطی کے مان لینے کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا چکے تھے۔

جب محمد شیر خاں گھی کا ظرف سامنے رکھ کر چپ سادھ گئے تو میرے والد سمجھ گئے کہ وہ کوئی نہ کوئی گُل کھلا کر آئے ہیں۔ چنانچہ والد نے ارشاد فرمایا: خاموش کیوں کھڑے ہو؟ کچھ تو سر سے کھیلو منہ سے بولو کہ آخر ہوا کیا؟ یہ سنتے ہی محمد شیر خاں نے غصّے میں اپنی داڑھی کو منہ میں دبایا اور کہا کہ۔

"فدوی حضور کے حقِ نمک سے ادا ہو چکا ہے۔ یہ صرف حضور کا خیال تھا کہ میں کچھ نہیں بولا، نہیں تو جلال کو مزا چکھا دیتا۔"

والد نے بگڑ کر فرمایا۔ "بات بتاتے نہیں اور جامے سے باہر ہوئے چلے جا رہے ہو۔" محمد شیر خاں نے والد کے تیور بگڑے ہوئے دیکھے تو ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "حضور جیسے ہی میں نے دروازے پر جا کر ہانک دی، جلال غصّے میں بھرے باہر آئے اور کہنے لگے: "جاؤ، جاؤ، تم کون ہو؟"

میں نے تپّا مار کر کہا: "خاں صاحب بہادر نے ملیاباد (ملیح آباد) سے آپ کو گھی بھیجا ہے۔" لال پیلے ہو کر انہوں نے کہا: "لے جاؤ، لے جاؤ اس گھی کو، گھی بھیجا ہے اور ہمارے ہاں، جاؤ، جاؤ، میں گھی نہیں لیتا، بڑے آئے گھی دینے والے۔ حضور یہ آپ کا ڈر تھا۔ جو میں نے یہ سنا او منہ سے کچھ نہیں بولا۔ آپ کا ملنے والا نہ ہوتا تو قرآن مجید کی قسم! مزا چکھا دیتا۔" اس کے دوسرے ہی روز والد مجھے ہمراہ لے کر حضرتِ جلال سے ملنے کی خاطر تشریف لے گئے۔ محمد شیر خاں بھی ساتھ تھے۔ انہیں دیکھتے ہی جلال نے والد سے کہا۔ "خاں صاحب خطا معاف! ان داڑھی والے کو میرے سامنے سے ہٹا دیجئے۔" والد نے محمد شیر خاں کو اشارہ کیا۔ اور وہ فرطِ غضب سے اپنی انگلی کو اپنے دانتوں سے چباتے ہوئے باہر چلے گئے۔

اُن کے اوجھل ہوتے ہی جلال نے والد سے کہا۔ "خاں صاحب۔ اس داڑھی والے جناور نے میری ناک کٹا ڈالی۔ محلے بھر میں میری ناک کٹا ڈالی۔"

والد نے انتہائی سنجیدہ ہو کر فرمایا۔ "ناک کٹا ڈالی! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں بھلا اس کی یہ مجال!"

جلال نے بات کاٹ کر کہا: "خاں صاحب کیا عرض کروں۔" اور خاموش ہو گئے۔ والد نے بڑے ادب کے ساتھ کہا۔ "برائے خدا جلد بتائیے اس نے کیا کیا۔ میں اسے کان پکڑ کر کھڑے کھڑے نکال دوں گا۔" جلال صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر فرمایا۔ "حضرت یہ جناور میرے دروازے پر آیا، لاٹھی سے میرا دروازہ ٹھونکا۔ آپ خود ملاحظہ فرمائیے، لاٹھی سے میرا دروازہ ٹھونکا، اور پھر چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "جلال خاں ہوت۔ جلال خاں ہوت۔ جلال خاں ہوت!"

آپ نے سُنا خاں صاحب، جلال خاں ہوت، میں کہتا ہوں مجھے اس وقت موت کیوں نہ آ گئی۔ میری دونوں بیگموں نے سُنا، میرے محلے بھر نے سُنا کہ میر ضامن علی جلال کو، جلال خاں ہوت، جلال خاں ہوت کے نعروں سے پکارا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر حضرت جلال نے اپنا سر پکڑ لیا اور گردن ہلا ہلا کر بار بار زیرِ لب کہتے رہے: "جلال خاں ہوت! اللہ اکبر، جلال خاں ہوت! اللہ اکبر!" دیکھے آپ نے جلال کے تیور؟ یہ تھا، یادش بخیر، ہمارا لکھنؤ!۔

اب ایک دوسرے بزرگوار کا قصّہ سنیئے۔ یہ تھے دُبلے پتلے، گورے چٹے، میانہ قامت، میر بارق لکھنوی، جن کا سن اس وقت ستّر کے لگ بھگ ہو گا۔ لکھنؤ کے بہت سے گوشہ نشین، لیکن خوش فکر شعرا کی طرح میر بارق کی شہرت بھی کبھی لکھنؤ کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلی۔ میر صاحب انتہا درجہ کے مفلس آدمی تھے۔ ان کی ایک قلیل المعاش بہن ان کے محلے سے کہیں بہت دور رہتی تھیں اور وہ بے چاری کھانا پکا کر انہیں بھیجا کرتی تھیں۔ اور کھانا چونکہ روز نہیں آ سکتا تھا، میر صاحب ان کی سوکھی چپاتیوں کو پانی میں تر کر کے دو دو چار وقت کھایا کرتے تھے لیکن خودداری کا یہ عالم تھا کہ وہ تقریباً روز میرے والد کے پاس آتے تھے لیکن ہمارے دسترخوان پر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے اور یہ بات صرف ہمیں تک محدود نہیں تھی۔ وہ اپنے کسی قرابت دار یا کسی دوست کے ہاں کھانا کھانے کو حرام سمجھتے تھے۔ اور جب ان سے کھانے کے لئے اصرار کیا جاتا تھا تو وہ بڑی صاف بیانی کے ساتھ کہتے تھے۔ میاں اگر ہم کسی کے گھر دس بار کھانا کھائیں تو اسے ایک بار تو کھانا کھلا دیں۔ اور جب ہماری

یہ حالت ہے کہ ہم کسی کو کھانا نہیں کھلا سکتے، تو پھر اس کے یہی معنی ہوں گے کہ ہم دوسروں کے گھر کھانا کھائیں اور دسترخوان کی مکھی کا خطاب پائیں۔ ایک روز غالباً محرم کی ساتویں تھی کہ وہ ہمارے گھر آئے۔ اس وقت مجلس کی شیرینی تقسیم ہو رہی تھی۔ چنانچہ مٹھائی کی تھالی میر بارق کے سامنے بھی آئی، اور انہوں نے حسبِ دستورِ قدیم اس کے چکھنے سے انکار فرما دیا۔ میرے والد نے فرمایا "میر صاحب یہ تو حضرت امام حسین علیہ السلام کی نیاز کی مٹھائی ہے۔ آپ اس تبرک سے بھی اجتناب فرمائیں گے؟"

یہ سن کر میر صاحب نے قائل ہو کر آنکھیں جھکا لیں۔ اور چاہتے تھے کہ برفی کی ایک ڈلی اٹھائیں کہ یکایک حامد علی خاں بیرسٹر برآمدے میں نمودار ہو گئے اور وہیں سے چلا چلا کر کہنے لگے "بارق صاحب دیکھ لیا۔ بارق صاحب دیکھ لیا!" بارق صاحب نے یہ سنتے ہی برفی کی ڈلی تھالی میں رکھ دی اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ یہ دیکھتے ہی حامد علی خاں بیرسٹر کے حواس گم ہو گئے۔ وہ لپکے ہوئے میر صاحب کے پاس آئے اور ہاتھ جوڑ کر معافی کی خواستگاری کرتے ہوئے کہنے لگے "میر صاحب اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ پر ایک ذرا سی مذاق کی بات کا اس قدر اثر ہو گا تو واللہ کہ میں ایسی جسارت کبھی نہ کرتا۔"

بارق صاحب نے ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر کہا "لیکن آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ آس پاس کے لوگ اور سڑک والے جب میر صاحب دیکھ لیا، میر صاحب دیکھ لیا، کا نوحہ سنیں گے تو اُن کو یقین ہو جائیگا کہ میر بارق کوئی ایسی بیہودہ حرکت ضرور کر رہا ہو گا کہ بیرسٹر صاحب کو ٹوکنا پڑا۔ آپ نے مجھے اس قابل بھی نہیں رکھا کہ اب یہاں سے باہر نکل کر خلق خدا کو منہ دکھا سکوں!"

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ یہ تھا ہمارے بزرگوں کا احساسِ بُردباری اور پاسِ وضعداری۔ ایک شام کا ذکر ہے۔ اتفاق سے والد کے پاس اس وقت میر بارق کے علاوہ اور کوئی نہ تھا کہ میرے والد نے مجھے پکارا اور میرے کان میں کہا کہ اپنی ماں سے پانچ اشرفیاں لے آؤ۔ اور رومال میں لپیٹ کر لانا۔ چنانچہ میں رومال میں لپیٹ کر اشرفیاں لے آیا اور والد کے حوالے کر دیں۔ اور والد نے مجھ سے فرمایا "اچھا جاؤ کھیلو" میں باہر چلا گیا۔ لیکن ذوقِ تجسس کے باعث، پاکھے کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا کہ اب کیا ہو گا۔ میں نے دیکھا کہ والد کھڑے ہو گئے۔ اور درباریوں کی طرح جھک کر وہ اشرفیاں بارق صاحب کی خدمت میں پیش فرمائیں۔ بارق صاحب یہ دیکھتے ہی کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور بھرائی آواز میں کہنے لگے "خاں صاحب بہادر، حضرت عباس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یہ اشرفیاں نہیں لوں گا۔ ہرگز نہیں لوں گا۔ اور اگر آپ دوبارہ چالیس قسم کا کرم مجھ پر کرنا چاہیں گے تو جناب امیر کی قسم میں آپ کو تمام عمر صورت نہیں دکھاؤں گا۔" یہ تھی مردانِ خدا کی شان۔ اور یہ تھی لکھنؤ کے بے زروں کی آن!

همت نخورد نیشترِ لا و نعم ما

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی تہذیب نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے، ہمیں بہت کچھ دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری ثقافت کا وہ سرمایہ عزّ و افتخار ہم سے چھین لیا ہے جس کے بغیر لفظ "ایشیا" بے معنی سا ہو کر رہ گیا ہے۔

ایک روز میر بارق ایک محفل میں ملے۔ پوچھنے لگے میاں اب کس محلّے میں قیام ہے، میں نے کہا "لا ٹوش روڈ پہ" تہے ہے! میر صاحب نے چھاتی پیٹ کر کہا "ارے تم اتنے خوش گو شاعر ہو کر ایک ایسی خبیث سڑک پر رہتے ہو جس میں (ٹ) اور (ڈ) کے سے حروفِ ثقیلہ پائے جاتے ہیں! میرے منہ سے تو اس نامراد سڑک کا نام تک نہیں نکل سکتا۔ اگر خاں صاحب زندہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ ان حروفِ ثقیلہ میں کبھی قیام نہ فرماتے میاں جب تک اس محلے میں رہو گے، ہم کبھی ملنے نہیں آئیں گے؟"

دیکھا آپ نے، یہ تھا ان لوگوں میں موسیقیت کا رچاؤ اور صوتی زیر و بم کا رکھ رکھاؤ!

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

★

آزاد کا سفرِ ایران

ڈاکٹر محمد صادق

مولانا محمد حسین آزاد دو دفعہ ایران گئے۔ پہلی بار غالباً ۱۸۶۵ء اور دوسری دفعہ ۱۸۸۵ء میں۔ دوسرے سفر کے حالات اور مشاہدات انہوں نے اپنی مختصر سی تصنیف "سیر ایران" میں قلمبند کئے ہیں لیکن پہلے سفر کے کوائف اور محرکات کا آجکل تو کیا ان دنوں بھی کسی کو علم نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد بے حد محتاط تھے۔ دوسرے انہیں تاکید کی گئی تھی کہ اس سفر کے اغراض و مقاصد کسی پر ظاہر نہ کریں، اس لئے انہوں نے آخر تک انہیں صیغۂ راز میں رکھا۔ اس پر قیاس آرائیاں شروع ہوئیں، چنانچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "مرحوم دہلی کالج" میں لکھا ہے کہ "غدر" کے بعد آزاد ایران بھاگ گئے اور جب گورنمنٹ کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہوا تو واپس آ گئے۔ لیکن آزاد کی اپنی تصنیف "آبحیات" سے اس کی تردید ہوتی ہے کیونکہ اس کے صفحہ ۱۵۲ پر لکھا ہے کہ ۱۸۵۸ء میں وہ لکھنؤ میں اردو شعراء کے متعلق مواد جمع کر رہے تھے۔

آزاد نے سفر ایران کیوں اختیار کیا؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہنگامۂ ۵۷ء کے دوران میں اور اس کے بعد اُن کی زندگی کا جائزہ لیا جائے۔ کچھ عرصہ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ آزاد کے والد مولوی محمد باقر اُن بے شمار بے گناہ لوگوں میں سے تھے جنہیں برطانوی جبر و تشدد اور بہیمانہ جوشِ انتقام کے بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے (ملاحظہ ہو مضمون "اردو کا پہلا صحافی" مطبوعہ "ماہ نو" بابت جون ۵۶ء) یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ سانحۂ ۵۷ء کے دوران میں مولوی محمد باقر اور خود آزاد نے انقلاب پسندوں کا ساتھ دیا تھا۔ اسی کی پاداش میں مولوی صاحب کو سزائے موت ملی۔ رہا آزاد کا معاملہ تو یہ ان کی خوش قسمتی تھی اور ہماری بھی کہ وہ اپنی گرفتاری کے احکام جاری ہونے سے پہلے ہی روپوش ہو کر دہلی سے نکل پڑے تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد آزاد دربدر ٹھوکریں کھاتے، مصیبتیں جھیلتے، نہایت کس مپرسی کے عالم میں لاہور وارد ہوئے اور نہایت صبر آزما حالات کے بعد انہیں محکمۂ تعلیم کے دفتر میں ایک ادنیٰ سی ملازمت مل گئی۔ ان دنوں پنجاب میں ایک نئی ادبی اور علمی زندگی جنم لے رہی تھی اور آزاد باوجود اپنی زبوں حالی کے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس ضمن میں ان کی ملاقات ڈاکٹر لائٹنر سے ہوئی اور یہ رابطہ اتنا بڑھا کہ وہ ان کے زمرۂ احباب میں شمار ہونے لگے۔ بعد میں جب آزاد "انجمن پنجاب" لاہور کے سکرٹری مقرر ہوئے تو یہ ڈاکٹر لائٹنر ہی کی مساعی کا نتیجہ تھا۔

ڈاکٹر لائٹنر اپنے عہد کی ممتاز ہستیوں میں سے تھے۔ وہ بیک وقت گورنمنٹ کالج کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ وہ ہنگری کے یہودی النسل باشندے تھے۔ معلوم نہیں پہلے پہل کب پنجاب آئے لیکن اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ پنجاب کے پہلے انگریزی اخبار "انڈین پبلک یونین" کے ایڈیٹر اور مالک تھے۔ اس کام میں سر لیپل گرفن ان کے شریک کار تھے۔ یہ وہی اخبار ہے جسے بعد میں "سول ملٹری گزٹ" کا نام دیا گیا۔

ہندوستان آنے سے پہلے ڈاکٹر لائٹنر لندن یونیورسٹی میں عربی زبان کے مددگار استاد تھے اور جنگ کریمیا کے دوران اوّل درجے کے ترجمان کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ ان کا شمار اعلیٰ درجہ کے زبان دانوں اور ماہرین لسانیات میں ہوتا تھا۔ اور انہیں عربی اور ترکی میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ لائٹنر کی تمام ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں آزاد اُن کے دستِ راست تھے۔ آزاد کی غیر معمولی صلاحیتوں سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن لائٹنر کی سرپرستی سے اُن کا رسوخ بڑھ گیا اور انہیں اپنی قابلیتوں کے اظہار کا موقع ملا۔

۱۸۵۷ء کے چند سال بعد آزاد کو نہ صرف فارغ البالی حاصل ہو چکی تھی بلکہ ادبی حلقوں میں اُن کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ نیز "انجمن پنجاب" کے سکریٹری کی حیثیت سے ان کے انگریزی حکام سے بھی مراسم پختہ ہو رہے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ۵۷ء کے عواقب کا خوف ایک آسیب کی طرح ان کے ذہن پر چھایا رہتا تھا۔ انہیں خوف تھا کہ اگر اس واقعہ میں شمولیت کا راز فاش ہو گیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا اور یہ خدشہ موہوم نہ تھا جب تک

آزاد گمنام رہے کسی شخص نے اُن سے تعرض نہ کیا لیکن جب وہ محکمۂ تعلیم میں ایک اعلیٰ ملازمت پر فائز ہو گئے تو ان کے بعض اقارب کا جذبۂ رقابت بھڑک اٹھا۔ ان کے ایک عزیز نے جو لاہور میں ملازم تھے، ان کے خلاف رپورٹ جڑ دی کہ آزاد جو گورنمنٹ کا خیر خواہ بنا پھرتا ہے، اس نے اپنے باپ کی طرح "غدر" میں انقلابیوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد کے خلاف خفیہ طور پر تفتیش شروع ہو گئی اور کچھ دیر بعد اُن کی شملہ میں طلبی ہوئی تاکہ وہ ان الزامات کا جواب دیں۔ اس سے آزاد کے اوسان خطا ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ مواخذہ سے بچ نہ سکیں گے۔ اس پریشانی کے عالم میں انہیں صرف ایک شعاعِ امید نظر آئی - ڈاکٹر لائیٹنر۔ چنانچہ انہوں نے اپنا سارا حال انہیں کہہ سنایا اور اُن کی اعانت طلب کی۔ ڈاکٹر لائیٹنر اپنے دوستوں کی مدد اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ انہوں نے ان کی مدد کا بیڑا اٹھایا اور جو کہا تھا کر دکھایا۔ آزاد کو جواب دہی کے لئے شملہ تو جانا پڑا لیکن معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اس کے بعد بھی آزاد ملک کی اُن ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں جن کی تحریک حکومت کی طرف سے ہوتی تھی نہایت انہماک سے حصہ لیتے رہے تاکہ ان کی وفاداری کا خیال حکام کے دلوں پر پختگی سے مرتسم ہو جائے۔ جلد ہی انہیں ایک ایسی خدمت سرانجام دینے کا موقع مل گیا جس نے انہیں سرکاری شبہات سے ہمیشہ کے لئے نجات دلوا دی۔ ان دنوں روس کا بڑھتا ہوا رسوخ ہندوستانی سیاست کے لئے ایک مستقل کابوس تھا۔ یعنی وہ وسط ایشیا کے مسلمان ممالک کو اپنے حیطۂ اقتدار یا اختیار میں لا کر ہندوستان پر حملہ آور ہوگا۔ چنانچہ اس کے سدباب کے لئے برطانوی حکومت نے ایران اور افغانستان سے معاہدے کئے۔ روس نے پہلے پہل خیوا کے حکمراں پر یہ الزام لگایا کہ وہ روسی باشندوں کو غلام بنا کر فروخت کرتا ہے۔ اور اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن یہ حملہ ناکام رہا۔ جنگ کریمیا کے بعد روس نے پھر وسطِ ایشیا میں قدم بڑھائے اور ۱۸۶۴ء میں روس بڑھتے بڑھتے خیوا، خجند اور بخارا کی حدود تک پہنچ گیا۔ ان ممالک نے انگلستان اور ہندوستان سے مدد طلب کی۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں بمقام لاہور لارڈ لارنس اور سفیرِ خجند کی ملاقات ہوئی۔ تین سال بعد بخارا کا سفیر بھی ہندوستان آیا۔ لیکن یہ سفارت بھی ناکام رہی اور روس نے بخارا اور خجند پر قبضہ کر لیا۔

برطانوی گورنمنٹ ان مخمصوں میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی تاہم وہ خواہاں تھی کہ روس کے جارحانہ اقدامات سے جو واقعات ان ممالک میں رونما ہو رہے تھے ان کے متعلق قابلِ وثوق معلومات حاصل کرے۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ ایک خفیہ مشن ان ممالک میں بھیجا جائے جو ان کا دورہ کرے اور ان کے سیاسی حالات پر رپورٹ پیش کرے۔ حکام کی نظر میں اس کام کے لئے ڈاکٹر لائیٹنر سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ تھا۔ وہ نہ صرف عربی اور ترکی کے عالم تھے بلکہ ان دونوں زبانوں کو بے تکان بول سکتے تھے۔ علاوہ بریں انہیں اسلامیات پر بھی پورا پورا عبور تھا۔ چنانچہ انہیں اس وفد کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس کے صرف دو اور رکن تھے۔ آزاد[1] اور پنڈت من پھول[2]، جن کا انتخاب ڈاکٹر لائیٹنر کے ایما سے ہوا۔

آزاد کے لئے یہ منصوبہ دو وجہ سے اہم تھا۔ ایک یہ کہ انہیں ایران اور اسلامی دنیا کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اور دوسرے یہ خدمت سرانجام دے کر وہ گورنمنٹ کے مقربینِ خاص میں داخل ہو جائیں گے۔ اور انہیں "غدر" کے عواقب سے نجات حاصل ہوگی۔

اس خفیہ مشن کی تفصیلات کا آج کسی کو علم نہیں کیونکہ تینوں اراکین پر ان معاملات کو پردۂ اخفا میں رکھنے کی کڑی شرط لگا دی گئی تھی۔ جہاں تک آزاد کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں اتنے محتاط تھے کہ بالفاظ مولوی خلیل الرحمٰن مؤلف "خبار اندلس"، انہوں نے ان کا ذکر اپنی اہلیہ تک سے نہ کیا ہوگا!

معتبر ذرائع سے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ اس سفر میں ڈاکٹر لائیٹنر نے اپنے تئیں ایک مسلمان عالم ظاہر کیا۔ مولانا آزاد نے ایک آزاد منش فقیر کا روپ دھارا۔ ایک دو جگہ نانبائی کا کام کیا اور کچھ عرصہ مرغینان میں طلبا کو تعلیم دیتے رہے۔ لائیٹنر اور آزاد نے اس ضمن میں کیا کام کیا، اس کا کسی کو علم نہیں۔ ہاں اس کام کی نوعیت پر ایک "سوال نامہ" سے روشنی پڑتی ہے جو آزاد اور دوسرے ممبروں کو دیا گیا تھا۔ ذیل میں اس نایاب مسودہ کی نقل پیش کی جاتی ہے۔ اس میں ممالک اور شہروں کے نام نہیں دئے گئے بلکہ ان کے پہلے حروف پر اکتفا کیا گیا ہے۔ (اس مسودہ کی عبارت مع روشِ املا حسب ذیل ہے):-

---

[1] سنا گیا ہے کہ اس معاملہ میں مولوی سید رجب علی خاں ارسطو جاہ نے آزاد کی مدد کی تھی۔ آپ دہلی کے باشندے تھے اور سر سید کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ "غدر" کے بعد بہت ترقی کی۔ آپ نے ایک اخبار بھی نکالا تھا جس کا نام "مجمع البحرین" تھا۔

[2] پنڈت من پھول دہلی کے ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ "دہلی کالج" میں انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اور ان دنوں لاٹ صاحب کے نجی سیکرٹری تھے۔ آزاد سے مربیانہ سلوک تھا۔ آزاد کی تصنیف "نصیحت کا کرن پھول" میں ان کے نام کی رعایت ہے۔

"(ک) میں ان کی اصل حیثیت کیا ہے۔ کتنی فوج ان کی اس ملک میں ہے بہ تفصیل سوار و پیادہ و توپ خانہ۔ فوج ان کی بیشتر اصلی ہے یعنی آدمی سپاہ کی سکنائے گرد و نواح سنٹ پیٹس برگ سے ہیں یا مسلمان سپاہی ہیں جو اضلاع و توابع (م) حدود متصلہ (ک) میں بھرتی کئے گئے۔ افسر اور سپاہی ایک ہی قوم سی ہیں یا افسر عیسائی ہیں اور سپاہی ماتحت مسلمان ــ (م) نے کیا قلعہ بنائے ہیں اور ان پر توپیں چڑھائی ہیں بڑی بڑی پلٹنیں کے یا وہ فقط مضبوط سرائے ہیں جو واسطے حفاظت سوداگران و مسافران از غارت گران بنائی گئی ــ کیا یہ تعمیرات بہت بنائی ہیں۔ عموماً کتنے آدمی ہر جگہ میں مامور ہیں ــ کیا (م) نے (ک) والوں کو بالکل شکست دی ہی یا وہ دونوں اب تک لڑتی ہیں اگر لڑتی ہیں تو (ک) والے اس لائق ہیں کہ خاطر خواہ کامیابی کے ساتھ مقابلہ (م) کا کریں یا ضرور شکست کھاویں گی۔ لڑائی کا سبب کیا ہوا ہے آیا یہ بات ہے کہ (م) چاہتے ہیں کہ (ک) کو فتح کر کے متصرف ہو جاویں یا فقط (م) کا یہ مطلب ہے کہ (ک) والوں کو حملہ ہائی اور دست درازی اپنی سرحد سے روکیں ــ کیا (ک) والی پہلی (م) کی ملک میں غارت گری نہیں کرتی تھی اور لوگوں کو پکڑ کر لے جاتی تھی جیسے ترکمان خراسان کی حدود پر کرتے ہیں ــ کیا (م) نے کسی قدر ملک (ک) پر تسلط کر لیا ہے اور جو کر لیا ہے تو کیا اس کا مالیہ وصول کرتے ہیں اور اس میں ٹیکس مقرر کر رکھا ہے اور بند و بست اس کا اپنے طور کر رکھا ہے۔ (م) نے (ک) میں اپنی طرف سے کوئی گورنر مقرر کر رکھا ہے اور جو کیا ہے تو اس کا نام کیا ہے وہ عیسائی ہے یا مسلمان ــ (ک) بسبب لڑائی سلسلہ تجارت کس طرح پر ہو رہا ہے آیا سست ہی یا بدستور ــ سوداگران کی حفاظت کرتے ہیں اور ان سے حسن سلوک پیش آتی ہیں یا برعکس ہوتا ہی (م) رعایائی ملک متفرقہ جدیدہ کی تالیف قلوب کرتے ہیں یا انکی ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں ــ یارقند کی لوگوں کی عموماً لڑائی کی بابت کیا رائی ہی جو مابین (م) اور (ک) کی ہے۔ کیا ان کو اندیشہ پیدا ہو گیا ہی اور وہ یہ امید کرتے ہیں کہ (م) ہمارے ملک یارقند پر بھی حملہ کر گی (ک) میں کوئی باترتیب گورنمنٹ ملکیہ لوگوں میں ہی یا نہ اور اگر ہی تو اوس خان یا سردار کی عمر اور سیرت کیا ہی۔ وہ لیس آدمی مستعد اور دلیر جس پر لوگوں کو بھروسا ہو ہی یا نہ ــ (ک) میں سپاہی ملکیہ لوک ہیں یا اپنے فوج ہی جہاں تک ہو سکے تعداد ہر ایک کے دریافت کرو۔ کیا بیشتر سپاہ سواران ہمراہیان سرداران ملک سے ہیں ــ خان (ک) کے پاس کوئی توپ ہے۔ اگر ہے تو کس پلٹی اور کس حجم کی اور عموماً اوسکی کتنے ماری اور کیونکر کھینچی جاتی ہی اگر گھوڑوں سے کھینچی جاتی ہی تو فی توپ کی گھوڑے لگائی جاتی ہے۔ کوئی میگزین بارود اور گولہ کا بھی رکھتی ہیں اگر نہیں رکھتے تو گزارہ کیونکر کرتے ہیں۔ سوار پیادہ کے پاس کیا کیا ہتھیار ہیں۔ کھلی ہوئی میدان میں (م) سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور لڑ سکتے ہیں یا فقط انکو اچانک چھاپہ مار کر حملوں سے حیران کر سکتے ہیں ــ چونکہ حال ہی خبر پہونچی ہی کہ خان (ک) یا تو مسند سے معزول کیا گیا اور نظر بند کیا گیا یا مارا گیا اور قبچاقیوں نی اسکو ہٹا کر ملک حوالہ شاہ (ب) کر دیا اسکا حال مفصل حتی الامکان دریافت ہونا چاہئے اور یہ بھی تحقیق ہونا چاہیے کہ اوسکا اثر غالباً نسبت رابطہ (م) اور (ب) ان دونوں ملکوں میں کیا ہوگا۔ علاوہ اسکی یورپ میں یقین ہو رہا ہی کہ (م) نی اپنے قدیمی قلعہ والی حد بڑھا دی ہی (ک) کا کچھ ملک لے کر۔ اس نئی حد کی تعین حتی الامکان معلوم ہونی چاہیئے جو قلعہ اس حد کی اوپر بنائی گئی کہاں کہاں اور کے قلعہ ہیں اور کس قدر ملک اس طرح سے (ک) سے نکل کر (م) میں شامل ہو گیا اور چونکہ معلوم ہوتا ہے کاشغر یارقند ختن میں جو اب تک چین کی ماتحت تھے مسلمانوں نے سرکشی ختائیوں سے کی اور اپنے سرداروں کے گورنمنٹ مقرر کر دی ہے اسکے صحیح حالات تحقیقات ہونی چاہیئے اور جو مابین ان ملکوں کی آپس میں واسطہ ہے اور درمیان (م) اور درمیان (ک) اور (ب) اور (م) کے جو کچھ؟ اور واسطہ ہو سب تحقیقات کرنا چاہیئے اور ان کی مرضی اور خواہش اور امکان رابطہ تجارت کیسے ہے اور نیز یہ کہ چین والی پھر سلطنت اپنے قائم کرنے والی ہیں یا نہ ــ اور کابل اور (ک) کی درمیان میں ملک بدخشان جس میں کان بہت ہیں اور ایک ایلچی حال میں بمعہ نمونہ جات پاس پاس (ک) پشاور کی آیا اسکی ملک کے حالات بھی شامل تحقیقات ہونے چاہیئے اور اسکی آمدنی اور پیداوار اور اس کا برتاؤ ریاستہائے متصلہ کے ساتھ کیا ہے تحقیقات ہونا چاہیئے۔"

اس مسودہ سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ مولانا کے سفر ایران کا محرک شوقِ تحقیق و تجسس نہ تھا، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، بلکہ ایک سیاسی مشن تھا۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس سفر سے آزاد کی معلومات میں کیا اضافہ ہوا، تو اس کا جواب ان کی تصنیف "سخندانِ پارس" کے مطالعہ سے مل سکتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایران کی پرانی تہذیب اور اس کے آثار قدیمہ کی جو جیتی جاگتی تصاویر آزاد نے اس کتاب میں پیش کی ہیں نیز ایران کی بوقلموں زندگی، اسکے باشندوں کے عادات خصائل، خوراک لباس، طرز معاشرت، موسموں کی بوقلمونی اور رنگینی کے جو شاداب مرقعے آزاد نے الفاظ کے ذریعہ کھینچے ہیں، وہ سب ان ذاتی مشاہدات کا نتیجہ ہیں جو اس سفر کی وجہ سے انہیں حاصل ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آزاد نے یہ بھی محسوس کیا کہ اسکے باشندوں کے فارسی زبان، اس کے خد و خال اور اس کے محاوروں کی ساخت پر ایران کے طبعی حالات، رسوم و عقائد، ان کے لباس، خوراک اور طرز حیات کا کیا اثر ہوا۔ یہ سب نہایت دقیع معلومات ہیں اور تمامتر اسی سیاسی مشن کا فیضان۔

فضل احمد کریم فضلی

غزل

(غمِ دوراں)

★

وہ سنگ سخت حوادث، وہ شیشۂ احساس
یہ سخت تر ہے کہ قائم ہیں اس پہ ہوش و حواس

بہار کے لئے دل خون کر دیا، لیکن
ہوا بہار کی آئی نہ عندلیب کو راس

کھلا یہ مجھ پہ بڑی تلخ کامیوں کے بعد
کہ تلخیوں میں بھی ہوتی ہے اک طرح کی مٹھاس

گذر رہی ہے کرم سے ترے خوش و ناخوش
عجیب دل کا ہے عالم نہ کوئی آس نہ پاس

کریں وہ مجھ پہ کرم یا ستم، خوشی ان کی
مری زباں پہ نہیں کچھ سوائے شکر و سپاس

اٹھا رہا ہوں قدم منزلِ یقیں کی طرف
گذر رہے ہیں مگر دل میں سیکڑوں وسواس

نہ ڈھونڈھو طرفہ مضامیں میرے شعروں میں
پہن لیا ہے حقیقت نے شاعرانہ لباس

اگر ہو دل سے تراوش تو شاعری الہام
جو صرف زورِ بیاں ہو تو شاعری بکواس

نہ زندگی میں سہی، میرے بعد ہی وہ سہی
کبھی تو ہوگا زمانہ مرا بھی قدر شناس

سبھوں کو اپنی ہی اپنی پڑے نہ کیوں فضلی
فضول تم ہو مری جان، اس قدر حساس

غزل

(غمِ جاناں)

★

گئے ہیں جب سے وہ رہنے لگا ہے یہ احساس
ہوا یہ جیسے کہ قائم ہے زندگی کی اساس

وہ راہِ عشق میں پہلے پہل مرا چلنا
قدم قدم پہ کشاکش، نظر نظر میں ہراس

وہ دم بخود شبِ مہتاب اور میں تنہا
وہ ایک عالمِ ہو، اور کوئی آس نہ پاس

ہوا ہے رام کہیں جاکے تب وہ شوخ غزال
ہزار راہِ طلب میں جب آئے ہیں بن باس

نفس نفس میں کھلی جا رہی ہے دل کی کلی
کہ عشق مثلِ نسیمِ سحر ہے خوش انفاس

بہت دنوں میں کہیں جاکے کوئی بنتا ہے
ادب شناس، ادا آشنا نگاہ شناس

ہوا ہے مجھکو اکیلے میں بارہا محسوس
کہ جیسے بیٹھ گئے ہیں وہ آکے میرے پاس

امید ہے کہ بنے جا رہی ہے کیا کیا کچھ
مگر یہ شان تو دیکھو کہ سوت ہے نہ کپاس

کبھی کو مشقِ ستم کے لئے چنا فضلی
اب اُن سے بڑھ کے بھلا کون ہوگا قدر شناس

غزل

جلیل قدوائی

کرتے ہیں وہ پرسشِ الم کیا
رہتی نہیں میری چشم نم کیا؟
صورت سے عیاں نہیں ہے کیا کچھ!
آنکھوں کے گئے ہیں اشک تھم کیا
قسمت میں تھا دل کی ٹوٹ جانا
اب ٹوٹ گیا تو اس کا غم کیا
لو، اپنی جفا پہ ہیں وہ نادم
کرتے ہیں ستم پہ وہ ستم کیا!
کہتے ہیں وہ مجھ سے "ہم ہیں سب کچھ"
سب کچھ ہیں وہی اگر تو ہم کیا
گر حسن خود اپنی ذات سے ہے
پھر عشق کا رہ گیا بھرم کیا
اللہ کرے نہ اس کو واقف
اس سے ہرگز کہ ہے الم کیا
تم کو تو جلیل اک نہیں ہے
کرتے ہیں وہ التفات کم کیا!

غزل

اقبال عظیم

شراب شیشوں میں ڈھل رہی ہے، لبوں پہ ہے پھر بھی تشنگی سی
چراغ روشن ہیں انجمن میں، فضا ہے لیکن بجھی بجھی سی
شریک محفل ہیں یوں تو ہم بھی، مگر با ندازِ خود فریبی
مزاج محفل بھی اجنبی سا، نگاہ ساقی بھی اجنبی سی
عجیب منزل پہ آ کے ٹھہرے ہیں، راہِ امروز کے مسافر
نگاہِ ماضی میں بے رخی سی، جبینِ فردا پہ تیرگی سی
فریبِ منزل کا راز افشا ہوا ہے آ کر قریبِ منزل
نظر تو آئی تھی دور سے کچھ سوادِ منزل پہ روشنی سی
شکست کھائی ہے زندگی نے خود اپنے [illegible]
قدم بظاہر تو بڑھ رہے ہیں، مگر بباطن ہے بےدلی سی
نقاب پوشوں کی انجمن میں حقیقتیں یوں چھپی ہوئی ہیں
دلوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں، مگر بظاہر ہے دوستی سی
کسی کو اقبال کیا خبر ہو کہ دل پہ کیا کچھ گزر رہا ہے
نہیں سمجھتی ہے اس کو دنیا لبوں پہ ہے کچھ جو کپکپی سی

ڈرامہ:

دلِ بہشت

آغا بابر

افراد

منو۔ بیمار لڑکا
بیگم کرامت۔ منو کی ماں
ڈاکٹر۔
مسخرا۔ دل بہشت

ایک کمرہ

(سامنے کھڑکی، دائیں طرف اندر آنے کے لئے دروازہ۔ دوسرا دروازہ بائیں طرف۔ ایک چارپائی پر منو کمبل لے کر لیٹا ہوا ہے۔ چارپائی کے سرہانے ایک میز جس پر ٹیبل لمپ جل رہا ہے۔ ذرا دور تپائی پر ٹیلی فون۔ کمرے میں اداسی۔ پردہ اٹھتا ہے تو ڈاکٹر ٹیبل لمپ کی روشنی میں تھرمامیٹر دیکھ رہا ہے۔ منو کی ماں گھبرائی ہوئی اس پاس کھڑی ہے۔)

بیگم:۔ کیوں ڈاکٹر صاحب۔ کتنا ٹمپریچر ہے؟

ڈاکٹر:۔ اگر رات خیریت سے گزر گئی تو خدا کے گھر سے پوری امید ہے۔

بیگم:۔ ہائے میرے اللہ!

ڈاکٹر:۔ معاف کیجئے میں نے یہ کہہ دیا یہ میرا فرض تھا۔

منو:۔ (بیہوشی میں) دل بہشت! تم کہاں ہو؟ آتے کیوں نہیں؟

بیگم:۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے؟ کچھ تو کریں۔

ڈاکٹر:۔ میں اپنی پوری کوشش کر چکا بیگم صاحب!

منو:۔ مجھے دل بہشت چاہیئے، دل بہشت کو بلاؤ۔ میری بات تو سن دل بہشت۔

ڈاکٹر:۔ یہ بیہوشی میں کسے بلا رہا ہے؟

بیگم:۔ مسخرے کو منو میری جان، میرے لال۔ ہائے بیٹا کس طرح تپ رہا ہے۔

ڈاکٹر:۔ کس مسخرے کو؟

بیگم:۔ سرکس کا وہ مسخرا، کیا نام؟ دل بہشت۔ کل سے اسی کو پکارے جا رہا ہے۔

ڈاکٹر:۔ اچھا، وہ مسخرا! سرکس کے بھی چار پانچ آدمی بیمار پڑے ہیں۔ میں ہی ان کا علاج کر رہا ہوں۔

بیگم:۔ اگر اسے بلا بھیجیں تو۔ بیوقوفی تو ہے لیکن شاید منو اچھا ہو جائے۔

ڈاکٹر:۔ دل بہشت تو اب شاید ہی لوگوں کو خوش کر سکے۔

بیگم:۔ کیوں؟

ڈاکٹر:۔ وہ خود سخت بیمار ہے۔ شاید ہی بچے۔

بیگم:۔ کون؟ دل بہشت؟

ڈاکٹر:۔ ایسا باہمت مخولیا مریض میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ چند دنوں کا مہمان ہے مگر موت پر ہنس رہا ہے۔ اچھا بیگم صاحبہ میں چلتا ہوں۔ دل بہشت کو جا کر دیکھنا ہے۔ واپسی پر پھر آؤں گا۔

منو:۔ امی! دل بہشت کیوں نہیں آتا؟

بیگم:۔ وہ تو بہشت میں جا رہا ہے۔

منو:۔ میں بھی اسی کے ساتھ جاؤں گا۔

بیگم:۔ ایسی بات نہ کہو منو۔ سو جا میرے لال!

منو:۔ کیسے سو جاؤں! نیند نہیں آتی۔ امی مجھے گانا سناؤ، وہی جو دل بہشت گاتا ہے۔

بیگم:۔ اچھا تو سونے کی کوشش کر۔ میں بجلی بجھا دیتی ہوں۔

(بجلی بجھ جاتی ہے۔ صرف ٹیبل لیمپ روشن ہے)

منو:۔ اب سناؤ نا گانا

(بیگم پاس بیٹھ کر گاتی ہے)

بیگم

آؤ میٹھو منہ سے بولو کرو کچھ ہنسی ٹھٹھول
سب ناچیں، بچہ بوڑھا جیسے کپا گول
میرے یار گلفام شہزادے بجے گول ٹھول
سکھ ہے اپنے پاس ہمارے، اٹھو مورکھ ٹٹول
فکروں کا یاں گزر نہیں ہے اُدھڑے اس کا چام
طاقت میری باندی شہرت مری غلام
میں ہوں مسخرا دل بہشت یہی ہے میرا نام نا نام

(اپنے آپ سے) لو سو گیا۔ اس پر کمبل اوڑھا کر آہستہ سے چلی جاتی ہے)

منّو :۔ (کمبل منہ پر سے اتار کر چاروں طرف دیکھتا ہے)
سب ناچیں بچہ بوڑھا جیسے کپا گول
شکر خدا کا، کمرہ خالی ہوا۔ (کمبل اتار کر اٹھتا ہے اور ٹیلی فون کے پاس جا کر ریسیور اٹھاتا ہے) مجھے بہشت سے ملا دیجئے۔ جی کیا کہا؟ جی نہیں مجھے کسی نمبر کی ضرورت نہیں۔ میں نے سنا ہے وہ بہشت میں جا رہا ہے۔ میں مسخرے دل بہشت سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ جی؟ کیا؟ کیا یہ دل بہشت بول رہا ہے؟ تو پھر آپ کون ہیں؟ آپ دل بہشت نہیں۔ معاف کریں، جب مسخرا دل بہشت آئے تو اس سے کہئے مجھے فون کرے۔ آپ بھولیں گے تو نہیں؟ مجھے بستر پر لیٹے لیٹے بس اسی کے فون کا انتظار رہے گا۔
(اتنی دیر میں کھڑکی آہستہ آہستہ کھلتی ہے اور اس میں سے ایک آدمی کالے کپڑے پہنے اندر کی طرف کودتا ہے) تم کون؟ یہاں کیوں آئے ہو؟ مجھے لینے کہیں تو موت تو نہیں؟

اجنبی :۔ اونہوں، میں موت ہوں، میں زندگی ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں، میں سب کچھ ہوں۔

منّو :۔ تم کچھ بھی نہیں اور سب کچھ ہو! کیا مطلب؟

اجنبی :۔ ابھی دیکھنا۔ یہ لے۔ (کالا چغہ اتار کے پرے پھینکتا ہے نیچے مسخروں جیسے ڈھیلے ڈھالے رنگدار کپڑے پہنے نظر آتا ہے)

منّو :۔ (تالی بجا کر) ارے دل بہشت! میں نے تو ابھی تمہیں ٹیلی فون کیا تھا۔

مسخرا :۔ مجھے پتہ ہے۔

منّو :۔ وہ کیسے؟

مسخرا :۔ میں بجلی کے کھمبے پر بیٹھا تھا۔

منّو :۔ بجلی کے کھمبے پر؟

مسخرا :۔ ہاں ہاں۔ میں اوپر جا رہا تھا۔ سگرٹ سلگانے کھمبے پر جو بیٹھا تو کیا سنتا ہوں کہ تیرا پیغام جا رہا ہے۔ اسی وقت برف کے ایک تودے پر چھلانگ مار دی۔

منّو :۔ برف کے تودے پر؟

مسخرا :۔ ہاں، وہ تو نیچے کو لڑھکتا چلا آ رہا تھا۔ اور مجھے بھی نیچے ہی جانا تھا

منّو :۔ میں نے سنا تھا تم مر گئے ہو، بہشت میں چلے گئے ہو۔ یاد نہیں کس نے کہا تھا۔

مسخرا :۔ میرا جسم مر سکتا ہے مگر میری روح بچوں کے دل میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

منّو :۔ کیا تم سرکس چھوڑ بیٹھے؟

مسخرا :۔ ہاں چھوڑ دیا۔ اب لوگ دل بہشت کا میٹھا مذاق کبھی نہیں سن سکیں گے۔ اس نے اپنی ہنسی ٹھٹھول سے بوڑھوں کو جوان بنایا، لوگوں کے دلوں کا میل صاف کیا۔ مگر وہ جوان نہ رہ سکا۔

منّو :۔ کیا تم نے سرکس بالکل چھوڑ دیا؟ استعفٰے دے بیٹھے؟

مسخرا :۔ استعفٰے دیا تو نہیں، لے لیا گیا ہے۔ آج میں فرشتوں کو ہنسانے جا رہا ہوں۔

منّو :۔ (خوش ہو کر، ہا ہا ہا! پھر تو تم انہیں ہنسا ہنسا کر دوہرا کر دو گے مگر سنو، بہشت میں ہر کسی کو تو نہیں جانے دیتے تم کیسے چلے گئے؟

مسخرا :۔ مجھے کیسے نہیں جانے دیں گے میں نے خلقِ خدا کی تاریک زندگیوں میں خوشی کے دیئے جلائے، مردہ دلوں کو گدگدا ہٹوں سے بھر دیا۔ بہشت والوں کو اور کیا چاہیئے؟ اب تو میرے کام کا مول پڑے گا۔ میں تو بہشت سے سارے آرام مانگوں گا۔

منو :۔ مگر تم اتنی دور پہنچو گے کیسے؟

مسخرا :۔ (دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ڈھیلے ڈھالے مسخروں جیسے لباس میں ناچ ناچ کے چلتا ہے اور کہتا ہے) قوس قزح کے راستے۔ تم نے کیا سمجھا تھا کیسے پہنچوں گا؟

منّو :۔ مگر قوس قزح ہے کہاں؟ اس وقت تجھے نظر نہیں آئے گی۔

مسخرا :۔ کھڑکی سے باہر

منّو :۔ گر میں تو ضرور دیکھوں گا۔

مسخرا :۔ آدمی بن، لیٹا رہ آرام سے۔ میں بتاتا ہوں۔ وہ یہاں سے

وہاں اور وہاں سے وہاں۔ اور وہاں سے وہاں آگے
جاتی ہے۔ یہ تمام راستہ پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔ رنگ رنگ
کے پھول کھلے ہیں۔ میں چاند پر پہنچ کر راستہ بدلوں گا۔ چاند جنکشن ہے نا
پھر میں وہاں سے کشتی پر بیٹھ کر کہکشاں کی پگڈنڈی پکڑ دوں گا ـــ
منّو! یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ راستے تو آپ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔

منّو :۔ مگر اس وقت قوسِ قزح کہاں ہے ؟

مسخرا :۔ ہے تو سہی مگر تو نہیں دیکھ سکتا۔ سورج کے نزدیک اتنے
پھول اُگے ہیں کہ تو کبھی مانے گا نہیں۔ جب پانی برستا ہے تو وہ
اپنا سر اوپر اٹھاتے ہیں اور تم لڑکے بالے شور مچانے لگتے ہو
پینگ پینگ پینگ۔

منّو :۔ ہم یہ بھی تو کہتے ہیں کہ آسمان کو آگ لگ گئی۔

مسخرا :۔ ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا کام بحث کرنا نہیں۔ تم بیماری
میں بہت کڑوی باتیں کرنے لگے ہو۔ مگر خیر، میں یہاں بحث
تھوڑی کرنے آیا تھا۔ میں تو تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ کیا ہوا تمہیں ؟

منّو :۔ بخار

مسخرا :۔ کون کہتا ہے ؟ ٹھہر میں تھرمامیٹر سے دیکھتا ہوں۔

منو :۔ میں تھرمامیٹر سے تنگ آ گیا ہوں۔ اگر لگایا تو توڑ دوں گا،
پھر نہ کہنا۔

مسخرا :۔ (ہنس کر) میں تھرمامیٹر...... یہ دیکھو

منو :۔ (تالی بجا کر) آہا ہا، میٹھا سگرٹ خوشبودار!

مسخرا :۔ ہے نا، جتنا چوسو اتنا ہی بخار کم ہوتا جائے گا (پاگلوں کی طرح
ہنستا ہے) منہ کھول شاباش! (عینک لگاتا ہے)

منو :۔ عینک کیوں لگا رہے ہو۔ یہ تمہیں عجیب سی لگتی ہے۔ مگر کوئی مسخرا
عینک کیوں لگائے ؟

مسخرا :۔ تاکہ لوگ مجھے سیانا سمجھیں۔ ہوں تو بیوقوف مگر عقل مند۔

منّو :۔ ہمارا ڈاکٹر بھی عینک لگاتا ہے۔

مسخرا :۔ تمہارے ڈاکٹر کی عینک میری عینک سے مختلف ہے۔ اسکی
عینک بیماری کو بڑھا چڑھا کر دکھاتی ہے۔ میری عینک گھٹا کر
دکھاتی ہے۔ جب میں اس عینک سے تم پر نگاہ ڈالتا ہوں تو تم
مجھے بالکل ٹھیک نظر آتے ہو۔ مگر ڈاکٹر کی عینک، خیر چھوڑو۔
تھرمامیٹر نکالو منہ سے۔ دیکھوں کتنا بخار ہے۔ (تھرمامیٹر دیکھ کر)

اوہ! معاملہ خطرناک ہے۔

منو :۔ کیوں ؟ کتنا بخار ہے ؟

مسخرا :۔ افسوس! تم سو سال سے زیادہ نہیں جیو گے۔

منو :۔ مگر یہ تو خاصی لمبی عمر ہے۔

مسخرا :۔ کون کہتا ہے۔ یہ تو کائنات کی زندگی میں ایک پل کے برابر ہے

منو :۔ خیر ہم خوش ہیں کہ ہم اتنی جلدی نہیں مریں گے

مسخرا :۔ ہم۔ تم جمع کا صیغہ کیوں استعمال کرتے ہو۔ اگر تجھے مرنا ہی ہے
تو صبح کر کیر سے مر۔ ذرا زبان دکھاؤ۔ اوہوں۔ ہوں۔ ہوں۔
بہت گندی ہے۔

منو :۔ اچھا۔

مسخرا :۔ تیرا پیٹ خراب ہے۔ بوجھ محسوس ہوتا ہے ؟

منو :۔ ہوں۔

مسخرا :۔ تم نے کاغذ کھائے ہیں ؟

منّو :۔ کیا کہہ رہے ہو ؟ کاغذ ؟

مسخرا :۔ اگر تمہارے پیٹ سے نکل آئیں تو ؟ یہ لے نکل آئے (منو کے
منہ میں سے رنگ برنگے کاغذ کی زنجیر نکالتا ہے) زنجیریں اور گچھے
بنے ہوئے (کہتا نہ تھا اور دکھا یا کر دکاغذ۔ کیوں ؟ کچھ پیٹ ہلکا ہوا!

منو :۔ (تالی بجا کر) مجھے پتہ ہے مجھے پتہ ہے۔ تو ہاتھ کی صفائی
دکھا رہا ہے۔ میں تمہاری سب چالاکیاں جانتا ہوں۔

مسخرا :۔ میری کونسی چالاکیاں۔ میں تو مسخرا ہوں۔ سیدھا سادا مسخرا
دل بہشت۔ گلفام شہزادوں کا یار بچوں کا ماموں!

منّو :۔ مگر تم ہمارے ڈاکٹر اچھے ہو۔ میں تمہارے علاج سے ٹھیک
ہو جاؤں گا۔

مسخرا :۔ مگر تمہارا رنگ تو ابھی تک پیلا ہے۔ ٹھہر۔ میں اس کا بھی
انتظام کر دوں۔ تیرے گال مروڑتا ہوں۔ (گال مروڑتا ہے)

منو :۔ مجھے گدگدی ہوتی ہے۔

مسخرا :۔ تو ہوتی رہے۔ یہ دیکھ۔ رنگ اب نکھرا۔ دل بہشت کوئی
معمولی ڈاکٹر نہیں۔

منو :۔ اچھا۔ کوئی اور صفائی دکھا۔

مسخرا :۔ منہ کھول۔ تمہارا گلا دیکھوں۔ اوں ہوں۔ ہوں ہوں۔
تو نے ساری دنیا کے نقشے کھائے ہوئے ہیں۔

منو :- نقشے؟

مسخرا :- ہاں ہاں۔ کھولے رکھو منہ۔ مجھے اندر جھانکنے دے۔ ارے رے رے رے۔ اٹلس کے سارے نقشے اندر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ اکڑ دکڑ بمبے بو۔ اسّی نوّے پورے سو۔ اسّی کو لگی رسّی۔ گن لو پورے اسّی۔ کیا نمک سنک کھایا ہوا ہے تم نے۔ دنیا کے سارے جھنڈے اندر گڑے ہوئے ہیں۔ ایسی جنگ کا نقشہ۔ او یارو میری توبہ۔ مجھے نکلنے دو۔ ہٹ جاؤ پرے۔ لے پکڑتا تھا۔ اک دو۔ تین۔ چار۔ پانچ چھ۔ سات، آٹھ، نو، دس۔ اسی کو لگی رسی۔ گن لو پورے اسّی۔ (مختلف ملکوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے نکال کے رکھتا جاتا ہے)

منو :- پاکستان کا جھنڈا کہاں ہے؟

مسخرا :- بڑے سمجھدار ہو؟ پاکستان کا ایک جھنڈا تو جناب کو راس آ گیا۔ یہ جھنڈا تو تمہارے خون میں رچا ہوا ہے۔ یہ تمہارے دل میں ہے، دماغ میں ہے۔ یہ منہ سے نہیں نکلے گا۔ اپنا کان ادھر لاؤ۔ کان دماغ کے پاس ہوتا ہے۔ یہ لو جھنڈا۔ (پاکستان کا چھوٹا سا جھنڈا منو کے ہاتھ میں دیتا ہے)۔

منو :- (ہنستا ہے) دل بہشت بڑے مزے کے آدمی ہو تم۔

مسخرا :- بولو اور کیا تکلیف ہے؟ ذرا کروٹ تو بدلو شاباش (منو کروٹ بدلتا ہے کمر کے نیچے سے دونیاں چونیاں، آنے، روپے گرنے لگتے ہیں) ہا ہا ہا ہا! یار تو نے تو پیٹ میں خزانہ بھر رکھا ہے۔ یہ سیونگ بنک تمہیں کیسے آرام کرنے دے گا۔

منو :- سیدھا ہو کر چارپائی کے نیچے دیکھتے ہوئے) ہیں، اتنے روپے پیسے! میں آئس کریم کھاؤں گا۔ چناں جور گرم لوں گا۔ گجک کھاؤں گا، ریوڑیاں چباؤں گا۔

مسخرا :- (ہنس کر) تمہیں اس دولت کا پتہ ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر تو بس کڑوی کسیلی دوا دینے کی بات کرتے ہیں اللہ اللہ خیر سلا۔ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر بچوں پر اپنی بڑائی جتاتا ہے ÷

منو :- کیا تم بڑی عمر کے نہیں؟

مسخرا :- میں! مسخرا دل بہشت بڑی عمر کا؟ حد ہو گئی کتنی غلط بات کی ہے تم نے۔ ارے میرے یار، میں تو کل پیدا ہوا ہوں؟ کل پھر پیدا ہوں گا۔ ہر ہر پل ایک بیوقوف پیدا ہوتا ہے۔ میں تو سدا بہار احمق ہوں۔ میں تو سورج کی صبح سویرے کی کرن کی طرح جوان ہوں۔ دیکھو مرے ڈھیلے ڈھالے کپڑے کس طرح ڈھلک رہے ہیں۔ (ذرا ناچ کر) اب کیسے مزاج ہیں سرکار کے؟

منو :- پہلے سے بہت اچھے دل بہشت کیا وہ گانا نہیں سناؤ گے؟

مسخرا :- کیوں نہیں۔ گانا سنانے ہی کو تو آیا ہوں۔ کونسا گانا سنو گے؟

منو :- وہی مسخرے والا؟ تمہارا اپنا۔

مسخرا :- میں تو ہمیشہ اپنا ہی گانا گاتا ہوں۔ دوسرے کا گانا مجھے پسند نہیں (گاتا ہے، ساتھ ساتھ کودتا اور ناچتا ہے)۔

میرے قہقہے بے لگام مری ہنسی ہے سب کا جام
پیتا ہوں میں جام جم پلاتا ہوں میں صبح و شام
فکروں کا یاں گزر نہیں ہے، ادھر ہے ان کا چام
یہی ہے میرا کام، ـــــ کام کام کام
آؤ بیٹھو منہ سے بولو، کرو کچھ ہنسی ٹھٹھول
سب ناچیں بچہ بوڑھا شاہ گدا جیسے کپا گول
میرے یار گلفام شہزادے بچے گول مٹول
سکھ ہے اپنے پاس ہمارے اٹھ مور کھ ٹٹول
فکروں کا یاں گزر نہیں ہے ادھر ہے اس کا چام
حماقت میری باندی شہرت میری غلام
میں ہوں مسخرا دل بہشت یہی ہے میرا نام نام

منو :- کتنا اچھا گاتے ہو کہاں کڑوی کسیلی دوا اور کہاں تم۔

مسخرا :- اوہو، مجھے دوا کا خیال ہی نہیں آیا۔ دوا تو میں نے دی ہی نہیں۔ میں (بڑا) کتنا احمق ہوں! مسخرے پن کی بھی حد ہونی چاہیئے۔ (بڑے تحکمانہ انداز سے تالی بجاتا ہے، جلدی سے بڑھ کر ٹیبل لمپ تک جاتا ہے اور ایک رکابی اٹھا لاتا ہے) یہ لو پکڑو۔ دوا کھاؤ۔

منو :- کہاں سے لی یہ دوا؟

مسخرا :- تمہارے ٹیبل لمپ پر پڑی تھی۔ جلدی جلدی کھا لو گل نہ جائے

منو :- آہاہا۔ آئس کریم! یہ تو بڑی ٹھنڈی ہے۔ تم کہتے ہو ٹیبل لمپ پر پڑی تھی۔ وہاں تو پگھل جاتی یہ۔

مسخرا :۔ کیوں مزیدار ہے نا؟ میں نے دراصل اسے سورج پر سے اٹھایا تھا۔ سورج پر اتنی گرمی ہوتی ہے کہ ٹیبل لیمپ کی گرمی اس کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں تمہیں پتہ ہے یہ آئس کریم میں نے بنائی ہے۔ برف میں کہکشاں کا کچھ دودھ ڈالا، چینی اور شکر نہیں ڈالی۔ اس کے بدلے میں نے ایک مسکراہٹ نچوڑ دی میٹھی بھی ہے کہ نہیں؟

منو :۔ بہت میٹھی ہے۔ دل بہشت اگر چاکلیٹ آئس کریم بنانی ہو تو پھر؟

مسخرا :۔ چاکلیٹ آئس کریم بس کسی سلونی شام کا رنگ ملا دو۔ بس بن گئی چاکلیٹ آئس کریم۔

منو :۔ (ہنس کر اپنا پیٹ دباتے ہوئے) اوہ میرے اللہ! تم کتنے ہنسوڑ ہو۔

مسخرا :۔ (مسخروں کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے) میں ہوں مسخرا دل بہشت (ٹوپی اتار کر) میری ٹوپی تم نے نہیں دیکھی مسخرے کی ٹوپی۔ ذرا سونگھو تو۔ ہے نا داناؤں کے سر کی بو (ٹوپی منو کو سنگھا کے آپ سونگھتا ہے اور برا منہ بنا کر کہتا ہے) اونہوں ہوں! داناؤں کے تیل کی بو! پھینکو باہر (اسے باہر پھینکنے لگتا ہے پھر ہاتھ روک لیتا ہے) میں منہ تو بیوقوفوں کا سا بنائے رکھتا ہوں مگر اپنے مسخرے پن سے بڑے بڑے بیوقوفوں کو پیچھے پھینکتا ہوں۔ میرا حلیہ مسخروں کا سا ہے مگر میری ہنسی سولہ آنے کھری ہے۔ دیکھنے کو میں بدشکل ہوں مگر میرا داغ سچا موتی ہے۔ میں کالا بھجنگ کھڑا ہوں مگر میرا جالا خالص سونے کا ہے۔ دیکھو مجھے میں کس طرح ناچتا ہوں۔ میرے ناچ کی سب کو ضرورت ہے (تھوڑا ناچتا ہے پھر کہتا ہے) "سب ناچو جیسے لوٹا جیسے کپا گول"۔

منو :۔ آہا ہا ہا، ہی ہی (تالیاں پیٹتا ہے) تم کمال کے مسخرے ہو۔ اب بس کرو خدا کے لئے پیٹ میں درد ہونے لگا۔

مسخرا :۔ دوا دوں؟

منو :۔ نہیں جی نہیں!

مسخرا :۔ میرا بیگ کہاں ہے؟ تجھے ایک اور دوا کھلاؤں میں۔

منو :۔ ہاں ہاں۔ جب تم آئے تھے تمہارے ہاتھ میں ڈاکٹروں کی طرح کا ایک بیگ تھا۔

مسخرا :۔ سب ڈاکٹروں کے پاس بیگ ہوتا ہے اس سے گول مٹول بچے پیدا ہوتے ہیں، جو بعد میں "گلفام شہزادے" کہلاتے ہیں، میرے دوست بن جاتے ہیں اور میں یاروں کا یار کہلاتا ہوں۔

منو :۔ کیا تمہارے بیگ میں بھی گول مٹول بچے ہیں؟

مسخرا :۔ کوئی ایک؟ یہ دیکھو (بیگ میں ہاتھ ڈال کر خرگوش کا بچہ نکالتا ہے) یہ لو پکڑو خرگوش کا بچہ۔ یہ لو بطخ کا، یہ لو کبوتر۔ چلو میرے بچو! اباؤٹ ٹرن۔ گھس جاؤ تھیلے میں۔ منو سنگترے کھاؤ گے؟ (بیگ میں سے تین سنگترے نکال کے مداری کی طرح ہاتھ میں اچھالتا ہے) ایک دو تین!

منو :۔ توبہ توبہ! کیا کیا چیزیں بیگ میں ڈال رکھی ہیں۔ کتنے خوبصورت سنگترے ہیں!

مسخرا :۔ واہ منو! یہ سنگترے تو نہیں، یہ تو ستارے ہیں، ایک چاند کا بچہ ہے۔ ستارے اور چاند میرے ہاتھ میں اچھل رہے ہیں۔ ایک دو تین۔ جنتر منتر جنتر۔ (سنگترے بیگ میں ڈال لیتا ہے)

منو :۔ کیا تم نجومی بھی ہو؟ ستاروں کو کیسے قابو میں کر لیتے ہو! کمال کر دیا تم نے تمہارا تماشہ کوئی خواہ ساری رات دیکھتا رہے۔

مسخرا :۔ رات! اوہو مجھے خیال دلا دیا تم نے، مجھے اب جانا چاہیے دیر ہو گئی۔ چاند سے کشتی پکڑنی مشکل ہو جائے گی۔ اور پھر مجھے بہشت کو تار دینا پڑے گا کہ میں دوسری کشتی سے آؤں گا۔ (تھیلے میں ہاتھ ڈالتا ہے) نکل بیٹا، پیغام لے جا۔ (بیگ میں سے ایک کبوتر نکالتا ہے)۔

منو :۔ ارے کبوتر! اس کے پروں پر کیا لکھنے لگے ہو!

مسخرا :۔ پیغام۔ یہ میرا پیغام لے کر بہشت جائے گا۔ وہاں پتہ چل جائے گا کہ میں دیر سے پہنچوں گا۔

منو :۔ کیا یہ کبوتر بہشت تک اڑ سکتا ہے؟ تھکتا نہیں؟

مسخرا :۔ کیسے تھک سکتا ہے اصیل کبوتر نہ ہوا مٹی کا مادھو ہوا!

منو :۔ لگتا تو اصیل ہے۔

مسخرا :۔ اصیل کہاں سے۔ یہ تو اصیل کبوتر کی روح ہے۔ دیکھا نہیں کتنا سفید ہے۔ کبھی اتنا سفید کبوتر دیکھا ہے۔

منو :۔ ہاں ہاں رنگ کچھ زرد سا ہے۔

مسخرا:۔ یہ پچھلی جنگ میں مارا گیا تھا

منو :۔ ہیں!

مسخرا:۔ جنگ کے محاذ سے پیغام لے جا رہا تھا کہ ...

منو :۔ چہ چہ چہ

مسخرا:۔ رحم کھانے کی ضرورت نہیں تمہیں پتہ نہیں یہ ٹٹّو خوش ہے بہشت کی طرف ہمیشہ گاتا ہوا جاتا ہے ۔

منو :۔ کبوتر بھی گاتے ہیں؟

مسخرا:۔ کیوں نہیں گاتے، مرنے کے بعد گاتے ہیں۔ اگر انسان مر کے گا بھی نہ سکے تو پھر مرنے کا فائدہ؟ ٹھہر ٹھہر۔ یہ آواز کہاں سے آئی ہے؟

منو :۔ کچھ بھی نہیں تمہارے کان بج رہے ہیں۔

مسخرا:۔ واہ جی واہ! میرے کان بج رہے ہیں! (غور سے سنتا ہے) یار کائنات گا رہی ہے منو! کیا تو سنتا نہیں آواز۔ ستارے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو ہو کر گا رہے ہیں۔ میرا بھی گانے کو جی چاہتا ہے۔

منو :۔ کبھی ستارے بھی گاتے ہیں؟

مسخرا:۔ کیوں نہیں۔ ستارے رات کو جگ کے پنچھیوں کو گیت سکھاتے ہیں۔ مگر یہ گیت پنچھی سوتے سوتے سنتے ہیں۔ صبح سویرے جب پنچھیوں کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ستاروں کا گیت گانے کی کوشش کرتے ہیں۔

منو :۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ پنچھی بھی گاتے ہیں۔

مسخرا:۔ گاتے کہاں ہیں، گانے کی نقل کرتے ہیں۔ اگر وہ ستاروں کے گیت سچ مچ گانے لگیں تو دنیا جنت نہ بن جائے

منو :۔ یہ گیت ہوتے ہیں؟ (جماہی لے کر) مجھے نیند آ رہی ہے۔

مسخرا:۔ آ رہی ہے نا۔ میں تجھے بستر پہ لٹا کے آپ رفو چکر ہو جاؤں گا۔ اٹھ بستر پر لیٹ جا۔ (منو بستر پہ لیٹتا ہے۔ مسخرا اس پہ کمبل ڈال دیتا ہے) میں روشنی کم کر دیتا ہوں (بجلی بجھا دیتا ہے لیمپ جل رہا ہے) تو اب سو رہ۔

منو :۔ پہلے کہانی سنا پھر سوؤں گا۔

مسخرا:۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک بہت بڑا احمق ہوتا تھا۔ بالکل بیوقوف۔ اس کا دل بہت بڑا تھا۔ احمقوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں۔ اس احمق کا دل ایک گھماؤں میں آتا تھا۔ سمجھ لے ایک حویلی کے برابر اس کا دل تھا ایک تمہارے جیسا لڑکا اس کے دل کا راستہ ڈھونڈ کر اندر گھس گیا۔ وہاں کئی کمرے تھے۔ اتنے کہ ساری دنیا کے لڑکے چاہے وہاں آنکھ مچولی کھیلیں وہاں بڑوں کے لئے بھی جگہ تھی۔ احمق کے دل کو کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔ لڑکے بالے اس کے دل کو خاصا گرما گرم رکھتے۔ تمہارے جیسا ایک لڑکا وہاں جا کر سو گیا۔ اس نے خواب دیکھا کہ احمق مر گیا! سن رہے ہو نا؟ ارے یار میرے تو تو سو گیا (مسخرا اس پر کمبل ڈال دیتا ہے اس کی پیشانی چومتا ہے اور جس کھڑکی سے آیا تھا اسی سے باہر غائب ہو جاتا ہے۔ کھڑکی کھلی چھوڑ جاتا ہے) (دائیں دروازے سے منو کی ماں دبے پاؤں داخل ہوتی ہے۔ ذرا رکتی ہے)

منو :۔ (بیہوشی میں) دل بہشت!

بیگم :۔ میں واری (قریب آ کر) کیوں منو؟

منو :۔ امی اس کمرے میں مسخرا دل بہشت آیا تھا؟

بیگم :۔ میں کمرے میں آئی تھی تو تم سوئے ہوئے تھے۔ اب کیا حال ہے؟

منو :۔ پہلے سے اچھا ہے۔ (بائیں دروازے سے ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر:۔ کیسی ہے طبیعت اب؟ (نبض دیکھتا ہے) نبض پہلے سے اچھی ہے۔

بیگم :۔ سچ؟ منو اچھا ہو جائے گا!

ڈاکٹر:۔ کیوں نہیں۔

بیگم :۔ خدایا تیرا شکر!

منو :۔ امی، مسخرا ابھی یہاں تھا۔

بیگم :۔ بیٹا تم نے خواب دیکھا ہوگا

منو :۔ امی، وہ یہاں تھا۔ میں کہتا ہوں وہ یہاں تھا اس کھڑکی میں سے کود گیا۔

بیگم :۔ میرے اللہ! کھڑکی کیوں کھلی ہے۔ میں تو خود اسے بند کر کے گئی تھی۔

منو :۔ میں نے کہا امی وہ اسی راستے سے گیا ہے۔

ڈاکٹر:۔ کھڑکی ہوا سے کھل گئی ہوگی۔

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

اعلیٰ ترین فضائی سروس کے لئے

پی آئی اے کے ذریعہ

کابل تک پرواز کیجئے

ہفتہ میں دو پرواز   براہ قندھار

کراچی سے روانگی:- پیر اور جمعرات صبح ۷ بجے
کابل سے روانگی:- منگل اور جمعہ صبح ۷-۳۰ بجے

اسی آزمودہ تجربہ کار اور ہر ایک مسافر کی انفرادی طور پر حقیقی معنوں میں آرام و آسائش فراہم کرنیوالی سروس سے لطف اندوز ہوں جو پی آئی اے کے یورپ کی پرواز کا طرۂ امتیاز ہے۔

اعلیٰ ترین فضائی سروس کے لئے ایرلائن

ریزرویشن کیلئے اپنے سفری ایجنٹس یا مندرجہ ذیل سے رجوع کریں:-
پاکستان انٹرنیشنل ایر لائنز
سنٹرل ہوٹل بلڈنگ ایم۔ اے۔ جناح روڈ۔ کراچی ٹیلیفون:- ۵۰۳۵۲-۵۰۲۶۱

PIA/GK/1030

اب ت

بچّوں کی پرورش کا پہلا سبق

بچے نازک، ناتواں اور بڑی دیکھ بھال کے محتاج ہوتے ہیں۔ تاہم اُن کے اندر نشوونما کی زبردست صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ مناسب نگہداشت، اچھی غذا اور عمدہ ٹانک کے استعمال سے اُن کے پنپتے ہوئے اور زندگی سے بھرپور جسم کو پُوری پُوری افزائش کا موقع مل سکتا ہے۔

نونہال کے باقاعدہ استعمال سے آپ کے بچے کو وہ تمام اجزا مناسب مقدار میں مہیا ہوتے رہیں گے جو اُس کی نشوونما اور اُن بیماریوں سے بچانے کے لئے ضروری ہیں۔
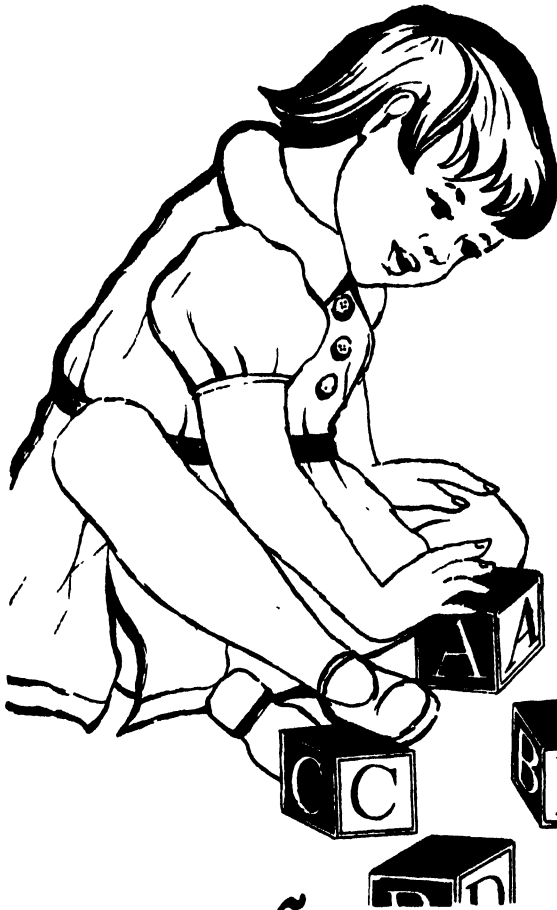
بنگالی افسانہ:

احساس

سید مقصود علی

تلخیص و ترجمہ: ابو سعید نور الدین

نواب شائستہ خاں کے پرانے قلعے کے کھنڈر کسی ڈھانچے کی پسلیوں کی طرح کھڑے تھے۔ دیوار کے شگافوں میں مختلف قسم کی گھاس پھونس اور برگد کے پودے اگ رہے تھے۔ جا بجا چمگادڑوں اور گرگٹوں کے سوراخ یوں لگتے تھے جیسے کوئی جاں بلب بوڑھا اپنی بجھی بجھی بے نور آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھ رہا ہو۔ نہ فضا میں فوج اور سنتریوں کی ہماہمی تھی نہ اسلحہ کی جھنکار!

اس پرانے قلعے کے اردگرد ایک چھوٹی غلیظ سی بستی آباد ہو گئی تھی۔ ہوا میں ہمیشہ سڑاند بسی رہتی تھی۔

آبادی کے تقریباً سب لوگ رکشا چلاتے، ریس کھیلتے، اور تاڑی پیتے تھے۔ کہتے ہیں ان میں سے قریب قریب سب ہی قلعہ کے محافظوں کی اولاد میں سے تھے یا کسی فوجی خاندان کی یادگار۔ انقلاب زمانہ سے وہ غریب اور نادار ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ باپ دادا کا مسکن چھوڑ کر کہیں اور جانا نہیں چاہتے تھے۔ قدیم شکستہ قلعہ ان کے لئے باعثِ فخر تھا۔

اس بستی کے اکثر باشندوں کی طرح حشمت بھی رکشا چلاتا، تاڑی پیتا اور ریس کھیلتا تھا۔ اس کی زندگی میں بیوی بچوں اور پکانے کھانے کا کوئی بکھیڑا نہ تھا۔ رکشا سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی سے وہ اپنا گذارہ کر لیتا اور یہ آمدنی کافی ہوتی تھی۔ مگر وہ تاڑی اور ریس کے پیچھے سب کچھ اڑا دیتا تھا۔ ہفتہ کے روز کا وہ بہت بے چینی سے انتظار کرتا تھا۔ ریس شروع ہونے تک اندھا دھند رکشا چلاتا۔ جب بھر جاتی تو فوراً ریس کے میدان کی طرف بھاگ اٹھتا۔ اور لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے میدان میں کود جاتا۔ وہ اکثر یہیں آ کر اپنی قسمت آزماتا۔

ریس شروع ہو گئی تھی۔ شدید بے چینی سے لوگ، اپنے اپنے گھوڑوں کے جیتنے کے لئے غل مچا رہے تھے۔ شور اٹھا "بہادر! بہادر! بہادر!"

حشمت نے نئے نئے نوٹ جیب میں ڈال لئے۔ پھر ٹکٹ خریدا اور لوگوں کے ساتھ ساتھ ویسے ہی بے تاب ہو کر چیخنے لگا۔ گھوڑ دوڑ ختم ہو جانے کے بعد حشمت نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ بڑبڑانے لگا "سارا قصور رجو کا ہے۔ کمبخت نے میرے "کالا پہاڑ" کو دبا رکھا تھا۔"

شام کے اندھیرے میں حشمت بیڑی منہ میں دبائے کوٹھری میں داخل ہوا۔ قلعہ کے ایک کونے میں دو چمگادڑیں اس کے سامنے سے پھڑپھڑا کر اڑ گئیں مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔ کوئی چیز لینے کے لئے وہ پھر باہر نکل گیا۔ اصطبل کے پاس چائے کی ایک گندی سی دوکان تھی۔ وہاں بیٹھ کر روٹی کھانے لگا۔ کھانا کھا کر ایک بیڑی سلگائی رات کے وقت رکشا چلانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اندھیرے کمرے میں موم بتی جلا کر میلے، کچیلے کمبل پر لیٹ گیا۔

فلو سردار کے گھر شادی کا ہنگامہ برپا تھا۔ بوڑھے نے دو ہی دن ہوئے شادی رچائی تھی۔ آج چوتھی کی تقریب تھی۔ گراموفون ریکارڈ زور شور سے بج رہے تھے۔ محلہ کے بچے بوڑھے سب ہی اس کے گھر جمع ہو گئے تھے۔ حشمت جان بوجھ کر شریک نہ ہوا۔ کیونکہ وہ فلو سردار کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ دروازے پر آہستہ سی دستک سن کر چونک پڑا۔

"کون؟" اس نے پوچھا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ جلد ہی سمجھ گیا یہ لیلیٰ تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہو گئی اور حشمت نے موم بتی جلا کر دروازہ بند کر دیا۔ "ارے! اس وقت رات گئے تم؟"۔

فلو سردار لیلیٰ کا باپ تھا۔ لیلیٰ کی آنکھیں یکایک آنسوؤں سے ڈبڈبانے لگیں۔ وہ کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز حشمت کے ہاتھ میں تھما کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ وہ دونوں بچپن میں ساتھ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ تب بھی لیلیٰ کو حشمت کی بیوی بننے کا کتنا شوق تھا! مگر حشمت کے ساتھ اس کا

گھل مل جانا کسی کو پسند نہ تھا۔ محلہ کا چودھری ظلو سردار تھا۔ جوانی میں خوب کھل کھیلا۔ اب عقبیٰ کا خیال آنے لگا تھا۔ بہو بیوں اور بیٹی پر پردے کی سخت پابندی تھی۔ مگر لیلیٰ سب کی آنکھ بچا کر کبھی کبھی حشمت کی خیر و عافیت پوچھ جاتی تھی۔

پھر بھی حشمت کو اس کے آگے شادی کا سوال اٹھانے کی ہمت نہ پڑی۔ ظلو سردار عمر خاں کے خاندان سے تھا جس پر وہ بڑا گھمنڈ کرتا تھا۔ کیونکہ عمر خاں نواب شائستہ خاں کے قلعہ میں برق انداز تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی ظلمت خان کے بیٹے شکم علی سے کرنا چاہتا تھا جس کا سلسلۂ نسب نواب شائستہ خاں کے ایک دوسرے نوکر علی شیخ گولنداز تک پہنچتا تھا۔

حشمت سوچتا تھا، وہ بھی تو عمر خاں کی ہی اولاد میں سے ہے۔ خون پسینہ ایک کر کے رکشا چلاتا اور تاڑی پیتا تھا۔ ظلو سردار سے شادی کی بات منہ پھوڑ کر کہی بھی جائے تو وہ اس کو ہنسی میں اڑا دے گا۔ حشمت نے گٹھڑی کھولی، اندر سے کچھ کھانا اور مٹھائیاں نکل آئیں۔ یہ ظلو سردار کی شادی کا کھانا تھا جسے لیلیٰ آج موقع پا کر چپکے سے دے گئی تھی! اس کا خلوص دیکھ کر حشمت سوچ میں پڑ گیا اور سوچتے سوچتے سو گیا۔ صبح کافی دیر میں بستر سے اٹھا۔ غنی کی دکان پر پہنچ کر چائے پینے لگا۔ وہاں ظلو سردار کے متعلق عام بات چیت ہو رہی تھی "بوڑھے نے خوب شادی کی ہے۔ بڑی خوبصورت بیوی ہے۔" افضل نے کہا۔

"بڑھاپے میں شادی کرنے کا بڑا شوق ہے۔ ابھی ایک دو اور بھی کرے گا۔" ایک بیوپاری کی اس بات پر سب ہنس پڑے۔ طرح طرح کی بیہودہ باتیں ہوتی رہیں۔ لیلیٰ کا ذکر بھی چل نکلا۔ "بیٹی بھی اچھے ٹھکانے لگ گئی ــ خوب مزے ہیں نا شکم علی!" افضل نے کہا۔

"تو مٹھائی کھلاؤ بیٹا ــ" غنی نے کہا۔ "اور حشمت، تم کیوں نہیں بولتے؟" "حضرت کو لیلیٰ سے شادی کرنے کی تمنا تھی، وہ پوری نہیں ہوئی۔" بیچ میں افضل بول اٹھا۔ شکم علی نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ "یہ سب جھوٹ ہے۔" حشمت غصہ میں آ کر بولا۔ اور پھر بیڑی سلگا کر روزگار کی تلاش میں نکل گیا۔

لیلیٰ کی شادی ہو گئی۔ اس سے پہلے حشمت نے لیلیٰ سے صرف ایک بار اس کے پاس آنے کی تمنا کی تھی۔ شاید بیچاری کو موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ شادی میں شریک نہ ہوا۔ ظلو سخت برہم ہوا۔ حشمت ساری رات اپنی تاریک کوٹھری میں ڈگمگا کر تاڑی پیتا رہا۔ دل میں کہا۔ "لیلیٰ کتنی جھوٹی ہے، شادی سے پہلے کیسے میری محبت کا دم بھرتی تھی ــ"

صبح حشمت رکشا لے کر نکل گیا، دن بھر رکشا چلائی۔ شام کو ایک گلی کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ کہ اچانک کسی نے دبی ہوئی آواز میں پکارا "رکشا والے! آؤ" رک گیا۔ ایک آدمی گرتا پڑتا رکشے پر آ بیٹھا۔ یہ شکم علی تھا! منہ سے دیسی شراب کے بھبکے آ رہے تھے۔ پیچھے سے کچھ بد اخلاقوں نے آوازے کسے۔ حشمت کو سخت طیش آیا۔ "ابھی اس کی شادی کو ایک دن بھی تو نہیں گذرا!" اس نے اپنے دل میں کہا۔ اور اسے دھکا دے کر نیچے اتار دیا۔

ہوتے ہوتے کئی دن گذر گئے۔ ایک دن وہ کافی رات گئے اتفاقاً شکم علی کے گھر کی طرف جا نکلا۔ اس کے گھر سے کسی عورت کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی "برائے خدا مجھے اس جلاد کے ہاتھ سے بچاؤ!" یہ لیلیٰ ہی کی آواز تھی۔ "بھاگ نکل نہ! جا اپنے پیارے حشمت کے پاس" شکم نے درشت لہجے میں کہا۔ لیلیٰ نے جھلا کر کہا "دیکھو حشمت کو برا مت کہو۔ خدا یہ برداشت نہیں کرے گا ــ"

"کیوں نہیں، وہ تو فرشتہ ٹھہرا، اسے تجھ سے محبت تھی کتنی ہی مرتبہ تو اس کے ہاں گئی ہے۔ خدا نے یہ تو برداشت کر لیا؟!"

حشمت غضب ناک ہو کر شکم کے گھر میں گھس گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے شکم کے سر پر ایک ضرب لگائی جس سے کان ایک طرف سے کٹ گیا۔ شکم لوہے کی ایک سلاخ اٹھا کر مارنے لگا۔ لیلیٰ نے تیزی سے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شکم نے ایسا دھکا دیا کہ وہ مٹی کی دیوار سے جا ٹکرائی اور سر پر سخت چوٹ لگی۔ حشمت اور شکم گتھم گتھا ہو گئے۔ شکم زخمی ہو کر ڈھیلا پڑ گیا۔ چاروں طرف سے لوگ اس کے گھر کی طرف دوڑ آئے۔ ظلو سردار، ظلمت، غنی، افضل سب اکٹھے ہو گئے۔ حشمت ابھی تک شکم کے سینے پر بیٹھا اس کا گلا دبا رہا تھا۔ لوگوں نے حشمت کو گھسیٹ کر باہر نکالا، وہ سب کی نظریں بچا کر بھاگ نکلا۔ ظلو سردار اور ظلمت غصے کے مارے دیوانے ہو رہے تھے۔ وہ اسی وقت حشمت کا تکا بوٹی لڈا دینا چاہتے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے ظلو سردار کے صحن میں پنچایت ہوئی۔ سرپنچ خود ظلو سردار تھا۔ بستی کے تقریباً سب لوگ جمع تھے۔ عورتیں پردے میں تھیں سردار کا فیصلہ ہمیشہ بے چون وچرا تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ حشمت ایک کونے میں مجرم بنا بیٹھا تھا۔ ظلو کے اشارے پر شکم نے اپنی شکایت پیش کی فیصلہ کی باگ ڈور اس کے خسر کے ہاتھ ہی میں تھی، سب واقعات کو خوب توڑ مروڑ کر پیش کیا اور کہا اس کی عدم موجودگی میں حشمت نے اس کی عزت پر حملہ کرنا چاہا۔ وہ عین وقت پر گھر پہنچ گیا اور یہ ہنگامہ بپا ہوا حشمت نے لوہے کی سلاخ سے کرا سے اور لیلیٰ کو لہولہان کر دیا۔ ظلو نے گھر کی طرف رخ کر کے لیلیٰ سے کہا۔ "بیٹی تو بھی اپنا زخم دکھا دے۔" بھلا لیلیٰ مردوں کے سامنے کیسے آتی! شکم کی ماں اس کو کھینچ کر قنات کے پاس لے آئی اور پردہ کھول کر سب کو زخم دکھا دیا۔ ظلو پھر بولا "بیٹی، تجھے کچھ اور کہنا ہے؟" اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیچاری شرم کے مارے خاموش رہی۔ اب ظلو نے حشمت سے پوچھا "تجھے کچھ کہنا ہے؟" حشمت دیوانہ وار چیخ اٹھا "یہ سب جھوٹ ہے جھوٹ!" وہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ مجمع نے شور مچا دیا "ہم اس کی بات نہیں سنیں گے۔ لفنگا، بدمعاش!" سب بے چینی سے فیصلہ کا انتظار کرنے لگے۔ ظلو نے بلند آواز سے کہا "اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو بیس جوتے لگائے جائیں۔ شکم علی اٹھ تو ہی اس کی پیٹھ پر جوتے لگا۔" ظلو نے اپنا موٹے تلے کا جوتا پیر سے کھول کر آگے بڑھا دیا۔ شکم اپنے شکار پر خونخوار بھیڑیئے کی طرح جھپٹا۔ چار پانچ آدمیوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور اس کی پیٹھ پر تڑ اتڑ جوتے پڑنے لگے۔ عورتوں نے ڈر کے مارے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ اس دوران میں لیلیٰ وہاں سے نکل گئی۔

اس بات کو کئی دن گذر گئے۔ بستی کی زندگی پھر معمول پر آ گئی۔ حشمت موقع کی تاک میں تھا۔ اس کی رگ رگ میں انتقام کی آگ شعلہ زن تھی۔ اس رات وہ اپنی کوٹھری میں ذرا جلدی لیٹ گیا۔ باہر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ظلو شیخ کے گھر پھر شادی کا ہنگامہ شروع ہوا۔ آج اس کے چھوٹے بھائی کی شادی تھی۔ حشمت کے سوا سب شریک ہوئے۔ لیلیٰ وہیں رہتی تھی۔ اس کا نام آتے ہی حشمت کے دل میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنے اصلی روپ میں اس کے سامنے آ چکی تھی۔ اس دن ذرا سی سچی بات بھی نہ کہہ سکی۔ دفعتاً دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی "کون؟" کوئی جواب نہ ملا۔ حشمت سمجھ گیا۔ اس نے دانت کچکچائے، شکار پاس ہی مل گیا۔ وہ شکاری کتے کی طرح لپک کر اٹھا اور جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ لیلیٰ اندھیرے میں بے حس وحرکت کھڑی تھی! حشمت کا جی چاہا اُسے ٹھوکر مار کر بھگا دے۔ پھر سوچا عورت پر کیا ہاتھ اٹھائے۔ وہ عمر خاں کی اولاد میں سے تھا۔ حشمت کچھ بولے بغیر پھر چارپائی پر جا لیٹا۔ لیلیٰ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی اور بولی "حشمت بھیا!" اس کا لہجہ بڑا درد آمیز تھا۔ حشمت کچھ نہ بولا۔ اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹٹول کر لیلیٰ نے حشمت کے سر پر ہاتھ رکھا اور ذرا ہلا کر آواز دی "حشمت بھیا!" — "بھاگو یہاں سے مجھے پیار کی کوئی ضرورت نہیں!" لیلیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے جھٹکا دے کر چھڑا لیا۔

لیلیٰ نے اچانک حشمت کے چوڑے چکلے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ پھر درد آمیز لہجے میں بولی "بھیا مجھے معاف کر دو!" حشمت نے اندھیرے میں محسوس کیا، اس کے سینے پر گرم گرم آنسوؤں کے کئی قطرے گرے۔ اس کی طاقتور باہوں نے غیر شعوری طور پر لیلیٰ کو سینے کے ساتھ دبانا چاہا لیکن وہ تیزی سے سایہ کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ حشمت نے بے قرار ہو کر آواز دی "پیاری لیلیٰ!" — مگر لیلیٰ کو وہ آواز سنائی نہ دی۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے حشمت سینہ پر گرے ہوئے گرم آنسوؤں کو محسوس کرنے لگا۔ بے عزتی کے احساس نے اس کے دل پر جو بوجھ ڈال رکھا تھا وہ ہلکا ہو گیا۔ ان معصوم آنکھوں سے ٹپکے ہوئے چند آنسو اس کی دکھی بھیگی زندگی میں، جس پر بدنامی کا گہرا سایہ تھا، واحد سامان تسلی تھے!

پروانوں کے ہات	کرنوں کے پلو
بوندا بوندی فضا	ذرّوں کے چلّو
رت کو آگ لگائے	کوئل کی کُو کُو
ٹھنڈی میٹھی رات	دھیمی دھیمی "ہُو"

(شیر افضل جعفری)

اوّلیں افسانہ:

یادیں

مزمّل اللہ خاں

(نئے لکھنے والوں میں جوہرِ قابل ڈھونڈ نکالنے اور اپنے پڑھنے والوں سے روشناس کرانے کے لئے "اوّلیں افسانہ" کا یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اس میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ اس سے پہلے کوئی اور افسانہ شائع نہ ہوا ہو)

وہ ایک حسین رات تھی۔ ہر طرف سکوت! چاند اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی سے ساری دنیا کو منور کر رہا تھا۔ ہوا کے سرد سرد جھونکے کسی کے آنے کا پیغام دے رہے تھے اور میں تنہا ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں، جو برسوں سے خالی پڑا تھا، بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ جگہ جگہ مکڑی کے جالے تھے اور کھڑکیوں، دروازوں کو دیمک چاٹ چکی تھی۔ لوگ کہتے تھے اس پر جنات کا قبضہ ہے۔ مگر میں یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی ڈر ہی نہیں۔ مجھے تو صرف کسی کا انتظار تھا۔ وہ رات جو میری زندگی میں اب کبھی نہیں آسکتی، اس کا تصوّر ہی سحر آفریں ہے۔ اس کے نقوش میرے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ مجھے عذرا کا انتظار تھا۔ میرے خوابوں کی ملکہ جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے ملنے آئے گی اور ملاپ کی کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لے گی۔

مجھے اس کا وہ خط حرف بحرف یاد ہے جو اُس نے مجھے پہلی بار لکھا تھا۔ خبر نہیں میں نے اس کو پڑھنے میں کتنا وقت صرف کیا، کیونکہ اس کی لکھائی بالکل ٹوٹی پھوٹی تھی۔ وہ بہت ہی کم پڑھی لکھی تھی۔ غریب ماں باپ کی بیٹی۔

لکھا تھا "آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔ مدت سے آس لگائے بیٹھی تھی۔ آج امید بر آئی۔ آپ کو میں کس نام سے یاد کروں! کیا آپ میرے خط کا جواب دیں گے؟ ——— آپ کی۔ عذرا"

ایسے ہی کئی دن خط و کتابت جاری رہی۔ محبت بڑھتی گئی اور اس کا لازمی نتیجہ ——— دنیا ہماری دشمن بن گئی!

میرے والدین نے وعدہ کیا تھا کہ بی، اے کرنے کے بعد وہ مجھے مزید تعلیم کے لئے ولایت بھیج دیں گے۔ مجھے ان کا بہت پاس تھا۔ اور میں ان کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرتا رہا۔ سب لوگ میری تعریف کرتے تھے لیکن ایک وقت ایسا آیا جب ان تعریفوں کا سلسلہ رک گیا۔ اور اپنے بھی بیگانے ہو گئے ؎

یار اغیار ہو گئے واللہ
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

وہ اس رات تو میرے جذبات کس قدر پاکیزہ تھے۔ اس نے جو کچھ کہا تھا مجھے خوب یاد ہے۔ وہ اس رات بہت ہی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے بڑے بڑے کالے بال اور نرگسی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ وہ میرے اور صرف میرے ہی لئے ہے۔ اس کی شیریں آواز کانوں کو کس قدر خوشگوار معلوم ہوتی تھی! اس معصوم لڑکی نے میرے ساتھ زندگی بھر نباہنے کی قسم کھائی تھی۔ اس نے کہا تھا وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ———

"میں دیوانوں کی طرح تمہارا نام دیواروں پر لکھتی پھرتی ہوں جس سے میرے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ میں تمہارے خیال میں ایسی محو ہو جاتی ہوں کہ کسی اور بات کا دھیان ہی نہیں رہتا۔ دنیا کے ظلم سہتے سہتے میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا ہے۔ تم مرد ہو اور میں ایک بے کس و مجبور عورت! تم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور میں غریب ہوں۔ تمہارے ماں باپ کسی بڑے گھرانے میں شادی کرانے کے خواب دیکھ رہے ہوں گے۔ بھلا وہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ایک اَن پڑھ لڑکی اُن کے گھر کی چار دیواری میں قدم رکھے۔ آخر تم چپ کیوں ہو؟ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

ماہ نو، کراچی، جنوری ۱۹۵۸ء

اُس لڑکی کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ ہوگی اور میری عمر کوئی انیس سال۔ وہ مجھے ایک معصوم بچی معلوم ہوتی تھی۔

میں سوچنے لگا کہیں وہ مجھ سے دل لگی یا دھوکہ تو نہیں کر رہی۔ مگر یہ بات دل کو نہ لگی۔ شام ہو گئی تھی، چراغ جل گئے لیکن ہم دونوں اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔ آخر جب کافی اندھیرا ہو گیا تو ہمیں مجبوراً اٹھنا ہی پڑا۔ ایسے ہی لوگوں کی نظروں سے بچ بچ کر کبھی کبھار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

اس وقت میرا بی۔ اے کا آخری سال تھا، جیسے وہ میری زندگی کا آخری سال ہو!

وہ بار بار کہتی میں شادی کا پیغام بھجواؤں مگر میں یہ کیسے کرتا! میرے ماں باپ، میرا خاندان اس کو اپنی بے عزتی خیال کرتا تھا۔ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ میں عذرا ہی سے شادی کر دوں گا۔ مگر جواب ملا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، چاہے زہر کھا لو یا کچھ اور کر لو۔

اُدھر عذرا کے ماں باپ اس شادی کے خلاف تھے، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ شادی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ میرے والدین اور عزیزان غریبوں پر طرح طرح کے ظلم توڑ رہے تھے، انہیں مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنی لڑکی کی کہیں جلد از جلد شادی کر دیں۔

عذرا نے بھی شرم و حیا کی چادر پھینک کر ماں باپ سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی، اسی لئے اس پر بڑی سختی کی جاتی تھی۔

ایک دن میں نے اسے اتفاقاً سرِ راہ دیکھا۔ وہ بہت ہی اداس دکھائی دے رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کسی طرح سے معلوم کروں کہ وہ اتنی اداس کیوں ہے۔ لیکن افسوس! مجھے اس کا موقع نہ ملا۔ میں رنج و غم میں کھویا ہوا گھر واپس آگیا اور باہر میدان میں پلنگ پر پڑ کر لیٹ گیا۔ ہرچند سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ اس کا اداس چہرہ بار بار نظروں کے سامنے ابھر آتا۔

دفعتاً ایک پتھر میرے پاس آکر گرا۔ اُٹھ کر دیکھا تو عذرا کھڑکی میں کھڑی تھی، وہ چاندنی رات میں صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ بار بار آنچل ہلا رہی تھی تاکہ میں یہ سمجھ جاؤں کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں اٹھ کر اس کی طرف چل دیا۔ میں نے کہا کہ عذرا کیا بات ہے، تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ وہ بولی کچھ نہیں، تم خدا کے لئے تھوڑی دیر اوپر آ جاؤ، میں آج اپنے دل کی دھڑکنیں تمہیں سنانا چاہتی ہوں۔ میں نے ہرچند سمجھایا مگر اس نے ایک نہ مانی۔ یکایک ایک آواز آئی۔ عذرا کی ماں نے ہم دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ غصہ میں بھری ہوئی تھی اور اس کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی لے گئی اور میں دیکھتا ہی رہ گیا!

میں نے سنا عذرا کو بخار آ رہا ہے۔ مگر میں اس کی خیر و عافیت بھی نہ پوچھ سکا۔ وقت گذرتا گیا۔ میں بی۔ اے پاس نہ کر سکا۔ ماں باپ مجھ سے مایوس ہو گئے۔ انہوں نے خرچ بند کر دیا اور میں آواروں میں شمار ہونے لگا۔

آخر ہم دونوں بڑی مشکل سے ملے اور طے کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہم ایک دن مل کر اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیں۔

افسوس! وہ حسین رات پھر کبھی میری زندگی میں نہیں آسکی۔ عذرا اصرار کر رہی تھی کہ میں اسے کوئی قطعی جواب دوں۔ اس کی شادی طے ہو گئی تھی، وہ کسی ایسے شخص کے سپرد کی جا رہی تھی جو اس کے باپ کا ہم عمر تھا۔ مجھے وہ دن یاد آ رہا تھا، جب میں اسے بچی سمجھتا تھا۔ اور دل ہی دل میں یہ سوچ کر شرماتا تھا کہ میں اس کے قابل نہیں۔ آج وہ ایک معمر آدمی کی شریکِ حیات بننے والی تھی! میری زبان گنگ تھی۔ میں اسے کیا جواب دیتا۔ میں تو ہر جتن کر چکا تھا۔

عذرا کو نامراد لوٹنا پڑا۔ وہ رات بے کسی کے ساتھ تنہا رہی تھی۔ اپنے والدین کی آنکھوں میں دھول جھونک کر، سماج کو بیوقوف بنا کر۔ اگر کسی کو پتہ چل جاتا تو قیامت ہی آ جاتی۔ چلتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ یہ اس کا آخری سلام تھا۔ کیا اس سلام کا کوئی جواب دیا جا سکتا ہے؟!

نئی آوازیں:

"غزلیں، دوہے، گیت"

(عالی)

شان الحق حقی

دورِ جدید کے مزاج میں ہنگامہ پسندی کو بڑا دخل ہے جس کے لئے ایک بڑا دلچسپ لفظ "سنسنی خیزی" ہماری زبان میں رائج ہو چکا ہے۔ اس مذاق نے ادب پر بھی ضرور اثر کیا، کثر متضاد اور اکثر موافق۔ ایک طرف وہ تیور چمکائے گئے جو مشاعروں میں مقبول ہوتے ہیں۔ دوسری طرف نئے شاعروں کو جستجو رہی کہ کوئی بہت ہی غضب کی جدت کر گذریں اور ہو سکے تو ادبی دھارے کو بالکل ہی الٹ کر رکھدیں۔ ان دو رجحانات کے بین بعض نوجوان شعرا بڑی گومگو میں رہے اور کسی حد تک بے اعتمادی کا شکار بھی ہوئے۔ عالی بھی اس سے مبرا نہ تھے۔ تاہم وہ ہمارے ان نئے شاعروں میں ہیں جن کی شعری افتاد بڑی محکم تھی۔ وہ بڑی سلامتی سے اپنی روش پر رہے۔ اور اب انہوں نے اپنی شاعری کا ایک دلپذیر مجموعہ پیش کیا ہے "غزلیں دوہے گیت"۔

عالی کے مجموعۂ کلام سے کوئی تہلکہ تو ادبی دنیا میں نہیں مچا، لیکن اس کی حیثیت پائدار معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک طرف شعر کی روایات سے پختہ ربط رکھتا ہے تو دوسری طرف شعر کے مستقبل کے بارے میں بھی اچھی آس بندھاتا ہے۔

بڑی شاعری کی ایک شناخت یہ ہے کہ وہ یا تو شاعری میں کسی نئے باب کا اضافہ کرے یا کسی باب کو اپنے ساتھ ختم کر دے۔ اس کی پرکھ مستقبل ہی کے ہاتھ ہوتی ہے۔ فی الحال دوہوں کا باب، جسے اردو میں عالی نے شروع کیا، تقلید کے قابل معلوم ہوتا ہے۔ مگر شاید قابل تقلید ثابت نہ ہو۔ عالی جتنے بھی دوہے اردو کے لئے لکھ جائیں غنیمت ہوگا۔ انہوں نے موضوع کی اتنی راہیں اس ایک انوکھی صنف میں نکال لی ہیں کہ ان کے دم تک تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی:

دوہے کبت کہہ کہہ کے عالی من کی پیاس بجھائے
من کی پیاس بجھے نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

ہمیں ان کی اس پیاس سے اور بھی توقعات ہیں۔ اس صنف کو جس طرح عالی نے برتا ہے اس میں ایک ترقی کی کیفیت اور بڑی گنجائش نظر آتی ہے۔ ہم نے اس کو ناقابلِ تقلید کہا تو اس لئے کہ برج بھاشا تو بہت سے لوگ لکھ سکتے ہیں اور شاید عالی سے زیادہ خالص برج بھاشا لکھیں۔ مگر دلی کی گلیاں، لوہارو کے دیہات، دیس دیس کی سیر، غالب کا پرتو، درد کی میراث اور ان کے ساتھ مرزا جمیل الدین کا سارا چھیل پن جب تک جمع نہ ہو ان دوہوں کا لہجہ، روپ، رس اور تاثر کوئی چیز بھی نہ بن سکے گی۔ یہ دوہے بڑے جادو اثر ہیں اور عالی نے ٹھیٹھ اپنی ہی زبان میں لکھے ہیں۔ برج بھاشا کے دوھوں میں اب معنی آفرینی تو ممکن ہے لیکن واردات کی یہ کیفیت اور آمد کی شان نہیں پیدا ہو سکتی جو عالی کی اپنی زبان سے ان کے تجربات میں اور تجربات سے زبان میں پیدا ہوئی ہے۔ دراصل کوئی ادبی جدت، روایت سے بالکل علیحدہ رہ کر تو نہیں پنپ سکتی۔ عالی کے ہاں بھی دوھے کی فارم کے علاوہ، ہندی کے آسان بولوں کی آمیزش میں روایتی آہنگ موجود ہے۔ بلکہ جہاں کہیں صرف مضمون آفرینی کی گئی ہے، کلام میں کلاسکی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس طرح کے دوہوں کو کبیر کا نہیں مگر رحمن کا سمجھ سکتے ہیں:

کہو چندرماں آج کدھر سے آئے ہو جوت بڑھائے
میں جانوں کہیں رستے میں مری ناری کو دیکھ آئے

مگر عالی کا یہ کلام اس تقلید پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جہاں جہاں آمد کا زور ہے لہجے کی متانت بڑھ گئی ہے۔ زبان روایتی وضع (MANNERISM)

سے پاک ہو کر خالص اردو ہو گئی ہے۔ اور تاثیر میں یہ دوہے کہیں غزل سے جا ملے ہیں تو کہیں جدید نظم کا عمدہ نمونہ بن گئے ہیں

آلہا او دل گانے والے پیاندے سے کترائیں
ہل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے سے دب جائیں

اے بھئین وہ دیکھ سمے نے اپنی تان لگائی
اے بھئین وہ ہوا سویرا نئی کرن لہرائی

موضوع کے لحاظ سے یہ دوہے بڑے متنوع ہیں۔ ان میں وحدت شاعر کے لہجے اور شخصیت سے پیدا ہوتی ہے۔ "عالی جی" کا اپنا کردار شروع سے آخر تک نمایاں رہتا ہے:

عالی جی اک دوست ہیں اپنے جن کا ہے یہ کام
جیون بھر تر دوش رہیں اور جیون بھر بدنام

مزاج ان کا عموماً تغزل آمیز ہے، لیکن شخصی واردات و تجربات کے اظہار اور ایک مخصوص رومانوی کردار کے باوجود ان میں کافی آفاقیت موجود ہے۔ اسی طرح بعض موقت کوائف اور مخصوص کنایات کے باوجود ان کا لطف اور تاثیر محدود نہیں ہونے پاتی۔ یہ اس کلام کا وہ غیر مرئی، غیر محسوس عنصر ہے جسے کمال سے تعبیر کرتے ہیں۔

غزل میں عالی کی ریاضت استاد سائل مرحوم کی صحبت میں یا اس کے باوجود اس رنگ کی تقلید سے شروع ہوئی۔ جس پر غالب کا پرتو تھا، پھر رفتہ رفتہ اپنے نکھار پر آئی۔ اول اول کلام کی اساس جذباتی ہے اور راہبر فلسفیانہ معنویت کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ایک رنگ ابھرا ہے، جسے نئی غزل کا عمدہ نمونہ کہہ سکتے ہیں ؎

بھٹکے ہوئے عالی سے پوچھو گھر واپس کب آئے گا
کب یہ در و دیوار سجیں گے کب یہ چمن لہرائے گا

ایک آدھ نئی غزل میں عالی نے اپنی روش سے ہٹ کر بھی چلنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تجربہ اہلِ کمال کو راس نہیں آتے۔ بعض کلام اس رنگ سے مختلف اور اس کیفیت سے خالی ہو گیا ہے جو ان کے عام کلام میں ملتا ہے۔ یہاں ہم عسکری صاحب کے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ عالی کو اپنی شعری صلاحیتوں کے باوجود اپنے کلام کے بارے میں کسی قدر بے اعتمادی لاحق رہی ہے۔

عسکری صاحب نے اپنے مقدمے میں عالی کی شاعری کے بارے میں بعض بڑی خیال آفریں باتیں کہی ہیں۔ ان کے نزدیک عالی کی شاعری اور شخصیت میں بڑا تفاوت ہے جو کبھی ہوتا ہے۔ مگر یہ کہنا دراصل بڑا مشکل ہے کہ خارجی شخصیت کی حدود کہاں قائم ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عالی اپنی شاعری میں اکثر صاف پہچانے جاتے ہیں۔ اور ان کی شخصیت اپنی جگہ بڑی وقیع معلوم ہوتی ہے لیکن ایک وقیع تر داخلی شخصیت بھی ضرور موجود ہے؛

غزل

جمیل الدین عالی

کوئی نہیں کہ ہو کہ اس دشت میں مراد ساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز

کبھی طلسمِ غرور اور کبھی فسونِ نیاز
ادائے سادگیٔ دوست تیری عمر دراز

کھلا یہ دوست نوازیٔ اہلِ ذوق سے راز
کہ قدر کے لئے کافی نہیں لبِ اعجاز

خزاں میں منظرِ گل دردناک ہے لیکن
یہیں سے ہے مری رودادِ شوق کا آغاز

یہ لب جو تشنہ ہے اک آہِ مختصر کے لئے
اسی میں تھے کبھی لاکھوں فسانہائے دراز

رہا نہ دل میں غمِ تنگیٔ گلستاں سے
وہ ولولہ جسے کہتے ہیں طاقتِ پرواز

کس انجمن میں دلِ سادہ کو سکون ملے
کہیں ہے قیدِ حقیقت کہیں ہے قیدِ مجاز

بہ ایں فسردہ دلی کیا غضب ہے اے عالی
مجھے دئے چلی جاتی ہے زندگی آواز

جشنِ ثقافت

نومبر کا مہینہ قاعدے سے تو اچھی خاصی دنداں شکن سردیوں کا مہینہ ہوتا ہے لیکن ہمارے شہر کراچی کی اور کون کل سیدھی ہے جو یہ ہوتی۔ مہینے کی ستائیسویں تک سردی چھوڑ گلابی جاڑے کا بھی دور تک پتہ نہ تھا اور کراچی والے لحافوں میں بیٹھ کر چلغوزے پھوڑنے اور ریڈیو پر سلامت علی، نزاکت علی کی نازک خیالیاں سننے کی بجائے ہر شب شہر سے میل بھر باہر ایک باغ کے سبزہ زار پر آسمان کی نیلی چھت کے نیچے جشنِ ثقافت کے شو دیکھنے جمع ہوتے تھے۔ ادھر ساڑھے نو بجے اور یاران باذوق نے چپ لگائی۔ نہ اٹھا ڈو ڈھول اور تاشے اور چلو فریئر گارڈن !

★

کراچی کی مصروف اور سرپٹ زندگی میں آرٹ کی حیثیت ایک شوقِ فضول ہی کی سہی لیکن آرٹ کے متوالے ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت' کے مصداق نچلے نہیں بیٹھتے۔ پاکستان آرٹ کونسل دو تین تقریبیں تو کامیابی سے منعقد کر چکی تھی لیکن محدود پیمانے پر۔ ایک مدت سے اس کا ارادہ ایک معرکے کا جشن ثقافت کرنے کا تھا جس میں اپنے ملک کے آرٹسٹوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کے فنکار بھی شریک ہوں۔ یہ خواب اب آکر شرمندۂ تکمیل ہوا۔ ہر چند کہ آرٹ کونسل کے حوصلوں اور ارادوں کے مطابق نہیں تاہم عوام نے اس کی جس ذوق و شوق سے پذیرائی کی اس سے اسے غیر معمولی طور پر کامیاب سمجھنا چاہئے۔ سترہ نومبر کو اس جشن کا آغاز ہوا اور تیس کو تمت۔ ٹکٹ خاصا مہنگا تھا لیکن مشتاقوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے تھے اور پنڈال میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔

★

اس جشن میں نمائندگی تو چار ملکوں کی ہوئی۔ یعنی پاکستان، امریکہ، جرمنی اور چین کی لیکن چینی آرٹسٹوں کی کارگزاریوں کو اس جشن کا حاصل سمجھنا چاہئے۔ طائفہ بھی انہی کا سب سے بڑا تھا۔ اور ان چودہ دنوں میں بیشتر انہی کے پروگرام رہے۔ پاکستان اور امریکہ کے حصے میں ایک ایک دن آیا اور جرمن آرکسٹرا نے دو دن اپنا کمال دکھایا۔ اختلاف مذاق کی وجہ سے ہمارے ہاں مغربی موسیقی کی کم ہی قدر ہوتی ہے لیکن جرمنی کے برلنر کیمر آرکسٹرا کو جو دنیا کے ممتاز ترین سازندوں میں سے سمجھا جاتا ہے اور ہینس فان بینڈا کی سرکردگی میں یہاں آیا تھا، لوگوں نے کامل توجہ سے سنا اور بے اختیار داد دی۔ یہ کنسرٹ کھلی فضا کی بجائے چھت ہی میں زیادہ لطف دیتا ہے لیکن اچھا میوزک کہیں بھی ہو، کسی فضا میں بھی ہو، اثر دکھائے بنا نہیں رہتا۔ امریکہ کی شہرۂ آفاق موسیقار مس اینڈرسن کو سن کر یہ شعر یاد آتا رہا ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے، آواز تو دیکھو

حقیقت یہ ہے کہ صوت و آہنگ کی زبان کسی ملک اور کسی فضا کے لئے اجنبی نہیں ہوتی۔ اس کے لیے کسی ترجمانی کی ضرورت نہیں۔ چینی آرٹسٹوں کے گیت اور رقص پر یہ بات کچھ اور صادق آتی ہے۔ مرکزی وزیر مسٹر یوسف ہارون نے ان آرٹسٹوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے تبھی تو کہا تھا کہ "یہ اکھترہ نوردانِ شوق ایک پیغام لائے ہیں جو کسی پارچے پر مرقوم نہیں بلکہ ساز و آواز اور رقص کی صورت میں ہے۔ اور ایسے عالم میں کہ دنیا بیم و شک کے ابتلا میں گرفتار ہے۔ دلوں کو فرحت و ابتسام کا درس دیتا ہے" کراچی سے فارغ ہو کر یہ لوگ لاہور پہنچے تو مغربی پاکستان کے گورنر جناب اختر حسین نے ان کے پہلے شو کا افتتاح کرتے ہوئے کہا۔ کہ "یہ شیریں آواز، نازک اندام اور پراں قدم فنکار ناچتے ناچتے اسٹیج سے سیدھے لوگوں کے دلوں میں جا اترتے ہیں" ہمارے ہاں سے بھی آزادی اور دوستی کا اسی زبان میں پیغام ہے کہ مشرقی افریقہ اور چین گئیں تو وہاں کے لوگوں نے بھی اسی احساس سے ان کا خیر مقدم کیا۔ محبت تو خیر سہی۔ آرٹ بھی کچھ کم فاتح عالم نہیں۔

★

بین الاقوامی جشن ثقافت

(زیر اہتمام پاکستان آرٹ کونسل کراچی)

چینی فن کاروں کے فنی مظاہرے

پاکستانی موسیقی اور رقص جو چینی فنکاروں نے

پاکستان آتے ہی سیکھ کر پیش کئے

(اوپر) ''آئی بہار''—پاکستانی موسیقی

(نیچے) ''لڈی ناچ''—پاکستان کا معمول رقص

ملاح اور لڑکی

مور ناچ

ایک تمثیل کا منظر: (اردھوں کی سرزمین میں ہندروں کا راجہ)

بین الاقوامی جشن ثقافت

(۲)

پاکستانی فن کار حمیدہ رزاق کا مظاہرہ فن

نامور امریکی رقاصہ، مسز اینڈ رس، کو پاکستان آرٹ
کونسل کی طرف سے ان کے مظاہرہ فن کے اعزاز میں
سلام بول نے ایک تحفہ پیش کیا

جرمن سازینہ
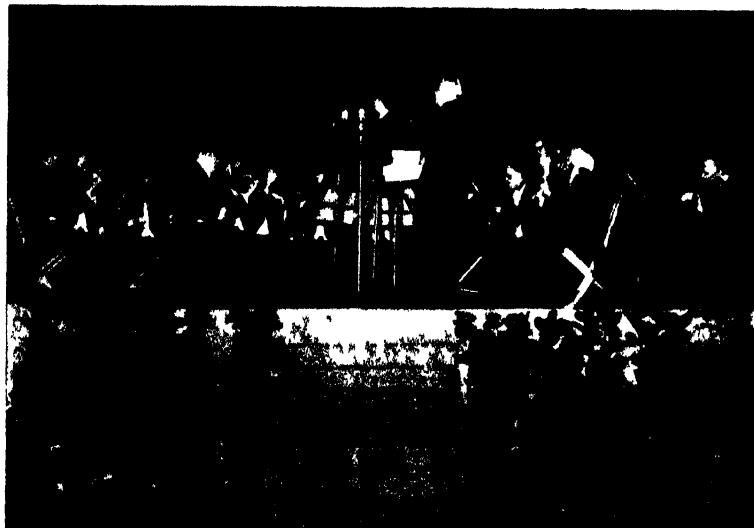
یوں تو دوسرے پروگرام بھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے لیکن چینی آرٹسٹوں کے کمالات روشنیوں کی سحر طرازی، رنگینیوں کی زنگارنگی، ملبوسات کی تابانی و دلکشی، تاروں بھرے آسمان کے نیچے بیٹھے تماشائیوں پر جو جادو کرتی ہیں اس کی کیفیت بیان کرنے کے لئے مولوی محمد حسین آزاد کا قلم چاہیئے کیونکہ یہ جشن جہاں اکبر کے "جشن مہتابی" سے کچھ کم کیف آور اور سرور ناک نہ تھا۔ شروع میں آرٹ کونسل نے دس فٹ اونچا اسٹیج کا شیل بنایا تھا اور رقص و موسیقی کے عام مظاہروں کے لئے اسی قدر کافی ہوتا ہے لیکن چینیوں نے کہا کہ ہمارا تو اژدہا ہی پچیس تیس فٹ کی زقند لگاتا ہے اور بندر راجہ کی قلابازیاں بھی اٹھارہ بیس فٹ کی اونچائی چاہتی ہیں لہٰذا تین دن رات کی محنت سے اور بہت بڑے صرفے سے چینی کاریگروں کی زیر ہدایت ایک تیس فٹ اونچا شیل کھڑا کیا گیا جو بجائے خود ایک دیکھنے کی چیز تھی۔ پروگرام کا آغاز "رقص طاؤس" سے ہوتا ہے۔ دلنواز اور لطیف چینی دھنوں کے ساتھ اسٹیج کا سرخ پردہ اٹھتا ہے اور گیارہ لڑکیاں رنگ برنگے لباس سات سے مورنی کھڑی نظر آتی ہیں۔ یکایک جھانجن کی جھنکار کے ساتھ یہ گلدستہ بکھر جاتا ہے اور ایک کے گیارہ مور بن جاتے ہیں اور رانی مورنی کے گرد پر پھیلا کر ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس ناچ کے تین حصے ہیں۔ ایک میں مور کو تالاب سے پانی پیتا دکھاتے ہیں، دوسرے میں نہاتے ہوئے ... تیسرے میں ناچتے اور پرواز کرتے ہوئے۔ جنگل میں مور ناچا کسی نے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، فریئر باغ میں سب نے دیکھا۔

★

کنول ناچ مور ناچ سے بھی زیادہ دلنواز چیز ہے۔ نو لڑکیاں گلابی رنگ کا باریک ریشمیں لباس پہنے، جس پر کنول کے بڑے بڑے پھول ٹکے ہیں، اس نرمی اور لطافت سے اسٹیج پر ناچتی ہیں کہ خود وہ اور کنول کے پھول صاف پانی میں تیرتے اور ہلکورے کھاتے معلوم ہوتے ہیں حتّٰی کہ تماشائی اٹھ اٹھ کر اسٹیج کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہاں فرش ہے یا واقعی پانی ہے!

اسی قسم کا دعوکا ایک کلاسیکی اوپرا "خزاں کا دریا" دیکھتے وقت ہوتا ہے جس کا قصہ ہمارے ہیر رانجھا کے لڈن ملاح والے حصے کی یاد دلاتا ہے۔ منگ خاندان کی ایک خوبصورت لڑکی جس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہونے والی ہے، گھر سے بھاگ کر اپنے محبوب سے ملنے جاتی ہے۔ دریا پر اسے بوڑھا ملاح ملتا ہے تو پہلے تو اس سے چہلیں کرتا ہے۔ اور پھر دریا کے پار پہنچا دیتا ہے۔ یہ دو نو فنکار محض حرکات سے ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اب کشتی کھے رہے ہیں۔ اب اسے کھونٹے سے باندھ رہے ہیں۔ اب کشتی ہچکولے کھا رہی ہے۔ ہمارے فنکار اس اوپرا سے جو مشہور عالم پیکنگ اوپرا کی پیشکش ہے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اب ایک اور کلاسیکی اوپرا جسے دیکھ کر تماشائی ششدر رہ جاتے ہیں "اژدہا راجا کے محل میں ہنگامہ" کے نام سے موسوم ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک بندر جس بندر نے ایک ہزار برس تک ریاض کر کے فنون جنگ میں کمال پیدا کیا ہے اور بندروں کا راجا بھی بن گیا ہے، ایک جادو کے ڈنڈے کی خبر پاتا ہے جو اژدہا راجہ کے محل میں ہے اور وزن اس کا کوئی ساڑھے پانچ سو من ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے اسے ایک ہفت خواں طے کرنی پڑتی ہے۔ راستے میں کیکڑوں اور دوسرے عجیب الخلقت جانوروں کے سردار ملتے ہیں لیکن وہ اپنی طاقت سے زیادہ چستی و چالاکی سے سب کو زیر کرتا ہوا بالکل راجا کے محل میں جا پہنچتا ہے۔ وہاں معرکے کی لڑائی ہوتی ہے اور بندر راجا اس آہنی ڈنڈے کو جسے کوئی ہلا بھی نہیں پاتا، انگلیوں میں یوں گھماتا ہے جیسے کوئی معمولی چھڑی ہو اور بالآخر اژدہا راجہ کے تخت پر قابض ہو جاتا ہے یہ بندر راجہ جس قسم کی قلابازیاں کھاتا ہے وہ معمولی بندر کے بس کی بھی بات نہیں ہے۔

★

ہر پروگرام کے بعد پردہ گر جاتا ہے اور ایک چینی مادام نئے پروگرام کا چینی میں اعلان کرتی ہیں۔ ایک چینی صاحب ہی اس کا قلعہ معلّٰی کی زبان میں اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اعلان ہوتا ہے "اب دیکھئے رقص "چائے کے باغ میں بہار کی آمد"۔ یہ عجیب رقص ہے اور دیکھنے والوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ کیونکہ اس میں شادکامی بھی ہے اور حسرت بھی۔ ابتدا میں ایک سرخ پوش البیلی لڑکی شاداں و فرحاں ٹوکری لٹکائے چائے کی پتیاں چنتی دکھائی دیتی ہے، پھر اس کی چار سہیلیاں آ جاتی ہیں۔ اتنے میں چار نوجوان لڑکوں کی ایک ٹولی (یہ بھی پتیاں چننے والے ہیں) آ نکلتی ہے اور یہ لڑکی ازراہ شرارت اپنی سہیلیوں کے ہمراہ چھپ جاتی ہے۔ کافی دیر کی آنکھ مچولی کے بعد سب مل جل کر ناچتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ چاروں لڑکے چاروں لڑکیوں کے ساتھ جوڑے بنا لیتے ہیں اور یہ بچاری تنہا رہ جاتی ہے۔ کبھی یہ اس نوجوان کو، کبھی

اُس کو ساتھ لانے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے جھٹک دیتے ہیں اور وہ جھنجلا کر رہ جاتی ہے۔ وہ سب اسے چڑاتے ہیں اور غصے میں تنہا ناچتے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ خیر تھوڑی دیر بعد وہ سہیلیاں اور نوجوان دوبارہ آجاتے ہیں اور اس لڑکی کو جھرمٹ میں لے کر ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بھی ساتھ مل جاتی ہے اور دل کا غبار دھل جاتا ہے۔

لوک ناچوں میں ان فنکاروں نے منگولیا کا "رکابی ناچ" پیش کیا جس میں مہمان اور میزبان ضیافت کے موقع پر خالی طشت اور طشتریاں لے کر ناچتے ہیں۔ ان کے ملبوسات اور موسیقی میں وسط ایشیائی رنگ ہے۔ چینی فنکاروں نے گانے اور سازینے بھی پیش کئے۔ ایک مغنی نے دو تارے پر چڑیوں کی آواز اس طرح نکالی کہ لوگ مبہوت رہ گئے کیونکہ تاردار سازوں پر ایسی آواز نکلنا محال ہے۔ پروگرام آخر میں اژدہا ناچ پیش کیا جاتا ہے جو طلسم کا ایک کارخانہ ہے اور عقل کو انگشت بدنداں چھوڑ جاتا ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور اوپر نیلا آسمان نظر آتا ہے۔ ایک بڑا اژدہا ایک بڑے گول یاقوت کو نگلنے کے لئے سمندر سے جست لگاتا ہے۔ اب وہ یاقوت آگے آگے ہے اور اژدہا پیچھے پیچھے۔ اژدہا بل کھاتا ہے، دوڑتا ہے۔ تیس فٹ اونچی زقند لگاتا ہے، نیچے آتا ہے لیکن یاقوت گرفت میں نہیں آتا۔ لوگ دم سادھے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور بعض لوگ تو اسے محض فلم سمجھے کیونکہ انسانی ہاتھوں سے ایسا نیرنگ پیدا ہونا مشکل ہے لیکن روشنی ہوتی ہے تو پلاسٹک یا کپڑے کا بنا ہوا اژدر بھی نظر آجاتا ہے۔ دونوں پر اسرار ستون بھی جو عین کھیل کے بیچ میں ابھر آتے ہیں اور وہ فنکار بھی جو کالے کپڑے پہنے ہاتھوں سے اژدہے کو جھلاتے ہیں!

★

چینی آرٹسٹوں کے پروگرام میں تفریح کا ایک نادر پہلو اور ہے۔ چینی آرٹسٹ ایک پاکستانی گانا گاتے ہیں۔ "آئی ہے بہار۔ کر کے سولہ سنگار" یہ گیت انہوں نے جناب شاہد احمد دہلوی سے دو دن میں سیکھا لیکن لہجے اور تلفظ سے اجنبیت قطعاً ظاہر نہیں ہوتی۔ اس سے بڑا کمال پنجاب کا "لڈی" ناچ ہے۔ یہ ان فنکاروں نے گھنشیام سے چند دن میں سیکھا لیکن اسٹیج پر جب ہم چینی نوجوانوں کو کرتے اور تہمد زیب تن کئے اور چینی لڑکیوں کو چولیاں اور جھومر اور لہنگے پہن پنجابی مٹیاریں بنے دیکھتے ہیں اور پھر جب رقص کا شباب ہوتا ہے اور نوجوان "موڑیں باڈانگ وایا" گاتے اور ہنکارتے ہیں تو مجمع تالیوں پر اکتفا نہ کر کے خوشی سے چیخ چیخ اٹھتا ہے اور مکرر مکرر کی آوازوں کے جواب میں انہیں دوبارہ ناچ پیش کرنا پڑتا ہے۔
انشا کا مصرع ہے:

"تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا"

لیکن اسے ہونا یوں چاہیئے کہ:

"اہلِ چین نے پنجابیوں کو لوٹ لیا"

یاد رہے کہ پنجابیوں سے مطلب ایک خاص علاقے کے لوگ نہیں۔ سارے پاکستانی اس ناچ سے یکساں لطف اٹھاتے ہیں۔

چینی وفد کے لیڈر ایک چینی مسلمان یوسف مایو ہوا تے ہیں جن کا یہ کمال پاکستانیوں کے دلوں پر دائمی نقش چھوڑ جائے گا۔ اے کاش ہمارے پاکستان کے دیہاتی اور عوامی فنکاروں کو دوسرے ملکوں میں جانے کا اسی طرح موقع ملے۔ ہمیں یقین ہے وہ بھی لوگوں کے دلوں کو اسی طرح جیت کر آئیں گے۔ اب بھی ہمارے پاکستانی فنکاروں نے جو چند سازینے اور گانے پیش کئے ہیں چینی فنکار ان سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

دودِ چراغِ محفل

جمیل نقوی

یہ نیا چاند یہ ہنستے ہوئے تارے یہ شفق
آسمانوں کی گھنی وسعتیں گمبھیر فضا
مجھے ماضی کی طرف کھینچ کے لے جاتے ہیں
چند بہکے ہوئے لمحات کی تجسیم جمیل
کچھ جواں چہرے تصور میں ابھر آتے ہیں
چاند کے خواب کی تعبیر منور چہرے
برق سائیدہ کی تحریر لئے آنکھوں میں
نوکِ مژگاں پہ لرزتی ہوئی اک شے جیسے
چاند کی مینڈ پہ کرنوں کا لرزتا ہوا عکس
صندلی بانہوں میں پیوست حریری ملبوس
صبحِ کاذب کی ملاحت کا دلآویز فروغ
مرمریں جسموں کے مربوط نظر تاب خطوط
دامنِ صبح پہ فطرت کی منبت کاری
کسمسائے ہوئے جذبات کی بڑھتی ہوئی لے
چاندنی رات میں ذرّوں کے دلوں کی دھڑکن
شیشۂ ناب سے رستی ہوئی رنگیں کرنیں
ادھ کھلے پھولوں کی شرمیلی منزہ خوشبو
رقص کے لوچ میں گھلتی ہوئی گھنگھرو کی چھنک
سرمدی نے میں چٹکتی ہوئی کچی کلیاں
نغمۂ روح بکھرتا ہوا ہر سانس کے ساتھ
ساتگینوں کے کھنکنے کی روپہلی جھنکار
مضمحل حسن کے چہرہ پہ پسینہ کی دمک
رنگ و نیرنگ کے پرتو کا گھنیرا سایہ
میرے تخئیل کے تاریک و تنگ پردوں پر
کچھ ہیولے سے ابھرتے ہیں پگھل جاتے ہیں

مونس

مقبول احمد سعید

پھر وہی سوچ کا صحرا، وہی آشفتہ سری
وہی ماضی کے تصوّر، وہی یادوں کے غزال

۔ یہ نہ ہوں، حال سلگتا ہوا لمحہ بن جائے
ایک آنسو سرِ مژگاں پہ جو آبھی نہ سکے
جو رگِ جاں پہ چلے نشترِ غم بن کے کبھی،
اور کبھی صرصرِ غم بن کے اٹھے، لہرائے!

تم سے آباد ہے آوارہ غزالو! مری سوچ
تم کہ دستِ گلِ تر بن کے بسے ہو دل میں!
مری رگ رگ میں رچی ہے تری خوشبو، تری باس
تم کہ ہو برگِ سمن - سادہ و شفاف و لطیف
جگمگاتی ہے مری سوچ کی شبنم جس پر
تم نہ ہو حال سلگتا ہوا لمحہ بن جائے!

یہ چاندنی یہ سفر

انور علی انور

یہ چاندنی، یہ سفر، یہ تری رفاقتِ ناز
یہ سحر فام اجالا، یہ حسنِ سیم طراز

یہ کوہسار، یہ وادی، یہ رہگزارِ جمیل
یہ اک ہجومِ تمنا، یہ شوق کی تکمیل

تری نگاہ میں دوشیزہ مستیوں کی امنگ
تری نگاہ مری آرزو سے ہم آہنگ

ہر ایک سمت عیاں تیرے حسن کا عالم
ہر ایک سمت غرورِ نشاط کا موسم

ہر ایک چیز پہ تیرا جمال عکس انداز
ہر ایک چیز ترے سامنے غریق نیاز

یہ ایک منظرِ سیماب گوں نرالا سا
یہ ہنستا بولتا گاتا ہوا اجالا سا

جبینِ وقت پہ ہلکی سی مسکراہٹ ہے
ترے خرامِ حسیں کی فضا میں آہٹ ہے

میں انبساط سراپا تو التفات تمام
یہ دیکھ دیکھ کے رقصاں ہے کائنات تمام

یہ تیرے حسنِ تبسم کی ہے مسیحائی
ہر ایک چیز ترنم بلب نظر آئی

(۲)

مگر یہ کیا مرے دل میں ابھی خیال آیا
فضائے زیست پہ ظلمت نے جال پھیلایا

یہ سچ ہے آج ترا قرب ہے نصیب مجھے
غمِ مآلِ سفر ہے مرے حبیب مجھے

میں سوچتا ہوں بلندی مجھے نصیب تو ہے
تو آج چاندنی بنکر مرے قریب تو ہے

یہ لمحہ بھی مگر اے دوست جاوداں تو نہیں
مری حیات بجز کشتیٔ رواں تو نہیں

رہِ سفر کی ملاقات پائدار نہیں
رواں دواں ہیں یہ لمحات پائدار نہیں

رہِ سفر میں مسافر بچھڑ ہی جاتے ہیں
یہ ہنستے بولتے رستے اجڑ ہی جاتے ہیں

یہ سوچ راہِ سفر میں مجھے ڈراتی ہے
ابھر ابھر کے مری سانس ڈوب جاتی ہے

★

آدم

وزیر آغا

کیا ہوئی تیری وہ تسخیرِ دو عالم کی لگن؟
کیا ہوئی ذوقِ تجسس کی وہ عالم گیری؟

تو نے تاریک سے اک کنجِ خیاباں میں کہیں
اپنے نغمے کو کیا ساز کے تاروں میں اسیر
اپنے ہاتھوں سے کیا اپنے قفس کو تعمیر
خود کو پہنائی بصد شوق طلائی زنجیر

یہ محبت کی الم ناک کہانی ساری
زرد گالوں پہ یہ جلتے ہوئے اشکوں کے دیئے
تیری بیماریٔ دل، تیری یہ آشفتہ سری
تو نے خود آپ کیا اپنی لگن کو پابند
تو نے خود آپ یہ جیتی ہوئی بازی ہاری!

بازار — زندگی کی سرگرمیوں کا مرکز

ڈھاکہ

قلعہ لال باغ — عہد کہن کی ایک پرشکوہ یادگار

بڑے کٹڑے کا دروازہ جسے شہزادہ شجاع نے
بارھویں صدی عیسوی میں بنوایا

احسن منزل — دریا کے کنارے نوابین ڈھاکہ کے قدیمی محل کا نظارہ

جہلم کے
اس پار

''جوئے نغمہ خواں''
سابق صوبہ سرحد

(قلعہ بالا حصار: پشاور)

رپورتاژ:
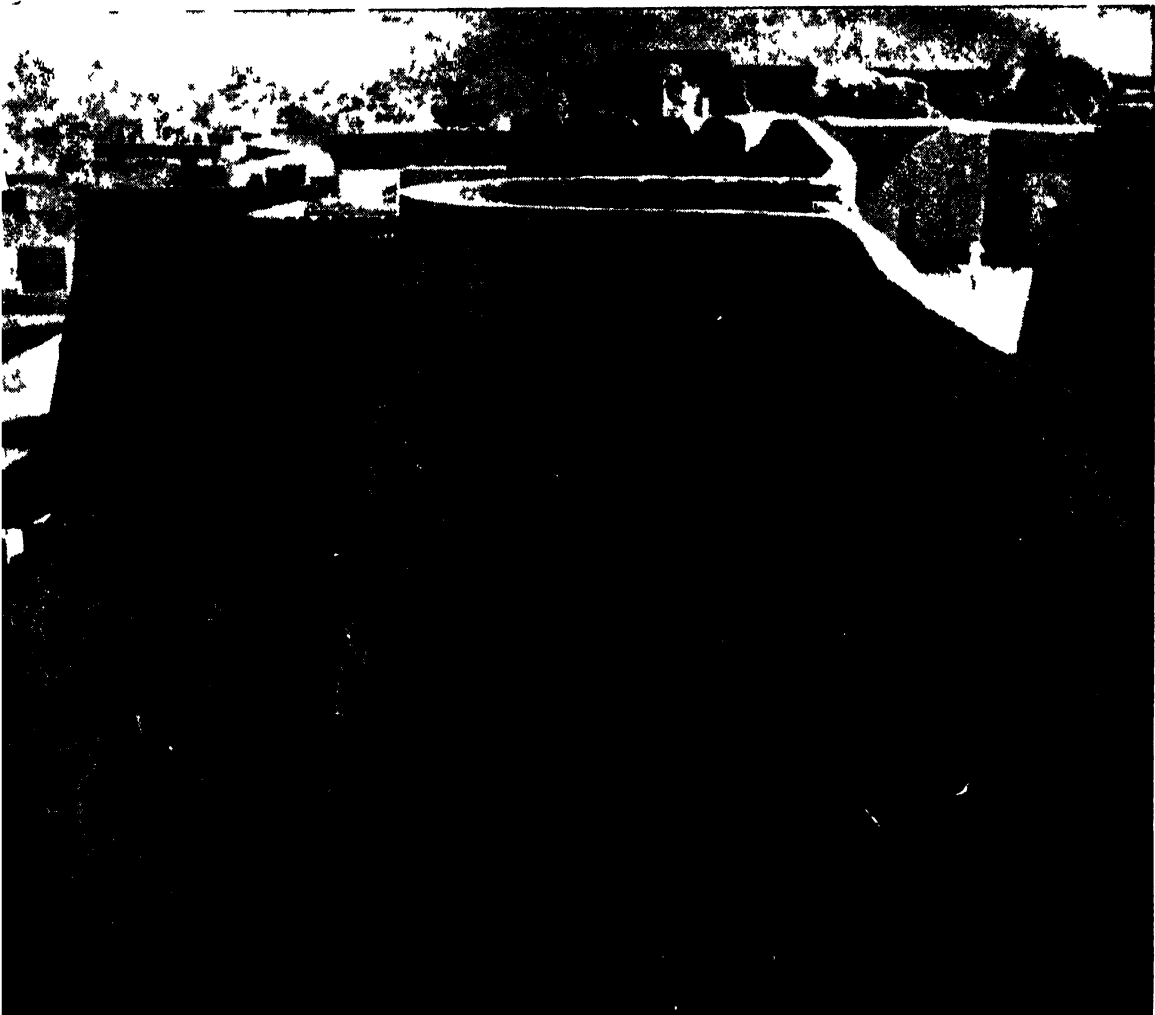
سرحد کا مغنّی دریا

عارف حجازی

ہونہار دنیا کے قصے تو بہت سنے تھے مگر جب دریائے کابل کی پرشور لہروں کو سنا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جادو نوا مغنّی زندگی کے نہایت موثر گیت گا رہا ہے۔

بیٹھے بیٹھے میں نے خان زماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو بخار تیز ہو گیا تھا اور نسوار کی دو تین چٹکیاں چڑھا لینے کے باوجود اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہ آئی۔ آنکھیں شرابی کی طرح چڑھی ہوئی تھیں اور وہ بار بار اونگھنے لگتا۔ چنانچہ میں نے اسے ڈیرے پہ پہنچا دیا اور پھر دریا کے کنارے آ بیٹھا۔

دریائے کابل بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا اور اس کی متلاطم لہریں آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ پرندے خوشی کے مارے بچوں کی طرح شور مچا رہے تھے اور جنگلی گلاب کی جھاڑیوں پر بلبلوں نے اپنے سریلے نغمے چھیڑ دئے تھے۔ اس خاموش اور رومانی سہ پہر کے لمحات نے جیسے میرے دل پر ایک جادو سا کر دیا تھا میں سوچنے لگا "یہ دریا نہیں زندگی کا سیل رواں ہے۔ لوگوں نے یہاں کی بہادری کے قصے تو سنے ہوں گے مگر یہاں کے شیریں نغمے اور عوامی گیت شاید ہی سنے ہوں گے۔"

یہ سنکر لہریں بڑے والہانہ انداز سے کسی پٹھان محبوبہ کی طرح مسکرانے لگیں۔ اور میری نگاہوں میں اس فرضی محبوبہ کے نازک خدوخال اجاگر ہو گئے۔ اتنے میں قریب کی پگڈنڈی سے ایک نوجوان کی سریلی آواز آئی:

"آجکل پھر تیرے حسین چہرے سے سرخی جھلکنے لگی ہے۔ جیسے برف میں خون کے قطرے مل گئے ہوں۔"

یہ سنکر مجھے نجانے کیوں اس محبوبہ پر غصہ آ گیا جسے ایک بڑی رقم کے عوض اس کے باپ نے ایک معمر ملک کے گلے باندھنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اس بے جوڑ شادی کے خلاف آواز بلند کرے۔ وہ عالم تنہائی میں افسردہ آواز سے گنگناتی رہی:

"میرے محبوب غیرت کر۔ میرا ظالم باپ مجھے اژدھے کے سپرد کر رہا ہے۔"

مگر وہ غریب محبوب خود حیران تھا کہ کیا کرے۔ وہ اپنے نصیب سے جنگ کیا کرتا جب کہ اس کے پاس نہ کھیت تھے نہ کھلیان۔

جب سے اس نے آنکھ کھولی تھی اچک زئی قبیلے کی بھیڑیں چرانا نصیب ہوا تھا۔ فصلوں کی کٹائی کا زمانہ آتا تو کھیتوں میں صبح سے شام ہو جاتی۔ گرمیوں کی تپتی ہوئی دھوپ اور جھلسا دینے والی گرم گرم لُو اس کے جسم کو جلا دیتی مگر وہ اُف تک نہ کرتا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو جھوٹی تسلیاں بھی دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس غریب کے پاس ایک ہی جواب رہ گیا تھا:

"تلوار کی لڑائی ہوتی تو لڑتا نصیب کی لڑائی ہے حیران کھڑا دیکھ رہا ہوں۔"

لہریں مسکراتی ہوئی قریب سے گذر گئیں۔ مجھے ان شریر لہروں پر رشک آنے لگا اور دل میں خیال آیا کہ وہ زندگی کے غم اور مسرت میں ایک ہی انداز سے مسکراتی رہتی ہیں۔ چاہے قحط کا زمانہ ہو یا لڑائی کا۔ بہار کا موسم ہو یا خزاں کا۔ انہیں چٹانوں کا مقابلہ بھی کرنا آتا ہے۔ ان کی زندگی سراب نہیں حقیقت ہے۔

میں نے شمال مغرب کی جانب نظر اٹھا کے دیکھا تو ہندوکش کے مخروطی فلک بوس حصار تا حد نگاہ پھیلے ہوئے تھے اور دور سے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ پہاڑ نہیں بلکہ مجبور دوشیزاؤں کے پاکیزہ جذبات کے اہرام کھڑے ہیں جن میں ان کے پیارے

پیارے محبوبوں کی یادیں دفن ہیں۔ میرے ذہن کے گنبد میں بیشمار گیت گونجنے لگے:

"اگر میرے بازو چڑیا کے ہوتے، تو تیرے حجرے کا طواف کرتی"

"تیرے حجرے کی دہلیز ٹیڑھی ہو جائے، تو نے میرے دل کا کھمبا ٹیڑھا کر دیا"

ہیریں بولیں "یہ حجرہ پٹھانوں کی مجلسی زندگی کا عکس ہے، سارے اہم کام اسی میں انجام پاتے ہیں۔ شادی، غمی۔ رقص و سرود۔ رومان بڑے بڑے جھگڑوں کے فیصلے۔ اس حجرے کی زینت قالین اور حریری پردے نہیں بلکہ چلم ہے دیکھنے میں بڑی معمولی لیکن اس کے بغیر زندگی کی ترنگ باقی نہیں رہتی۔ اس کا سرور محفل پر جادو کر دیتا ہے ——— ویاک۔ زادیاقی بان — کی لمبی تانیں اور سہی رنگ جما دیتی ہیں، ایک طرف اہلِ محفل کی مرحبا کا شور اور دوسری طرف سرنا گھڑے پر گھنگرو بندھے ہاتھوں کی تھاپ اور ان کے صوتی اثرات اہلِ محفل کے دل کو بے قابو کر دیتے ہیں۔ پھر چھم چھم چھم کرتی ہوئی مہ جبیں اپنا درد بھرا گیت چھیڑ دیتی ہے:

"اے چلم خدا کی قسم میں تجھے توڑ دوں گی، محبوب میرا ہے اور دل تجھ سے بہلاتا ہے۔ اے چلم تو مجھ سے بہتر ہے ——— میرا محبوب دونوں ہاتھوں اور لبوں سے تجھے چومتا ہے"

"چھم چھم چھم" کرتی ہوئی مہ جبیں جیسے ابھی تک میرے ذہن کے حجرے میں ناچ رہی تھی۔ ہیریں بڑے رازدارانہ انداز سے کہنے لگیں:

"دیکھا آپ نے محبوبہ کا دیوانہ پن؟" ——— "وہ کیا؟"

وہ قہقہہ لگا کے بولیں "جیسے آپ نے کچھ سنا ہی نہیں۔ چلم توڑنے پر تلی ہے اس نیک بخت سے کوئی پوچھے اس بے زبان نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ یہی تو حجرے کی بہار ہے۔!"

کاش محبوبہ بھی اپنے گلابی ہونٹوں سے اس چلم کا بوسہ لے لیا کرے! تب تو وہ محبوب کے لبوں کی شیرینی اور لطیف جذبات کی ساری کپکپی اپنے دل میں محسوس کر سکتی ہے اور وہ لذت حاصل کر سکتی ہے جس کے انتظار میں چلم کی حاسد بن گئی ہے!

ہیریں زور زور سے تالیاں بجا کے رقص کرنے لگیں ان کے شور و غل میں مجھے یوں سنائی دیا جیسے وہ محبوبہ مجھے بہت برا بھلا کہہ رہی ہے لیکن میں اس کی پوری بات نہ سن سکا صرف اتنا سنائی دیا کہ "میں چناب کے پانیوں پر کچے گھڑے کے سہارے تیرنے والی بیوقوف سوہنی نہیں۔ بزدلی سے بہتر ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ جھیل لئے جائیں"

ہیروں پر ایکا ایکی سناٹا چھا گیا اور جیسے جیسے سورج مغرب کی بھول بھلیوں کی جانب بڑھ رہا تھا ان کی خاموشی زیادہ سنگین ہوتی چلی جا رہی تھی۔ پھر جب تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو گیا تو شام کا غبار پھیل گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ نیم وا پلکوں سے مشرق کی جانب دیکھا تو چاند کی منور کرنیں آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی تھیں۔ جیسے سیاہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے نور کا دریا پھوٹ رہا ہے۔ میں کنارے کی ایک اونچی چٹان پر چڑھ کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں چودھویں کا چاند سیاہ پہاڑوں کی اوٹ سے یوں نمودار ہوا جیسے "جلالہ دہ" پر پانی بھرنے والی محبوبہ اپنے چہرے سے آنچل ہٹا دیتی ہے اور اس کا ہنس مکھ حسین چہرہ دلکشیوں کا پرتو معلوم ہونے لگتا ہے۔

جلالہ کے پنگھٹ[1] کا خیال آتے ہی جیسے سچ مچ میری نگاہوں کے سامنے کوئی محبوبہ کھڑی مسکرا رہی تھی اس کا سانس ڈیڑھ میل دشوار گذار چڑھائی چڑھتے چڑھتے ابھی تک پھولا ہوا تھا سنگ ریزوں اور نکیلے پتھروں نے اس کے نازک و مرمریں پاؤں زخمی کر دئے تھے اس کے باوجود وہ درد و کرب کی شدت کو جیسے بھول گئی تھی۔ ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور شریر ہوا نے اس کے آنچل کو بھی ہٹا دیا تھا۔ رخسار پر ننھے سے مصنوعی سبز خال[2] نے اس کے حسن کو اور زیادہ جاذب نظر بنا دیا تھا۔ اور قریب ہی اس کا محبوب ٹخنے ٹخنے پانی

---

[1] گودر پشتو میں پنگھٹ کو کہتے ہیں۔ جلالہ کا پنگھٹ۔ مردان سے تقریباً دو ڈھائی میل شمال میں واقع ہے اور سارے سرحدی علاقہ میں مشہور ہے۔ [2] پٹھان لڑکیوں اور عورتوں میں مصنوعی سبز خال بہت پسند کئے جاتے ہیں۔

میں کھڑا تصویر حیرت بنا اس کے حسن کی دل آویزیوں میں ایسا کھو گیا تھا جیسے کوئی ستارہ شناس سائنسداں چاند کی رومانی اور تخیلی دنیا کے حسین خواب دیکھنے میں مصروف ہے۔ ہوا کی تیز لہر کے ساتھ جیسے دریا کے منجدھار سے ایک دردناک نغمہ بلند ہوا:

"جلالہ پنگھٹ ویران ہو جائے، اس سے محبوبہ کو دمہ کا عارضہ ہو گیا ہے۔"

اس پر لہروں نے گنگناتے ہوئے کہا: "سنیئے اور سنیئے! میاں سڑی کیا فرماتے ہیں۔ اگر جلالہ کا پنگھٹ ویران ہو گیا تو پھر ایسے درد بھرے نغمے کہاں جنم لیں گے اور صدیوں پرانے جلالہ کے پنگھٹ کی تاریخی عظمت کیسے باقی رہے گی۔ مگر میاں مجنوں بھی اس چلم توڑنے والی نادان محبوبہ سے کم نہیں۔ جذبات کی رو میں ایسے بہہ نکلے کہ لگے افلاطونی محبت جتانے اور جناب کو یہ یاد نہ رہا کہ پنگھٹ کی ہر جڑی بوٹی شفا کا حکم رکھتی ہے۔ کیونکہ اس نے محبوبوں کے آنچلوں کو چھوا ہے!"

لہریں آپس میں ٹکراتی ہوئی خاموش ہو گئیں لیکن میں نے انہیں بڑے اعتماد سے جواب دیا: "تمہارا خیال اپنی جگہ درست ہو سکتا ہے۔ مگر یہ افلاطونی محبت نہیں بلکہ دل پر جو واردات گذرتی ہے وہ گیت بن کر سارے عوام پر چھا جاتی ہے سچ پوچھو تو یہی سچی شاعری ہے۔"

اس پر لہروں نے کچھ نہ کہا۔ اور میں نے اپنا چہرہ دریا کے بہاؤ کی جانب پھیر لیا۔ چاندنی رات میں دریائے کابل کا تیز رفتار دھارا پگھلے ہوئے سونے کی مانند بہہ رہا تھا۔ اس صدیوں بوڑھے تجربہ کار مغنی دریا کی زندہ دلی کا ثبوت تو پُر جوش لہریں تھیں جو ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد شور مچاتی ہوئی رقص کرنے لگتیں اور کبھی کوئی جادو بھرا نغمہ چھیڑ دیتیں۔ میں چند منٹ ساکت بیٹھا چاند کو اس طرح گھورتا رہا جیسے کوئی شیر خوار بچہ ماں کی گود میں بیٹھا اس عجیب و غریب قدرت کی لالٹین کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ پھر میں نے آسمان سے نگاہیں پھیر لیں اور وادی کے چھوٹے سے گاؤں کے گھروں کے چھوٹے چھوٹے موکھلوں کی جانب دیکھا چراغ کی روشنی چنگاری کی مانند دکھائی دی میرا دھیان کسی عورت کی نہایت پُرکشش آواز کی طرف ہٹ گیا۔ آواز برابر میرے کانوں کے دریچوں سے ٹکرا رہی تھی:

"سو جا میرے پیارے سو جا۔ تو خالد کا پوتا ہے۔ تو غزنوی کی نسل سے ہے پھر تیرا جی کیوں جاندہے۔ سو جا میرے پیارے سو جا۔
تو شہسوار ہے۔ دشمن سے منہ نہ موڑ۔ دشمن کو ملک سے نکال دے۔"

میں نے بڑے خلوص و احترام سے کہا:

آزاد قوم کے آزاد دریا تجھ پر میرا دل قربان ہو تو پاکستانی سرحدوں سے بہت دور درۂ انائی (افغانستان) سے اپنے ہی بل بوتے پر چل پڑتا ہے پھر تیرے ساتھ اور بہت سی ندیاں نالے آملتے ہیں، تو تیرے حوصلے اور بڑھ جاتے ہیں اور تو بڑی تیزی سے پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں اپنی راہیں تلاش کرتا ہوا تیز چال سے یوں آگے بڑھتا ہے جیسے تو زمین کو تمام آلودگیوں سے پاک کرنے کا عزم کر چکا ہے۔ تجھے یہاں کے لاکھوں آدمیوں ہی کا نہیں سارے پاکستان کے لوگوں کا خلوص حاصل ہے تو اس علاقے کی بنجر زمینوں، سنگلاخ چٹانوں اور میدانوں کو سیراب کرتا ہے۔ تجھے یہاں کی قدیم تاریخ بھی خوب یاد ہے تو نے دریائے خیبر سے گزرتے وقت نجانے کتنے قافلوں کی پیاس بجھائی ہے۔ میں تیری بزرگی اور تجربوں کی اسی طرح تعظیم کرتا ہوں جیسے یہاں کے لاکھوں پٹھان۔ میرے مغنی دریا! میں تجھے کبھی نہیں بھولوں گا۔ تو سدا اسی طرح بہتا رہے اور دیس کے لوگوں کی خوشحالی کے نغمے سناتا رہے!"

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی کی کتابیں، رسائل، اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہ راست حسب ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداران کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے:۔ ادارۂ مطبوعات پاکستان معرفت پاکستان ہائی کمیشن شیر شاہ میس روڈ نئی دہلی (بھارت)

منجانب:۔ ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

فکاہیہ:

افسانہ نگار

اشرف صبوحی

(شادی سے پہلے)

خلیل:- بیگم، مسعود کہاں ہے۔ ابھی تک اوپر سونے نہیں آیا؟

بیگم:- نیچے کمرے میں بیٹھا ہے۔

خلیل:- ایسی گرمی میں؟

بیگم:- نجانے یہ شاعری کہاں سے اس کے پیچھے پڑی ہے۔ سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔

خلیل:- لاحول ولاقوۃ! یہ خبط اچھا نہیں۔ کہیں دیوانہ نہ ہو جائے۔

بیگم:- سلمٰی، اپنے بھائی جان سے کہنا ابا میاں خفا ہو رہے ہیں۔ صبح کو لکھ لینا۔

سلمٰی:- (نیچے پہنچ کر ڈرتے ڈرتے) بھائی جان، اے بھائی جان! بہرے ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری طرف دیکھے جاتے ہو۔ بولتے نہیں۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا۔

مسعود:- (چیخ کر) کیا ہے مردار؟ بھتنی بن کر چمٹ گئی۔

سلمٰی:- (پیچھے ہٹتے ہوئے) واہ! کیسی چیخ ماری ہے۔ نگوڑا کلیجہ بھی دھک دھک کرنے لگا۔

مسعود:- گئی نہیں؟

سلمٰی:- ابا میاں بلا رہے ہیں۔

مسعود:- نہیں آتا کہہ دے۔

سلمٰی:- کہہ دوں؟

مسعود:- جاتی ہے یا اٹھوں؟ کمبخت نے میرا سارا مضمون ملیامیٹ کر دیا۔

بیگم:- (بیٹی کو آتا دیکھ کر ہنستے ہوئے) کوئی چانٹا وانٹا تو رسید نہیں کیا؟

خلیل:- تم ہنستی ہو مجھے غصہ آ رہا ہے۔

بیگم:- وہ کیوں؟

خلیل:- تم ہی نے تو شہ دے دے کر بگاڑا ہے۔

بیگم:- تو اب سنوار لو۔ ابھی کچی لکڑی ہے۔

خلیل:- غضب خدا کا، جوان بیٹا پاگل ہو رہا ہے اور مجھ سے کہا بھی نہیں جاتا۔

بیگم:- اٹھا چور کو توال کو ڈانٹے۔ اور یہ کیا کہا دو ر پار میں کے دشمن پاگل ہو رہے گا۔

خلیل:- پاگلوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔ شاعروں اور دیوانوں میں فرق ہی کیا ہے۔

بیگم:- (بیٹے کے پاس جا کر آہستہ سے) میاں! بارہ بجتے ہیں، اٹھو چل کر سو رہو۔

مسعود:- آپ لوگوں نے تو میرا ناک میں دم کر دیا۔ مجھے ابھی نیند نہیں آئی۔

بیگم:- واہی باتیں نہ کرو، صبح کو لکھ لینا۔ گرمی نہیں لگتی۔

مسعود:- آپ کیوں سر ہو گئیں؟ جائیے، آ جاؤں گا۔ تھوڑا سا اور لکھ لوں۔

بیگم:- بڈھا کی خفگی کا بھی خیال نہیں؟

مسعود:- آپ جاتی ہیں یا میں اپنا سر پھوڑ لوں۔

بیگم:- سچ مچ کہیں دل کا ورق تو نہیں الٹ گیا۔ . . . سارے سارے دن اور آدھی آدھی رات تک کیلے سر جھکائے بیٹھے رہنے سے یہی ہوتا ہے۔ آج اپنا سر پھوڑو گے تو کل دو سروں کا۔

مسعود:- آپ کی بلا سے۔

بیگم:- ذرا جب تمہارے ہاں اولاد ہو گی تو ایسے جوابوں کا مزہ آئے گا۔

مسعود:- یہ عذاب شادی کرنے والوں کو مبارک ہو۔

بیگم:- اور تم تو بنیوا کا سونٹا ہی بنے رہو گے؟ اگر ان پر بھوت سوار ہو گیا تو آفت آ جائے گی۔

خلیل:- (اوپر سے) کیوں، تم بھی بیٹے کے ساتھ شاعری میں شریک

ہوگئیں؟

بیگم:- آرہا ہے۔ دو سطریں پوری کرلے۔

خلیل:- اوپر کیوں نہیں آتا؟ اچھا میں آتا ہوں۔ نیند حرام کردی — کیوں؟ دنیا سو رہی ہے اور تو اُلّو کی طرح بیٹھا ہے۔ یہ شاعری ہی تیرا ستیاناس کردے گی۔

مسعود:- میں شاعری تو نہیں کرتا۔

خلیل:- پھر یہ بیٹھے بیٹھے آنکھیں مٹکانی، ہاتھ چلانے، پاگلوں کی طرح آپ ہی آپ بڑبڑانا کیسا؟

مسعود:- نہیں ابا میاں۔ افسانے لکھنے کا شوق ہوگیا ہے۔ یہ کوئی بُرا مشغلہ نہیں۔

خلیل:- گڑ نہیں گلگلے سہی۔ ابھی سے دروغ بافی! اپنے ساتھ ہمیں بھی جہنم میں لے جائے گا؟

مسعود:- ابا میاں! آج کل افسانے لکھنے والے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

خلیل:- قدر! اور جھوٹوں کی! وہ بات کر جس سے گھر میں کمائی آئے۔

مسعود:- رسالے والوں سے بات چیت ہو رہی ہے۔ خدا نے چاہا تو دو چار افسانوں کے بعد ......

بیگم:- یہ کیا کہا؟ کیا فوج میں جائے گا؟

خلیل:- دو چار افسانوں کے بعد آپ کو تھیلیاں ملنے لگیں گی! اس سے پہلے آپ جو پاگل خانے پہنچ گئے؟

مسعود:- آخر افسانہ نویسی میں نقصان کیا ہے؟

خلیل:- نقصان؟ ایک شریف کا بچہ اخباروں میں نام نکلائے جھوٹ موٹ کے قصے گھڑے اور ان کی اجرت لے؟

مسعود:- آپ تو خواہ مخواہ اُلجھتے ہیں۔ اس زمانے میں ان ہی چیزوں کی قدر ہے۔

بیگم:- ارے، باپ سے دو بدو! بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ صبح کو ایک ایک پرزہ چولھے میں نہ رکھ دیا ہو۔

خلیل:- تم کیا آگ لگاؤ گی۔ میں ابھی دیا سلائی دکھاتا ہوں۔ لو برخوردار، تمہارے افسانے رسالوں میں چھپ رہے ہیں۔ کہو کتنے روپے ملے؟ اگلے سال تمہاری شادی ہونے والی ہے، چڑھاوے کا زیور تو ضرور بن جائے گا۔

(شادی کے بعد)

دلہن:- (پلنگ پر پڑے پڑے) اے کیا کر رہے ہو؟ ادھر تو آؤ... سنتے نہیں۔

مسعود:- کام کر رہا ہوں۔ اس وقت نہ بولو۔

دلہن:- چاہے کسی کا دم نکل جائے تمہاری بلا سے..... ہائے میں مری۔

مسعود:- (گھبرا کر) اُفوہ! یہ نیا ذوق کا آزار لگا۔

دلہن:- تم تو اپنے کسی افسانے کی معشوقہ کے چکر میں پڑے ہو۔ میرا ہاتھ سُن ہوگیا ہے۔

مسعود:- کچھ میں کیا کروں؟ ہلاؤ جلاؤ ٹھیک ہو جائے گا۔

دلہن:- خدا ایسے کٹّر سے پالا نہ ڈالے۔

مسعود:- مجھے کام بھی کرنے دو گی؟ صبح ہی صبح اچھی چھیڑ خانی نکالی۔

دلہن:- تم کو لکھنے پڑھنے سے فرصت نہ تھی تو شادی کیوں کی؟

مسعود:- خطا گر، اب کھائی سو کھائی، آگے کھاؤں تو رام دُہائی۔

دلہن: ایسے بیزار ہو تو زہر کیوں نہیں دے دیتے؟ تم نے تو مجھے اپنے افسانے کی کوئی بچی ہوئی ہیروئن بنا لیا ہے۔ خیر تھوڑی دیر اپنا کام کرلو۔ آج میں اکیلی ناشتہ نہیں کروں گی۔

(مشکل سے ایک پیراگراف لکھا ہوگا کہ نیچے سے ماما آتی ہے)

ماما:- بیگم صاحب پوچھتی ہیں دودھ پیوگے یا ٹکیاں تلی جائیں گی؟

(خاموشی)

ماما:- (زور سے) دلہن بیگم کہاں ہیں؟ میاں تو بولتے ہی نہیں — دلہن بیوی! دلہن بیوی!!..... اوئی یہاں تو سب نے گھُنّی سادھ لی۔ دن چڑھتا چلا آتا ہے۔ گھر کے ستر سے بہتّر کام کرنے ہیں۔ بڑے میاں کی دوا لانی ہے......

مسعود:- (جھلا کر) میرے سر پر کیوں چلائے جاتی ہے۔

ماما:- میاں کوئی لونڈی نہیں جو اس طرح دھتکارتے ہو۔ میں نے ہاتھ بیچے ہیں ذات نہیں بیچی۔

مسعود:- ہاتھ ذات کی خالہ۔ جاتی ہے یا کچھ اور سُنے گی؟ کہہ دیا مجھے خبر نہیں۔

ماما:- واہ واہ واہ!

دلہن:- ـــــ بڑی بی! انہوں نے تو آج خواب میں تلی لاگی ہے۔

ماما:- اچھا بتاؤ، بیگم صاحب نے ناشتے کو پوچھا ہے؟

دلہن :- اے میں بتانے والی کون؟ وہ مختار ہیں، جس چیز سے آپ ناشتہ کریں ہمیں بھی بھیج دیں۔

ماما :- آپ ہی بتا دیجئے وہ تو نہیں بتلاتے۔ آپ کہیں تو کچوریاں تل لوں۔

بیگم :- سلمیٰ بیٹی، دیکھنا گھی بھی ہے؟ ــــ بڑی بی تم بھی سٹری بہتری ہو گئی ہو۔ خاصی طرح سے بنئے کے نام گھی کی پرچی لکھوا تی لاتیں۔ سلمیٰ! جا کر بھائی سے سیر بھر گھی کی پرچی تو لکھوا لاؤ۔

سلمیٰ :- بھائی جان! گھی نہیں ہے، بنئے کو پرچی لکھ دو۔

مسعود :- مجھے فرصت نہیں۔

سلمیٰ :- (پاس آکر) کیا کہانی لکھ رہے ہو، ہمیں بھی تو سناؤ؟

مسعود :- اب تو جاؤ، رات کو سنائیں گے۔

سلمیٰ :- کوئی مزے کی کہانی ہے؟

مسعود :- (ہاتھ سے دھکا دے کر) اب کے بولی تو مار بیٹھوں گا۔

سلمیٰ :- میں بھی بھابی دلہن سے کہہ دوں گی۔

ماما :- (نیچے سے چیخ کر) ننھی بی آؤ نا۔ تم تو جا کر بیٹھ ہی رہیں۔

سلمیٰ :- (چلا کر) آتی ہوں بی آتی ہوں۔ پرچی ہی لکھوا لوں۔

مسعود :- کیسی حلق پھاڑ کر چیخی ہے۔ کانوں میں آواز گھس گئی۔

دلہن :- پھر پرچی کیوں نہیں لکھ دیتے۔ ایک پرزے پر دو حرف لکھ دینا بھی ایسا دشوار ہے۔

مسعود :- (جھٹک پٹک کر) تم لوگوں کو نہ جانے میرے ستانے میں کیا مزہ آتا ہے۔ کہاں چلا جاؤں؟ چار سطریں لکھنی قیامت ہو گئیں۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ لوں۔ (کاغذ کا پرزہ پھاڑ کر) آچکا، اُن سے اپنا منہ کالا کر۔ میرے لئے یہ گھر بھوت خانہ ہو گیا۔

بیگم :- (دالان سے) لو بی جلدی سے تم گھی تو لاؤ۔ قصائی سے گوشت کو کہتی آنا۔

ماما :- لگے ہاتھوں بڑے صاحب کا نسخہ بھی دے دو۔

بیگم :- خدا تمہارا بھلا کرے، خوب یاد دلایا۔ جانا سلمیٰ بھائی جان کو بلا لانا۔ حکیم صاحب مطب میں آگئے ہوں گے۔ ان سے جا کر حال کہیں۔

سلمیٰ :- (نیچے سے) بھائی جان! بھائی جان! دیکھئے اماں جان کیا کہتی ہیں۔

مسعود :- (دانت پیس کر) اب کیا آفت آئی۔ آٹا ہو چکا ہوگا (بیوی سے) ذرا آکر کہہ دو وہ ضروری کام کر رہے ہیں۔ اچھا کوئی جواب تو دے دو، نہیں تو وہ بھنبھیری سی چیخے جائے گی۔

دلہن :- تم خود کھڑے کھڑے جا کر کیوں پوچھ نہیں آتے؛ نجانے ابا میاں رات کو کیسے رہے۔

مسعود :- جی بھر کر دق کر لو۔ دیکھو کوئی کسر نہ رہے۔

بیگم :- (اوپر آکر) مسعود! ایسا لہو سفید ہو گیا۔ باپ کا یہ حال اور بیٹا کانوں میں تیل ڈالے بیٹھا ہے۔

مسعود :- بات کیا ہے؟ میں گھر سے نکل جاؤں؟

بیگم :- اسی دن کے لئے تم کو پالا تھا۔ آپ گیلے میں سوئی تمہیں سوکھے میں سلایا۔

مسعود :- میں برا معلوم ہوتا ہوں تو گھر سے نکال دو۔ آخر اس کوسنے پیٹنے کا مقصد کیا ہے۔

بیگم :- ننھے بچے ہو، کچھ جانتے ہی نہیں۔ صبح سے اتنا وقت آیا۔ باپ کو آکر پوچھا، ان کی دوا ٹھنڈائی کا فکر کیا۔

مسعود :- میں بھی تو خالی نہیں بیٹھا۔ گھر چلانے ہی کی خاطر تو آنکھیں پھوڑ رہا ہوں۔

بیگم :- ہم نے تو ابھی تک اس آنکھیں پھوڑنے کا نتیجہ دیکھا نہیں۔

مسعود :- اماں جان! خدا کے واسطے یہ باتیں چھوڑئیے۔ لائیے نسخہ دیجئے۔

بیگم :- حکیم کے پاس جاؤ۔ آج کبوتر کا شوربا دینے کو کہا تھا۔ اگر وہ بتا دیں تو لیتے آنا۔

مسعود :- (اٹھتے ہوئے) حیرت شملوی نے یہ شعر میرے ہی لئے کہا ہوگا ؎

ایک شب کا نہیں ہے قصۂ غم
اور غم ایک دن کی بات نہیں!

★

صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

یوں تو پاکستان کی ہر جہتی ترقی کا ہر پہلو جاذب نظر ہے لیکن جو ترقی اس نے صنعت کے میدان میں کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایک طرف حکومت اور دوسری طرف پبلک نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، صنعتی ترقی کے منصوبے تمام تر ایک ہی مہتم بالشان ادارہ سے بروئے کار آئے ہیں۔ جس کا نام بی۔آئی۔ڈی۔سی یعنی ''صنعتی ترقیاتی کارپوریشن'' ہے۔ اس کے قیام کی منظوری ۱۹ اپریل سنہ ۱۹۵۰ء کو عمل میں آئی تھی لیکن اس کا پہلا بورڈ ۱۲ جنوری سنہ ۵۲ء میں قائم ہوا۔ اس طرح ادارہ کو قائم ہوئے درحقیقت تقریباً ۵ سال ہی گذرے ہیں۔

کارپوریشن کا سرمایہ جس سے وہ کام چلاتی ہے دو طرح سے حاصل ہوتا ہے۔ اول مرکزی حکومت اسے ہر سال ایک رقم مہیا کرتی ہے جس میں واجبی حد تک بیرونی زر مبادلہ بھی شامل ہوتا ہے۔ دوسرے وہ روپیہ جو نجی سرمایہ‌دار اسکے کاموں میں لگاتے ہیں۔

کارپوریشن نے پاکستان کی صنعتی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے گذشتہ پانچ سال میں لگ بھگ ۵۴ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کی لاگت سے ۳۲ منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ ان کے علاوہ سترہ اور منصوبوں پر کام جاری ہے جن پر اندازاً ۶۱ کروڑ روپے صرف ہونگے۔ مسودہ پانچ سالہ منصوبہ کے تحت کارپوریشن کا ایسے صنعتی منصوبے اختیار کرنا قرار پایا ہے جن پر ایک ارب روپے سے زیادہ لاگت کا اندازہ ہے۔ لیکن ان منصوبوں میں موجودہ ۱۷ منصوبے بھی شامل ہیں جن پر کام جاری ہے۔ اس وقت تک جو منصوبے مکمل ہو چکے ہیں، ان کی کیفیت یہ ہے :—

پٹ سن کے کارخانے	(۱۲)
شکر کے کارخانے	(۲)

زیل پاک سیمنٹ فیکٹری حیدرآباد

کیمیاوی کھاد کی
فکٹری داود خیل

سوتی کپڑے کا کارخانہ (۱)
ڈی ڈی ٹی کا کارخانہ (۱)
سنٹونن فیکٹری (۱)
کاغذ اور گتے کے کارخانے (۳)
اونی مال کے کارخانے (۳)
روئی اوٹنے کے کارخانے (۵)
گندھک کے نیزاب کا کارخانہ (۱)
سوئی کراچی گیس بائپ لائن۔
زیر تکمیل منصوبے یہ هیں :

(۱) کراچی اور کھلنا میں جہازوں کی دو بڑی بڑی گودیاں اور نرائن گنج میں ایک خشک گودی - (۲) کھاد کے کارخانے- (۳) سوئی - ملتان گیس پائپ لائبن - (۴) ملتان میں ایک بڑا گرمابی اسٹیشن جو سوئی گیس سے کام کرے گا- (۵) گیس تقسیم کرنے والی کمپنیاں - (۶) ایک پینیسیلین کا کارخانہ - (۷) ایک رنگوں اور کیمیاوی اشیاء کا کارخانہ - (۸) تین پٹ سن کے کارخانے - (۹) - تین شکر کے کارخانے - (۱۰) کھلنا میں اخباری کاغذ کا ایک کارخانہ - (۱۱) - کوئلے کی کانوں کے دو کاروباری ادارے -

کارپوریشن کی سر گرمیوں کا ایک اهم پہلو یہ ہے کہ یہ نجی سرمایہ کو اپنے منصوبوں کی طرف متوجہ کرنے میں کس حد تک کامیاب رهی ہے - ابتک کارپوریشن کے مکمل منصوبوں پر اندازاً ۲۷ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کا سرمایہ لگا ہے جو کارپوریشن کے بعض اور منصوبوں کو لمیٹڈ کمپنیاں بنانے کی حالت میں اور بھی بڑھ جائے گا -

یہ کارپوریشن بنیادی طور پر ایک کاروباری نظام ہے اور مفاد عامہ کے پیش نظر حکومت خود اس کی رهنمائی کرتی ہے مگر اس طرح کہ اسکے معاملات دفتری گھس گھس میں نہ پھنسے رهیں - کارپوریشن نے ۱۴ صنعتوں کو جس طرح محکم بنیادوں پر قائم کیا ہے اس کا حال اس تفصیل سے معلوم هو سکتا ہے:

۱ : پٹ سن: ۱۲ کارخانے چالو ہوئے ہیں جن میں (۶۷۵۰) کرگھے لگے ہوئے ہیں - لاگت ۱۹۶ کروڑ روپے ہے جن میں ۶ کروڑ کارپوریشن کے ہیں اور باقی نجی صنعت کاروں کے - ایک ہزار کرگھے دوسرے کارخانوں میں ۵۷ء کے آخر تک نصب ہو جائیں گے - باقی (۳۲۵۰) کرگھے جن کی تجویز پہلے پانچ سالہ منصوبے میں پیش کی گئی ہے حکومت کی منظوری اور سرمایہ مہیا کئے جانے پر نصب ہوں گے - موجودہ ذرائع سے پاکستان جو پٹ سن تیار کر رہا ہے اس سے نہ صرف تمام ملکی ضروریات پوری ہو رہی ہیں بلکہ بڑی مقدار میں برآمد بھی ہو رہی ہے - چنانچہ ۱۹۵۵-۵۶ء میں اندازاً ۹ کروڑ روپے کا مال برآمد کیا گیا - سال رواں میں اس کا اندازہ ۱۴ کروڑ روپے کیا جاتا ہے -

۲ : کاغذ سازی : کارپوریشن نے کاغذ اور گتے کے ۳ کارخانے قائم کئے ہیں - ان میں سب سے اہم کارخانہ کرنافلی کا ہے جو سالانہ ۳۰ ہزار ٹن مال تیار کرتا ہے - ایک اور کارخانہ جو (۲۳۰۰۰) ٹن اخباری کاغذ اور (۱۳۰۰۰) ٹن کتابی چھپائی کا کاغذ تیار کرے گا پہلا میں زیر تعمیر ہے -

۳ : انجنیرنگ کا بھاری سامان : ملتان میں لوہے اور فولاد کا کارخانہ قائم کرنے کی تجویز مرکزی حکومت کے زیر غور ہے - یہ کارخانہ شروع شروع میں (۷۰) ہزار ٹن فولاد تیار کرے گا - فی الحال کالا باغ کی لوہے کی کانوں میں کانکنی کو ترقی دی جارہی ہے اور چترال میں لوہے کی کانوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے -

۴ : جہاز سازی : کراچی میں جہاز سازی کی گودی کا پہلا مرحلہ مارچ ۵۶ء میں طے ہو گیا تھا، سوائے بھاری مرمت کے اور کارخانہ ڈھلائی کے جو امید ہے ۵۷ء کے آخر تک مکمل ہو جائیں گے - توقع ہے کہ کھلنا اور نرائن گنج میں جہاز سازی کی گودیاں ۵۷ء کے دوران میں مکمل ہو جائیں گی -

۵ - بھاری کیمیاوی اشیاء : نوشہرہ میں کیمیاوی اشیاء اور ڈی-ڈی-ٹی کا ایک ایک کارخانہ اور لائل پور میں گندھک کے تیزاب کا کارخانہ کھولا گیا ہے - تیزاب کے کارخانہ میں عنقریب سوپر فاسفیٹ کھاد کا ایک کارخانہ بھی قائم ہوجائیگا - کارپوریشن کے زیر انصرام "فرم کیمیکل کمپنی" راولپنڈی میں سٹونن تیار کر رہی ہے - یہ کمپنی دنیا بھر میں سب سے زیادہ سنٹونن تیار کرتی ہے - ہری پور میں گندہ بروزہ اور تارپین

گندھک کے تیزاب کا کارخانہ، لائل پور

کا کارخانہ بھی بن رہا ہے۔

۶ : کھادیں : کیمیاوی کھادیں تیار کرنے کے لئے داؤدخیل میں پاک امریکن فرٹلائزر فیکٹری نے مئی ۵۷ء سے کام شروع کردیا ۔ اس پر ۸ کروڑ روپے لاگت کا اندازہ ہے اور یہ سالانہ ۵۰ ہزار ٹن امونیم سلفیٹ تیار کریگی۔ مشرقی و مغربی پاکستان میں کیمیاوی کھاد کے دوبڑے کارخانے قائم کرنے کے لئے ابتدائی کام ختم ہوچکا ہے۔ یہ کارخانے قدرتی گیس سے کام کریں گے اور دو دو لاکھ ٹن کھاد تیار کریں گے۔

۷: کیمیاوی اشیاء ، رنگ اور ادویہ :

کارپوریشن مشہور جرمن کمپنی "بائیرز" کی شرکت میں رنگ اور کیمیاوی اشیاء بنانے کی کلیں داؤد خیل میں لگا رہی ہے جو ۵۸ء کے اوائل میں مال تیار کرنا شروع کر دیں گی۔

۸ : سیمنٹ : کارپوریشن نے داؤد خیل میں ۱ لاکھ ٹن اور حیدرآباد میں ۲ لاکھ ۲۰ ہزار ٹن پیداوار کا کارخانہ قائم کرکے پاکستان کو بڑی زبردست اقتصادی مدد دی ہے۔ ان کارخانوں کو اور بھی وسیع کرنے کی تجاویز حکومت کے سامنے پیش کی جاچکی ہیں ۔ ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ اب پاکستان کچھ سیمنٹ ہندوستان، افغانستان اور خلیج فارس کو بھی برآمد کر رہا ہے۔

۹ : شکر : کارپوریشن کے زیر اہتمام جوہرآباد اور چارسدہ (مغربی پاکستان) میں دو، اور ماھی گنج، ٹھاکرگاؤں اور دیوان گنج (مشرقی پاکستان) میں تین کارخانے کام کر رہے ہیں ۔ مغربی پاکستان کے کارخانوں نے مال پیدا کرنا شروع بھی کردیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے کارخانے گنے کی اگلی فصل میں کام کرنا شروع کردینگے ۔

۱۰ : پارچہ بافی : کارپوریشن نے سوتی کپڑے کا کام نجی اداروں پر چھوڑدیا ہے لیکن ۵۰ ہزار تکلوں کا ایک کارخانہ کالی گنج میں خود بھی قائم کردیا ہے۔ یہ کارخانہ مشرقی پاکستان کی پارچہبافی کی ضروریات کو کافی حد تک پورا کر رہا ہے۔ کارپوریشن نے نجی صنعتکاروں کو روئی اونٹنے کے پانچ کارخانے قائم کرنے میں بھی مدد دی ہے۔ اور اسکی بدولت بنوں ، ہرنائی اور قائدآباد میں اندازاً ۱.۴ کروڑ روپے کی لاگت سے اون کے تین کارخانے بھی قائم ہو گئے ہیں ۔

۱۱ : قدرتی گیس : کارپوریشن نے پاکستان کے قدرتی گیس کے ذخیروں کو کام میں لانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ برما آئل کمپنی اور کامن ویلتھ ڈویلپمینٹ فنانس کارپوریشن کی شراکت سے کارپوریشن نے سوئی (بلوچستان) سے کراچی تک کم از کم وقت میں ۸.۴ کروڑ روپے کی لاگت سے ۳۵۰ میل لمبی پائپ لائن بچھائی ہے اور کراچی اور حیدرآباد کے متعدد صنعتکاروں کو فراہم بھی کردی ہے ۔ فی الحال روزانہ کھپت تقریباً ۲.۷ کروڑ مکعب فٹ ہے ، لیکن جلد ھی اسکی مقدار بڑھ جانے کی توقع ہے۔ سوئی سے ملتان تک ۲۱۷ میل لمبی لائن بچھانے کا کام شروع ہوگیا ہے۔ ادھر مشرقی پاکستان میں سلہٹ سے ڈھاکہ تک لائن بچھانے کے سلسلہ میں ابتدائی مراحل طے کئے جا چکے ہیں ۔

۱۲ : طاقت بذریعہ قدرتی گیس :

مرکزی اور مغربی پاکستان کی حکومت کے کہنے پر کارپوریشن نے ملتان میں ۱۰.۷ کروڑ روپے کی لاگت سے (۱۳۲۰۰۰) کلوواٹ طاقت کا گرمابی اسٹیشن قائم کرنے کا منصوبہ اپنے ذمہ لیا ہے ۔ یہ اسٹیشن قدرتی گیس سے چلایا جائیگا۔ اس سلسلہ میں کارپوریشن ملتان سے لائلپور تک لائن بھی بچھائے گی تاکہ اس نئے اسٹیشن سے سابق سرحد و مغربی پنجاب کے علاقوں تک اس طاقت کے کنکشن پہنچا سکے ۔

غرض اگر کارپوریشن کی کارگذاریوں پر مجموعی حیثیت سے نظرڈالی جائے تو بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس نے پاکستان کی صنعتی ترقی اور اقتصادی خوشحالی کے سلسلے میں بہت ھی شاندار خدمات انجام دی ہیں *

پاکستانی خواتین کی ترقّی

ہماری تحریک آزادی کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اس میں خواتین نے بھی نمایاں حصّہ لیا ہے۔ وہ اس قومی جنگ کے ہر محاذ پر پیش پیش رہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا پوری لگن سے کیا اور کڑی سے کڑی آزمائشوں کا بڑی جرأت و ہمت سے سامنا کرتی رہیں۔ صنف نازک کی یہ جدوجہد ہماری تاریخ کا ایک سنہری باب ہے جس کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے :

خواتین کی سرگرمیوں کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا حصولِ آزادی تو ان کی کوششوں کی بالکل ابتدائی منزل تھی۔ ان کا مدعا تو اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا یعنی قومی زندگی کو بام عروج تک پہنچانا۔ اور وہ اس کے لئے برابر کوشاں ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ ان کے ذمہ کیا کیا فرائض ہیں یعنی نئی نسل کو صحیح نہج پر پروان چڑھانا، خواتین کو نئی زندگی کے نئے نئے تقاضوں کا اہل بنانا اور مردوں کے ساتھ قومی تعمیر کے کاموں میں شریک ہونا تاکہ ہمارے ملکی اور بین الاقوامی مقاصد بوجہ احسن حاصل ہو سکیں۔ جیسا کہ لازم تھا، حصول آزادی کے بعد ان کا مطمح نظر یہ قرار پایا کہ وہ کس طرح اپنی سرگرمیوں کو نئے سانچوں میں ڈھالیں جس خوش اسلوبی سے انہوں نے یہ کام انجام دیا ہے وہ ان کی فطری صلاحیت اور بیدار مغزی کی بین دلیل ہے :

صنف نازک کو سماجی فلاح و بہبود کے ساتھ فطری مناسبت ہے۔ گھریلو زندگی ہو یا سماجی، وہ ایسے کاموں کو بڑے سلیقے سے سرانجام دے سکتی ہیں۔ انہوں نے شروع ہی سے نئے تقاضوں کو بھانپ لیا اور اپنی کوششیں ان کے لئے وقف کر دیں۔

پاکستانی خواتین کا مشہور ادارہ "اپوا" اسی کے لئے قائم ہوا اور اس نے گوناگوں معاشرتی، اقتصادی، تعلیمی اور ثقافتی مقاصد کو اپنایا۔ قدرتی طور پر شروع شروع میں خواتین کی سرگرمیاں مغویہ عورتوں کی بازیابی اور اپنی مصیبت کی ماری، بے سہارا بے گھر بہنوں کی بحالی کے لئے وقف رہیں۔ یہ در اصل انسانیت کی خدمت تھی اور ہمیں فخر ہے کہ ہماری کتنی ہی خواتین نے گھروں کی چار دیواری اور آسودہ زندگی چھوڑ کر اس شاندار کام کا بیڑا اٹھایا۔

یہ خواتین کی سرگرمیوں کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے صحت اور تعلیم کو فروغ دینے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ چنانچہ اس وقت "اپوا" کے زیر نگرانی کتنے ہی اچھے اچھے ادارے کام کر رہے ہیں جن میں عورتوں کو دستکاری سکھانے، تعلیم دینے اور صحت و صفائی کے کاموں میں تربیت بہم پہنچانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

صحت کے سلسلہ میں ایک بڑا اقدام یہ تھا کہ خواتین نے ہسپتالوں اور زچگی و بہبودیٔ اطفال کے مرکزوں میں جا جا کر وہاں کے عملہ کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ قیام پاکستان کے دو تین سال ہی میں اپوا کی کوششوں سے باقاعدہ شفاخانے، ہسپتال اور زچگی و بہبودی اطفال کے مرکز بھی قائم ہو گئے۔

پاکستان کی ایک بڑی ضرورت تربیت یافتہ نرسیں تھیں۔ قومی، اور اس سے بڑھ کر انسانی خدمت کے جذبہ نے جلد ہی نوعمر مسلمان خواتین کو نرسنگ کی طرف مائل کر دیا اور وہ جوق در جوق اس کی طرف رجوع ہونے لگیں۔ اس سے ابتدائی بحران کی صورت جلد ہی دور ہو گئی اور اب یہ سروس اعلیٰ پیمانہ پہ منظم و آراستہ ہے۔ لہٰذا اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ پہلے سے کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ حفظان صحت اور بڑی بڑی بستیوں اور طبقوں میں "اپنی مدد آپ کرو" اور صحت کے مرکز قائم کرنے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آگیا ہے :

سینا پرونا، بننا، کھانا پکانا اور مختلف قسم کی گھریلو دستکاریاں عورتوں کے من بھاتے کام ہیں۔ ان کے لئے کتنے ہی صنعتی ہوم اور ٹریننگ سینٹر قائم کئے گئے ہیں جنہوں نے بڑا معرکے کا کام کیا ہے اور ان سے ہمارے ملک کی اقتصادی حالت اور عورتوں کی خوشحالی میں بڑا اضافہ ہوا ہے :

کام کے ساتھ ساتھ تفریح بھی ضروری ہے چنانچہ خواتین ملک میں مصوری موسیقی اور دوسرے فنون کا ذوق عام کرنے میں بھی نمایاں حصہ لے رہی ہیں۔

ہماری خواتین بین الاقوامی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہی ہیں جس سے دوسری قوموں اور اداروں کے ساتھ میل ملاپ بڑھانے اور خوشگوار تعلقات قائم کرنے میں بڑی بڑی مدد ملی ہے۔ ہمارے یہاں کتنی ہی بین الاقوامی شہرت کی مالک خواتین تشریف لائی ہیں۔

اسی طرح یہاں سے بھی متعدد خواتین اور ان کے وفود دوسرے ممالک کو جاتے رہے ہیں اور ایک جلیل القدر خاتون بیگم لیاقت علی خاں تو عرصہ سے ہالینڈ میں پاکستانی سفیر کے طور پر متعین ہیں۔

ایک اعلیٰ حکومت کی علامت یہ ہے کہ وہ عوام کی خوشحالی کے لئے کیا کیا کوششیں عمل میں لاتی ہے۔ حکومتِ پاکستان نے اجتماعی ترقی کا ایک بہت بڑا منصوبہ تیار کیا ہے جس کو شہری آبادیوں اور دیہات میں تیزی سے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ مگر جو بات خود مل جل کر، اپنے ہی بل بوتے پر کی جائے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں اجتماعی اور دیہاتی ترقی کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ دو بڑے اہم منصوبے ہیں جن کا تعلق بڑی بڑی جماعتوں اور آبادیوں میں رفاہِ عامہ کی سرگرمیوں سے ہے۔ یہ سرگرمیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق اجتماعی ترقی، بچوں اور خاندانوں کی بہبودی، خواتین کے لئے مرکز قائم کرنے اور بے سہارا عورتوں کی خوشحالی و آبادکاری سے ہے۔ اس سلسلہ میں "ماؤں کے کلب" بھی بہت مقبول ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض میں تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

ان کاموں کا ایک بڑا اچھا پہلو یہ ہے کہ جو ضرورت بھی پیش آئے عورتیں اسے خود ہی باہمی تعاون اور رضاکارانہ خدمات سے پورا کر لیتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے عورتوں کو تربیت بھی دی جاتی ہے۔ آئے دن سیلاب کی تباہ کاریاں، قحط اور دوسرے حادثے بھی ہنگامی حالات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ان کے سلسلہ میں بھی خواتین برابر امدادی کام کرتی رہی ہیں۔ ادھر عارضی امداد کے لئے دودھ، مکھن، تیل اور کپڑے تقسیم کرنے کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ جو عورتیں اس قسم کے سماجی کام کرنا چاہیں، ان کے لئے تھوڑی تھوڑی مدت کے تربیتی کورسوں میں شریک ہونے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔

شہری ضرورتیں اپنی جگہ پر ہیں۔ یہ خاصی اہم بھی ہیں اور متنوع بھی۔ ان کے مقابلہ میں دیہی ضرورتیں بھی کچھ کم نہیں۔ ہماری خواتین نے ان کی طرف بھی اپنی پوری توجہ صرف کی ہے۔

چنانچہ علاقہ ملیر کے ایک گاؤں میں دیہاتی تعمیر و ترقی کا ایک منصوبہ جاری کر کے اس کام کی شروعات کی گئی ہے۔ یہاں ایک مرکز قائم کیا گیا ہے جس میں تربیت کے ساتھ ساتھ عملی کام بھی کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اس تربیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ خواتین کو لکچروں اور مظاہروں کے ذریعے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ کس طرح دیہات کی عورتوں میں امورِ خانہ داری، بچوں کی دیکھ بھال، صحت و صفائی، کھیل کود، ورزش، رہن سہن، باہمی تعاون، غذا، گھریلو دستکاریوں اور تعلیمِ بالغان کا پرچار کریں۔

شہروں میں اجتماعی ترقی کا پروگرام مسودہ پنج سالہ منصوبہ کے تحت ہے۔ اس کو رفاہی بہبود کے تمام کاموں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس منصوبے کے مطابق سر دست ملیر علاقہ لیاری، اور کھنڈہ نوآباد کراچی میں بڑی سرگرمی سے کام شروع کیا گیا ہے اور ان میں خواتین کی سرگرمیاں خاصی وسیع اور متنوع ہیں۔

لیاری کے تیرہ علاقوں میں مردوں کی طرح عورتیں بھی "اپنی مدد آپ کرو" کے اصول پر کام کر رہی ہیں۔ وہ اپنی رفاہ کے کام آپ سوچتی اور آپ کرتی ہیں مثلاً تعلیم (مع تعلیمِ بالغان)، امورِ خانہ داری، ٹریننگ، تفریح، صحت و صفائی، خوبصورت گھروں اور صاف باورچی خانوں کا مقابلہ، طبی امداد، بچوں کی دیکھ بھال، زچہ بچہ اور صحت کے مرکزوں کا قیام، غذا، دوائیں اور دوسرا سامان مہیا کرنا، وباؤں کا انسداد، ٹیکوں کی مہم، گھریلو مسئلے، اخراجات اور دستکاریاں، میلے نمائش وغیرہ وغیرہ۔

ایسی ہی سرگرمیاں کھنڈہ نوآباد اور ملیر میں بھی جاری ہیں اور ان کی رفتار روز بروز تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ ادھر لاہور اور ڈھاکہ میں بھی اجتماعی ترقی کا ایسا ہی وسیع پیمانہ پر بندوبست کیا جا رہا ہے۔ اس سے ان تمام مقامات میں خواتین کی گوناگوں سرگرمیوں اور ان کے دور رس عمدہ نتائج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ صرف ابتدائی جھلکیاں ہیں۔ امید ہے کہ پاکستانی خواتین کی رفتارِ ترقی اور بڑھے گی اور وہ ملک کی فلاح و تعمیر کے کاموں میں عوام کی بالعموم اور اپنے طبقہ خواتین کی بالخصوص بیش از بیش خدمت کرتی رہیں گی۔

ماہ نو، کراچی، جنوری ۱۹۵۸ء

اُفق تا اُفق:

نیا نظامِ تعلیم

(اورینٹل کالج لاہور کے ۸۸ ویں یومِ تاسیس پر خطبۂ استقبالیہ)

ڈاکٹر سید عبداللہ

مشرقی علوم کے سوال کو عام تعلیم کے مسائل سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ کیونکہ بالآخر مشرقی علوم کی ساری بحث بھی اُنہی اصولوں تک جا پہنچتی ہے جن کا تعلق تعلیم کے عام فلسفہ و حکمت سے ہے۔ اور پھر اس لئے بھی کہ مشرقی علوم کے سوال کو عام تعلیم سے الگ رکھ کر سوچنے کی پالیسی ہی دراصل اس بات کی ذمہ دار ہے کہ اس وقت ہماری تعلیم (مشرقی اور مغربی) دو الگ الگ خانوں اور طبقوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ جن میں سے عملاً ایک کو اعلیٰ اور دوسری کو ادنیٰ یا ایک کو مفید اور دوسری کو غیر مفید یا بے ضرورت خیال کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ تقسیم ایک غیر ملکی حکومت کی غرض مندانہ حکمت عملی کا نتیجہ تھی۔ اور اب اس تقسیم کو جاری رکھنے کا مطلب ماسوا اس کے کچھ نہیں کہ ہم ایک غلط رسم کو ہمیشہ کے لئے برقرار رکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔

پاکستان کے موجودہ عقائد کے پیش نظر ہم اس تعلیمی نظام کو قومی تعلیم کا درجہ نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس تعلیم کا بنیادی محرک جذبہ غرض مندانہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اصول بیشتر صورتوں میں غیر قدرتی اور غیر عقلی تھے۔ اس میں ہمارے ملک کی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی ضرورتوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا اور اس کے اکثر نمونے یا خاکے (PATTERNS) مستعار اور اجنبی تھے۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری یہ تعلیم ہمارے حق میں اتنی مفید ثابت نہیں ہوئی، جتنا کسی اچھی تعلیم کو ہونا چاہیئے۔ ایک بہت بڑا نقصان اس نظام تعلیم سے یہ ہوا کہ ہماری تعلیمی روایت کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ کیونکہ یہ تو مسلّم ہے کہ اس ملک میں بھی ایک تہذیب، ایک ثقافت تھی۔ اس ملک کے لوگوں کا بھی کوئی ادب تھا، ان کی بھی کوئی روایات تھیں، ان کا بھی کوئی نظام تعلیم و تربیت تھا، میکالے کی نظر میں ان کی اہمیت کچھ بھی ہو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ تاج محل کی بنا ڈالنے والی قوم، دل اور نظر کی کچی نہیں ہوسکتی، پاک بین نگاہ اور گداز دل کی یہ تہذیب کسی گھنیر تعلیمی روایت کے بغیر ممکن نہیں، مگر غیر ملکی حکومت نے یہ تعلیمی روایت یکسر فنا کر دی۔ اس میں اس کے بُرے ارادے کا دخل نہ بھی ہو، تب بھی اس سے ہمارے فکر و نظر کی قدرتی ترقی بالکل رک گئی۔ اس سے ہماری تعلیم دو متحارب کیمپوں میں تقسیم ہوگئی اور ملک ان عمدہ نتائج علمی سے محروم ہوگیا جو ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے اجتماع و ترکیب سے لازمی طور سے برآمد ہوتے۔ آج کئی سوچنے والے اور محسوس کرنے والے یہ شکایت کرتے ہیں کہ اب ہم میں غزالی، ابن خلدون، اور شاہ ولی اللہ نہیں پیدا ہوتے تو دراصل اس کی ذمہ داری ہماری ڈیڑھ ہزار سالہ تعلیمی روایت کے انقطاع پر ہے جس سے بڑھتی ہوئی روایت تو ختم ہوگئی مگر علم و تعلیم تصنیف و تحقیق اور آزادانہ غور و فکر کی کوئی نئی روایت پیدا نہ ہوسکی ۔۔۔!

بہر صورت اب پاکستان کے نظامِ تعلیم کی اساس اور غایت کو بدل دینا ہوگا۔ سب سے پہلے پاکستانی تعلیم کی غایت متعین کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اسی پر اس ملک ملک کی ساری تعلیم کی عمارت بلند ہوسکے گی اور اسی سے اس کی تفصیلات و جزئیات کے نقوش تیار ہوسکیں گے۔ میں نے تعلیمی غایت کے سلسلے میں مخصوص عقائد کا سوال اٹھائے اٹھایا ہے کہ تعلیم کے عام اور مثالی نصب العین کچھ بھی ہوں، عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کے نظام تعلیم پر اس کے مخصوص سیاسی اور تہذیبی احوال کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اور عملی شکل میں، اقوام عالم میں سے ہر قوم اپنے خاص احوال کو مدنظر رکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ نظری اعتبار سے تو تعلیم کا ہر نصب العین اور ہر مقصد نیک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً، شخصیت کی تکمیل، خیر، صداقت اور حسن کی قدروں کی تربیت، عملی قابلیتوں کی تکمیل وغیرہ وغیرہ۔ افلاطون سے لے کر آج تک کئی اہل فکر نے تعلیم کے لئے نہایت اونچے اور مثالی مقاصد تجویز کئے ہیں۔ مگر اس کو تعلیم کی بدقسمتی کہیئے یا ناگزیر خصوصیت کہ تہذیب انسانی کے ہر دور میں وہ سامنے کے مخصوص عمرانی یا سیاسی فلسفوں سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ ان میں سے بعض نے حقیقی تعلیم کو آگے بڑھایا اور بعض نے اس کو پیچھے دھکیل دیا۔ مگر مخصوص ملکی اور سماجی احوال کا اثر ہوتا رہا اور اس کو قبول کرنے پر ہر قوم مجبور رہی۔

بظاہر یہ تصور تنگ نظری پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور میں پاکستان کو اس تنگ نظرانہ اور محدود نقطۂ نظر کی دعوت کبھی نہ دیتا اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ خوش قسمتی

سے پاکستان کی بنیادی تعلیمی غایت قومی ہو جانے پر بھی وسیع اور آفاق گیر ہی رہے گی۔ یورپ اور امریکہ کے ماہرینِ تعلیم صدیوں کے تجربوں، کاوشوں اور بغاوتوں کے بعد جس بین الاقوامیت کی طرف اب رجوع کر رہے ہیں، وہ بین الاقوامیت مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ اسلامی ذہن اصولاً بین الاقوامیت، آفاقیت، اور انسانیت سے مانوس ہے۔ یورپ اور امریکہ بڑی بڑی فکری بغاوتوں کے بعد آج اس تصور کے قریب آئے ہیں جو نسل اور جغرافیہ کی حدود سے بلند تر نظر کا مدعی ہے۔ اسلام کا یہ عقیدہ اس کے اولین عقاید میں سے ہے۔

یورپ میں دوسرے شعبہ ہائے فکر و نظر کی طرح تعلیمی نظریات میں بھی بغاوتوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ کلاسیکی روایت کے خلاف انسانیاتی تحریک (HUMANISM) کی بغاوت، اس کے خلاف عمرانیاتی پھر عام سائنسی تحریک۔ بیچ میں شوپن ہار کی خود رو رضائیت (VOLUNTARISM) اور پھر عملی تجرباتی تحریک (PRAGMATISM) غرض، اسی طرح تعلیم کبھی قومی، کبھی نسلی، کبھی علاقائی عصبیتوں سے متاثر ہوتی رہی، جس کا ایک نمایاں نقطہ وہ تھا جو اس وقت، ایک طرف روس کی منظم تدریس میں ملتا ہے اور دوسری طرف امریکہ کی "قومی بین الاقوامیت" کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

ان سب نظریات میں اصولی اختلافی مسئلے کم و بیش دو ہی ہیں اوّل یہ کہ تعلیم کا مقصود کس قسم کے انسان اور کس قسم کی سوسائٹی پیدا کرنا ہے اور دوسرا یہ کہ خدا اور انسان اور فرد و اجتماع کے باہمی روابط کیا ہیں اور تعلیم ان کی تنظیم میں کیا مدد دے سکتی ہے؟

دُنیا کے موجودہ تعلیمی افکار کے تجزیئے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت ذہنِ انسانی، انسان کی ان قسموں کے جھگڑے سے سخت تنگ آگیا ہے اور اب وہ ایک ایسے انسان کی تلاش میں ہے جو عالم ہو یا نہ ہو، نیک ضرور ہو، اور اسے اب ایک ایسے معاشرہ کی تلاش ہے، جس کی حدیں جغرافیہ نے نہیں، انسانیت نے قائم کی ہوں۔ اسی طرح انسان اب مادے کی کارفرمائیوں سے خوف زدہ ہو کر خود اپنے مستقبل کے بارے میں مشوّش ہے۔ ان حالات میں اب دنیا روحانیات اور مادیات میں مناسب پیوند اور خوشگوار توازن کی آرزومند ہے۔ وہ خاص کی بجائے عام، قومیت کی بجائے بین الاقوامیت اور عصبیت کی بجائے انسانیت کی طرف مائل ہے، اور تعلیم کو سائنس بنانے کی بجائے پھر اخلاق، دین اور فلسفہ بنانے کے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں

اسی طرح صدر امریکہ کے تعلیمی کمیشن کی اکثر سفارشات کا رخ بھی ادھر ہی ہے۔ یہاں تک کہ خود روس میں بھی جس پر جبریت کا الزام ہے (RETURN TO CULTURE) کی صدا سننے میں آرہی ہے۔ جو دراصل مادی افادیت کے ڈھیلا ہونے کی واضح علامت ہے۔

اس گفتگو سے یہ تو ظاہر ہوا کہ اس وقت تعلیم کا عام رجحان یہ ہے کہ اس میں مادی مقاصد کے ساتھ ساتھ روحانی و اخلاقی تکمیل بھی مدنظر رہنی چاہیئے۔ یہ تصور وہ ہے جو دنیا کو بڑی روحانی آزمائش اور سخت ذہنی تکلیف کے بعد اب ہاتھ آیا ہے۔ مگر یہ تصور تو وہی ہے جو مسلمانوں کی تعلیمی روایت کا ہمیشہ سے ایک اہم اصول رہا ہے ÷

پرانے نصاب و نظام پر لاکھ دوسرے اعتراضات ہوں مگر یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ یہ نصاب عملی اور سماجی علوم کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ پرانے تمام مشہور نصابوں کی اصل روح یہی رہی ہے "کہ ان سے دینی و دنیاوی اور علمی و عملی کا لفظی امتیاز مٹ کر ایک ایسا متوازن ذہن پیدا ہو جو زندگی کو وحدت بسیط کی حیثیت سے دیکھ سکے۔ غرض دین و دنیا کے درمیان توازن پیدا کرنا اور قائم رکھنا اس کا سب سے بڑا نصب العین رہا ہے!

یہ صحیح ہے کہ آج ہم پرانی تعلیم کو یک رخا اور دنیا سے ذرا ہٹا ہوا دیکھتے ہیں، مگر اس کی ذمہ داری اس تعلیم پر نہیں، قوم پر ہے یا اس دورِ غلامی پر ہے جس نے ہماری تعلیم کو دو کیمپوں میں تقسیم کر دیا تھا یعنی جدید اور قدیم یا مشرقی اور مغربی یا دینی اور دنیوی۔ یہ چیز دراصل انگریز کا دیا ہوا تحفہ ہے جسے ہم آج تک سینے سے لگائے پھرتے ہیں اگر ہماری تعلیم قدرتی ارتقائی فضا میں آگے بڑھتی تو یہ دین اور دنیا کے دو کیمپ کبھی قائم نہ ہوتے۔ کیونکہ ہمارے تصورات کی رو سے دنیا دین کے اندر ہے۔ اس سے باہر نہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے یہاں CHRISTIAN SECULARISED کی سی اصطلاحیں نہیں ملتیں ÷

بہرحال یہ دو عملی غیروں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ شبلی نے ندوۃ العلماء کی تحریک میں اس دو عملی کے خلاف آواز بلند کی تھی اور نظریہ وحدت تعلیم پر اصرار کیا تھا تاکہ عام تعلیم کے لئے دینی مدرسے اور دنیوی مدرسے الگ الگ قائم ہو کر قوم کو فکری انتشار میں مبتلا نہ کریں۔ مگر اس دور کے نقار خانے میں شبلی کی آواز طوطی کی آواز سے بھی نحیف تر ثابت ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ غلامی کے خاتمے کے بعد ہماری پاکستانی تعلیم، نظریہ وحدت تعلیم کے

اصول پر نافذ ہونا چاہیئے جس میں ملّا اور مسٹر کی یہ تقسیم باقی نہ رہے۔ اس طرح علوم دین بھی محفوظ رہیں گے اور دنیوی علوم بھی دین کے دائرے میں آ جائیں گے۔۔۔

وحدت تعلیم کا تصور ہی ہماری تعلیمی اور تہذیبی مشکلات کا حل ہے۔ اس دوعملی اور دو کیمپوں کی لڑائی سے تو باہمی نفرت اور بغض و عناد اور اس سے بھی زیادہ دو طرفہ بے علمی اور جہالت کی توسیع کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے تلخ تجربات سے فائدہ اٹھائیں اور غیروں کی نافذ کردہ اس دوعملی کا خاتمہ کر دیں۔ وحدت تعلیم کا منصوبہ صحیح بھی ہے اور قابل عمل بھی۔ مگر ہاں، اس کے لئے تعصب اور جمود دونوں کو خیر باد کہہ دینا پڑے گا۔!

مروجہ تعلیم اس معنی میں نہایت غیر قدرتی ہے کہ اس کا ذریعہ تعلیم تقریباً ایک سو سال سے ایک غیر ملکی زبان ہے جس کی مشکلات علوم کی اشاعت کے لئے سنگ راہ بنی ہوئی ہیں۔۔۔۔ بعض لوگ آج بھی اس قدرتی طریق کار کے حق میں ہیں مگر بیشتر عقلی اور عملی دلائل اس کے خلاف ہیں۔ دوعملی نے قدیم و جدید کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دی ہے کہ اب مفاہمت کے دروازے تقریباً بند ہو چکے ہیں گویا ایک ہی ملک میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں جن کی زبانیں الگ الگ ہیں اور مزاج بھی الگ الگ۔

غیر قدرتی نظام تعلیم نے ملک کی اعلیٰ اختراعی تخلیقی صلاحیتوں کو بالکل فنا کر دیا ہے۔ ہم میں آزادانہ سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی ہماری سوچ کی دنیا تنگ ہو گئی ہے۔ ہم غلامانہ تفکر کے دائرے میں قید ہو کر اس تنگی کو بھی وسعت ہی خیال کرنے لگے ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ جاپان، روس، چین بھی تو انگریزی کے بغیر جی رہے ہیں اور نظری اور تجرباتی علوم میں روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور روس کا غیر انگریزی داں سائنس داں تو اب سوئے افلاک پہنچنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ یہ سب ترقی ان ملکوں نے اس لئے کی کہ انہوں نے اپنی تعلیم و تربیت کی اساس قدرتی اصولوں پر رکھی۔۔۔۔ ہمارا تعلیمی دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے اور انسانی مسائل و معلومات کی پرپیچ وسعتوں کے ساتھ تعلیم کی تنظیم بھی اتنی پرپیچ سی شے ہو گئی ہے کہ اب اس کو کامل طور پر قدیم نظام تعلیم کے نمونے پر لانا مشکل بھی ہے اور ناقابل عمل بھی۔ مگر قدیم نظام تعلیم کا ایک اصول اور تجربہ ایسا ہے جو آج بھی قابل غور اور قابل قدر ہے۔ وہ ہے مدت تعلیم کا تجربہ۔ عام احساس یہی ہے کہ اس وقت طلباء کی عمر کا کارآمد اور پرجوش زمانہ غیر ضروری طور پر تعلیم میں صرف ہو جاتا ہے چنانچہ تکمیل کے لئے ۲۰ سے لے کر ۲۵ سال تک کی عمر درکار ہوتی ہے۔ اس طرح تکمیل کے بعد تخلیق و تحقیق اور تعلیم کے عملی استعمال کے لئے جوش عمل کا زمانہ کچھ زیادہ نہیں رہتا۔ بقول اکبر۔

مغربی کورس میں ہوتی ہے جوانی رخصت
اب تو پیری رہی رندانہ مشاغل کے لئے

شاید یہی سبب ہے کہ ہمارے ملک میں اعلیٰ ذہنی فکری اور عملی کارکردگی کی شخصی روداد اکثر تشنہ و مختصر ہی رہتی ہے۔ اور مقابلتاً جب اسلاف کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کی زندگیاں کتنی نتیجہ خیز اور بارآور ہوتی تھیں۔ چنانچہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں کثیر التصانیف مصنفوں کی بڑی کثرت دکھائی دیتی ہے، ان میں سے اکثر تصانیف معمولی رسائل تک محدود نہ تھیں بلکہ نہایت جامع، خیال انگیز اور عہد آفریں ہوتی تھیں۔

میں علی وجہ البصیرت یہ رائے رکھتا ہوں کہ موجودہ مدرسوں کے نظام کے مقابلے میں مسجدوں اور خانقاہوں کا نظام تعلیم زیادہ قابل عمل اور غایتوں کے لحاظ سے زیادہ پرمنفعت نظام تھا۔ جو کم خرچ تھا مگر زیادہ نفع کی طرف لے جاتا تھا ـــــ اب ہزارہا روپے کے خرچ کے بعد بھی نفع معدوم ہے۔ اس وقت تعلیم آزاد تھی۔ اب تعلیم مقید ہے۔ اس کی وجہ سے اب حکومتوں کو بھی طرح طرح کی پریشانیاں ہیں تعلیم کے سلسلے گراں ہو گئے ہیں اور اتنے وسیع نظام کے اخراجات حکومتوں کے بس کی بات نہیں رہی۔ لہذا جو نظام بھی نافذ ہوتے ہیں ان کے لئے نہ روپیہ ہوتا ہے۔ نہ وسائل۔ پھر کوئی ان سے پوچھے کہ صاحب! جو نظام چل نہیں سکتا اس کو محض اس وجہ سے چلائے جانا کہ امریکہ یا انگلستان میں ایسا ہی ہوتا ہے کہاں کی دانشمندی ہے۔ میرا تو نہایت سیدھا سا مشورہ یہ ہے کہ اس نقالی کو چھوڑیئے! تعلیم کو آزاد کیجئے۔ اور ارزاں بھی! وہی، بزرگوں کی سی بوریا نشینی جس کے

بغیر تعلیم اس وقت عام شہری کے لئے عذاب ہی عذاب ہے۔ یعنی یہ وہ لڈو کہ جو کھائے وہ بھی پچھتائے جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے! ان حالات میں تعلیم کو ارزاں کرنا ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

اب آپ قدرتی طور پر پوچھیں گے کہ تعلیم میں بوریا نشینی کی یہ سپرٹ عملی طور پر پیدا کرنے کی آخر کوئی تدبیر بھی تو ہو! میں عرض کرتا ہوں کہ اس کی صورت ہے تبدیلیٔ ذہن اور آزادیٔ فکر ایسی آزادیٔ فکر جو ہم میں اس شاہین کی سی جرأت پیدا کرے گی جس نے اقبال کی روایت کے مطابق پہاڑوں پر بسیرا کر لیا تھا۔ یہ جرأت سب سے پہلے قوم کو عرفانِ نفس سے بہرہ ور کرے گی۔ پھر آہستہ سے ہمارے کان میں یہ بات ڈال دے گی کہ اپنے ملک کے مسائل اپنے ملک کے وسائل کے مطابق اور ان کی روشنی میں ہی حل ہونے چاہئیں! یہی سو نصیحتوں کی ایک نصیحت ہے!

ہمارے ملک کے وسائل ہم سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہم تعلیم کا سارا بوجھ حکومت پر نہ ڈالیں اور ان ذمہ داریوں میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ میرا خیال ہے کہ تعلیم قومی زندگی کا ایک آزاد ادارہ ہے۔ اس کا بار پبلک کو برداشت کرنا چاہیئے۔ میرا یہ خیال جنرل ایجوکیشن کے بارے میں ہے۔ البتہ پیشہ ورانہ اور کارخانجات کی تعلیم یعنی ٹکنیکل تعلیم کی ذمہ داری تمام تر حکومت پر ڈالی جانی چاہیئے۔ تاکہ ملک کی ٹکنیکل ضرورتوں کی سرانجام دہی زیادہ منظم انداز میں ہو۔

دل بہشت —— بقیہ صفحہ ۲۰

منو :- ہوا سے؟ امی ذرا باہر جھانکنا۔ شاید وہ باہر کھڑا ہو۔

بیگم :- (کھڑکی سے باہر جھانکتی ہے) باہر تو کچھ بھی نہیں۔

منو :- کچھ بھی نہیں! پھر دیکھو امی۔

بیگم :- ایک تارہ ٹوٹا ہے، بس۔

منو :- (خوشی سے) امی وہی مسخرا دل بہشت ہے۔ آسمان پہ قلابازیاں کھا رہا ہے۔ وہ مسخرے پن سے باز نہیں آتا۔

بیگم :- (گھبرا کر) ڈاکٹر صاحب! کہیں بچے کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟

ڈاکٹر :- (ہنڈے پہ ہاتھ لگا کر) ابھی تپ تو ہے، مگر اب خطرہ نہیں۔

بیگم :- تو پھر یہ آپ کی دوا کی کرامت ہے۔

منو :- امی، ابا نے تو اپنا نام یونہی کرامت رکھ چھوڑا ہے، یہ ساری کرامت تو مسخرے دل بہشت کی ہے۔ (پس منظر سے مسخرے کے گانے کی آواز آہستہ آہستہ ابھرتی ہے) سنو امی، مسخرا ستاروں کو اپنا گانا سنا رہا ہے، یہ ناوہی دل بہشت کا گانا؟

(موسیقی بند ہو جاتی ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

بیگم :- ہیلو، میں بیگم کرامت بول رہی ہوں۔ جی نہیں ہمیں کسی نمبر کی ضرورت نہیں۔ جی نہیں۔ یہ غلط نمبر ہے۔

منو :- یہ غلط نمبر نہیں۔ امی بند نہ کرنا ٹیلی فون۔ یہ مسخرا دل بہشت ہوگا۔ میں نے ہی ان لوگوں کو کہا تھا کہ دل بہشت جونہی وہاں پہنچے مجھے ٹیلی فون کرے۔ یہ اسی کا فون ہے۔

بیگم :- (گھبراہٹ سے) ڈاکٹر صاحب، یہ کیا؟

ڈاکٹر :- کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ زندوں کے متعلق تو ڈاکٹروں کو علم ہوتا ہے مگر مردوں کے متعلق ہم بالکل لاعلم ہیں۔ منو آج رات موت کے منہ میں تھا۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے شاید مسخرا آیا ہی ہو۔

منو :- ڈاکٹر صاحب، آپ دل بہشت کو بتا دیں۔ میں اب اچھا ہوں۔

ڈاکٹر :- (ٹیلیفون سے) کہ منو اب اچھا ہے۔ دل بہشت ہم تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولیں گے۔ بہشت والوں کو ہمارا سلام کہنا۔ تم جہاں رہو خوش رہو۔ اچھا خدا حافظ!

(پردہ)

"ماہ نو"

میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

۱- "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

۲- مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لیے کسی اور رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

۳- ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

۴- ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵- مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶- ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

م، خ

نقد و نظر

از قتیل شفائی

روزن ناشر: ادارۂ فروغ اردو، لاہور
صفحات ۱۲۸، قیمت تین روپے

قتیل شفائی کا کلام سادگی و پرکاری کے دوگونہ کیف کا حامل ہے۔ اس کے یہاں ہلکے پھلکے مدھر الفاظ میں احساس کی دھیمی دھیمی آنچ ایک سہانی سی لو پیدا کرتی ہے جو اپنی جھلملاہٹ میں ایک سیمابی کیفیت لئے ہوئے ہے۔ اس کی نے ہلکی ہلکی، منجھی ہوئی نے ہے جس میں صرف ایک اندیشہ ہے۔ کہیں یہ زیادہ ہلکی نہ ہو جائے۔ اس کے لئے صرف شاعر کا وہی شعور ہی ضمانت ہو سکتا ہے۔

قتیل کا میلان تصور سے حقیقت کی طرف ہے۔ وہ اپنے "آئینۂ فکر" میں "جلوۂ بیدار" یعنی زندگی کی اصلیتوں کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں مثلاً ناداری، ناانصافی، صنف نازک پر سماج کا ظلم ناروا جس سے شاعر فلمی دنیا کی شاید زندگی سے قریب ہونے کے سبب زیادہ متاثر ہے۔ "رگ سنبل ہوا، ترم آہو" ان میں رومان اور حقیقت دونوں کی لہریں آمیز ہیں کیونکہ شاعر کے اپنے ضمیر میں ان کا وجدانی طور پر سنگم ہے۔ وہ اپنے احساس کو ایک پھیلے ہوئے انکشاف کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے جس کا نتیجہ ایمائیت کے مقابلہ میں شرح و بیاں ہے — میانہ روی سے کچھ آگے بڑھ کر اقدام فکر و احساس کے ساتھ ساتھ شعری سانچوں میں بھی نمایاں ہے جن میں شاعر ذرا ذرا سی لوچ لچک بڑھا کر تماشی طرحیں پیدا کرتا ہے۔

"خم کاکل" از: سیف الدین سیف
ناشر: مکتبۂ کارواں۔ لاہور
صفحات ۲۰۸، قیمت ۴ روپے

یہ مجموعہ سیف کی شعری کوششوں کا اولیں سرمایہ ہے جن میں ایک نازک کیف کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں اترنے والا سوز و گداز بھی ہے۔ اسی سے ان کے ساز سخن کے تاروں سے ایسی ہلکی ہلکی نوائیں اٹھتی ہیں جو کسی کے اشک کے قافلہ کے لئے بانگ درا ہیں۔ ان میں شاعر کا رچا ہوا احساس خود بخود بڑی بے تکلفی کے ساتھ رومان کے سانچوں میں ڈھل جاتا ہے۔ اور "خم کاکل" میں اندیشہائے دور و دراز "مثلاً آشوب دہر، گردش روزگار وغیرہ کو کھو دیتا ہے یا دانستہ تو ہے مگر ہلکا ہلکا، دھیما دھیما۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے ان کی روح تغزل ہی ہے اور اندیشہ ہائے دور و دراز نے خم کاکل یعنی غزل کی روایتی زبان کا سایہ اس قدر گہرا ہے کہ مجموعی طور پر یہی نمایاں رہتا ہے۔ گویا غزلیں تمام تر غزلیں ہی ہیں ان میں زندگی کی اصلیتوں کی جھلکیاں ہیں بھی تو بے حد دبی دبی۔ غزلیں ہوں یا دیگر اصناف، اس مجموعے میں ان سب کا رنگ یکساں ہے۔ ان پر ایک ہلکے ہلکے، منجھے ہوئے بیان کی جھلملاہٹ چھائی ہوئی ہے جس کو سلاست کہتے ہیں۔ اس میں ایک بڑا اندیشہ یہ ہے کہ کہیں اس کا "ملمع" دوسری خوبیوں کو گہنا نہ دے۔ سیف کی شاعری میں یہ اندیشہ ہر کہیں دامنگیر ہے۔

انتخابات

انتخاب سودا: ثاقب کانپوری
ناشر: اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی
انتخاب ناسخ، آتش، ذوق: سید مرتضیٰ حسین فاضل
ناشر: کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور

شعرا کا انتخاب کلام ان کے دل و دماغ اور امتیازی خصوصیات کو واضح کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ ہمارے قدیم شعرا کے ضخیم کلیات کمیاب نہ ہوں تو بھی ان کا مطالعہ کارے دارد کا مصداق ہے۔ اور آشوب نظر کے علاوہ درد سر سے بھی خالی نہیں۔ لہٰذا ان کا انتخاب اور بھی ضروری ہے۔ اگر انتخاب موزوں ہوا اور پیشکش بھی مناسب تو انتخاب کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ ہمارے بعض ناشروں نے حال ہی میں اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کے نتیجے میں چند نامور شعرا مثلاً سودا، ناسخ، آتش، ذوق وغیرہ کے انتخابات شائع ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان سے وہ مقاصد ایک حد تک حاصل ہو جاتے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، لیکن انتخاب اور پیشکش کے حقیقی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اس سلسلہ میں جہاں یہ ضروری ہے کہ انتخاب رطب و یابس سے پاک ہو، وہاں یہ بھی لازم ہے کہ اشعار واقعی چیدہ، قابل لحاظ اور کسی اہم خصوصیت کے عکاس ہوں۔ مقدمہ میں ایسی ہی نادر خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہو جو مبصر نے بالواسطہ یا بلاواسطہ مشاہدہ کی ہوں۔ ذاتی مشاہدات کی نشاندہی خصوصاً زیادہ ضروری ہے تاکہ روایتی آراء کو دہرانے کی بجائے تازہ نگاہی کا احساس پیدا ہو۔

ان انتخابات میں زیادہ تر روایتی پہلو ہی پر زور دیا گیا ہے۔ البتہ "انتخاب سودا" میں بعض نئے اشارات جھلکتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ اس سلسلہ کو اور بھی آگے بڑھایا جائے۔ انتخاب برجستہ بھی ہو اور نمائندہ بھی۔ فنی و معنوی قدروں کا زیادہ سکّی تجزیہ کیا جائے۔ عمومی فیصلوں سے پرہیز کیا جائے اور نتائج کے استنباط میں زیادہ احتیاط برتی جائے۔ موجودہ انتخابات میں کئی اشعار کی اہمیت محل نظر ہے۔ اس طرح انتخاب کی خوشگواری میں فرق آجاتا ہے اور بڑی حد تک انتخاب کا مدعا ہی فوت ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ ہم شاعر کے کلام کا زیادہ ذوق و شوق سے مطالعہ کریں اور اس کے خد و خال کو زیادہ آسانی اور وضاحت سے بھانپ سکیں ۔

اردو رسم خط اور طباعت

از پروفیسر ہارون خان شروانی
ناشر: اہتمام مطبوعات، سعود منزل حمایت نگر، حیدرآباد (دکن)
صفحات ۸۲، قیمت دو روپے

اردو کا مروجہ رسم خط اور طباعت بلاشبہ جدید ضروریات کے لئے موزوں نہیں کیونکہ یہ اتنا لچکدار نہیں کہ دور حاضر کے گوناگوں تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ یہ احساس اقوام مغرب کے آتے ہی پیدا ہو گیا تھا جبکہ جدید سائنسی دریافتوں اور مشینی ایجادات نے پرانے نظام کے بہت سے جامد لوازمات کو بے کار کر دیا تھا۔ چنانچہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اکثر ممالک نے اپنے رسم خط اور طباعت دونوں کو یک قلم تبدیل کر دیا ہے۔ ہمارے یہاں ان کا مسئلہ ابھی تک محل نظر ہے۔ اور کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے کے لئے ایسے مقالات کی اشد ضرورت ہے جو اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں۔ اس کتاب میں یہ ضرورت کافی حد تک پوری ہو گئی ہے اور مختلف کوائف اور حقائق کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ لیتھو اور نستعلیق کو فوراً خیرباد کہہ کر نسخ ٹائپ کو رواج دیا جائے جو مراکو سے ملایا تک پھیلا ہوا ہے اور ہر اعتبار سے نہایت موزوں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اعلیٰ علمی و ادبی کتابیں اصلاح شدہ رومن خط میں شائع کی جائیں۔ یہ نتائج نہ صرف قابل توجہ بلکہ نسخ کی حد تک بالعموم قابل قبول بھی ہیں۔ کتاب میں توضیح و تشریح کے سلسلہ میں بہت سی نادر معلومات بھی بہم پہنچائی گئی ہیں جو اس کی افادیت میں اور بھی اضافہ کرتی ہیں۔

بلّو کا بستہ اور دوسری نظمیں

از: ابن انشا
ناشر: لاہور اکیڈمی، سرکلر روڈ، لاہور
صفحات ۶۰، قیمت ایک روپیہ
سرورق رنگین اور دلچسپ خاکوں سے مزین

یہ ہماری زبان میں اپنی قسم کی پہلی اور بڑی دلچسپ چیز ہے۔ یعنی انگریزی کے نمونہ پر بچّوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نظمیں جو ان ننھے ننھے شوقینوں کی نظر میں پیاری ہوتے ہوئے ان کے دلوں کو بھی پیاری ہیں۔ ہر صفحہ بڑے مزیدار خاکوں سے آراستہ ہے اور بچوں کی جیتی دنیا کا بڑا کرارا منظر پیش کرتا ہے۔ بچوں کی ذہنی نشو و نما کے لئے ایسی نظمیں بڑی مفید ہیں۔

رسید کتب

انقلابِ مصر	محمد حسن الاعظمی	مکتبۂ اعظمیہ بالمقابل گاندھی گارڈن۔ کراچی۔
آئینۂ دلدار	محمد ابرار علی صدیقی	افسر بکڈپو، سنٹرل جیکب لائن کراچی
سفرِ چین	عبدالقدوس ہاشمی	مکتبۂ مہر نیمروز، کراچی
بنگلہ تعلیم	رفیع احمد فدائی	رائٹرس پبلی کیشنز، ڈھاکہ
اردو کی فریاد	داؤد سعیدی	انجمن ترقی اردو، شاخ ٹنڈو آدم
اسلامی نظام تعلیم	سعید احمد رفیق	ادارۂ تصنیف و تالیف، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی
جرم و سزا	کمال احمد رضوی	غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور
انتخاب غالب	ممتاز حسین	اردو اکیڈمی۔ سندھ، کراچی
امید	مترجمہ نظیر صدیقی	مکتبۂ کارواں۔ لاہور
چاند گہن	انتظار حسین	″ ″ ″
فکر و نظر	رفیع اللہ عنایتی	سائنٹفک سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
سالنامہ نئی قدریں		پوسٹ بکس [illegible]۔ حیدرآباد
کانسٹی ٹیوشنل لا اِن اسلام	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	فصیح برادرز۔ "الریاض" حیدرگوڑہ حیدرآباد انڈیا

ہماری ڈاک

مدیر محترم — کل ایک جوابی مضمون بھیجنے کے بعد ایک خبر کا تراشہ کھانوں میں مل گیا۔ براہ مہربانی اسے بھی موقع دیکھ کر اسی مضمون میں کہیں شامل کر دیجئے یا اسے الگ ہی شائع کر دیجئے۔ (ابوالجلال ندوی)

(ہم درست ہم اس تراشے کو شائع کر رہے ہیں۔ مدیر)

"مدراس سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر لوتھل میں جو آثار کاوی ہوئی ہے اور پڑوس ہی کے علاقے رنگپور میں جو انکشافات ہوئے ہیں انہوں نے غیر مشتبہ طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ہڑپا کی ثقافت جنوب مشرق میں وادیٔ مہران کے حدود سے بہت دور بمبئی کے شمالی مبلغ تک پھیلی ہوئی تھی۔" اس سے ایک ہندی محقق نے یہ نتائج اخذ کئے ہیں کہ سوراشٹر کا ساحلی مقام لوتھل ایک اہم اور نہایت سرگرم بندرگاہ تھا اور موئن جو ڈرو اور ہڑپا کے ساتھ وسیع تجارتی رابطہ رکھتا تھا۔ یہاں کی مہریں رگ ویدی تصورات کو منعکس کرتی ہیں۔ دونوں مقاموں کی مہروں میں کامل مماثلت ہے۔ لوتھل میں سَو سے زیادہ سندھی جیسی مہریں اور ٹھپے ملے ہیں جن پر جانوروں کی صورتیں اور سندھی رسم خط کے نوشتے ہیں۔ (۲۰۰۰) — (۱۵۰۰) ق م کے دوران یہاں کی آبادی سراسر ہڑپا والوں جیسی تھی۔ رنگپور کے انکشافات نے (۲۰۰۰) ق م سے (۸۰۰) ق م تک کی تاریخ ہند پر نئی روشنی ڈالی ہے۔ اس زمانہ میں کلچر کا تسلسل برابر قائم رہا۔ یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ اس کے نابود ہو جانے کا سبب ایک تباہ کن سیلاب تھا۔ گجرات، سوراشٹرا اور کچھ میں جا بجا ہڑپائی نوآبادیوں کا نشان ملا ہے۔"

اب ہماری سنئے۔ ہو سکتا ہے کہ لوتھل والے اور رنگپور والے مہاجرین سندھ ہوں جو آریوں کے ورود کے بعد بے وطن ہو کر یہاں آ رہے۔ تجارت تو اس وقت مانی جا سکتی ہے جب لوتھل میں صرف ہڑپا اور ہڑپا میں لوتھل کی ساخت کی چیزیں ملیں۔ کیا سائیہ لوگ آریوں کے ستائے ہوئے لوگ تھے جو یہاں آ بسے تھے۔ پھر ان کو یہاں سے بھی ماتو اور جنوب، مشرق یا مغرب میں پناہ کے لئے بھاگنا پڑا۔ اگر ہڑپا اور لوتھل کی مہروں میں کامل مماثلت ہے تو یہ ویدک تصورات کو منعکس نہیں کرتیں۔ اگر یہ مذکورہ بالا زمانہ کی ہیں تو ان کا اندازِ تحریر اس قسم کا ہونا چاہیئے:

ПΥΥW(ΙΙ)ƲƲΟ≺ ‡(ΟΟΠ)Υ)3Υ)ΠΙΙΙ

اگر ان پر تمثالی قسم کے نوشتے ہیں تو ان کا زمانہ (۲۰۰۰) ق م سے پہلے ہونا چاہیئے۔ یہ نوشتہ سندھی نوشتوں کے حروف اور چند الفاظ کو لے کر بنایا گیا ہے۔ مقصد یہ دکھانا ہے کہ ۸۰۰ ق م کے نوشتے ایسے ہوں گے۔ ممکن ہے لوتھل میں ایسے نوشتے مل جائیں جو میرے اس خیال کو ثابت کر دیں کہ (۷۰۰) اور (۵۰۰) ق م یا (سنہ ۱۲۰۰) اور (سنہ ۱۱۰۰) ق م کے درمیان جب افغانستان، ایران اور جنوبی عراق سے آریوں کے ریلے آگے آگے، پیچھے خاکستر لئے داخل پنجاب و سندھ ہوئے تو کچھ لوگ مشرق کی طرف پانی پت تک بھاگے۔ پانی پت کے نام سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کیونکہ موئن جو ڈرو کی ایک قوم کا نام پنؔ یا پانؔ تھا جسے یہاں سے جلا وطن کیا گیا تھا۔ کچھ لوگ جنوب کی طرف بھاگے جن کا محل معلوم نہ تھا۔ یہ اس خبر سے معلوم ہو گیا۔

ان وجوہ سے جناب عین الحق فرید کوٹی صاحب (جن کا مراسلہ "ماہ نو" بابت ستمبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا) کو یقین کر لینا چاہیئے کہ لوتھل اور رنگپور کا جو زمانہ مقرر کیا گیا ہے اگر وہ صحیح ہے تو اب سنسکرت رسم خط تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ (۸۰۰) ق م تک سندھی رسم خط مستعمل تھا۔ اس لئے اس کی بجائے ان مہروں کے عکس حاصل کئے جائیں تو بہتر ہوگا۔

افسوس! میں نے یہ مہریں نہیں دیکھیں اور نہ ان کو حاصل کرنے کی توفیق ہی رکھتا ہوں۔ ورنہ بہت ممکن ہے یہاں کچھ تاریخی نوعیت کی مہریں مل جائیں۔ پاکستان میں جو لوگ اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں چاہیئے کہ کم از کم ان کے عکس حاصل کر لیں۔ پھر شاید کوئی ان کو پڑھ سکے۔

سندھی رسم الخط کے ارتقا کے وجود سے اگرچہ قطعی انکار کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ بالکل برعکس ہے۔ (ابوالجلال ندوی)

سیدھی پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے ننھے بچّہ کو
یہ خالص دودھ دیجئے
OSTERMILK
MODIFIED MILK FOOD FOR INFANT FEEDING

دو اُستادوں کی کہانی

بہتر نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں — بشرطیکہ آپ تندرست ہوں

۱ "اُستاد کا کام بڑا ہی صبر آزما اور مشکل ہوتا ہے۔" عابد نے کہا "بچوں کی صحیح رہنمائی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُستاد پوری طرح صحتمند ہو۔"

۱ آصف کو بچوں کا پڑھانا بڑی جانفشانی کا کام معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے "میں بچوں کو صحیح طور پر تعلیم نہیں دے سکتا اسی لئے نتائج اتنے خراب نکلتے ہیں"

۲ عابد ہمیشہ تندرست و چست رہتا ہے۔ وہ اپنے کام سے دلچسپی لیتا ہے۔ اُسکی خواہش ہے کہ وہ بچوں کو تعلیم میں ترقی کرتے دیکھے۔

۲ آصف "کافی تندرست" نہیں ہے۔ وہ اکثر ملیریا میں مبتلا ہو کر بستر پر پڑا رہتا ہے۔

۳ عابد کی تندرستی کوئی معجزہ نہیں۔ وہ اپنی صحت کی بڑی خبر گیری کرتا ہے۔ وہ باقاعدہ 'پیلوڈرین' استعمال کر کے ملیریا سے اپنی حفاظت کرتا ہے۔

۳ آصف نے غفلت سے کام لیا۔ اگر وہ باقاعدہ 'پیلوڈرین' استعمال کرتا تو ملیریا سے محفوظ رہتا اور بچوں کو اچھی طرح تعلیم دینے کے لئے کافی تندرست ہوتا۔

دور اندیشی اور دانشمندی سے کام لیجئے۔ یاد رکھئے ہفتہ میں صرف ایکبار 'پیلوڈرین' کی ایک ٹکیہ کے باقاعدہ استعمال سے آپ ملیریا سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔
پیلوڈرین ہمیشہ کھانا کھانے کے بعد ایک گلاس پانی کے ساتھ استعمال کیجئے۔

بلاشبہ تمام ہوابازوں کے چہروں سے تجربہ کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔

اور یہ تجربہ سالہا سال سات آسمانوں اور سات سمندروں کے درمیان فضا میں پرواز کرتے ہوئے موسمی کیفیات کو بغور دیکھنے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

جب آپ طیارے میں سفر کرتے ہیں تو اپنے ہواباز کے چہرے پر آپ اسی تجربہ کی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی ایک بہت بڑی وجہ ہے کہ اکثر لوگ جب کہیں ہوائی جہاز پر سفر کرنا چاہتے ہیں تو وہ پین امریکن ہی کو منتخب کرتے ہیں کیونکہ ہر کلپر طیارے کے ڈیک پر، سمندروں پر پرواز کا تجربہ رکھنے والے کم از کم تین ایسے قابل ہواباز موجود ہوتے ہیں جن کو دنیا میں ہوابازی کے صحیح اور ٹھوس معیار کے مطابق ٹریننگ دی گئی ہے۔

پرواز کے دوران ہر کلپر طیارہ ہوابازی کے ان ماہرین کی نگرانی میں رہتا ہے جو زمین پر تعینات ہیں اور جن کا زبردست امدادی عملہ دُنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ پین امریکن کے ایسے ماہرین کی تعداد ۱۷۶۰۰ ہے۔

آسمان میں ہوں یا زمین پر، یہی وہ لوگ ہیں جن کی مسلسل کوششوں سے ریاستہائے متحدہ یا ہمارے عالمگیر سسٹم کے ۸۱ ممالک (جن میں ہمارے چھ سو سے زائد دفاتر موجود ہیں) میں سے کسی بھی ملک کو جانے والی ہر سروس نہ صرف تیز پرواز ہے بلکہ اس کی ایک جگہ سے دوسری جگہ متعدد بار آمد و رفت بھی ممکن ہوگئی ہے۔

یاد رکھئے جب آپ پین امریکن کے طیارے میں سفر کرتے ہیں تو گویا آپ ایک ایسی واحد ایرلائن سے سفر کرتے ہیں جس نے بحرِ اوقیانوس کو ساٹھ ہزار بار عبور کیا ہے۔

نشست مخصوص کرانے کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ سے بات چیت کیجئے یا اس پتہ پر پین امریکن سے معلومات حاصل کیجئے۔

ماہر ہواباز جان ییٹس جو ایک کلپر کپتان ہیں اور جنھوں نے ۵۰۰ سے زیادہ مرتبہ بحرِ اوقیانوس کو عبور کیا ہے۔

PAN AMERICAN

کراچی: وکٹوریا روڈ، ٹیلیفون نمبر ۵۰۲۸۱

• ٹریڈ مارک پین امریکن ورلڈ ایرویز انکارپوریٹڈ

دنیا کی سب سے زیادہ تجربہ کار ایرلائن

PAA 910

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

۱ ۔ ہزایکسیلنسی مسٹر محمد ہاشم خان میوندوال سفیر افغانستان، صدر پاکستان کے سامنے اسناد سفارت پیش کر رہے ہیں

۲ ۔ وزیر اعظم پاکستان کا پشاور میں اجتماع سے خطاب

۳ ۔ دولت مشترکہ کی پارلیمنٹری ایسوسی ایشن کے اراکین غلام محمد بیراج ملاحظہ فرما رہے ہیں

۴ ۔ پاکستان میں رہن سہن کا معیار بلند کرنے کی تحریک (لانڈھی میں مہاجرین کی بہبود کا مرکز)
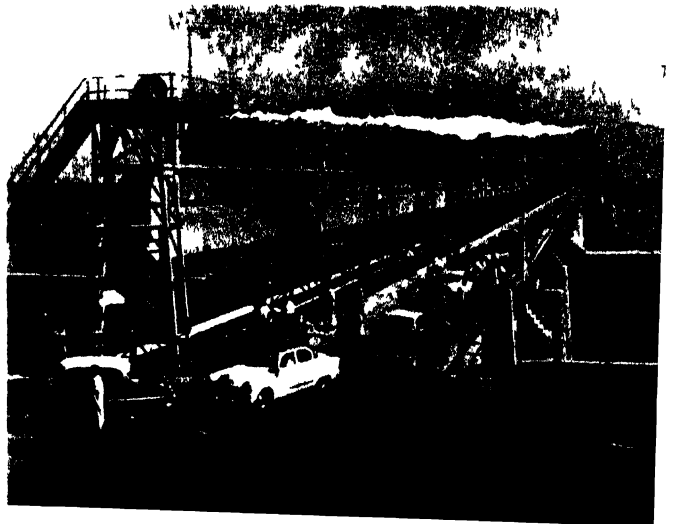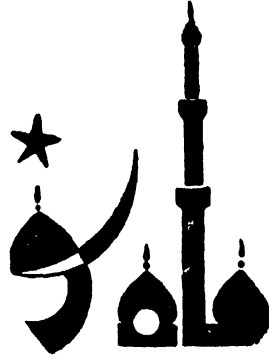
جمہوریت نمبر مارچ ۱۹۵۸ء

جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی دوسری سالگرہ پر

ایک یادگار پیشکش

''جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش،،

''ماہ نو'' گزشتہ دس سال سے برابر ہماری حیات ملیہ کی عکاسی اور

ہرجہتی ترقیات کا سرحاصل جائزہ پیش کرتا رہا ہے۔

یہ علوم و معارف کا بہترین مخزن اور ثقافتی سرگرمیوں کا شاندار مرقع ہے

یہ ادب و فن کے تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو مظاہر کو بروئے کار لا کر

دل و دماغ کو نئی نئی جولانگاہیں مہیا کرتا ہے۔

یہ بیک وقت ناظر بھی ہے اور مبصر بھی ـــ اس کے دامن میں ماضی و حال کے

نظرفریب جلوے بھی ہیں اور مستقبل کی سحرآفریں جھلکیاں بھی۔

جمہوریہ نمبر ـ اس کا سالانہ شمارۂ خاص ہے

جو پاک و ہند کے بہترین ارباب قلم کے جواہرپاروں سے مالامال اور متعدد دیدہ زیب

رنگین و سادہ تصاویر سے آراستہ ہوکر اپنی امتیازی خصوصیات کے ساتھ

پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوگا

سرورق: ـ فنی محاسن اور تخلیقی ندرتکاریوں کا شاہکار

ایجنٹ و مشتہرین حضرات: سالنامہ کی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں اور

استہارات کی بکنگ کے لئے فی‌الفور متوجہ ہوں *

ادارۂ مطبوعات پاکستان ـ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی
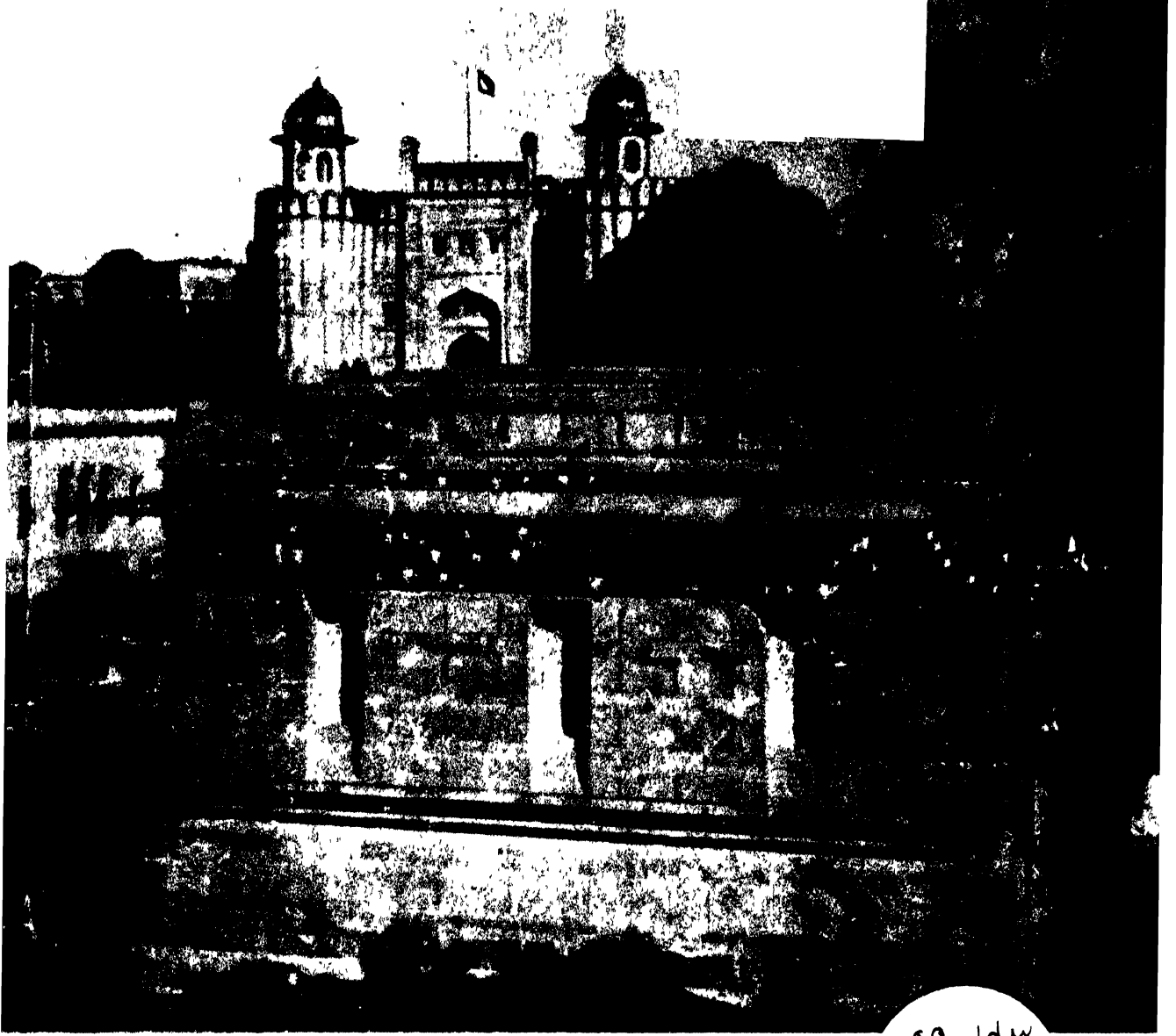
ماہ نو

اپریل ۱۹۵۸ء

ڈاکٹر میری شیمل　حجاب امتیاز علی　نظر حیدرآبادی　اختر ہوشیارپوری

سید عبدالواحد　جمیل الدین عالی　اے۔ شمسی　ضمیر اظہر

اللہ بخش راحوت　عنایت اللہ　جمیل نقوی　ثروت
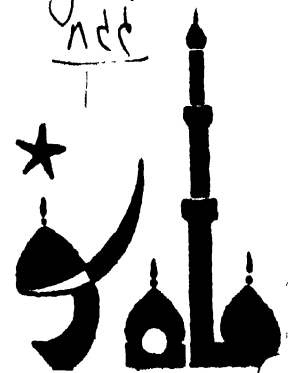
ہزار برکت ہے!
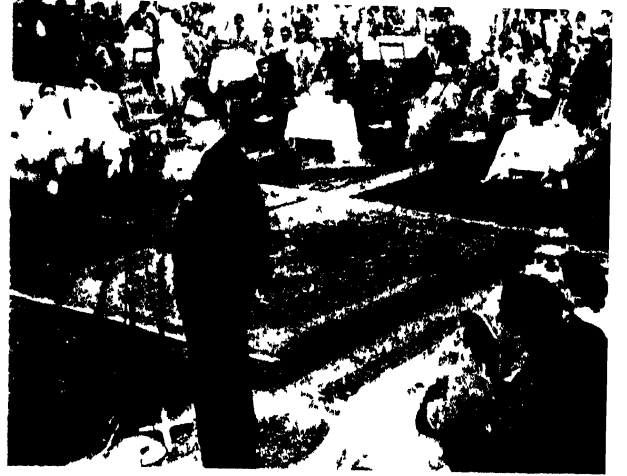
رمضان کے بابرکت مہینے میں صحت اور تندرستی کے لئے زیادہ احتیاط لازم ہے تاکہ ہم اس اہم فرض کو بخوبی انجام دے سکیں۔

سال بھر میں ایک مرتبہ تزکیۂ نفس کے لئے یہ مقدس اور متبرک ۳۰ دن میسّر آتے ہیں۔ اِن دنوں ہم اپنے اخلاق اور روح کی پاکیزگی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ حقیقتاً رحمتوں کا مہینہ ہے، بے جا مشقت کا نہیں۔

سِنکارا کا استعمال یوں تو ہر موسم میں فائدہ بخش ہے لیکن رمضان میں یہ ہزار نعمت کے برابر ہے۔ اِس قوت بخش ٹانک کے استعمال سے آپ دن بھر تر و تازہ اور چاق و چوبند رہیں گے۔ جسمانی توانائی کے لئے ضروری اور مفید نمکیات، حیاتین اور جڑی بوٹیوں کے جوہروں کا یہ نادر مرکّب دِل و دماغ اور جسم کو تقویت دے کر عام تندرستی قائم رکھنے اور بحال کرنے میں بے مثل ہے۔

سِنکارا کی خوراک ڈیڑھ بڑا چمچہ ہے جسے آپ ہر روز سحر اور رات کے وقت کھانے سے پہلے یا بعد استعمال کریں تو جسم کو ضروری غذائی اجزاء اور وٹامنز ملتے رہیں گے اور قوتِ برداشت پیدا ہوگی، جس سے آپ رمضان کے تمام دن ہنسی خوشی گذاریں گے۔

ہمدرد

حیاتین آمیز

سِنکارا

رمضان میں جس کا استعمال نہایت ضروری ہے

HC-1 UNITED
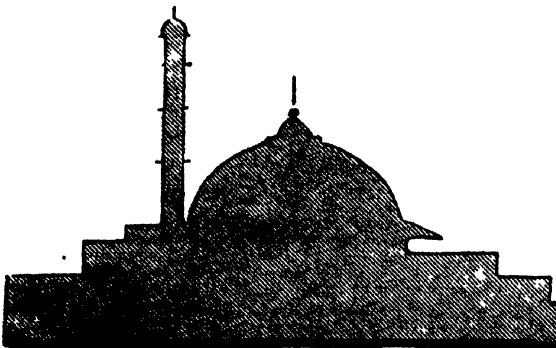
"لکس کا سفید رنگ اس کے
خالص ہونیکا ثبوت ہے"
ثمر - کہتی ہے
"اسی لئے میں ہمیشہ
لکس ٹائیلٹ صابن
استعمال کرتی ہوں۔۔
LUX
TOILET SOAP
فلمی ستاروں کا سفید
اور خوشبودار
حسن بخش صابن
LTS 20—193 UD

Eagle
VANASPATI
ایگل وناسپتی
نئی پود کیلئے
منصوبہ
بنائیے
اچھی صحت کیلئے وٹامینز (حیاتین) کی ضرورت
ہوتی ہے۔ ایگل وناسپتی استعمال کیجئے
اسمیں وٹامن اے اور ڈی شامل ہوتا ہے
ملک کی نئی نسل کی صحت بہتر بنائیے اور
جسم کی نشوونما میں مدد دیجئے
ایک اچھوتا وناسپتی
تیار کنندگان:
مقبول کمپنی لمیٹڈ

وہ دن جب ہواباز کی دُنیا آپ کی ہو جاتی ہے

دُنیا کا ایسا کوئی گوشہ نہیں جس سے وہ آشنا نہ ہو۔ اُس نے غروبِ آفتاب کے ایسے حسین مناظر دیکھے ہیں جن کی تصویر کشی کوئی مصور نہیں کر سکتا۔ اُس نے سحر کو سمندروں اور کرۂ ارض پر آہستہ آہستہ نمودار ہوتے دیکھا ہے۔ اسکے دِل میں ایک خود شناس انسان کا جذبۂ یقین و اعتماد موجود ہے۔ وہ نہایت طاقتور کلپر* طیارے کا ماہر ہواباز ہے۔

جب آپ کا طیارہ بحرِ اوقیانوس پر بلند پرواز کر رہا ہوتا ہے تو آپکے کلپر کپتان کے لئے یہ بات فخر و مسرت کا باعث ہوتی ہے کہ اُسکی دُنیا میں آپ بھی اُس کے شریک ہیں وہ آپ کی میزبانی کے فرائض اُسی ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتا ہے جس طرح وہ اپنے طیارے کے کل پُرزوں کو ماہرانہ طریقہ پر قابو میں رکھتا ہے۔ جب کپتان ذرا سستانے کے لئے مسافروں میں آبیٹھتا ہے تو طیارے کے ڈیک پر دوسرے تربیت یافتہ کلپر ہواباز موجود ہوتے ہیں (سمندر پر پرواز کرنے والے ہر طیارے پر کم از کم چار ہواباز ہوتے ہیں) وہ اُس کی جگہ پر کام کرنے لگتے ہیں۔

پین امریکن کے ۲۰۰ سے زائد ہوابازوں میں سے ہر ایک دس لاکھ میل سے بھی زائد مرتبہ پرواز کر چکا ہے اور ۱۵۰ ہواباز تو تیس لاکھ میل سے بھی زائد مرتبہ پرواز کر چکے ہیں۔ اُنکے تجربات آپکے لئے ایک بہترین تحفہ ہیں۔ کلپر کے لئے فوری طور پر نشست مخصوص کرانے کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ سے ملئے یا اس پتہ پر پین امریکن سے گفتگو کیجئے:۔

کراچی: ہوٹل میٹروپول ٹیلیفون نمبر 90281

PAN AMERICAN

دُنیا کی سب سے زیادہ تجربہ کار ایرلائن۔

پین امریکن ورلڈ ایرویز۔ انکارپوریٹڈ
(انکارپوریٹڈ اِن دی یو۔ ایس۔ اے۔ کمپنی کے ممبران کی ذمہ داری محدود ہے)
* ٹریڈ مارک رجسٹرڈ یو۔ ایس۔ پیٹنٹ آفس

0AA 2 3 2 J.W.T

ماہِ نو

جلد ۱۱ —— شمارہ ۱

اپریل ۱۹۵۸ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی ۸ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

اداریہ: آپس کی باتیں

بہ یادِ اقبال: اقبال اور ملٹن — سید عبدالواحد — ۷

منصور حلاج: اقبال کی نظر میں — ڈاکٹر میری این شیمل — ۱۲

عشق، دمِ جبرئیل — ریاض الدین قیصر زیدی — ۱۶

لسان العصر (اقبال کا ایک ہم عصر و ہمنوا) — ثروت یاسمین — ۱۹

نظمیں: فیضِ دوام (نظم) — رشید اگجراتی — ۲۱

رقیبِ سروساماں! (نظم) — جمیل نقوی — ۲۲

طلسمِ خواب (نظم) — شہاب رفعت — ۲۳

فن: شاکر علی — اے۔ شمسی — ۵۰

ثقافت: کوٹ ڈیجی — اللہ بخش راجپوت — ۲۴

افسانے: وہ گرپڑا — حجاب امتیاز علی — ۲۹

چمن میں آگ لگی! — محمد احمد حامی — ۳۲

پیچ و خم — عنایت اللہ — ۳۸

سورج مکھی! (اوّلیں افسانہ) — عذرا حسنین — ۴۵

غزلیں: جمیل الدین عالی • اختر ہوشیارپوری — ۴۷

ضمیر اظہر • نظر حیدرآبادی — ۴۸

طلعت اشارت • مشتاق مبارک — ۴۹

مصور فیچر: بچت میں برکت — ۵۷

آپس کی باتیں

اقبالؒ نے جس فکرِ نو کی بنیاد رکھی اس کا آفاقی ہونا لازم تھا۔ کیونکہ اس کی حیثیت شروع ہی سے بنیادی تھی۔ وہ جس زمانے میں پیدا ہوئے اس میں مشرق و مغرب کے تصوّرات اور تہذیبی دھارے آپس میں گھل مل رہے تھے۔ اقبال نے ان کا بھرپور جائزہ لیا اور اسی کی بناء پر ایک وسیع تر نظامِ فکر کی تشکیل کی۔ اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے عہد سے بہت آگے تھے۔ اپنے ہی الفاظ میں وہ "—— بہ شہرِ خود غریب" کا مصداق تھے۔ اسی لئے ابتدا میں اپنے ملک میں بھی اُن کی نوائے راز کو نہ سمجھا سکا۔ وہ بھری انجمن میں تنہا تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے کتنے ہی ہمنوا پیدا ہو گئے۔ اور ہند و عراق و عرب و شام سے قطع نظر یورپ بھی ان کے حدی خوانوں سے خالی نہ رہا۔ اور آج مشرق کی طرح مغرب بھی ان کی فضیلت کے اعتراف میں پیش پیش ہے۔ بعض دانشورانِ مغرب کو اقبالیات سے خاص شغف ہے۔ انہی میں سے ایک نامور جرمن خاتون ڈاکٹر میری این شیمل ہیں جو پچھلے دنوں پاکستان تشریف لائی تھیں اور انہوں نے متعدد فاضلانہ مقالات پڑھ کر اقبال پر بسیط روشنی ڈالی تھی۔ ہم اُن کا ایک مقالہ اس شمارہ میں پیش کر رہے ہیں۔ جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ آج مغرب کی بہترین شخصیتیں اقبال کو کس نظر سے دیکھتی ہیں۔

جس طرح مسیحیت اور اسلام میں کئی باتیں مشترک ہیں اسی طرح ان کے نمائندوں ملٹن اور اقبال میں بھی کئی باتیں مشابہ ہیں۔ اس موضوع پر جو مقالہ پیش کیا جا رہا ہے اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ مشرق و مغرب کے فکر کی راہیں کہاں کہاں ملتی اور کہاں کہاں جدا ہوتی ہیں۔ اور اقبال نے عالمی افکار کا سلسلہ کس حد تک آگے بڑھایا ہے۔

مقامی شعراء میں اکبر کا نقطۂ نظر اقبال کے نقطۂ نظر سے بظاہر کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو در اصل اس کے ساتھ موافقت رکھتا ہے۔ یہ حقیقت اس شمارہ کے ایک اور مضمون "لسان العصر" سے بخوبی نمایاں ہو جاتی ہے۔

★

مولانا ابو الکلام آزاد کی وفات سے عہدِ اکبر و اقبال کی ایک اور جید شخصیت نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ ابو الکلام بحیثیت سیاستدان فوت ہو چکے ہیں مگر وہ مردِ مومن جس نے ۱۹ برس کی عمر میں اسلامیات اور اردو صحافت میں انقلاب برپا کر دیا تھا بدستور زندہ ہے۔ اور ہم ایک عظیم صحافی، نامور انشاء پرداز اور مفسّرِ قرآن کی حیثیت سے ہمیشہ اُن کی قدر و منزلت کرتے رہیں گے۔ اپنے ہمعصروں کی طرح ان کا مطمحِ نظر بھی ماضی کی بازیافت یا احیاءِ دین ہی تھا۔ اور انہوں نے گیسوئے اردو اور گیسوئے ملّت کی جو شانہ آرائی کی ہے، اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

★

پاکستان کے ہر شعبہ میں ترقی کے لئے جو سعئ بلیغ کی جا رہی ہے اس کی ایک عمدہ مثال آثارِ قدیمہ کی تحقیق و دریافت ہے۔ جس کا آغاز قیامِ پاکستان کے جلد ہی بعد ہو گیا تھا۔ چنانچہ مغربی و مشرقی پاکستان میں کئی مقامات پر بڑے اہم انکشافات ہوئے ہیں۔ اب کوٹ ڈیجی پر جو سابقہ سندھ میں واقع ہے، ہڑپا و موہن جو دڑو تہذیب کے آثار کے علاوہ ایک اور تمدن کے آثار بھی دستیاب ہوئے ہیں، جنہوں نے پاکستان کی قدیم تاریخ کم از کم پانچ چھ سو سال بڑھا دی ہے۔ یہ ایک عظیم الشان دریافت ہے جس سے عالمی تاریخ پر بھی نہایت وسیع اثرات کا امکان ہے۔ یہ تحقیق ہنوز ابتدائی منازل میں ہے۔ دیکھئے آگے چل کر کیا کیا حقائق بروئے کار آتے ہیں۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم اس شمارہ میں کوٹ ڈیجی کے متعلق اوّلیں سیر حاصل مقالہ پیش کر رہے ہیں۔

سرورق: مرقدِ اقبالؒ • رنگین عکس: احسان ملک

اقبال اور ملٹن

سید عبدالواحد

شعر و ادب کی تاریخ میں یہ اتفاق شاذ و نادر دکھائی دیتا ہے کہ دو بڑے شاعر جو مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ہوں، مختلف مذہبوں سے تعلق رکھتے ہوں، ان کا کلام مختلف زبانوں میں ہو اور وہ مختلف تمدنوں سے ابھرے ہوں، ان کے فکر و فن میں اس قدر مشابہت ہو جتنی اقبال اور ملٹن میں ہے۔ اور جو بات اس مشابہت کو اور بھی دلچسپ بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ فکر و فن سے قطع نظر ان کی زندگیوں میں بھی کئی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ اگرچہ زندگی کے یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ان عظیم فن کاروں کے تخیلات اور کلام کے اعتبار سے کچھ ایسے اہم نہیں ہیں پھر بھی ان سے ان دونوں میں مشابہت کے جو گوناگوں پہلو ابھرتے ہیں وہ بڑے ہی دلچسپ ہیں۔ مگر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اقبال نے اپنی تحریرات میں کہیں بھی ملٹن کا ذکر نہیں کیا۔ سوائے ایک خط کے جو انہوں نے اپنی زندگی کے بالکل آغاز میں ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء کو لکھا تھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

"ایک عرصہ سے ملٹن کے انداز یعنی فردوسِ گم گشتہ" وغیرہ کے انداز میں لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اور یہ وقت بڑی تیزی سے قریب آرہا ہے، کیونکہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جب میں اس معاملہ پر شدت سے غور نہیں کرتا۔ پچھلے پانچ چھ سال سے یہ تمنا میرے دل میں کروٹیں لے رہی ہے مگر ایسے تخلیقی کارنامے کے لئے جو شدید تڑپ اب پیدا ہوگئی ہے وہ کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔"

ملٹن کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا جو تمام عمر اس کے دل و دماغ پر حاوی رہی، یہ تھی کہ وہ ایک مہتم بالشان نظم لکھے۔ ایسی نظم جو نفسِ موضوع، اسلوب اور شکیش، ہر اعتبار سے مہتم بالشان ہو۔ چنانچہ ایک موضوع جس سے دونوں کو عظیم شاعری کا فیضان حاصل ہوا ہے وہ زوالِ آدم ہے۔ ملٹن کے لئے یہ اس کی زندگی کا عظیم ترین کارنامہ تھا۔ اور اقبال بھی اس کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ڈرامائی نظموں میں، فلسفیانہ خطبات میں اور ان حکمت و بصیرت میں ڈوبے ہوئے پُر مغز، بصیرت افروز اشارات میں جو معاملات کی تہہ تک کاٹ کرتے ہوئے حقائق و بصائر کو الم نشرح کرتے ہیں۔

ملٹن اور اقبال دونوں نے سیاسیات میں حصہ لیا اور مخالفت کا سامنا کیا۔ ملٹن انگلستان میں کرام وِیل کے دورِ دینداری کا مبلغ اور فلسفی تھا اور اقبال وہ فلسفی جس نے پاکستان کی آزاد اسلامی مملکت کا خواب دیکھا۔ دونوں کے نزدیک سیاسیات اور مذہب میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ شاعری کو دیکھا جائے تو ملٹن اور اقبال دونوں نے ایک نہیں دو زبانوں میں شاعری کی اور اس کے وجوہ بھی ایک ہی تھے۔ یہ کہ اپنے اپنے ملک کی حدود سے باہر زیادہ وسیع حلقوں تک رسائی پیدا کریں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں ملٹن کی عظیم تخلیقات انگریزی میں ہیں اور اس کا لاطینی کلام محض طبع آزمائی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، وہاں اقبال کا بیشتر بہترین کلام فارسی میں ہے۔ ملٹن کو انگریزی اور اقبال کو اردو میں ایسی شاعرانہ زبان، ایسا پُر سطوت اسلوب برتنا پڑا جو ان کی سیاسی تصوریت کے تمام تر التہاب اور والہانہ شوریدگی کی ترجمانی کر سکے۔ ایڈیسن نے ملٹن کے متعلق جو الفاظ کہے "زبان اس کے افکار کے بارِ گراں کے نیچے دب گئی"، اقبال پر بھی صادق آتے ہیں۔ دونوں کا اسلوب بیان عنایت درجہ مترنم ہے اور اس میں زبردست گھن گرج ہے دونوں عالمانہ، گراں ذیل الفاظ کے دلدادہ ہیں جن میں خاص پُر شکوہ ناموں کی رغبت شدت سے نمایاں ہے اور یہ وہ غلغلہ آفریں نام ہیں جو ملٹن کی حد تک بنی اسرائیل اور یونانی دیو مالا کی تلمیحات پر مشتمل ہیں۔ اور اقبال کے یہاں عبرانی و اسلامی تاریخ کی طرف اشارہ کناں ہیں۔

ملٹن اور اقبال دونوں کو شعر و ادب کے شائقین اور ناقدین نے "شاعر پیغمبر" قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر گریرسن فرماتے ہیں "جناب! اخلاقی شر جو ہمارے تمام دکھوں کا سرچشمہ ہے، راستبازی اور توبہ و استغفار آئندہ فلاح و بہبود کی نوید لئے ہوئے پیغمبرانہ شاعری میں بار بار انہیں امور کا اعادہ ہوتا چلا آیا ہے۔"

اقبال نے "شاعر پیغمبر" کی حیثیت سے جو کردار ادا کیا ہے اس کے متعلق اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اس کے متعلق کچھ اور کہنا تحصیل حاصل ہے۔ ماسوا اس کے کہ ان کے استاد گرامی کے اس مشہور شعر کو دہرا دیا جائے کہ "در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال - پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت" اور پھر یہ بات بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں کہ ملٹن کی مہتم بالشان نظم کا مرکزی کردار آدم ہے۔ اس طرح اقبال کی شاعری کا مرکزی موضوع بھی انسان ہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

بہر انساں چشم من شبہا گریست	تا دریدم پردۂ اسرار زیست

پروفیسر سورت نے ملٹن کے بنیادی عقائد کا خلاصہ یوں کیا ہے:

۱- عقیدۂ الٰہ جس میں بیٹا (خلق و کائنات) ہے اور بیٹے میں مسیح (زبدۂ خلق و کائنات) ہے۔

۲- عقیدۂ اختیار۔

۳- مادہ: نیک، غیر فانی اور الٰہی

۴- انسان کی دورنگی: نفس و عقل

۵- عقیدۂ حریت

چونکہ دونوں شاعروں کے دینیات الگ الگ تھے۔ اس لئے لازماً ان کا تصور الٰہ بھی بالکل یکساں نہیں ہو سکتا تھا لیکن دیگر عقائد میں ان کے یہاں غیر معمولی یکسانیت نظر آتی ہے۔ سوائے اس کے کہ جہاں تک ملٹن کے یہاں انسان پر دو قوتوں کا عمل ہے: نفس و عقل وہاں اقبال کے ہاں یہ قوتیں عقل اور عشق ہیں۔ اس میں کچھ اچنبھہ تو ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے "عشق" اور ملٹن کی "عقل" کا مفہوم ان الفاظ کی اصطلاحی وضع سے بظاہر کتنا ہی مختلف معلوم ہو، لیکن درحقیقت ان میں کافی مشابہت ہے۔ اقبال کی 'عقل' کا مدعا و مقصود ملٹن کی 'عقل' سے یقیناً کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اور بعض اعتبارات سے اس کے بالکل برعکس۔ لہٰذا ان میں مقابلہ بعید از امکان ہے۔ پھر بھی ملٹن کے 'نفس' اور 'عقل' کا مقابلہ اقبال کے عقل و عشق سے بڑا دلچسپ رہے گا۔

مگر سچ پوچھئے تو ملٹن اور اقبال جس طرح کائنات اور حیات انسانی میں شر کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سے ان کے افکار میں غیر معمولی مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلۂ شر نے نوعِ انسان کو شروع ہی سے سرگرداں رکھا ہے۔ اور دنیا کے بڑے بڑے مفکروں نے کائنات میں شر کے عنصر کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال کے نزدیک شر کی موجودگی فلسفہ الٰہیت کا سب سے خاردار مسئلہ ہے۔ آخر کائنات کا الٰہی نظام کیسے برقرار رہ سکتا ہے جبکہ انسان کی زندگی میں خیر و شر یوں آمیختہ ہیں؟

ملٹن نے اس مسئلہ کا وہی نصرانیت کا روایتی جواب دیا ہے یعنی شیطان یا ابلیس۔ اقبال نے بھی شر کو شیطان سے منسوب کیا ہے۔ مگر انہوں نے مسئلہ شر، جو توجیہہ کی ہے وہ ان کے فلسفہ خودی کے عین مطابق ہے۔ "جاوید نامہ" میں زندہ رود مشہور عارف، شاہ ہمدان سے پوچھتا ہے:

از تو خواہم سِرّ یزداں را کلید	طاعت از ما جست و شیطاں آفرید
زشت و ناخوش را چناں آراستن	در عمل از ما نکوئی خواستن
از تو پرسم این فسوں سازی کہ چہ	با قمار بد نشیں بازی کہ چہ

شاہ ہمدان اس کا جواب دیتے ہیں:

بندۂ کز خویشتن دارد خبر	آفریند منفعت را از ضرر
بزم با دیو است آدم را وبال	رزم با دیو است آدم را جمال
خویش را بر اہرمن باید زدن	تو ہمہ تیغ، آں ہمہ سنگ فسن

در عشق غنچه ایم که لرزد ز باد صبح
در کار زندگی صفت سنگ خاره ایم

محمد اقبال لندن ۲۴ دسمبر ۳۲ء

اقبال رح (۱۸۷۳ء—۱۹۳۸ء)
اسلام کے عظیم مفکر جن کے تصورات مشرق و مغرب
میں ایک نئے نظام فکر و حیات کی نشان دہی کرتے ہیں

جان ملٹن (۱۶۰۸ء—۱۶۷۴ء)
انگلستان کا نامور شاعر ، جس کی تصنیف ''فردوس گم گشتہ''
دنیا کے عظیم ترین شعری شاہکاروں میں شمار کی جاتی ہے

And courage never to submit or yield,
And what is else not to be overcome,
That glory never shall his wrath or might
Extort from me To bow and serve for peace
With suppliant knee, and deify his power
Who from the terror of this arm, so late
Doubted his empire—that were low indeed."

(*Paradise Lost*, *I* 105-114)

شاکر علی کی نقاشی

(مضمون صفحہ ۵۰)

اماس : (سں لائف)

قس

سائے . (لمموس سر رہ حصی ہ سی)

تیز ترشو تا فتد ضرب تو سخت　　　　ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

ملٹن اور اقبال دونوں کے مطابق شر کا تعلق ابلیس سے ہے۔ اس لئے یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ وہ دونوں اس کا تصور کیسے کرتے ہیں۔ ملٹن، ابلیس کو ایک مقرب فرشتہ قرار دیتا ہے اگرچہ وہ اولیں فرشتہ نہیں۔ آسمان پر بغاوت کا فوری سبب یہ اعلان ہے کہ تمام ملائکہ مسیح کو اپنا آقا تسلیم کرکے اس کی پرستش کریں۔ ابلیس اس فرمان پر برہم ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ملائکہ کا درجہ مسیح کے برابر ہے، وہ خود بخود وجود میں آئے ہیں، تخلیق نہیں کئے گئے۔ اس لئے وہ کسی کی پرستش نہیں کرسکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف بیٹے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے ہی سے انکار نہیں کرتے بلکہ خدائے تعالیٰ کے تخت و کرسی اور بادشاہت کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کرتے ہیں۔

ملٹن، ابلیس کو گھمنڈ، تعلی اور طاقت کی مجنونانہ ہوس کا مظہر قرار دیتا ہے۔ ابلیس میں یہ برخود غلطی کا احساس وہ زہر ہے جو اس کے سارے وجود میں سرایت کرجاتا ہے اور اس میں جو خیر کا عنصر ہے اس کو بھی گھن لگا دیتا ہے۔ ابلیس کا یہ منصوبہ کہ وہ انسان کو بگاڑ دے، تمام تر بغض اور نفرت ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ملٹن، ابلیس کو خدا کی ضد کے طور پر پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کس طرح شر یعنی بغض، حسد اور نفرت کی قوتیں اس کی فطرت میں کارفرما ہیں۔ مگر جیسا کہ پروفیسر باؤرا نے بیان کیا ہے یہ قوتیں مذموم ہوسکتی ہیں، حقارت آمیز نہیں۔ یہ بڑی مرعوب کن ہیں، اس لئے بعض اوقات ہم سے خراجِ تحسین بھی وصول کرتی ہیں۔ ابلیس میدانِ کارزار میں ایک بہت بڑا قائد ہے، خاص طور پر اس وقت جب وہ شکست سے دوچار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نازک موقع پر وہ ایسی جرأت آمیز باتیں کرتا ہے جو اس کا اور کوئی ساتھی نہیں کرسکتا۔ پھر وہ نہایت خوش تدبیر بھی ہے اور ہمیشہ غیر معمولی طور پر فصیح البیان بھی۔ حق یہ ہے کہ ابلیس کے گھمنڈ کا ایک اچھا پہلو یہی ہے۔

اقبال نے آسمان پر شورش کی وجہ اس سے بہت مختلف بیان کی ہے۔ اس داستان کا خلاصہ قرآن کے الفاظ میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے:

"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو تو وہ سب سجدہ میں گرگئے سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کردیا۔ پھر ہم نے آدم سے کہا "آدم! یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے۔ دیکھو کہیں وہ تم دونوں کو جنت سے باہر نہ نکلوا دے۔ اور تم مصیبت میں مبتلا ہوجاؤ۔ اس میں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جس سے تم بھوکے نہ رہو، پیاس کا دکھ نہ اٹھاؤ اور دھوپ میں نہ جلو۔ شیطان نے اس کے کان میں بری بات پھونک دی۔ "اے آدم! کیا میں تجھے ابدیت کے شجر تک لے جاؤں اور اس بادشاہت کی طرف جسے کبھی زوال نہ ہوگا" غرض ان دونوں نے درخت کا پھل کھالیا۔ اس طرح آدم نے اپنے خدا کے خلاف سرکشی کی اور دھوکے میں آگیا۔ مگر خدا نے اسے اپنے فضل کے لئے چن لیا" (سورہ ۲۰)

مگر جہاں تک ابلیس میں اعلیٰ اوصاف کی نشاندہی کا تعلق ہے اقبال، ملٹن سے متفق ہے۔ جہاں ملٹن سے پہلے اور اس کے بعد مصنفوں نے ابلیس میں بعض قابلِ تعریف اوصاف کا سراغ لگایا ہے وہاں اکثر مصنف خواہ وہ مذہبی ہوں یا فلسفی اسے مجسم شر ہی قرار دینے پر مطمئن رہے ہیں۔ ملٹن اور اقبال میں یہ مشابہت بڑی دلچسپ ہے۔ اور اسے حال ہی میں بعض لوگوں نے محسوس کیا ہے۔ مگر انہوں نے دونوں کا فرق محسوس نہیں کیا۔ ملٹن کے مطابق ابلیس ایک فرشتہ مقرب تھا۔ اس نے خدا کے خلاف بغاوت کی جو اس کے زوال کا باعث ہوئی۔ اس زوال کے بعد، جو تمام تر اس کی نافرمانی کا نتیجہ تھا، ابلیس بعض اوصاف کا اظہار کرتا ہے۔ تاہم ملٹن ابلیس کو جس انداز سے پیش کرنا چاہتا تھا اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ "وہ ایک مقدس ہستی کے طور پر نمودار ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ نہایت قابلِ نفرت اور مکروہ بن جاتا ہے۔" (باؤرا) بے شک ابلیس، ملٹن کے یہاں رفتہ رفتہ بالکل قابلِ نفرت بلکہ حقارت آمیز بن جاتا ہے۔ اس کی شخصیت میں ملٹن نے ایک بلند روح کے تکبر و حسد کے باعث زوال پذیر ہونے کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کے برعکس اقبال کے یہاں ابلیس برابر اعلیٰ اوصاف کا ثبوت دیئے جاتا ہے۔ جو ہمیں متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

رہا ہبوطِ آدم کا سوال۔ تو اقبال فرماتے ہیں: "غرض ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں زوالِ آدم کی جو داستان بیان کی گئی ہے، اس کا انسان کے پہلی مرتبہ کرۂ ارض پر نمودار ہونے سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ کس طرح انسان جبلّی نفسانی خواہشات کی وحشیانہ حالت سے ابھر کر ایک آزاد خودی کا شعوری احساس پیدا کرتا ہے۔ خودی جو شک بھی کرسکتی ہے اور نافرمانی بھی۔ زوالِ آدم میں کوئی اخلاقی

تنزل مضمر نہیں ہے بلکہ یہ تو معمولی شعور سے ابھر کر خودی کے شعوری احساس کا طلوع اولیں ہے۔ جیسے کوئی شخص فطرت کے خواب سے بیدار ہوکر اپنے وجود ہی میں ایک ذاتی حادثہ کی کسک، اس کی تڑپ سے چونک اٹھے۔ اور پھر قرآن کی رو سے زمین کوئی دار عذاب بھی نہیں جہاں انسان کو اس کی لغزشِ اولیں کی سزا میں قید کر دیا گیا ہو۔ انسان کا پہلا عملِ سرکشی اس کا ذاتی اختیار کے تحت اولیں اقدام تھا۔ اسی لئے قرآن کے مطابق آدم کی اولیں خطا معاف کر دی گئی۔ (چھ لکچر)

اس طرح جہاں دونوں شاعروں میں ہبوط آدم اور ابلیس کے کردار کے بعض اہم پہلوؤں کے بارہ میں اختلاف ہے وہاں ملٹن اور اقبال دونوں بنیادی حیثیت سے مسئلۂ شر کے بارہ میں متفق بھی ہیں۔ ان کی منظومات خیر و شر کی ازلی کشمکش اور انسان کی سعی و کوشش سے آخر کار شر کی شکستِ فاش کی آئینہ دار ہیں۔ بلکہ اقبال تو اپنی فطری زندہ دلی سے کام لیتے ہوئے شیطان سے خدا کے حضور یہ شکایت بھی کرواتا ہے کہ وہ انسان کی ذات میں اپنا شایانِ شان حریف نہیں پاتا۔ وہ ایک بہتر حریف کا طلبگار ہے جو اس کے مقاصد کو پیغام شکست دے سکے اور اس قدر آسانی سے اس کے دام تلبیس کا شکار نہ ہو جائے۔ یہ احساس اقبال میں اپنے معاصر انسانوں ہی کے مشاہدہ سے پیدا ہوا ہوگا۔

ملٹن اور اقبال کے مطابق ابلیس کا المیہ اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ وہ اپنی تقدیر کو بدل نہیں سکتا:

ہم کہاں اور خیر کے ساماں کہاں
شر ہی شر ہے قسمتِ ابلیساں
ہم خطا و معصیت سے شادکام
ہے یہی شغل کہن کارِ دوام
جو بھی صادر ہو زا وجِ کبریا
ہم کریں تخریب اس کی برملا "(فردوسِ گم گشتہ)"

اس کے برعکس انسان اپنی قسمت کا مالک و مختار ہے۔ اور اس کے سامنے نشو و ارتقا کے لامحدود امکانات ہیں۔ ملٹن نے آدم اور ابلیس کی جو داستان "فردوس گم گشتہ اور بازیافتہ" کی بارہ فصلوں میں بیان کی، اقبال نے صرف چھوٹی چھوٹی متفرق نظموں میں بیان کی ہے جن میں سب سے نمایاں "تسخیر فطرت" (مطبوعہ "پیام مشرق")، "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"، "ابلیس و جبرئیل" اور "جاوید نامہ" وغیرہ کی بعض منظومات ہیں۔ ان نظموں میں ملٹن اور اقبال نے بعض مواقع کی تصویر ایسے الفاظ میں پیش کی ہے جو ایک دوسرے سے نمایاں مشابہت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر جہنم میں ابلیس کی تقریر کا مقابلہ "تسخیر فطرت" میں ابلیس کی تقریر سے کیا جا سکتا ہے:

اگر رن میں ہم ہار جائیں تو کیا   سبھی کچھ نہیں اس سے کھو یا گیا
سلامت ہے یہ عزم راسخ ابھی   یہ جرارِی اپنی یہ لشکر کشی
سلامت ہے یہ جذبۂ انتقام   سلامت ہے نفرت کا زورِ تمام
یہ جرأت کہ ہرگز نہ ہاریں گے ہم   سفینہ کبھی پار اتاریں گے ہم
بھلا ہار جانے کی ہے بات کیا   یہاں عزم باراں ہے اس سے سوا
کبھی ہم پہ غالب نہ آئے کوئی   کبھی جیت ہم پہ نہ پائے کوئی
یہ شوکت، یہ سطوت، یہ شانِ نمود   کہاں چھین پائے گا ربِ ودود
سدا اپنے تن کو جھکائے ہوئے   مدام اپنے من کو رلائے ہوئے
گزارش کروں بہرِ امن و اماں!   ہوں تسبیح سے اس کی ذلت نشاں؟
کہ جس کے لئے میری کند آوری   کچھ اس درجہ سرمایۂ خوف تھی

کہ وہ ٹھہر ٹھہراتا تھا اب کوئی دم	گیا اس کا جاہ و جلال و حشم
نہ وہ بادشاہت نہ وہ احتشام	ہوا چند لمحوں میں قصہ تمام

اقبال فرماتے ہیں:

نوریٔ نادان نیم سجدہ بآدم برم	او بہ نہاد است خاک، من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوز من خون رگ کائنات	من بہ دوِ صرصرم، من بہ غوِ تندرم
پیکرِ انجم زتو گردش انجم زمن	جاں بہ جہاں اندرم، زندگیٔ مضمرم
من زتنک مایگاں گدیہ نکردم سجود	قاہرِ بے دوزخم، داورِ بے محشرم

وہ الفاظ جن میں ایک اقتدار باختہ تاجدار کے دم خم، لاف زنی، آن بان، برخود غلطی اور فخر و غرور کی تصویر کھینچی گئی ہے آپس میں کس قدر مشابہ ہیں۔ اگرچہ ابلیس نے یہ دونوں تقریریں بالکل مختلف حالات میں کی ہیں "مجلس شوریٰ" میں ابلیس کا ایک مشیر اسے یوں خطاب کرتا ہے:

ہے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار	تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
آب و گل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز	ابلہِ جنت تری تعلیم سے دانائے کار
تجھ سے بڑھ کر فطرت آدم کا وہ محرم نہیں	سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف	تیری غیرت سے ابد تک سرنگون و شرمسار

یہ اشعار ہمیں "فردوس گم گشتہ" کے یہ الفاظ یاد دلاتے ہیں:

"اے تاجدار! اے اورنگ براورنگ شاہ ذوالاقتدار جس نے صف بر صف ملائکہ کی معرکہ کارزار میں قیادت کی اور ہیبت آفریں معرکوں میں بے خوف و خطر فلک الافلاک کے سلطان علی الدوام کو ملاء اعلیٰ سے گھسیٹ کر لے آیا اور اس کی بالادستی کو معرضِ امتحان میں ڈالا۔"

اور جب ابلیس جنت عدن سے باہر نکلتا ہے تو وہ اپنے احساسات کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"مسرت و حیرت سے سرشار وہ یوں گویا ہوا: اے خیر لا انتہا! اے خیر کثیر جو اس تمام شر سے خیر کو ابھارے گا اور شر کو بالآخر خیر سے موسوم کرے گا! اس کائنات سے کہیں زیادہ شاندار اور حیرت آفریں جس کو تو نے ابتدائے دم تخلیق تحت ظلمات سے ابھارا تھا، بروئے کار لائے گا۔"

"میں متذبذب و تشکک سے معمور کھڑا تھا کہ میں اس خطا و عصیان پر شرمندگی محسوس کروں جس کا میں مسبب اور مرتکب ہوا تھا یا اور بھی زیادہ مسرور رہوں کہ اس شر سے اور بھی زیادہ خیر جنم لے گا۔ یعنی خدائے تعالیٰ کا جلال اور بھی بڑھے گا اور انسانوں کے لئے ذاتِ باری کی طرف سے اور بھی خیر خواہی اور غیظ و غضب پر بے انتہا فضل و کرم حاوی ہوگا۔"

اقبال کے یہاں انسان یہ اشعار گنگناتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زوال ایک ایسا شر نہ تھا جس میں خیر کی آمیزش نہ ہو:

اے کہ زخورشید تو کوکب جاں مستنیر
از دلم افروختی شمع جہانِ ضمیر
گرچہ فسونش مرا بُرد ز راہِ صواب
از غلطم در گذر، عذر گنہ ہم پذیر
رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم
جز بکمندِ نیاز ناز نہ گردد اسیر
عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمنِ شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

منصور حلاج: اقبال کی نظر میں

ڈاکٹر میری۔ این شیمل

اقبالؒ کی تصنیف "جاوید نامہ" کا نقطۂ عروج بلاشبہ تین زندیقوں، حلاج، غالب اور قرۃ العین طاہرہ کی ارواح کی فلکِ مشتری پر آمد ہے۔ یہ وہ فلک ہے جو انتہائی سعادت سے منسوب ہونے کی بنا پر "السعد الاکبر" کے نام سے موسوم ہے۔ اور بانیان مذاہب اور عارفانِ حق کا ملجا و ماوی ہے۔ ان تین عاشقانِ جلیل کی پاکیزہ روحیں شاعر کو بود و نبود، تقدیر اور انبیاء و ابلیس کے مناصب کے عمیق ترین اسرار و رموز پر غور و فکر کی تحریک دلاتی ہیں۔ اگر طاہرہ کے دو نہایت ہی ترنم آفریں گیتوں اور غالب کے چند اشعار سے قطع نظر کر لی جائے تو اس مقام پر ساری کی ساری گفتگو حلاج ہی کی زبانی ادا ہوتی ہے جس کے تصوف کا اقبال نے ۲۵ سال پہلے اپنے مقالہ میں بڑے حقارت آمیز پیرائے میں ذکر کیا تھا۔

سوال اٹھتا ہے کہ حلاج کی تعلیمات کیا ہیں اور اس نے تصوف کی تاریخ میں کیا حصہ لیا؟

حسین ابن منصور الحلاج جس کا پیشہ روئی دھنکنا تھا اور کتب تصوف میں صرف منصور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی سال پیدا ہوا جب کہ اسلام کا نامور عارف ذوالنون مصری پیدا ہوا تھا یعنی ۸۵۹ء میں۔ وہ اپنے وطن مالوف صوبہ فارس سے بغداد آیا جو نویں اور ابتدائی دسویں صدی عیسوی میں تصوف کا مرکز تھا۔ اس جگہ وہ تصوف جس سے ہم عام طور پر شناسا ہیں، نمو پذیر ہوا یعنی حسن البصری جیسے کڑے مزاج کے زاہد منش واعظ اور رابعہ جیسی سرمست عاشقِ حق سے شروع ہو کر محاسبی جیسے ثقہ انسان کے ضبطِ نفس سے گذرتے ہوئے ساری السقطی تک پہنچا اور آخر میں السقطی کے بھتیجے جنید تک ارتقائی مدارج طے کئے۔ یہ آسان صورت میں ہے کہ صرف اکابر معلمین روحانی ہی پر اکتفا کیا جائے کیونکہ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار صوفیا موجود تھے جو عرفانِ حق، عشقِ الٰہی، توحید (بہ انواع معنی) اور فنا فی اللہ کے ساتھ اس کی مثبت صورت بقا باللہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حلاج بھی ان کے حلقہ میں شامل ہو گیا مگر اس کے اپنے مرشد جنید کے ساتھ مراسم کچھ ایسے اچھے نہ تھے کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کے حق میں بد دعا کی تھی۔ کوئی ایک سال حلاج مکہ شریف میں مقیم رہا اور کرامتیں دکھائیں۔ پھر وہ مشرقی ممالک کی طرف چل پڑا۔ سنتے ہیں وہ جوگیوں کے طور طریقے جاننے کے لئے ہندوستان بھی گیا اور اس کے علاوہ ترکستان بھی پہنچا۔

۹۱۳ء میں بغداد واپس آنے پر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ کیونکہ حکومت اور اکثر فقہا، یہاں تک کہ صوفیا نے بھی اسے قرامطہ سے سازباز اور بے دینی کا ملزم گردانا۔ ۲۶ مارچ ۹۲۲ء کو اسے بڑی بے رحمی سے نذرِ دار کر دیا گیا۔ صوفیاء کی رائے میں یہ بارگاہِ حق کی طرف سے اس امر کی سزا تھی کہ حلاج نے عشقِ الٰہی کے ناقابلِ بیان راز کو برملا فاش کر دیا تھا یعنی "انا الحق" کہہ کر خود کو خالقِ اکبر قرار دیا۔ اور یہ کلمات کٹر اہلِ شریعت کے لئے بھی ناقابلِ برداشت ہیں اور متحمل مزاج اہلِ طریقت کے لئے بھی۔ لہٰذا متقی و پرہیزگار شیخ ابن خفیف شیرازی اور عارفِ بزرگ ابو علی دقاق بخاری کے علاوہ کسی نے اس کے عارفانہ نظریہ "ہُوَ ہُوَ" کو سمجھا جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہستی باری کا ذاتی اور زندہ ناظر و شاہد ہے اور نہ اس کے مشہور الفاظ "انا الحق" کے صحیح مفہوم کو ہی پا سکا جو ہرگز ایک ایسے عاشقِ از خود رفتہ کا نعرۂ مستانہ نہیں جسے اپنے آپ پر کوئی ضبط و اختیار نہ رہا ہو۔ بلکہ اس کے عارفانہ نظریات کی روحِ رواں ہے جن کی تشریح وحدت الوجود کی روشنی میں مناسب نہیں جیسا کہ ابن عربی کے زمانہ کے بعد کیا گیا۔

حلاج کی ذات نے چند عرصہ بعد اسلامی [illegible] قصص و حکایات کے باعث بالکل بدل گئی یا شاید اہلِ نظر نے اس کی حقیقی نوعیت کو

بھانپ لیا۔ اے جیسا کہ آر۔ اے۔ نکلسن نے بیان کیا ہے، اس کی حیثیت یہ قرار پائی کہ "وہ تمام تر ایک ایسی مستم نصیب ہستی ہے جس نے جان و دل سے جدوجہد کرتے ہوئے فرمانِ باری کی تعمیل کی خواہ اس کی خاطر اسے کتنی ہی آفات و مصائب کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑا۔" اس نے اس عاشق صادق کا برن ے یا جس نے بے پایاں محبت کے جذبۂ بے اختیار میں خون کی قربانی دی اور دار پر چڑھ کر منصور یعنی فاتح بن گیا۔ چنانچہ مولانا رومؔ نے شاخ پرُ اگے ہوئے سرخ گلاب کو منصور سے تشبیہ دی ہے۔

حلاج کے عقائد کا اثر اور اس کی شخصیت سے جو احساس دوسروں کے دل میں پیدا ہوا، اس کا عکس خواجہ فریدالدین عطارؔ کی تصانیف نظم و نثر میں بڑی وضاحت سے دکھائی دیتا ہے جو اسے اپنا مرشد روحانی تصور کرتے تھے۔ باقی رہے مولانا جلال الدین رومیؔ تو مثنوی معنوی اور دیوان شمس تبریز دونوں اس شہید عشق کی تلمیحات سے بھرپور ہیں، فرماتے ہیں:

ما مست الستیم بیک جرعہ چو منصور
اندیشۂ فتوائے سرِ دار نداریم

ترکی شاعری میں شروع ہی سے عشقِ منصور یعنی اس جادۂ پرخار عشق کا تذکرہ نظر آتا ہے جس میں خطرات ہی خطرات اور مصائب ہی مصائب ہیں۔ ترکی شعراء کے کلام میں حلاج کی زندگی کے واقعات پر واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً نسیمیؔ کے یہاں جو اپنے مرشد ممدوح کی طرح ملحدانہ عقائد کے لئے مارا گیا۔ یعنی اس نے نماز عشق ادا کرنے کے لئے اپنے خون سے وضو کیا۔ سولہویں صدی کا شاعر پیر سلطان ابدال بھی اپنی اسیری اور تعزیر کے دوران ان پتھروں کی شکایت نہیں کرتا جو اس پر پھینکے گئے بلکہ اس پھول کی شکایت کرتا ہے جو اس کے دوست نے پھینکا تھا۔ بالکل اس طرح جس طرح منصور نے اپنے شاگرد شبلیؔ کے پھول کی شکایت کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس نے کیا کیا ہے۔ اور منصور کا نام بیان نہ بھی کیا جائے تو بھی اکثر مشرقی شعراء اس کی حکایتِ شمع و پروانہ ضرور برتتے ہیں۔ جو صدہا سال سے فنا کی تمثیل ہے۔ تصنیف معروف "کتاب الطواسین" میں بڑے مختصر مگر نغز و شیریں جملوں میں اس عاشق کا حال بیان کیا گیا ہے جو وصل کو پہنچ کر کبھی اپنے ساتھیوں کے پاس واپس نہ آئے گا۔ مگر یہ نہ بھولئے کہ حلاج قرون وسطیٰ میں نہ صرف شعراء کے نزدیک دکھ سہنے والی محبت کا ہیرو بن گیا تھا بلکہ دور مابعد کے تصوف میں وحدت الوجود کا نمائندہ بھی بن چکا تھا۔ چونکہ ۱۳ ویں صدی میں عقیدۂ وحدت الوجود ابن عربی کے فلسفہ کے باعث درجۂ کمال کو پہنچ چکا تھا اسلئے مسلم عارفین ان نظریوں میں بہت گہرے کھو گئے اور کلاسی صوفیاء، جنید، حلاج، وغیرہ کے مقولوں اور عقیدوں کی اس فلسفہ کے مطابق ایسی تشریح کی گئی جو حقیقۃً ان کی تعلیم میں موجود نہ تھی۔ کلاسی تصوف یہاں تک کہ حلاج نے بھی ہمیشہ یا تقریباً ہمیشہ خدا کے ماوراء ہونے ہی پر زور دیا ہے۔ اور خدا و انسان کا رشتہ خالق و مخلوق اور بعد میں عاشق و معشوق کا رشتہ قرار دیا ہے۔ لیکن ابن عربی کے بعد حلاج کے عقائد کو بالکل بدل ڈالا گیا اور اس کی تشریح اندلس کے شیخ اکبر کے تصورات کے مطابق کی گئی جو اقبال کو قطعاً پسند نہ تھے۔ کیونکہ انہوں نے وجودی فلسفہ کے خطرناک نتائج کو بڑی وضاحت سے محسوس کر لیا تھا اور یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ دین اسلام کی الہامی روح کے مطابق نہیں۔ اسی لئے اپنے مقالہ درباره "ارتقائے مابعد الطبیعات ایران"۔ (۱۹۰۸ء) میں لکھا تھا:۔

"اس بہاؤ نے حلاج میں بے انتہا وجدیت کی شکل اختیار کر لی تھی اور وہ اپنشدوں کی روح میں "انا الحق" یعنی "برھمسی" پکار اٹھا۔ اس سے ہمیں معاً "زبورِ عجم" کے یہ اشعار یاد آتے ہیں:

دگر از شنکر و منصور کم گوئے	خدا را ہم براہِ خویشتن جوئے
بخود گم بہرِ تحقیق خودی شو	انا الحق گوئے و صدیقِ خودی شو

یہاں اقبال پھر حلاج کو ویدی اپنشدوں کے اس نہایت گنوان اور پراتم شاج، شنکر سے ملاتے ہیں جو غالباً خالص ترین لامحدودیت کا سب سے بڑا نمائندہ اور "ادوایتا" کا اہم ترین فلسفی ہے۔

اس اثناء میں یعنی مقالہ اور "زبورِ عجم" کے مذکورہ اشعار کی تصنیف کے دوران اقبال فرانسیسی عالم، ایل۔ میسی نان کے اہم مطالعوں سے

واقف ہو چکے تھے جس نے ۱۹۲۲ء میں اپنی ضخیم کتاب: "LA PASSION d' al HUSAYN IBN-MANSUR- al- HALLAJ : MARTYRE MYSTIQUE de l' ISLAM"

—— "حسین ابن منصور۔ حلاج شہید عارف اسلام کا اندوہ نامہ" اور اس موضوع پر متعدد اور بیش بہا کتابیں شائع کرنے سے پہلے ۱۹۱۴ء میں "کتاب الطواسین" کی تدوین کی تھی۔ اقبال نے یہ کتاب ۱۹۱۸ء۔ ۱۹۱۹ء میں ضرور پڑھی ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے مولانا اسلم جیراج پوری (مرحوم) کے نام ایک خط مرقومہ ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ منصور کے بنیادی عقائد اب واضح ہو گئے ہیں پھر بھی وہ اس مشہور و معروف شہید عشق سے زیادہ ہمدردی ظاہر نہیں کرتے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اقبال نے کب حلاج کی طرف اپنا رویہ بدلنا شروع کیا۔ ہمیں یہ تبدیلی پہلی بار "جاوید نامہ" میں دکھائی دیتی ہے۔ جس میں "کتاب الطواسین" ان پر کچھ ایسا الہامی کیف طاری کرتی ہے کہ وہ فلکِ قمر میں اپنی دلفریب طواسین رسل اختراع کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ "طواسین" سورہ ۲۸۔ ۲۶ کے حروف مقطعات کا مجموعہ ہے۔

جہاں تک میسنی نان کا تعلق ہے اس نے بڑی کامیابی سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ حلاج کے دینی عقائد میں خدا کی ماورائیت کارفرما ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ خدا اپنے فضل سے مومن کے دل میں بھی جاگزیں ہوتا ہے جبکہ وہ تزکیہ نفس سے مصفی و منزہ ہو جائے۔ انسان کو اس لئے خلق کیا گیا ہے کہ عشق الٰہی دنیا میں ظاہر ہو۔ وہ خدا ہی کی تمثیل ہے جس نے اسے ازل سے مشتاقانہ دیکھتے دیکھتے اس طرح الٰہی اوصاف سے متصف کر دیا ہے کہ وہ "ہُوَ ہُوَ" یعنی وہی بن جائے۔

یہاں یہ نکتہ اور بھی اہم ہے کہ آدم نے خدا سے ظہور نہیں کیا بلکہ وہ عدم سے پیدا کیا گیا۔ حلاج کہتا ہے یہ بات اور بھی اہم ہے کہ "وحدتِ حق عارف کی خودی کو محو نہیں کر دیتی بلکہ اسے اور بھی زیادہ کامل، مقدس اور الوہی بنا کر ایک آزاد و زندہ عضو بنا دیتی ہے۔" کیونکہ اس کی رائے میں تخلیق کا راز جب ہی سمجھا جا سکتا ہے کہ الٰہی خصوصیتِ خاصّہ عشق یعنی تخلیقی عشق ہے جو خدا کی سرشت میں داخل ہے۔ وہی جسے میسنی نان نے ایک نہایت وقیع مضمون میں "خلاقی شوق" قرار دیا ہے۔ یہ حلاج کا خاص انداز ہے کہ وہ اس شوق الٰہی کو "عشق" قرار دیتا ہے جس سے "متحرک شوق" مراد ہے اور جسے صوفی اُس وقت بھی شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ لفظ 'محبت' کو بھی، جو ایک سکونی تصور ہے، ۹ ویں صدی سے تمام صلحانے خدا اور انسان کے باہمی ربط کو ظاہر کرنے کے لئے قبول نہیں کیا تھا۔ یہ خاصۂ الٰہی جسے حلاج عشق کہتا ہے، انسان کو خدا سے قریب لانے کی کوشش کرتا ہے اور فضل ربی کا منتہائے مقصود یہی ہے کہ انسان اس جبلی عشق ربانی میں شریک ہو۔ مگر عشق میں بے شمار مصائب لازم ہیں یعنی لوگوں سے جدائی، آلام، آنسو، آہیں۔ اقبال نے حلاج کے منہ سے یہ بالکل صحیح الفاظ کہلوائے ہیں کہ:

بے خلش ہا زیستن نا زیستن ۔۔۔ باید آتش در تہ پا زیستن!

دیسے عشق کے معنی ہیں خدا کی راہ میں تسلیم جان یا اس کی بارگاہ میں نادان لوگوں کے ہاتھوں قربانی کے طور پر پیش کیا جانا۔ اسلئے حلاج کی نہایت خوبصورت دعائیں اس فریاد سے لبریز ہیں:۔

اقتلونی یا ثقاتی ۔۔۔ الیٰ فی قتلی حیاتی
ومماتی فی حیاتی ۔۔۔ وحیاتی فی مماتی

یہ اس قصیدہ سے ماخوذ ہے جسے سہروردی حلبی، ابن عربی اور دیگر عارفین خصوصاً رومی نے پڑھا ہے۔ اور اپنی مثنوی میں اس کا بار بار ذکر کیا ہے:

عشق اور اذیت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس بارے میں ایک نہایت رقت آمیز حکایت "تذکرۃ الاولیاء" میں مذکور ہے:۔

"لوگوں نے حلاج سے پوچھا: "عشق کیا ہے؟" اس نے جواب دیا: "تم اسے آج، کل اور پرسوں دیکھ لوگے۔ ایک دن اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے، دوسرے دن اسے مار دیا جائے گا اور تیسرے دن ہوا اس کی خاک اُڑاتی پھرے گی۔"

"جاوید نامہ" میں طاہرہ جو شعر گا کر سناتی ہے اس سے یہ حکایت بھی یاد آتی ہے اور اُس پروانہ کی تمثیل بھی جو اپنے محبوب سے ہمکنار ہو کر کبھی واپس

نہیں آتا ؎

گر نہ از دار و رسن گیرد نصیب — برنگردد زندہ از کوئے حبیب

حلاّج کے سلسلہ میں جو سب سے دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے وہ "انا الحق" کا سوال ہے۔ خبر نہیں حلاّج نے اپنے مرشد جنیدؒ کے سامنے یہ الفاظ بولے یا نہیں مگر اب یہ "کتاب الطواسین" کے چھٹے باب میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب میں حلاّج کے نزدیک "حق" سے مراد ذات باری کا خاصۂ تخلیق ہے یعنی حق بحیثیت خالق۔ یہ اس شخص کی پکار ہے جو محسوس کرتا ہے کہ روح ناطقہ یعنی غیر مخلوق یزدانی روح نے اس میں قلب ماہیت پیدا کر دی ہے اور اب وہ اس کی زندہ مشاہد ہے کیونکہ خدا کی غیر مخلوق روح اس کے فضل سے انسان کی مخلوق روح سے متحد ہو گئی ہے

ظاہر ہے کہ بعد میں آنے والے صوفیائے عارف شہید کے اس خطرناک ارشاد کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن میں سے اکثر اپنے اپنے طور پر اس کی ذہنیاتی اساس کو بھول گئے ہیں۔ بعض کی رائے میں حلاّج کی ہستی عالم مستی میں محو ہو گئی اور اس کی جگہ خدا نے اس کی زبانی کلام کیا۔ غزالی جو ہمیشہ شرعی پہلو کو ملحوظ رکھتا ہے اس کو ایک دعوے کا قرار دیتا ہے جس کا برسرِ عام اعلان کیا جائے تو یہ ایک خطرناک مغالطۂ ذہنی بن جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسے عاشق کا غلو جو مستیٔ عشق سے اس قدر سرشار ہو جائے کہ وہ اپنے آپ اور اپنے محبوب میں کوئی فرق محسوس نہ کرے۔ مگر یہ وہ جلائے باطنی بھی تو ہو سکتا ہے جو اسم الٰہی "الحق" پر غور و فکر کرنے سے مومن کے دل میں پیدا ہوتی ہے ——— صرف "مشکوٰۃ الانوار" میں غزالی یہ تسلیم کرتا ہے کہ ممکن ہے جلوۂ حق نے حلاّج کے منہ سے یہ الفاظ نکلوائے ہوں۔ مگر جب وہ اس کے مقولوں اور دعاؤں کا تذکرہ کرتا ہے تو بھی شاذ و نادر حلاّج کا نام لیتا ہے۔

"انا الحق" کی سب سے دلآویز تشریح شاہ عبد القادر گیلانیؒ نے کی ہے۔ کیونکہ اس عظیم عراقی عارف نے جو استعارے استعمال کئے ہیں۔ وہ اقبال کے تصور سے بہت قریب ہیں۔ گو اس نے حلاّج کو دلی تسلیم نہیں کیا:

"ایک دن ایک عارف کا مرغِ ہوش اس کے پیکرِ ظاہری سے اڑ کر آسمان پر جا پہنچا جہاں وہ ملائکہ کی صفیں چیر کر آگے نکل گیا۔ وہ ایک شاہین تھا جس کی آنکھوں پر "وخلق الانسان ضعیفا" کا خول چڑھا تھا۔ اسے آسمان پر کوئی شکار نہ ملا۔ اور جب اس نے اپنا شکار "رائیت ربی بعینہ" دیکھا تو وہ اس پریشانی میں مبتلا ہو گیا کہ کہیں شکار اسے یہ نہ کہہ بیٹھے کہ "اِنّی وجھت وَجْھِیَ لِلّذی فطر السّموات والارض" ——— وہ پھر آسمان سے نیچے اُتر آیا تاکہ وہ چیز پالے جو مخفی کی تہہ کے نیچے شعلہ زن آگ سے زیادہ مبتلا ہا ہو۔ جب اس نے اپنی چشمِ ہوش کھولی اور اس کے جلووں کے سوا اور کچھ نہ پایا تو وہ واپس آ گیا اور اس دنیا اور دوسری دنیا میں اپنے محبوب مطلوب کے سوا کچھ نہ پایا۔ وہ بہت خوش ہوا اور مستی میں پکار اٹھا: انا الحق"۔ وہ ایسی نواؤں میں گا اٹھا جو انسان کو نصیب نہیں اور باغِ حیات میں اس طرح زمزمہ پیرا ہوا جو اولادِ آدم کو میسر نہیں۔ اور اسی دھن میں نغمہ سرا ہوا کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ..."

اس تشریح میں 'طائر' کا تصور قابلِ توجہ ہے۔ اقبال نے بھی فلکِ مشتری پر حلاّج کو ایک ایسی روح قرار دیا ہے جو طیور کی طرح ہمیشہ برسرِ پرواز رہتی ہے۔ یہ حلاّج کے شارح روزبہان باقلی کے اُس نہایت دلپذیر مقولے کی طرف تلمیح ہے جس میں اُس نے اپنے مرشد کو "شاہِ طائرانِ عشق" قرار دیا ہے۔ اور یہ خیال کہ ملائکہ بلکہ حق تعالیٰ بھی ذوق و شوق و آرزو کا شکار ہے۔ اقبال کی شاعری میں بار بار دکھائی دیتا ہے۔

شاہ صاحب نے جو کچھ کہا ہے، وہ "وحدت الشہود" کے نقطۂ نظر سے ہے۔ طالب کا حقیقی مقصود جمالِ حقیقی ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے "افشائے سِرّ" کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ الٰہی محبت اور وصل کے عظیم اسرار کو فاش کرنا ممنوع ہے۔ اس لئے منصور جس نے اس ممانعت کی پروا نہ کی، سزایاب ہوا۔

ابن عربی نے "انا الحق" کی تشریح تمام تر وحدت الوجود کی روشنی میں کی ہے۔ رومی نے "انا الحق" کہنے والے کو اُس لوہے سے تشبیہہ دی ہے جسے آگ میں ڈال دیا جائے، اس طرح لوہے کا رنگ آگ کے رنگ میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ مواصلت بہ اعتبار عرض نہیں بلکہ بہ اعتبار اوصاف ہے۔ رومی مزید کہتا ہے کہ مناسب وقت پر "من" کہنا مہر کا باعث ہے، اور نامناسب وقت پر قہر کا باعث۔ منصور کی "میں" مہر بن گئی اور فرعون کی "میں" قہر۔

اس شعر میں اقبال کے مسئلۂ خودی سے ایک دلچسپ مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا حلاّج کے متعلق اقبال کی مزید آراء کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں انکے پیچیدہ دلائل کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔ یہ موضوع ایک الگ بحث کا متقاضی ہے اور ہم اس پر پھر کبھی کسی اور مضمون میں بحث کریں گے۔

عشق : دمِ جبرئیل

ریاض الدین قیصر زبیری

اقبال کا فلسفہ حرکت اور زندگی کا فلسفہ ہے۔ یہ اور خودی کا اثبات ہم معنی ہیں اور خودی کی پرورش عشق کے زیر سایہ ہوتی ہے۔ اس لئے اقبال کے پیغام کو سمجھنے کے لئے عشق کے معنی سمجھنا لازم ہے۔

اقبال کا تصوّرِ عشق، اردو اور فارسی شعراء کے روایتی تصوّرِ عشق سے یکسر مختلف ہے۔ وہ اس عشق کی تعلیم ہرگز نہیں دیتے جس میں پڑکر عزّتِ سادات گنوا بیٹھنے کا اندیشہ ہو۔ اقبال روایتی شاعر کی طرح نالہ و فریاد نہیں کرتے، وہ عشق کا رونا نہیں روتے، وہ عشق کا ترانہ گاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق وہ دھیمی دھیمی آنچ نہیں ہے جس کی تپش سے زندگی شمع ساں فنا کی طرف بڑھتی ہے، بلکہ وہ دہکتی ہوئی آگ ہے جس میں پڑکر زندگی کندن کی طرح جگمگاتا ہوا روپ اختیار کرلیتی ہے اور رمزِ بقا سے آگاہی حاصل کرتی ہے۔ عشق ان کے نزدیک ارتقائے حیات کا راہ نما ہے۔ اقبال صوفیا کے اس روایتی تصوّرِ عشق کے سخت خلاف ہیں جس کی رو سے وصالِ محبوب اور مکمل سپردگی یا فنا ہم معنیٰ ہوکر رہ جائیں۔ اس طرح خودی کی نفی ہوتی ہے۔ یہی تو وہ گراں بہا قوت ہے جس کی پرورش و ارتقاء حیاتِ انسانی کا صحیح مقصد ہے اور جس تک زندگی نہ جانے کتنی کٹھن منزلوں سے گزر کر پہونچی ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق انسان کی خفتہ اور عظیم تخلیقی قوتوں کا محرک ہے۔

عقل و عشق، منطق و وجدان کی بحث بہت پرانی ہے یعنی محض عقلی و خشک منطقی دلائل کے ذریعہ دنیا، زندگی اور ارتقاء کے اہم مسائل کو سمجھا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں عقلی وسائل زیادہ کارگر ہیں یا وجدانی۔ اقبال کے نزدیک زندگی کے ادق اور ٹھوس مسائل کو سمجھنے کے لئے وجدان ہی ایک کارگر ذریعہ ہے محض منطق بیکار ہے۔ وہ عشق کو رہبر گردانتے ہیں لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ انہوں نے عقل کی اہمیّت سے سرے سے انکار کیا ہے۔ وہ عقل اور عشق کے مابین کسی تضاد کے قائل نہیں۔ یہ دونوں دریا کے دو کنارے نہیں جو کہیں مل ہی نہ سکیں۔

راہنمائی کا کام عقل صرف ایک خاص مقام تک ہی کرسکتی ہے۔ جن مقامات پر عقل کی رسائی ممکن نہیں عشق وہاں رہ نورد ہے۔ جہاں سے کائنات کی راہ مردِ مومن یا دانائے راز کی طرف مڑتی ہے، عقل کی سرحدیں وہیں ختم ہوجاتی ہیں۔

اہلِ دنیا جو مادی سود و زیاں ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں عقل سے راہبری کا کام لیتے ہیں۔ لیکن کیا مادی جاہ و حشم ہی تمام و کمال زندگی ہے؟ ایسی زندگی جس میں اعلیٰ مقاصد بھول جائیں انسانیت کی معراجِ کمال نہیں ہوسکتی۔ درخشندہ فلزّات کی خدائی میں مغرب نے کیا پایا؟ مشینوں کی حکومت دل کی موت ہے۔ اقبال اس زندگی کا خواب دیکھتے ہیں جو کبھی جاں ہے تو کبھی تسلیمِ جاں اور اس راہ کے سفر میں راہنمائی کا جو طریقہ عشق اختیار کرتا ہے، وہ اقبال کے نزدیک زیادہ مفید اور زیادہ موثر ہے۔ عشق کے پاس حد کی حس اور اس حس کی بدولت عرفانِ حقائق کا فقدان نہیں۔ نئے نئے مسائل سامنے آتے جاتے ہیں اور ان کا حل ملتا جاتا ہے۔ نئی نئی گتھیاں اور نئی نئی الجھنیں پیش آتی ہیں اور طے ہوتی جاتی ہیں اور کاروانِ حیات عشق کی سرکردگی میں جرس کی آواز پر کان دیئے آگے بڑھتا جاتا ہے۔

عقل کی بھی دو اقسام ہیں عقل خود بیں اور عقل جہاں بیں۔ یہاں عقل سے مراد عقل خود بیں ہے جس کا انجام حیرت ہی حیرت ہے، بہت پیچیدہ مسائل کو حل کرتا نہیں اور جو صرف خود غرضی کی بناء پر تسخیرِ فطرت کرتی ہے۔ عقلِ جہاں بیں جو کائنات کی گہرائیوں میں سرایت کرکے اسے اندر سے منقلب کرتی ہے عقل خود بیں سے بہت بلند تر درجے پر ہے اور عشق سے بہت قریب۔

عقل بہت سے مسائل طے کرسکتی ہے، بہت سے رموز کی عقدہ کشائی کرسکتی ہے۔ زندگی کے کارواں کو آگے بڑھانے میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ زندگی کی رہ گزر میں انسان کو دیکھنے، اشیاء کی جانچ پڑتال کرنے اور ان کی ماہیّت دریافت کرنے والی آنکھ عطا کرتی ہے لیکن دل کے اندر حرارت پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں، یہ کام عشق کا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جتنے فلسفہ ہائے حیات، جتنے نظامِ فکر بھی دنیا میں پنپ کر اپنے اپنے زمانے میں لاکھوں کروڑوں دماغوں کو جِلا دے گئے ہیں، وہ اسی جراَتِ رندانہ کی بدولت تھے جس کا بانی عشق ہے۔ عقل "مسائلِ حیات" کو سمجھ سکتی ہے لیکن "رازِ حیات" کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے　　خرد کیا ہے؟ چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا　　چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

مادی اشیا کی خارجی تقسیم اور ان کی خارجی حقیقت کو سمجھنے کے لئے عقل بہت موزوں وسیلہ ہے مگر اصل حیات کو سمجھنے کے لئے ہم صرف عشق و وجدان ہی کو ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ عقل بہت کچھ کر سکتی ہے۔ لیکن بہت کچھ نہیں بھی کر سکتی۔ جب عقل شکستہ پا ہو کر بیٹھ جاتی ہے، عشق زندگی کے قافلے کی رہبری کرتا ہے۔ زندگی کو ایڑ لگاتا ہے جہاں پہونچ کر عقل "چہ کنم" میں پڑ کر محوِ تماشائے لبِ بام رہ جاتی ہے عشق ایک جست میں اس شبستانِ وجود کے تمام پردوں کو پار کر جاتا ہے۔ کتابی علم اور عقل انسان کو منزل کے قریب تو لیجاتے ہیں لیکن اس تک پہنچا نہیں سکتے۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں　　اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اقبال کے تصورِ عشق کو منفی افعال سے نفرت ہے۔ وہ ایک جنوں آمیز والہانہ تڑپ کا درس دیتے ہیں جو آگے چل کر انسانی فلاح و ارتقا کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہ انسان کو مادی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ اس روحانی ترقی کی طرف لیجاتی ہے جس کا اختتام کہیں نہیں۔ یہ انسان کو ہر دم جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیتا ہے اور آنے والے ادوار میں عظمت کے ان بلند مقامات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو لا انتہا ہیں۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ انسانی تسخیر کا میدان کہیں ختم نہ ہو۔ افلاطون نے جس سکونی زندگی کا خواب دیکھا تھا وہ باطل ہے۔ انسان کا مقام تو ہر ایک مقام سے آگے ہے۔ سکون وجمود اور موت مترادف ہیں۔ حرکت، سفر اور زندگی ہم معنیٰ ہیں۔ اس لئے "ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم" یہی سب سے بڑی صداقت ہے۔

انسان اپنا جگر خون کر کے، اپنی کاوش و سخت کوشی کی بدولت جوں جوں ارتقا کے زینہ پر چڑھتا جائے گا۔ آپ ہی آپ اس کی خودی بھی پرورش پاتی جائے گی اور بالآخر ایک مقام ایسا آئے گا جب انسان پر دو عالم کے مخفی راز فاش ہو جائیں گے۔ وہ صحیح معنوں میں نیابتِ الٰہی کا رتبہ حاصل کرلے گا۔ اور "انسانِ کامل" کہلانے کا مستحق ہوگا۔ یہ درجہ جب خودی کی ظاہری مکمل طور پر بروئے کار آجائے گی، اور انسان آفاق میں گم ہونے کے بجائے آفاق کو اپنے اندر گم کرلے گا، بہکی ہوئی خودی کے ذریعہ قوت و جبروت کے ناجائز استعمال سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کا حشر وہی ہوگا جو مسولینی اور ہٹلر کا ہوا جنھیں عشق کی راہبری حاصل نہ تھی۔

مادی و روحانی ارتقاء فطرتِ انسانی کی مدِ مقابل ہے۔ وہ انسانی ترقی کی سب سے بڑی اور خطرناک دشمن ہے۔ انسان جو حقیقت ارتقاء کا کامل ترین مظہر ہے زندگی کو ارتقا کے مزید زینے طے کرانے میں صرف اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب وہ فطرت اور زندگی کی گوناگوں قوتوں کو زیر کرے۔ دنیا میں بقا کے لئے جو جنگ ہمہ وقت جاری ہے وہ انسان اور انسان کے مابین نہیں۔ دراصل یہ جنگ انسان اور فطرت کے درمیان ہے۔ انسان حرکیت کے اصول کو منظم کر کے یعنی عمل کا سانچہ عطا کر کے اپنے اس مدِ مقابل پر فتح پاسکتا ہے۔ اس حقیقت سے منہ موڑنا گویا اپنی موت کو لبیک کہنا ہے۔ اگر انسان تسخیرِ فطرت کے اصول پر کاربند ہونے کے بجائے شانتی اور نروان کی تلاش میں خانقاہوں میں جا بیٹھا تو اس کا یہ دشمنِ اعظم اسے شکست دے دیگا۔

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد　　عالمے، از ذرۂ تعمیر کرد
اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ　　عالم اسباب را دوں گفتۂ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را　　دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را
گیر او را تا نہ گیرد او ترا　　ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

ارتقائے حیات اور تکمیلِ خودی کے راستے میں فطرت روڑے اٹکاتی ہے۔ انسان کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اس دشمن کو زیر کرے اور تمام تر قوتوں کو اپنے کام کے سپرد کردے۔ اقبال کے نزدیک یہ سانس لیتی ہوئی کائنات اور اس کائنات کے منقلب ذرات مندر، مسجد یا خانقاہ نہیں ہیں جنہیں یونہی رہنے دیا جائے۔ یہ تو اس معمل کی طرح ہے جہاں ہر وقت نت نئے اوزاروں سے نئے نئے طریقوں سے نامعلوم رازوں کی عقدہ کشائی کی جاتی ہے۔

اس معرکۂ کارزار تخلیق و تسخیر کے اس میدان میں انسان کے پاس جذبۂ عشق سب سے ضروری اور کارآمد ہتھیار ہے۔ یہ غنیم کے وار سے بچنے کے لئے ڈھال بھی ہے اور غنیم پر وار کرنے کے لئے تلوار بھی ہے لیکن یہ شمشیر ایسی ہے کہ جب تک وار کرتی رہے گی، اس کی آب بڑھتی ہی جائے گی۔

جس طرح ارتقائے حیات کے مدارج ہیں اسی طرح عشق کے بھی مدارج ہیں۔ جوں جوں یہ مدارج طے ہوتے جائیں گے۔ حوصلے اور جوان ہوتے جائیں گے۔

انسان کا فرضِ اولیں یہ ہے کہ اس شاہراہ پر ہر دم آگے ہی کی جانب قدم بڑھائے اور کہیں مطمئن ہو کر نہ بیٹھے۔ بہت سے جہان ایسے بھی ہیں جو ابھی نگاہوں سے مستور ہیں امکانات کی کوئی حد و انتہا نہیں ضمیرِ وجود کی گود ممکنات سے بھری ہوئی ہے۔

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیٔ فکر و کردار کا

انسان بلندی کے کسی درجے پر بھی پہونچ کر سکون و جمود کو دعوت نہ دے، پیہم عمل سے اپنا دامن نہ کھینچے کسی مقام پر بھی قناعت نہ کرے۔ قناعت اس مذہب میں نفرت کا درجہ رکھتی ہے، ایسی قناعت جو نمود سے خوب تر کی آرزو پیدا کرتی، جو ایک سیڑھی پر قدم رکھنے کے بعد اس سے اگلی سیڑھی سے گریز سکھاتی ہے۔ گریز عشق کی اخلاقیات میں کبھی نہ بخشا جانے والا عظیم گناہ ہے۔ پیہم آرزو تو عشق کا خاصہ ہے۔ یہ اس روغن کی طرح ہے جو شمعِ زندگی کو صرف فروزاں ہی نہیں رکھتا بلکہ اس کی آب و تاب میں ہر دم اضافہ کرتا جاتا ہے، پیہم آرزو کے بغیر عشق ایک ایسا دیا ہوگا جس کا تیل ختم ہو چکا ہو۔

اقبال کے نزدیک عشق ایک ایسی وجدانی کیفیت ہے جس کے ذریعہ انسان کو زمین پر حکومت کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ جس کی مدد سے وہ آخر کار جبر کی مضبوط زنجیروں کو توڑ دیتا ہے عظمت و جبروت اور شاہانہ وقار و طمطراق کے ساتھ قدر کی مملکت میں قدم رکھ کر حقیقی آزادی سے ہمکنار ہوتا ہے بغیر وسیلۂ عشق اس حقیقی آزادی کا تصور بھی یکسر غلط ہے۔ اسی کی راہبری میں تو قافلہ اس میدان میں جا پہونچتا ہے جہاں بے دریغ کبھی نہ ختم ہونے والے تخلیقی عمل کا امکان نظر آتا ہے۔ عشق زندگی کے میدان میں بے خوف، بے دھڑک ہو کر کچھ کر گزرنے پر اکساتا ہے اور اسی جذب و مستی میں ڈوبے ہوئے پیہم عمل میں ارتقائے خودی کا راز مضمر ہے۔ یہاں پہونچ کر ہی تو وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جب بحر و بر پر انسان کی عظمت و حکومت مسلّم ہو جاتی ہے۔ تقدیر انسان کے آگے نگوں سر ہو جاتی ہے، جب خدا بندے کی رضا کے بغیر کچھ مقدر نہیں کرتا مستقبل میں سوئے ہوئے تمام طوفانوں کا راز جیتے جاگتے بنیا پر آشکار ہو جاتا ہے اور آنے والے نظام کائنات کا صرف راز ہی منکشف نہیں ہوتا بلکہ ایسے ہی نہ جانے کتنے نئے نئے عالموں کی تخلیق بھی ہوتی جاتی ہے۔ عشق کا تعلق دوران خالص سے ہے۔ موت اس پر حرام ہو جاتی ہے، یہی زندگی کو دوام بخشتا ہے۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ — عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو! — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

ان زمانوں پر قابو پانے پر اور روحانی طور پر ان کو اپنی گرفت میں لے لینے کے بعد عمل کا میدان بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ یہاں پہونچ کر انسان خود ہی مسافر ہے اور خود ہی منزل۔ زمین اس کی ہے، زماں اس کا ہے، آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے وہ سب اس کی پہونچ سے پرے نہیں ہوتا۔

اقبال کے نظریئے کے مطابق تقدیر، لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا حرفِ آخر نہیں ہے۔ تقدیر زندگی کا قانون ہے لیکن ایسا قانون نہیں جو کہیں باہر سے آیا ہے، جو کسی جابر و قاہر خدا نے ذہنی بیڑیوں کی صورت میں اپنے مجبور و مظلوم بندوں کے پیروں میں ڈال کر اپنی مکمل مختاری کا اعلان کیا ہے۔ یہ ایسا قانون نہیں ہے جو اپنی جگہ پر جامد و ساکت ہے، جو حرکت و انقلاب کے جاری و ساری اور ہمہ گیر اصول کی نفی کرتا ہے بلکہ یہ ایسا قانون ہے جو زندگی نے خود ارتباط و تنظیم قائم رکھنے کے لئے اپنے اوپر نافذ کیا ہے۔ جوں جوں زندگی آگے بڑھتی جاتی ہے، حیات نئی نئی شکلیں اختیار کرتی جاتی ہے۔ تقدیر بھی ہر قدم پر ہر ہر تبدیلی کے ساتھ منقلب ہوتی جاتی ہے۔ زندگی کے سانچوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تقدیر کا سانچہ بھی بدلتا رہا ہے اور آئندہ زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہے گا۔ جس طرح زندگی کی تبدیلیوں کا اختتام نہیں، اسی طرح تقدیر کی تبدیلیوں کا بھی اختتام نہیں۔ جب شئے تغیر پذیر ہے تو قانون بھی تغیر پذیر ہی رہے گا۔

لہٰذا بے خوف و خطر اعمال کی حرارت سے جن کا محرک عشق ہے، جن کی پشت پناہی پر لاوے کی طرح دہکتا اور اُبلتا ہوا جذبہ موجود ہے، شیشۂ تقدیر بھی گداز ہو جاتا ہے اور انسان اپنی مرضی اور اپنے حوصلوں کے مطابق اپنی تقدیر ڈھال لیتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ ارتقا کی اس دوڑ میں یہ ذرہ کب آفتاب بن جائے، کب اسی عشق کے سہارے، اسی تیغِ جگر دار کی بدولت زندگی اپنے مدِ مقابل یعنی فطرت پر مکمل فتح حاصل کر لے اور تخلیق کا مقصد پورا ہو جائے۔

ماہِ نو، کراچی۔ اپریل ۱۹۵۸ء

لسان العصر

(اقبال کا ایک ہمعصر ، ایک ہمنوا)

ثروت یاسمین

لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کو اقبال کا معاصر کہا جائے یا ہمنوا، بہرحال وہ زمانی حیثیت ہی سے نہیں، ذہنی اعتبار سے بھی ان کے بہت قریب تھے۔ اس قدر کہ اگر ہم ان کے افکار کا امعانِ نظر سے جائزہ لیں تو ان میں اشتراکِ فکر کے کتنے ہی پہلو دکھائی دیں گے۔ بلکہ بڑی حد تک مماثلت بھی دکھائی دے گی۔ ان کا دور، ان کے مسئلے ایک ہی تھے۔ اور دونوں کا دل و دماغ بھی اسلامی روایات ہی میں رسا بسا ہوا تھا۔ لہٰذا ان کا ردعمل بھی یکساں ہی ہو سکتا تھا۔ خواہ ہم اندازِ فکر پر نظر رکھیں یا شعری وضع و مطمحِ نظر پر دونوں میں کافی حد تک ہم آہنگی ہی دکھائی دے گی۔

انیسویں صدی برصغیر پاک و ہند میں نشاۃ الثانیہ کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس میں مغربی اثرات کے باعث نئے نئے رجحانات پیدا ہوئے اور وہی کیفیت پیدا ہوئی جس کی طرف غالب نے اشارہ کیا ہے کہ ؎ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے۔

تہذیبِ مغرب میں تمام تر مادی علوم اور مادی اقدار ہی پر زور تھا۔ یورپ کی غیر معمولی صنعتی ترقی اپنے جلو میں مادی ترقیات لائی۔ عقلیت اور سائنس کے زور نے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی بساط کو الٹ کر رکھ دیا۔ مغربی تمدن کے عناصر ہمارے سماج میں پھیل گئے۔ انیسویں صدی کے وسط تک سائنس اور مذہب کی کشمکش شروع ہو چکی تھی اور جو مسئلہ نشاۃ الثانیہ کے بعد یورپ کے سامنے تھا کہ یا تو سائنس مذہب سے مطابقت پیدا کرے یا سائنس اور مذہب میں سے کسی کو برتری حاصل ہو، مشرق میں بھی پیدا ہوا۔ اور جو کیفیت دیگر ایشیائی ممالک میں پیدا ہوئی وہی اس برصغیر میں بھی پیدا ہوئی۔ ایک طرف مشرق کی روحانیت تھی اور دوسری طرف مغرب کی مادیت۔ کچھ دیر تک ان کی کشمکش بڑی تندی و تیزی سے جاری رہی۔ آخر ۱۸۵۷ء سے پہلے ہماری دینی و اصلاحی تحریکات اس ردعمل ہی کا نتیجہ تو تھیں جو تہذیبِ مغرب کے نقیب انگریزوں کے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی غلبہ کے خلاف پیدا ہوا تھا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ سیاسی ٹکر سے زیادہ تمدنی ٹکر تھی۔ اور یہی اس قضیہ کا پہلا فیصلہ بھی ثابت ہوئی۔ اس نے حالات کا پانسہ بالکل پلٹ دیا۔ اور اب سوال مزید حربی کشمکش کا نہیں بلکہ مغلوب فریق کی طرف سے مفاہمت کا تھا۔ یعنی یہ کہ اس عظیم قومی افتاد کے پیش نظر اپنی بگڑی کو بنایا جائے۔ کس طرح ایک ایسا لائحہ فکر و عمل پیدا کیا جائے جو اس ذہنی و حیاتیاتی کشمکش کے بحرانی دور میں ہماری صحیح رہنمائی کر سکے اور یا ہمہ گرد ست و گریباں دھاروں میں پھنسی ہوئی کشتی کو سلامتی کے کنارے پر لے جائے۔ قومی پیمانہ پر "ہراکری" تو خارج از بحث تھی۔ ہماری طبعی سلامت روی کا اس چیلنج کو اس طرح منفی جواب دینا محال تھا۔ زمانہ شناس نگاہوں نے اپنا صحیح راستہ بھانپ لیا اور اس چیلنج کا برجستہ جواب دیا — سر سیدؒ جس نے ڈگمگاتی ہوئی ناؤ کو تنتِ پر سنبھال لیا "در مع الدار اکیف دارا"۔ یہ وہ روش تھی جو اس نازک دور میں ہر طرح کے خطرات سے بچا کر ہمیں قومی حفظ و بقا کے راستے پر ڈال سکتی تھی۔ سر سیدؒ وہ خضرِ مبارک پے تھے جو عین وقت پر علمِ اصلاح لے کر اٹھے۔ انھوں نے نہ صرف حکومت بلکہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور اس کے گوناگوں پیچیدہ تقاضوں سے مفاہمت کرنے کی تلقین کی۔ اپنی روایات کو چھوڑ کر نہیں بلکہ ان سے اعتنا کرتے ہوئے۔ یہ درحقیقت اس بات کا ردعمل تھا کہ جنگِ آزادی نے مادی طور پر مغرب کی برتری تسلیم کر لی تھی۔ نظامِ حیات کے وہ نقوش واضح ہو گئے تھے جو سو سال سے برصغیر کے افقِ زندگی پر ابھر رہے تھے۔ اپنے ہم مذہبوں کو قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک نیا جادۂ حیات تراشنے اور ان کو بقائے ملی کی راہ پر ڈالنے کے سلسلے میں سر سیدؒ اور ان کے رفقا کی مشترکہ کوششیں بر وقت اور برمحل اقدام تھا۔

اپنے ہم قوموں کو مغرب سے روشناس کرانے اور نئی روشنی سے مطابقت پیدا کرنے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگرچہ ان کے رجحان کو اپنی روایات کے منافی سمجھا گیا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس رجحان میں ایک نئی جوت جگانے، ایک نئی روح پھونکنے کے محرکات بھی تھے۔ حقیقی معنوں میں حیات افروز اور ناگزیر۔ یہ بھی مسلم ہے کہ زندگی کے ساتھ احیاء و تجدید کی ان کوششوں نے ادب و فن میں بھی قلبِ ماہیئت پیدا کی۔ جس سے ہمیں نئے نئے تصورات ہاتھ آئے اور جدید ادب

کی وضع قدیم ادب سے بالکل علیحدہ و ممیز دکھائی دینے لگی۔

یہ بوقلموں تہذیبی اثرات جو اس تمام دور پر مرتب ہو رہے تھے۔ اکبر کا دل و دماغ بھی ان کی آماجگاہ تھا۔ اور وہ ان سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک جیتا جاگتا حساس، بیدار مغز انسان ان سے غیر متاثر رہ بھی کیسے سکتا ہے؟ وہ اس اصلاحی و تجدیدی دور سے متعلق تو تھے جس کی سربراہی سرسید اور ان کے رفقائے کار نے کی تھی۔ وہ قرنوں سے سوئے ہوئے کی ایک جنبش تھی جو کلفت ادھر سے ادھر ہو گئی اور ایک طلسمی رو کے تحت سب مغرب ہی کی طرف بہہ نکلے۔ جب اکبر نے آنکھ کھولی تو ہر طرف سرسید اور ان کی سرگرمیوں ہی کا غلغلہ تھا جس میں نیچریت کے فتووں کی گرم بازاری تھی۔ اکبر کی پرورش خالصتاً مذہبی اور روایتی ماحول میں ہوئی تھی، اس لئے جو پاس ان کو قدیم اقدار کا ہو سکتا تھا وہ شاید ہی کسی اور کو ہو سکتا۔

چونکہ سرسید کے مسلک میں بظاہر مادی رجحان غالب تھا اس لئے اکبر اول اول اس سے بہت گھبرائے۔ جیسا کہ اور خالص مذہبی لوگ بھی گھبرائے تھے اور انھوں نے سرسید پر جی بھر کر طنز کے زہر میں بجھے تیر و نشتر برسائے تاہم بنیادی طور پر ان میں بھی وہی اصلاحی جذبہ، وہی قوم کی لگن، وہی مذہب سے وابستگی تھی جو سرسید میں تھی۔ دونوں کا مطمحِ نظر ایک ہی تھا۔ قوم کو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچانا، اس کو صحیح معنوں میں زندہ بنانا۔ اکبر کی شاعری میں "شیخ و سید" کی قابلِ احترام اصطلاحات اس امر کی طرف اشارہ کناں ہیں کہ وہ سرسید سے متاثر تھے چنانچہ انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ——— ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا ——— اتنا ضرور ہے کہ سرسید اصلاح و تجدید کی دھن میں اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ ان کی تحریک سے بعض تخریبی اثرات بھی پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

اکبر نے ان اثرات کا اندازہ اچھی طرح لگا لیا تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ گو مادی و دنیاوی سرگرمیاں لازمۂ حیات ہیں لیکن وہ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ مقدم حیثیت مذہب اور روحانی اقدار ہی کو حاصل ہے۔ جو کچھ ہو ان ہی کے تحت ہو۔ ہمیں دنیا کے شوق میں دین اور حق کو فراموش نہیں کر دینا چاہئے۔ لہٰذا جب اقبال نے بھی "خودی" کا آوازہ بلند کیا تو اکبر نے اس سے جو کچھ سمجھا اس کے خلاف ردعمل بھی تمام تر اسی موقف ہی کے تحت تھا۔ بعد میں جب یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ بلال دگیرے رائے پرستند اور اقبال کسی مطلق العنان خودی کے قائل نہیں بلکہ اسلامی عقائد اور احکام شرعی کی پابند "مسلمان خودی" کے قائل ہیں جو زیادہ واضح الفاظ میں روح یا ایمان ہی ہے، تو انہیں اقبال میں غیریت کی بجائے اپنائیت کا عکس نظر آیا۔ اسی لئے انہوں نے بعد میں اقبال کا زور شور سے خیر مقدم کیا۔ دونوں کی آواز، دونوں کا مسلک، دونوں کا پیغام ایک ہی تھا گو اس کے پیرائے مختلف تھے۔

اور پھر ان میں طبائع کا بھی تو فرق تھا۔ اقبال کی افتادِ طبع انگریزی شعراء شیلے، ورڈزورتھ وغیرہ سے قریب تھی۔ ان کا ذوق انہی رومانوی شعراء کا ہم رنگ تھا۔ اکبر طریق تو اختیار کرنے کے باوجود غزل گو ہی رہے۔ اور پھر قدرت نے انہیں طنز کا بادشاہ بنا لیا تھا۔ اس صنف کے لئے جو تیکھا پن جو ہنسانے کا سلیقہ چاہئے۔ ایسا کہ وہ ہنسانے کے ساتھ ہی ساتھ رلائے بھی تو اکبر کو مبدءِ فیاض سے بدرجۂ اتم میسر آیا تھا۔ انہوں نے پرنسلے کے الفاظ میں خالص طنز ہی کو اپنایا جس کا مقصود تفریح یا خندہ آوری نہیں بلکہ تیز و تلخ تنبیہ و اصلاح ہے۔ ان کے اشعار کی تہہ میں ایک شدید جذبہ و مقصد ہے۔ اسی لئے ان میں یکسوئی کی بھرپور شدت ہے۔ یہاں تفنن کی کوشش سے ذہن کسی اور طرف منحرف نہیں ہوتا۔ اسی لئے شدت میں بھی کوئی فرق نہیں آتا۔ یہی اکبر کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔

اکبر نے اپنی بے پناہ تنقید سے اہلِ وطن کو چونکا دیا کہ دیکھنا غیروں کی تقلید کے شوق میں اپنے آپ کو نہ بھول جانا۔ مغرب سے استفادہ ضرور کرو مگر اپنے ماضی کی میراث کو فراموش نہ کرو۔ اپنا توازن برقرار رکھو۔ اگر اس وقت یہ آواز بلند نہ کی جاتی جب کہ لوگ تقلیدِ مغرب کے شوق میں دیوانے ہو رہے تھے تو بہت بڑا اندیشہ تھا کہ مشرق تمام تر مغرب ہی نہ بن جائے۔ اکبر نے اس اندھا دھند میلان کو روکنے میں ایک زبردست کردار ادا کیا اور ان کے کام کو بلاشبہ ہماری ملت کی تاریخ میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اگر اکبر اور اقبال نہ پیدا ہوئے ہوتے تو آج جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا وجود بھی نہ ہوتا۔

جب اکبر نے آنکھ کھولی تو برطانیہ کی عظمت کا سکہ بیٹھ چکا تھا تعلیم، تہذیب، معاشرت، سیاست، اخلاق، عادات سب پر انگریزی تمدن کی چھاپ بہت گہری اور دیرپا نظر آتی تھی۔ اور مسلمانوں کی دم توڑتی ہوئی تہذیب تقریباً مغربی تہذیب میں ضم ہو کر رہ گئی تھی۔ برصغیر پر مغرب کا جادو چل چکا تھا۔ اور اس زہر کا تریاق ملنا مشکل تھا۔ دانشِ فرنگ، اقبالِ سرکار وغیرہ ہر کہہ و مہ کے ذہن پر چھا گئے تھے۔ اور جو اہلِ فرنگ جو اہلِ ہند ... کی نگاہوں میں ملعون تھے، اب ... خیر و برکت تصور کئے جاتے تھے۔ اکبر نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور چونکہ وہ فطرت ... [illegible] ... بہت گہرائی سے ... قدامت ... قدرت کی طرف سے عطا ہوئی تھی، اس لئے انہوں نے مغربیت کا طلسم ... [illegible]

ہے سب کچھ کہہ دیا اور سیاست پر اس طرح چوٹیں کیں کہ سننے والا بھی حیران اور کہنے والا بھی شرمندہ نہ ہوا اور نہ مدبرانِ فرنگ کی طرف سے دار و گیر ہو سکے اور نہ وہ قید و بند کا شکار ہوئے یہ حکمتِ عملی جو انگریز کی شہرۂ آفاق حکمتِ عملی کا برجستہ جواب تھی اور فن کی کامیابی کی دلیل، ان کی دربارِ دوام میں شہرت عام کا باعث ہوئی۔ انہوں نے بلاشبہ اپنے عہد کے حالات کی طرف اعتنا کیا، اس پر نہایت پُرمغز اور برمحل تبصرہ کیا۔ اس لئے وہ حقیقتاً "لسان العصر" تھے لیکن ان کی حیثیت اس سے بلند تر بھی تھی۔ ان کا تبصرہ، ان کی تنقید بنیادی تھی۔ اس کا براہِ راست قوم کی تمام زندگی، اس کے ماضی، اس کے حال، اس کے مستقبل سے تعلق تھا۔ انہوں نے دوامی اور آفاقی اقدار کو ملحوظ رکھا۔ وہ ایک حقیقت نگر سے زیادہ سنجیدہ مفکر، بلند نظر حکیم، ایک محرمِ رازِ صوفی اور نباضِ فطرت تھے۔ وہ اپنے زمانہ کے لئے ہی نہیں تمام زمانوں کے لئے تھے۔ اور یہ تمام باتیں انہیں اقبال کی طرح "غیر فانیوں" کے زمرہ میں شامل کرتی ہیں۔ اس لئے خواہ ان کے طنزیہ نشتر آج وہ کام نہ کرتے ہوں جو کسی زمانہ میں کیا کرتے تھے، خواہ ان کی شاعری میں ذاتی حیثیت سے وہ کیف نظر نہ آئے جس سے کبھی اربابِ شوق و آرزو پر وجد طاری ہوا کرتا تھا، پھر بھی ان کا شمار ہمیشہ ہمیشہ اُن برگزیدہ ہستیوں میں رہے گا جنھوں نے فکر و فن اور تاریخ و تہذیب کے سرمایہ میں معتدبہ اضافہ کیا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر توسنِ حیات کو مہمیز کیا ہے۔

★

فیضِ دوام

(اقبال کی خدمت میں)

شیدا گجراتی

تری نوا نے ہمیں اک نیا چمن بخشا
گلوں کو عظمتِ رفتہ کا پیرہن بخشا

چمن کو نکہتِ نسرین و یاسمن بخشی
غزالِ دشتِ محبت کو اک ختن بخشا

گلوں کو رنگ، بہاروں کو تازگی بخشی
دلوں کو شعلۂ احساسِ روح و تن بخشا

بھٹک رہا تھا دھندلکوں میں کاروانِ حیات
مسافرانِ محبت کو اک وطن بخشا

دلوں کو تو نے عطا کی یقین کی تابانی
مٹے ہوؤں کو جوانی کا بانکپن بخشا

شکوہ و سطوتِ پرویز سر پٹکتی رہی
دلوں کو ولولۂ عزمِ کوہکن بخشا

گدازِ عشق سے محروم ہو چلا تھا حرم
پھر اس کو عظمتِ اسلاف کا چلن بخشا

خیال و فکر سے عاری تھے انجمن والے
خیال و فکر کو احساسِ انجمن بخشا

بہائے دولتِ پرویز کے عوض تو نے
ہم اہلِ درد کو گنجینۂ سخن بخشا

رقیبِ سروساماں!

جمیل نقوی

یہ چمکتے ہوئے تارے یہ فلک سبز نجوم
رقص کرتے ہیں خلاؤں میں نہ جانے کب سے
آسمانوں کی گھنی وسعتیں تھک جاتی ہیں
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے طلوعِ شب سے

رات ڈھلتی ہے تو احساسِ زیاں ہوتا ہے
غمِ فردا غمِ ماضی پہ گراں ہوتا ہے
صبحِ کاذب کے سحر خیز دھندلکوں کا طلسم
سر پہ چھایا ہوا آہوں کا دھواں ہوتا ہے
لبِ خاموش پہ ہو لاکھ تبسم رقصاں
شب کا افسانہ نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے

راس آجائے اگر کام و دہن کی تلخی
یہ وفائیں، یہ جفائیں، بخدا کچھ نہ رہے
پختہ ہوجائے اگر ذوقِ نظر، ذوقِ جمال
حُسن مغرور بجز حُسنِ ادا کچھ نہ رہے
ہر طرف کچھ نہ نظر آئے بجز غنچۂ گل
ایک گلرنگ تخیل کے سوا کچھ نہ رہے

عشق گر خاصۂ فطرتِ انسانی ہے
تو بہر رنگ رقیبِ سروساماں کیوں ہو
"بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل"
جو تری بزم سے نکلے وہ پریشاں کیوں ہو

دلِ مجبور کہ ہے حُسن کے جلووں کا امیں
حُسنِ برہم کے تصوّر سے گریزاں کیوں ہو

لاکھ، جذبات کے ابرو پہ شکن ہو لیکن
عشق خود دار سنورتا ہی چلا جاتا ہے
گردشِ دہر کے گلخن میں جنوں کا کندن
جتنا تپتا ہے نکھرتا ہی چلا جاتا ہے
دل میں قائم ہے اگر ضبطِ تمنا کا نظام
غم کا طوفان اترتا ہی چلا جاتا ہے

زندگی صرف تمناؤں کا جھولا ہی نہیں
رقصِ پرویں بھی ہے اور گردشِ ایام بھی ہے
زندگی کارگہِ دہر کا آئینہ ہے
روزِ روشن بھی، سلگتی ہوئی اک شام بھی ہے
زندگی ایک حقیقت بھی ہے افسانہ بھی ہے
زندگی زہر بھی ہے بادۂ گلفام بھی ہے

میرے سینہ میں بھی پنہاں ہے دھڑکتا ہوا دل
قربِ محبوب کی دولت بھی ملی ہے مجھ کو
ستم و جور کے نشتر بھی چبھے ہیں دل میں
حُسن سرکش سے محبت بھی ملی ہے مجھ کو
گلشنِ حُسن سے بھی پھول چُنے ہیں میں نے
غم کے کانٹوں سے اذیت بھی ملی ہے مجھ کو

میں کہ اک شاعرِ وارفتہ و آشفتہ مزاج
رسم و راہِ چمنِ دہر سے بیگانہ نہیں
لاکھ دل شدّتِ احساس سے بیتاب سہی
رنگ و نیرنگِ تصور کا جلو خانہ نہیں
آپ کے حسنِ جنوں خیز کے جلووں کی قسم
آپ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہوں، دیوانہ نہیں

★

طلسمِ خواب

شہاب رفعت

میں راوی کے کنارے دھیرے دھیرے
اکیلا ناؤ کھیتا جا رہا تھا
شفق کی دھیمی دھیمی جھلملاتی
سنہری ارغوانی روشنی گھولی ہوئی لالی
دیے کی بجھتی بجھتی لَو!
خماریں ہلکا ہلکا سرخ پانی، سحر کا پھونکا ہوا سا
پینکی لہروں کے میٹھے میٹھے ہلکے کنمناتے زمزمے
اک بہکی بہکی راگنی جیسے
کوئی سادھو جو پہنے ڈھیلا ڈھالا گیروا چولا
ہَون میں ہولے ہولے میٹھے میٹھے منتر گاتا ہو
"ہری ہرا وم ادم" اس کے دہن سے اس طرح نکلیں
کہ ان سے داسیوں کی آتما پر کیف چھا جائے
وہ کشتی ڈولتی، اک بلبلہ سا۔ تیرتا جادو!
میں کھیتا جا رہا تھا ناؤ، کھیتا ہی گیا، جیسے
میں خود بھی ناؤ تھا، بہتی ہوئی کشتی
جو آپ ہی آپ کھنچتی جا رہی تھی!
لہروں لہروں، روح سیلانی
یونہی چلتی گئی چلتی گئی چلتی گئی کشتی
نظر آتے تھے پُل کے بھاری بھرکم پیلتن پائے
کسی جادوگرِ مشاق کی بیگاریں جیسے
اٹھا رکھا ہو اک بارِ گراں جنات نے سر پر
چلی آتی تھیں یوں جنگل کی جانب دور سے کھنچ کر
قطاریں ہی قطاریں دم بخود خاموش کونّوں کی

کہ جیسے سوئے مقناطیس کھنچ کھنچ کر چلے آئیں
ہزاراں در ہزاراں ناتواں فولاد کے ذرّے
نہیں، جس طرح آدم خور پودوں کی طرف آئیں
سیہ قسمت پرندے، آدمی اُس تیرا اعظم میں
جسے ہیئت شناسانِ جہاں "تاریک" کہتے ہیں
چلی آتی تھی ایسے ریل بھی یوں اونگھتی جیسے
کوئی افیون کی پینک کا مارا جھومتا آئے
پڑے جنگل میں سوکھے سوکھے پیڑوں کے سڑے ٹہنے
ہوا میں جیسے بھوتوں نے ہوں اپنے ہاتھ پھیلائے
وہ [illegible] لمبے کالے کالے بڑھتے رینگتے سائے!
دمِ [illegible] پھیلتے چمکیلے ذرّے حلقہ در حلقہ
مٹکتے دیدے، جگنوؤں کی طرح، جیسے خلاؤں کے
دریچے سے ہیولے ہی ہیولے جھانکتے جائیں
ہوا کے پنکھ کا سرّاٹا، سنّاٹوں کو تھرّاتا!
چھپک پانی کی، چپّو چھپاتے، ہلکی پھلکی سرخ پتواریں
ٹپکتے، ڈوبتے سورج کی پتلی پھانک سی کرنیں
ہوا کا پنکھ! اس کی پھڑپھڑاہٹ، ہلکی ہلکی
کنمناہٹ۔ ہشت! یہ سرگوشیاں پیہم!
مرے گھڑیال کا پنجر۔ یہ ساحل ریتلا چتلا
یہ ٹوٹا پھوٹا ڈھانچہ، ہوبہو بجلی کے کھمبوں کا
یہ رونق ریل پیل اور سیٹیاں۔ اور گیت ملاحی
ارے یہ گھاٹ!
ابھی تو ناؤ بہتی جا رہی تھی دور اُس بن میں!

کوٹ ڈیجی

اللہ بخش راجپوت

گزشتہ پینتیس برس میں پاکستان کے زمانۂ ماقبل تاریخ کے سلسلہ میں ایسی دریافتیں ہوئی ہیں جو غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۲۴ء سے پہلے اس برصغیر کی تاریخ ایک دم یوں شروع ہو جاتی تھی کہ آریا لوگوں کا حملہ ہوا، وہ مغربی پاکستان میں در آئے اور یہاں کے وحشی لوگوں کو جو نہ دین دھرم جانتے تھے نہ قاعدہ قانون، باہر نکالکر ان کی جگہ خود لے لی۔ یہ نظریہ کہ آریا ہی اس ملک بلکہ تمام برصغیر میں تہذیب و تمدن کی روشنی لے کر آئے، مدتوں رائج رہا۔ یہاں تک کہ موجودہ صدی کی دوسری دہائی کے اوائل میں مغربی پاکستان میں وادیٔ سندھ کی تہذیب کے معرکہ آرا انکشافات نے صورتِ حالات بدل ڈالی۔

سابقہ صوبۂ پنجاب کے ایک شہر منٹگمری کے نزدیک ہڑپا اور سابقہ سندھ کے ایک ضلع لاڑکانہ میں موئن جو دڑو کے اہم مقامات پر جو کھدائیاں ہوئیں، اُن سے ایک نہایت ترقی یافتہ تہذیب کا سراغ ملا جو کوئی ایک ہزار میل لمبے علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے برصغیر پاک و ہند کے زمانۂ ماقبل تاریخ کا ایک اور ہی تصور پیدا کر دیا۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے یہ دو مرکز دریافت ہونے کے بعد جو زمانہ گزرا اس میں دریائے سندھ کے کنارے کتنے ہی اور مقامات مثلاً چھنودڑو، شاہ جو دڑو، لوہم جو دڑو، علی مراد، غازی شاہ، گورندی، ڈھل، امری، کرچت، تھانہ بولاخان، اللہ دینو، کوتاسر اور ڈیجی جی ٹکری دریافت ہوئے جو اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس کے بعد ہڑپا اور موئن جو دڑو میں وسیع پیمانہ پر کھدائیاں ہوئیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ایک حد تک وادیٔ سندھ کی تہذیب عراق کی تہذیب کی معاصر ہے جس کا زمانہ فروغ ۲۳۰۰ سے ۵۰۰ [illegible] تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر کے اردگرد دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کی اونچی اونچی دفاعی فصیلیں اور بھٹی میں پکی ہوئی اینٹوں سے بنے ہوئے رہائشی مکانات، پبلک ہال اور دیگر عمارات تھیں جو بڑی بڑی کشادہ سڑکوں کی دونوں طرف بنی ہوئی تھیں۔ اور یہ سڑکیں ایک بہت عمدہ منصوبے کے مطابق بنائی گئی تھیں۔ یہاں کی شہری زندگی کا ایک غیر معمولی پہلو بڑے بڑے پبلک تالاب یا حوض تھے جن کے اردگرد اینٹوں کی سیڑھیاں بنی تھیں اور ساتھ ہی غسل خانوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں جن کے بہت خوش اسلوبی سے بنے ہوئے چبوترے تھے اور ڈھکی ہوئی بدرویں بھی۔

ان مقامات سے جو چیزیں ملی ہیں ان کی کیفیت یہ ہے: کانسی اور پیتل کے ہتھیار مثلاً کلہاڑیاں، خنجر اور نیزے۔ ہاتھی دانت، منکوں، گھونگوں اور ہڈی سے بنے ہوئے زیورات۔ سونے چاندی کے جڑاؤ گہنے بڑی کاریگری سے بنے ہوئے۔ پیتل کے برتن، سوت اور اون۔ ابرقی اور مختلف رنگوں کی مٹی سے بنی ہوئی بے شمار طرح طرح کی مہریں جن پر مختلف جانوروں مثلاً بیل، ہاتھی، ہرن وغیرہ کے نقوش کندہ ہیں اور ساتھ ہی ایک ایسے خط میں کچھ لکھا ہوا ہے جسے ماہرین ابھی تک پڑھ نہیں سکے۔ اس تہذیب اور اُن تہذیبوں کی تاریخ میں جو مصر و عراق کے معاصر شہروں میں تھیں، بعض حیثیتوں سے نمایاں فرق ہے۔ چونکہ وادیٔ سندھ کی تہذیب جیسا کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے، اور ملکوں سے بہت دور بالکل الگ تھلگ نشو و نما پاتی رہی۔ اس لئے اس کی تاریخ تمدن میں کوئی حادثہ یا اچانک انقلابات نظر نہیں آتے۔ کھدائی کرنے پر اس علاقہ سے جو ہتھیار، زیورات اور ظروف ملے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے باشندے صدہا سال پیتل کے پھل کی بڑی پرانی وضع کی چپٹی کلہاڑی استعمال کرتے رہے مگر ظروف سے معلوم ہوا ہے کہ اندازاً پانچ سو سال سے لے کر آٹھ سو سال کے عرصہ میں جب کہ یہ تہذیب قائم رہی، اس کی ثقافت میں یقیناً تدریجی نشو و نما ہوئی۔ اس تہذیب کے ابتدائی نمائندوں نے جو ظروف بنائے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بنانے کا کوئی سکہ بند اسلوب نہ تھا۔ ان مقامات کی تمام سطحوں سے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے مٹکوں، ہنڈیوں، تھالیوں، طباقوں اور گلاسوں کے عام کھپت کے لئے وسیع پیمانہ پر بنائے جانے کی شہادت ملتی ہے۔ ان کی وضع بتدریج یکساں ہوتی گئی۔ نسبتاً بعد کے زمانہ میں بالائی سطحوں سے جو ظروف دستیاب ہوئے وہ گھٹیا، موٹے موٹے اور بھدے بھدے ہیں۔

جو تبدیلیاں موئن جو دڑو اور ہڑپا کی ظروف سازی کے سلسلہ میں نظر آتی ہیں وہی ان کے فن تعمیر اور شہری زندگی میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ فن تعمیر کا سب سے پہلا

کوٹ ڈیجی
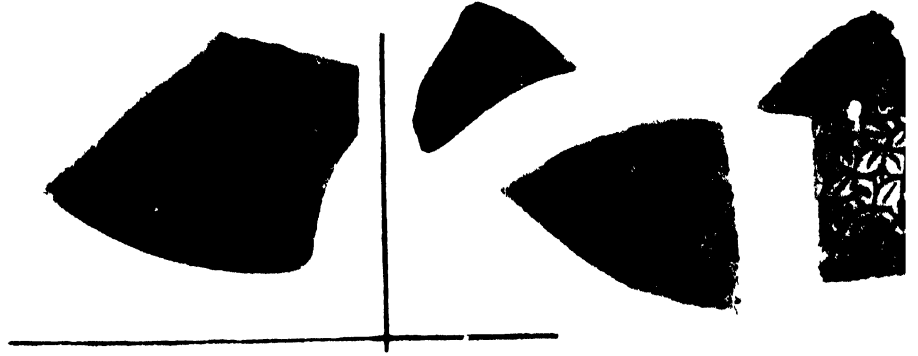
منقش مٹکا

شکستہ ظروف کے ٹکڑے

صنعت کاری کے مختلف نمونے (ہڑپا کے آباد کاروں کا کام)

کھدائی کے بعد کا منظر

کوٹ ڈیجی کی مختلف سطحوں سے برآمد شدہ ظروف

کوٹ ڈیجی کا شہر اور قلعہ

کوٹ ڈیجی - ۲

بصوی مٹکا جس پر
خوبصورت نقاسی ہے
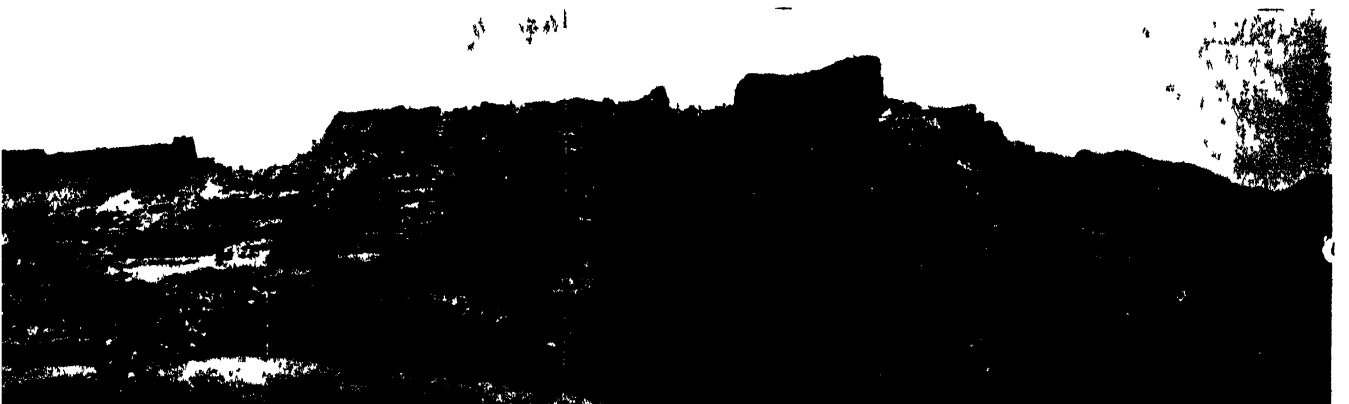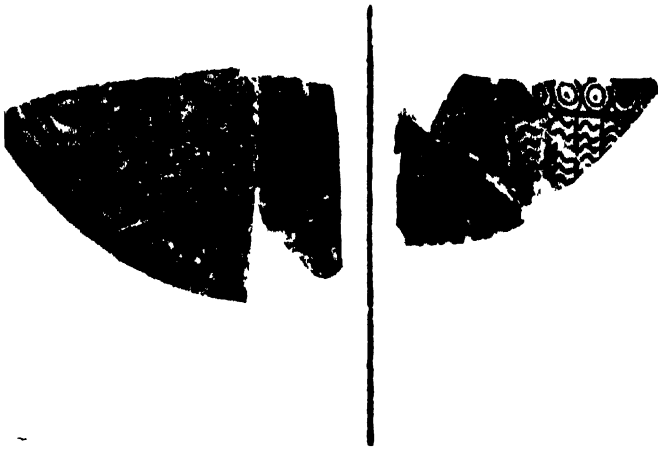
برتنوں کے نفیس آرائشی نقوش

گھڑے پر نقش و نگار
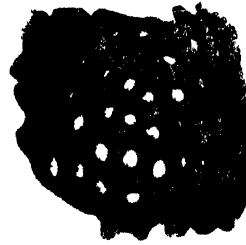
مٹی کی جالی
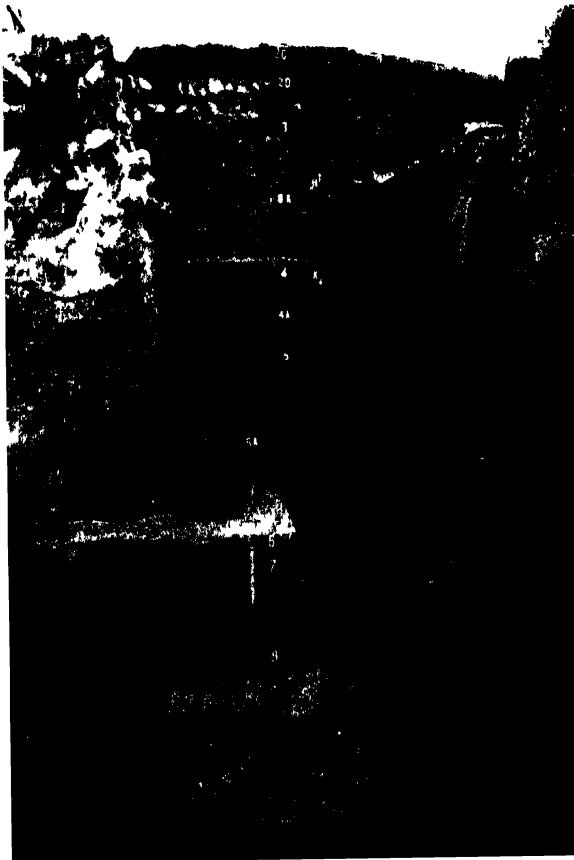
کھدائیوں کی مختلف تہیں

نمونہ دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کی بنی ہوئی قلعہ کی فصیل ہے جب کہ بعد زیادہ ترقی یافتہ فن کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی خود قلعہ، پبلک عمارات اور شہر جس کی خاکہ بندی بڑے اہتمام وسلیقہ سے کی گئی ہے۔ یہ سب کام بھٹی میں پکی ہوئی اینٹوں ہی سے کئے گئے ہیں۔ آخر میں جس طرح ظروف سازی کا فن اور معیار گر گیا۔ اسی طرح عمارت سازی کی خوبی اور معیار میں بھی فرق آگیا۔ جیسا کہ ان ادنیٰ عمارتوں سے ظاہر ہے جو قلعہ کے کھنڈرات پر بنائی گئی ہیں۔ غرض یہ ہے وادیٔ سندھ کی تہذیب کی مختصر کہانی جس کا پتہ موئن جودڑو اور ہڑپا کے مقامات پر مسلسل تیس سال کی پُرمشقت کھدائی اور تحقیق سے چلتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دریا کے کنارے پر واقع نہایت مطمئن اور بالکل الگ تھلگ آبادی کا فضائی، اقتصادی اور سیاسی انحطاط ایک قدرتی اضمحلال کا نتیجہ تھا جو بڑھتے بڑھتے آریاؤں کے حملے سے جاملا۔ آریاؤں کے دَل پر دَل آئے اور اُن کی بے دریغ تاخت وتاراج نے ۱۵۰۰ سے ۱۳۰۰ ق م کے درمیان کسی وقت اِس تہذیب کا خاتمہ کر دیا۔

یہ بے نظیر اور حیرت انگیز ماقبل آریائی تہذیب جس نے فنی مہارت اور صناعی میں اس قدر اعلیٰ درجہ پیدا کیا تھا اور جس کا ایک کافی ترقی یافتہ رسم الخط بھی تھا، ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور اہلِ تاریخ میں ایک چوتھائی صدی سے زیادہ دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ ان لوگوں کی اصل اور ان کا رسم الخط بہت ہی بحث انگیز موضوع رہا ہے۔ یہاں کے رسم الخط کے بارہ میں کتنے ہی دلچسپ نظریئے پیش کئے گئے ہیں مگر زبان تو کیا اس کی ابجد کے بارہ میں بھی کوئی عالم کسی دوسرے عالم سے اتفاق نہیں کرسکا۔ اسی طرح اس کی تہذیب کا سراغ مختلف بیرونی اثرات میں لگایا گیا ہے یا مقامی اسباب کو اس کا ذمہ دار گردانا گیا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکا۔ چونکہ موئن جودڑو کی نچلی تہوں میں زمین سیلی ہے۔ اس لئے وہاں گہری کھدائی ممکن نہ تھی۔ اس وجہ سے اس تہذیب کے ارتقائی مدارج کا پتہ نہ چل سکا اور ان کے متعلق قیاس آرائی کا میدان کھلا رہا۔ مگر حال ہی میں سندھ کے اس پار موئن جودڑو کے مشرق میں کوئی ۳۰ میل دُور ڈیجی جی ٹکری یا کوٹ ڈیجی کے مقام پر جو سرسری کھدائی ہوئی ہے اس سے تاریخ میں پہلی بار اس عظیم الشان تہذیب کے ابتدائی مرحلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ہڑپا کے ظروف پر جو گہری سرخ چکنی مٹی کی پتلی تہہ پائی جاتی ہے، یہاں کے ظروف میں ابھی ٹھیک طرح ترقی پذیر نہیں ہوئی۔ تاہم سرخ زمین پر سیاہ آرائشی نقوش بالکل واضح ہیں۔ اس قسم کے پیچیدہ مگر دلچسپ نقوش جیسے ہڑپا اور موئن جودڑو کے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے دائرے اور پیپل کا پتہ بالائی سطحوں میں موجود نہیں۔ ان کی بجائے ہرن اور مور کے نقوش ہیں۔ یہ دلکش طرحوں اور شکلوں کے بڑی گھٹی ہوئی لیس کے ظروف جو چرخ سے بنائے جاتے تھے۔ رنگ میں گلابی سے لیکر سرخ تک ہیں۔ آرائش زیادہ تر ظروف کے گلوں پر چوڑی چوڑی سرخ یا دامی اور خاکی رنگ کی پٹیوں پر مشتمل ہے۔ اور باقی حصہ پر مچھلی کے چھلکوں کے سیاہ رنگ میں طرح طرح کے پیچیدہ لچھے دار ڈیزائن اور لہریا دھاریاں ہیں۔ نیز کچھ سیاہ وسفید پیچیدہ نقوش بھی جن میں ایک سینگوں والی دیوی کی مورت پیش کی گئی ہے۔ یہ دوسری قسم کے نقوش برصغیر کی قدیم ظروف سازی میں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ اور خاصے ترقی یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔ مختلف رنگوں کی چوڑی چوڑی پٹیوں کے علاوہ دیگر آرائشی نقوش باریک افقی خطوط پر مشتمل ہیں جو کبھی ایک کبھی زیادہ پھولوں اور لہروں سے ملے جلے نظر آتے ہیں۔

کوٹ ڈیجی اور ہڑپا وموئن جودڑو کے ظروف میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ کوٹ ڈیجی کے ظروف زیادہ ہلکے پھلکے اور پتلے پتلے ہیں اور دوسرے زیادہ دَل دار اور بھاری بھرکم۔ آرائشی اشکال میں بھی فرق اس قدر نمایاں ہے کہ دونوں کا بنیادی فرق بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ دونوں میں رنگوں کی ترتیب کا الگ الگ انداز، نرالی وضع اور منفرد آرائشی اسلوب۔ ان ساری باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوٹ ڈیجی کے ظروف ایک ایسے تمدن کی نشانی ہیں جو ہڑپا اور موئن جودڑو کے تمدن سے پہلے کا تمدن بھی ہے اور اس سے الگ بھی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کوٹ ڈیجی، موئن جودڑو کے تقریباً بالمقابل دریا کی دوسری طرف واقع ہے۔ اس لئے یہ بہرطور اس وادی ہی کی پیداوار ہے مگر اس جگہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں گہری کھدائی کرنے سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ ہڑپا اور موئن جودڑو تمدن کے ابتدائی نمائندے تقریباً فی الفور ہی کوٹ ڈیجی کے ان کھنڈرات پر آباد ہو گئے تھے۔ جو یہاں کی زیریں سطح پر آباد اصلی باشندوں نے اپنے پیچھے چھوڑے تھے۔ اس سے پہلے یہ بات وادیٔ سندھ میں موئن جودڑو، ہڑپا یا کسی اور جگہ پر زمین کی نچلی سطحیں سیلی ہونے کے باعث ثابت نہیں کیا جاسکا تھا۔

ڈاکٹر ایف۔ اے خان، جنھوں نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کے شہرۂ آفاق ماہرینِ آثارِ قدیمہ، سرجان مارشل، دی گارڈن چائیلڈ اور سرمارٹیمر وہیلر سے آثار کاری میں تربیت حاصل کی تھی، کے زیرِ نگرانی کوٹ ڈیجی پر جو خفیف سی کھدائی ہوئی ہے اس سے اس امر کی کافی شہادت بہم پہنچتی ہے کہ یہاں کے اصلی باشندوں

کا ایک اپنا بہت ترقی یافتہ تمدن تھا۔ جس سے ہڑپا اور موئن جودڑو والوں نے بعض فنی اور دیگر تصورات حاصل کئے۔ ان میں شہر کی خاکہ بندی، قلعہ بندی اور غالباً مذہبی شعائر اور عقائد بھی شامل تھے۔

موئن جودڑو کی طرح کوٹ ڈیجی میں بھی شہر کے دو نمایاں حصے ہیں: بالائی اور زیریں۔ جن میں سے دوسرے حصے میں ایک بھاری بھرکم قلعہ تعمیر کیا گیا ہے۔ کوٹ ڈیجی کے بھی دو واضح حصے ہیں: ایک ۵۰۰ فٹ لمبا، ۳۰۰ فٹ چوڑا اور ۴۵ فٹ اونچا قلعہ ہے اور دوسرا خود شہر۔ قلعہ کی فصیل کافی اونچی اور چوڑی ہے۔ یہ ایک دریا برآمد زمین کے نیچے کی چٹان پر بنایا گیا ہے۔ نیچے بنیاد میں بغیر مسالے کے پتھر جڑے ہیں، اور اوپر کی عمارت میں کچی اینٹ اور گارے کی چنائی ہے۔ ہڑپا اور موئن جودڑو کی فصیلوں کے حفاظتی پشتے بھی کچی اینٹوں اور گارے سے بنے ہیں۔ اور ان کے باہر کی طرف بھی ان میں پکی ہوئی اینٹوں کی تہہ جمی ہے۔

کوٹ ڈیجی میں بھی فصیل کو مضبوط کرنے کے لئے باقاعدہ وقفوں کے بعد برج بنائے گئے ہیں۔ ویسے ہی جیسے بعد میں ہڑپا میں بنائے گئے۔ قلعہ کا استعمال جیسا کہ ہم ہڑپا اور موئن جودڑو میں دیکھ چکے ہیں، کوٹ ڈیجی سے ملتا جلتا ہے۔ یہ حکمران طبقہ کا دفتر بھی تھا اور اس کی رہائش گاہ بھی۔ پھر کوٹ ڈیجی میں بھی ترقی یافتہ اور خوشحال معاشرہ کے باعث وہی جانا پہچانا نقشہ نظر آتا ہے۔ قلعہ کے بالائی درجوں میں بڑے کھلے کھلے کمرے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کی بنیادیں پتھر کی ہیں اور بالائی عمارت کچی اینٹوں کی۔ کبھی اینٹوں کے فرش، دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کی دیواریں اور چٹائی کی چھتیں جن پر مٹی گارے سے پلستر کیا گیا ہے۔ یہ ہیں شہری عمارات کی نمایاں خصوصیات۔

مٹی کے برتنوں اور طباقوں کے علاوہ غلہ جمع کرنے کی بڑی بڑی کوٹھیاں، ماتا دیویاں اور جانوروں کی پختہ مٹی کی مورتیوں کے علاوہ کھیلنے کی گولیاں اور گیند، اور پختہ مٹی و پتھر کی بنی ہوئی چوڑیاں اور منکے بھی ملے ہیں۔ اسی طرح پختہ مٹی کی بنی ہوئی ایک بیل کی مورتی بھی ملی ہے۔ بیل کا ڈیل ڈول خوب ہے۔ اور سینگ چھوٹے نوکدار۔ اس کا انداز ان مورتیوں سے بہت مختلف ہے جو موئن جودڑو، ہڑپا اور بلوچستان سے ملے ہیں۔ اس کے برعکس یہ اُس بیل سے ملتا ہے جس کا نقش جنوب مغربی ایران کے قدیم شہر شوش کے سرخ رنگ کے ظروف (۲۸۰۰ - ۲۷۰۰ ق م) پر دکھائی دیتا ہے۔ چوڑیاں سادہ بھی ہیں اور مٹی اور گھونگوں پر کاڑھی ہوئی بھی۔ لیکن منکوں میں کڑھے ہوئے نقوش ہیں اور گولیاں پختہ مٹی سے بنی ہوئی اور سڈول ہیں۔ کوٹ ڈیجی سے پنڈول کی نمونے کی روٹیاں اور ٹکلوں سے ملتی جلتی سویاں بھی کافی تعداد میں ملی ہیں۔

ان کے علاوہ پتھروں کا اندرونی حصہ اور پرت بھی ملے ہیں۔ ان سے مختلف چیزوں کے پھل، کھرچنے کے آلات، تیروں کی انیاں اور درانتیاں کاٹ کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ یہیں پتے کی شکل کے بڑی صفائی سے بنے ہوئے تیروں کے نگین پھل بھی ملے ہیں جو قبل ازیں بلوچستان اور سندھ سے ملے تھے لیکن وادئ سندھ سے باہر برصغیر میں اور کہیں نہیں ملے تھے۔ پتھر کے ان اوزاروں اور تیروں کے پھلوں کے ساتھ کانسی کے پھل بھی ملے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوٹ ڈیجی کا تمدن حجری انقلاب کے فوراً ہی بعد نمو پذیر ہوا۔ اور اس کا ظروف سازی سے قبل، نیز ابتدائی حجری دور کہیں اور بسر ہوا۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کوٹ ڈیجی کے لوگ یہاں اس وقت آباد ہوئے جب ان کا فن ظروف سازی اعلیٰ پیمانہ پر ترقی کر چکا تھا اور وہ اس جگہ کافی عرصہ مقیم رہے جیسا کہ اوپر تلے آبادی کی گیارہ تہوں سے نظر آتا ہے۔ اُن متواتر گیارہ آبادیوں کو کم از کم ۵-۶ سو سال گئے ہوں گے جیسا کہ ہڑپا اور موئن جودڑو (جس کی تاریخ اب تقریباً ۲۵۰۰ ق-م مقرر کی گئی ہے) کی تہوں کا اندازہ ۵-۶ سو سال کیا گیا ہے۔ اس اندازے کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوٹ ڈیجی کے اصلی باشندے یہاں ۳۰۰۰ ق-م کے لگ بھگ آئے ہوں گے اور چھ سات سو سال رہے ہوں گے۔ یہاں تک کہ ہڑپا، موئن جودڑو والوں نے ان کی جگہ لے لی۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مذکورہ بالا گیارہ متواتر تہوں کے سب سے اوپر جلی ہوئی چیزوں کی ایک دبیز تہہ جمی ہوئی ہے اور یہ تہہ اس تمام علاقے میں موجود ہے جس میں کھدائی کی گئی ہے۔ راکھ کی یہ دبیز تہہ کسی اتفاقی آگ کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ کسی دشمن کی خوفناک آتش زدگی کا نتیجہ ہے جس نے کوٹ ڈیجی کی ساری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا اور ہڑپا اور موئن جودڑو کے نو آباد کاروں کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

اس طرح جہاں کوٹ ڈیجی کی کھدائی سے تاریخ کا سلسلہ موئن جودڑو کی تہذیب کے ابتدائی سلسلوں سے براہ راست مل جاتا ہے۔ وہاں پاکستان کی قدیم تاریخ میں، جس حد تک ہم اسے جانتے تھے، ۷۰۰ سال کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کی قدامت ۲۳۰۰ ق-م سے ۳۰۰۰ ق.م تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس سے ایک اور بڑا ترقی یافتہ تمدن بھی آشکار ہوا ہے جو پاکستان کی اس قدیم ترین تہذیب سے جس کا ہمیں تا حال علم تھا، پہلے موجود تھا۔ اس صورت حال

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

ذیل پاک پاکستان کی صنعت کیلئے

باعث فخر ہے

مینیجنگ ایجنٹس:-

پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

افسانہ:

حجاب امتیاز علی

اسے سٹیچر پر ڈال کر آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ وہ آج صبح اپنی بالائی منزل کے شہ نشین میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ صبح بے حد روشن اور نہایت حسین تھی کہ اچانک وہ کئی سو فیٹ نیچے زمین پر آ رہا۔ اسے بظاہر کسی نے دھکا نہیں دیا تھا۔ نہ شہ نشین کا فرش ہی اتنا کمزور تھا کہ اس کے بوجھ کو نہ سہار سکتا۔ پھر وہ اچانک نیچے کیسے آ رہا؟ —— اور بھلا اس میں سوچنے کی بات بھی کیا ہے؟ یہ بالکل ایک ویسا ہی حادثہ تھا جیسے ہر روز وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ خود گرنے والے میں بھی اتنی خود آگاہی نہ تھی کہ اپنے گر پڑنے کی وجہ پر غور کرتا۔ ویسے اسے بخئے ادھیڑنے کی عادت بھی نہ تھی۔ ظاہر ہے یہ اس کے پاؤں کی لغزش تھی کہ وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور کئی سو فیٹ کی بلندی سے نیچے آ رہا۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے یہ وجہ بالکل صحیح ہے کہ وہ توازن قائم نہ رکھ سکنے کی وجہ سے نیچے گر پڑا۔ اور ہر حادثے یوں ہی ہوتے ہیں!

جب وہ آپریشن تھیٹر میں لایا گیا تو ہر چند اس کا جسم لاش کی طرح بے حس و حرکت تھا مگر اس کے دماغ میں سمندر کا سا تلاطم بیکراں تھا۔ وہی مدوجزر۔ وہی طوفانی لہریں...... انسانی ذہن لمحہ بھر کے لئے بھی تفکرات و کشمکش سے معرا نہیں ہوتا!

وہ اپنے ماحول سے یکسر بے نیاز تھا۔ اسے نہ تو نرسوں کی سفید ٹوپیاں نظر آ رہی تھیں نہ ڈاکٹروں کے نقاب پوش چہرے۔ آپریشن تھیٹر کی تیز روشنیوں کے لئے اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔ اور قینچیوں اور چھریوں کی آوازوں کے لئے اس کے کان بہرے۔ کیونکہ جب ہم ماضی کی کسی چیونٹی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں حال کا سامنے کھڑا ہوا پہاڑ بھی نظر نہیں آتا۔ اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ یہاں کیوں لایا گیا ہے! البتہ اس کے حافظے کے کان اور ذہن کی آنکھیں بہت دور کچھ دیکھ رہی تھیں۔

”منّو! منو!“ —— اس کے کان میں آواز آئی۔ وہ سوچنے لگا یہ کس کا نام تھا جو ماضی کی گہری وادیوں میں اب تک گونج رہا ہے؟ ——

پھر اسے اچانک یاد آیا منّو کتّے کا ایک پلّا تھا جسے اس نے اپنے کسی دوست سے مانگ کر بڑے چاؤ سے پالا تھا۔ مگر منّو اتنا چھوٹا تھا کہ وہ نہ دودھ پی سکتا تھا نہ اپنے آپ کو سنبھال سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ساری ساری رات اپنی درد انگیز آواز میں آہ و زاری کیا کرتا۔ جسے سن کر محلے کے لوگ بیزار ہو گئے تھے محلے کے لوگ ایک طرف۔ خود اس کی ماں کو اس پلے سے خدا واسطہ کا بَیر ہو گیا تھا۔

کئی دفعہ اس کی ماں نے جل کر کہا تھا ”اسے واپس کر دو ورنہ میں اسے زہر دے دوں گی۔ کمبخت ساری ساری رات چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا رکھتا ہے ——“

مگر آج اتنے سالوں بعد اسے منّو کیوں یاد آ رہا ہے؟!

پھر یوں ہوا کہ منّو کو زہر تو نہیں دیا گیا مگر قدرت خود اس کے درپئے آزار ہو گئی۔ سڑک پر کھیل رہا تھا کہ ایک بائسکل کے نیچے آ گیا۔ اس حادثے کے بعد منّو اس کی ماں کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ منّو کے زخم کے لئے بازار سے فوراً دوا منگوائی گئی۔ اس کی مرہم پٹی ہوئی۔ اس کے لئے نیا بستر آ گیا۔ اب منّو کی بے وقت کی راگنی بھی اس کی ماں کو بری نہیں لگتی۔ بچارہ کتّا! زخمی ہو گیا تھا!

پھر منّو کے بھونکنے کی آواز اس کے ذہن سے رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگی۔ اور چند ہی سال پہلے کا ایک واقعہ ذہن کے پردوں پر ابھر آیا۔

اس دن جمعہ ہونے کی وجہ سے اسے دفتر سے جلدی چھٹی مل گئی تھی۔ اس لئے اس نے رستے ہی میں ارادہ کر لیا کہ آج فیروزہ کے ساتھ کشتی رانی کے لئے چلنا چاہئے۔ اور چائے بھی وہیں پینی چاہئے۔ راستہ میں ایک بے تکلف دوست کا گھر پڑتا تھا۔ وہاں جا کر اسے بھی ساتھ چلنے پر رضامند کر لیا۔ لمحہ بھر کو خیال

آیا۔ جس دوست کو اس نے ابھی ابھی مدعو کیا ہے بیوی اسے ناپسند کرتی ہے شاید وہ ناراض ہو جائے۔ پھر دل کو سمجھا لیا کہ بیوی کو منا لیا جائے گا آخر احمد اتنا برا آدمی تو نہیں جتنا وہ سمجھتی ہے۔ جھوٹا ضرور ہے۔ مگر جھوٹ کون نہیں بولتا؟ پھر پاس کے رستوراں سے چکن سینڈوچ اور چیز فنگرز خریدے اور جلد جلد گھر کی طرف چلا۔

جب ناشتے کی پڑیاں ہاتھ میں لیکر گھر پہنچا تو اس کا جی چاہتا تھا کہ فرطِ انبساط سے چیخیں مارتا ہوا ننھے بچے کی طرح فیروزہ سے چمٹ جائے اور کہے کہ آج جلدی تعطیل ہو گئی۔ چنانچہ وہ بچوں کی طرح چیخ پڑا:۔ "فیروزہ۔ فیروزہ ——! دیکھو میں کیا لایا —— آج دفتر سے جلدی چھٹی ہو گئی۔"

اس کی بیوی کام کرتے کرتے کمرے میں آگئی:۔ "کیا لے آئے؟"

وہ ہنس پڑا:۔ "چکن سینڈوچ اور چیز فنگرز۔ چلو کشتی رانی کو چلیں۔"

فیروزہ مسکرا کر بولی:۔ "تم تو دفتر سے چھٹی ملتے ہی ایسے خوش ہو جاتے ہو جیسے کوئی بچہ سکول سے نجات پا کر پھولا نہیں سماتا۔"

وہ کسی قدر پشیمان کر بولا:۔ "تم ہر روز دفتر جاتیں تو جانتیں کہ انسانوں کے لئے دفتر اور اس کی پابندیاں وہی معنی رکھتی ہیں جو بچے کے لئے مدرسہ اور اس کی قیود۔ اچھا یہ پڑیاں تم جلد جلد ٹفن باسکٹ میں رکھ دو۔ تھرماس میں گرم گرم چاء بھرو۔ دس منٹ کے اندر اندر سمندر پر پہنچ جانا چاہئے۔ احمد سے میں نے کشتی کے بندوبست کے لئے کہہ دیا ہے۔ وہ وہیں ساحل پر ہمارا انتظار کرے گا۔"

"احمد کی کیا ضرورت تھی —— " اس کی بیوی نے کسی قدر ناراض لہجے میں کہا کشتی بڑی آسانی سے کرائے پر مل جاتی ہے ہم خود وہاں پہونچ کر لے لیتے۔ دراصل مجھے احمد کی شورش پسند طبیعت اچھی نہیں لگتی۔"

وہ ٹالنے کے لئے بولا۔ "خواہ مخواہ تم بچارے کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ بھلا آدمی ہے۔"

"ٹفن باسکٹ میں پڑیاں رکھتے ہوئے بولی:۔ "بھلا آدمی ہی تو نہیں۔"

"مگر اس میں برائی بھی کیا ہے؟"

"چغلخور ہے۔ ادہر کی ادُہر لگاتا رہتا ہے۔ یہ تھوڑی برائی ہے؟ ایسے خطرناک لوگوں سے مجھے نفرت ہے۔"

وہ ہنس پڑا ایسے ہی لوگ تو سیر و تفریح کی جان ہوتے ہیں۔ خیر اس دفعہ معاف کر دو۔ اور آج اس سے ناراض ناراض سی نہ رہو۔ گذشتہ دفعہ بھی وہ تمہاری ناراضی کو پہچان گیا تھا ——"

"اور پھر بھی آج آنے پر رضامند ہو گیا۔ ایسی بے غیرتی کس کو پسند آسکتی ہے۔" فیروزہ نے ابرو چڑھا کر کہا۔

"خیر آج ایک دن تو اسے برداشت کر لو۔ آئندہ کبھی نہ بلاؤں گا۔ وہ اس وقت کشتی کے ساحل پر ہماری راہ دیکھ رہا ہو گا۔"

اور وہ ساحلِ سمندر پر پہونچ گئے۔

اتفاق کی بات کہ اس مختصر سی پارٹی کو سمندری لہروں پر گئے آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ اچانک سیاہ خوفناک گھٹا اٹھی اور اس زور کی آندھی شروع ہوئی اور ہوا کے جھکڑ چلنے لگے کہ کشتی قابو میں نہ رہی اور الٹ گئی۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اور اس کی بیوی تو صحیح سالم ساحل پر پہونچ گئے مگر معلوم ہوا کہ احمد موجود نہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایسا ڈوبا کہ پھر ابھر ہی نہ سکا۔ کسی نے کہا سمندری مچھلیوں کی خوراک بن گیا۔ کسی نے سمجھا کہ دم گھٹنے کی وجہ سے بے ہوش ہو کر رہ گیا اور لہریں اسے بہالے گئیں۔

اس نے محسوس کیا اس المیہ حادثے کا فیروزہ پر بہت زیادہ اثر ہوا ہے۔ وہ نہایت غمگین اور رقت بھری آواز میں کہنے لگی:۔ "آہ! کیا معلوم تھا کہ احمد اس طرح اچانک ہم سے چھوٹ جائے گا!"

"تم کو تو خوش ہونا چاہئے" اس نے طنزیہ کہا تھا۔

"میں اس کی دشمن نہیں تھی۔"

اور پھر دوسرے ہی دن ماہی گیروں نے بے ہوش احمد کو پا لیا تھا۔

وہ علاج کے لئے اپنے گھر لانے سے پہلے بیوی سے مخاطب ہوا۔ "اگر تم ناراض نہ ہو تو میں احمد کو اپنے ہاں لے آؤں۔ اچھا ہو جائیگا تو اپنے گھر چلا جائے گا۔"
فیروزہ نے نہایت جوش سے جواب دیا۔ "ہاں ہاں ضرور لے آؤ۔ ہائی کہ اس حادثے کے بعد تو جیسے میری نفرت دُھل گئی!"
اور احمد اس کے گھر لایا گیا۔

پھر اس نے دیکھا کہ اس حادثہ نے اس کی بیوی کا نقطۂ نظر بدل دیا ہے۔ وہ یا تو اس کی موجودگی برداشت نہ کرتی تھی یا اب وہی فیروزہ ہے کہ اس کی تیمار داری کس چاؤ سے کر رہی ہے۔!

اس نے سوچا اس خطرناک حادثے نے فیروزہ کی نظروں میں احمد کو قابلِ رحم بنا دیا ہے۔

پھر اسے اپنی ماں اور اپنی بیوی کے مزاج میں ایک مطابقت سی محسوس ہونے لگی۔ منو کا واقعہ۔ اور اب یہ احمد کا حادثہ! ماں اور بیوی میں کئی چیزوں کی مطابقت کے باوجود اسے دونوں میں زمین و آسمان کا تفاوت بھی نظر آتا تھا۔ بھلا مرد ایسی عورت کو کیونکر برداشت کرے جس میں اس کی ماں جیسی خوبیاں نہ ہوں؟ —— ہاں اگر یوں ہوتا کہ فیروزہ —— اس کی ماں سے بالکل مختلف ایک اور عورت ہوتی —— اتنی مختلف —— جتنی دن سے رات ہوتی ہے —— تب بھی اسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کی الجھن یہ تھی کہ اسے کئی باتوں میں دونوں ایک سی معلوم معلوم ہوتے ہوئے بھی مختلف تھیں! آہ اسی سے تو کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ اضطرابِ قلب بڑھ گیا تھا! حادثے سے چند دن پہلے ہی وہ اپنی بیوی کے سلسلے میں مغموم سا رہنے لگا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں بیوی کے خلاف شکایات کا ایک دفتر کھلا رہتا تھا۔ وہ کبھی اپنے گلے شکووں کو عملی شکل میں نہ دیکھ سکا، اور دیکھے بھی کیونکر؟ وہ خود اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کے ان شکوہ شکایات کی بنیادی اور اصلی وجہ کیا ہے۔ پھر وہ کیونکر اپنی بیوی سے کسی بات پر لڑ سکتا یا شکایت کر سکتا تھا؟

اسے یاد آیا ایک رات وہ بیوی سے کسی معمولی سی بات پر الجھ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ فیروزہ اس کی اس تکلیف سے پریشان ہو کر اس کے پاس آئے گی اور شاید اس کا سر بھی دبائے گی۔

مگر یوں نہیں ہوا —— بلکہ فیروزہ نے اس پر ایک درشت سی نظر ڈالی اور بولی:۔ "دفتر کا وقت ہو گیا ہے۔ اُٹھو۔ ناشتہ کرو اور جاؤ۔"
اور جانے اس کا بخار کیسے اتر گیا۔ اس کا درد سر کہاں چلا گیا۔

منٹوں میں وہ تیار ہو کر دفتر تو چلا گیا مگر افسردگی و اضمحلال نے اسے وہاں نکما بنائے رکھا۔

دوپہر کے بعد اس کا ایک بے تکلف دوست آ گیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ شام تک وہ تاش کھیلتا رہا۔ اور طبیعت کی کدورت بظاہر رفع ہو گئی۔ مگر جب شام کو وہ اپنے گھر کے زینے پر چڑھ رہا تھا تو بے اختیار اس کا منہ غصہ سے پھول گیا اور آنکھوں میں یاس کا دریا لہریں لینے لگا۔ اور وہ مغموم انداز سے اپنی بیوی کے آگے سے گذرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے مری جان؟ ادھر تو آؤ ——" اس کے منتظر کانوں میں اس کی بیوی کے محبت بھرے الفاظ گونجے۔ وہ بے قابو ہو کر بیوی کی طرف بھاگنے ہی کو تھا کہ اسے معلوم ہوا وہ اس کی بیوی کے الفاظ نہیں تھے۔ اوپر کی منزل میں ریڈیو کھلا ہوا تھا اور اس میں، ایک ڈراما ہو رہا تھا —— یا شاید اس کے کانوں نے تمنائی الفاظ سنے تھے۔ جو کچھ بھی تھا۔ وہ اس کی بیوی کے الفاظ نہ تھے۔ اس کے قدم وہیں جامد ہو گئے۔ اور اس پر ایک یاس انگیز اداسی چھا گئی۔

دوسرے دن وہ اپنی بالائی منزل کی شہ نشین میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ صبح بے حد روشن اور نہایت حسین تھی کہ دفعتا —— بالکل اچانک جانے کس طرح کئی سو فیٹ نیچے زمین پر آ رہا ——!! اور حادثے یوں ہوتے ہیں!!

★

چمن میں آگ لگی!

محمد احمد حامی

یوں تو بہار کے لفظ کے ساتھ ہی ذہن میں ایک انقلاب کا تصور آجاتا ہے۔ خزاں دیدہ اشجار کی بیداری، گل و لالہ کی تاجپوشی، زمستاں کے زمانہ کے شفاف چشموں میں برف کے گلنے سے گدلاہٹ، اُداس پرندوں کی ایک دم زمزمہ خوانی، غرضیکہ ساری کائنات انگڑائی لے اٹھتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بے جان پتھر بھی متاثر ہو کر گنگنانے لگتے ہیں لیکن جو بہار میرے سابق وطن کے مسکن سے ملحق عیدگاہ میں آتی تھی وہ ان سب سے الگ تھی۔ یوں کہنے کو تو یہ جگہ عیدگاہ تھی لیکن دراصل یہ مجموعہ تھا ایک دیہاتی سڑک کے کنارے واقع قبرستان، ایک سدا بہار جوہڑ، ایک شیریں کنوئیں، ہندوؤں کے ایک مندر، جس کے گرد ایک خوبصورت باغیچہ تھا' جس میں آڑو اور امرود اُگتے تھے، اور ایک چٹیل میدان کا جہاں مسلمانانِ شہر سال میں دو بار جمع ہو کر نمازِ عید پڑھتے تھے۔

یہ بستی کسی زمانہ میں ایک مغل رئیس کا ٹھکانہ بنی تھی جس کے خاندان کے افراد کو یکے بعد دیگرے ایک جگہ دفن کرتے جانے سے ایک ننھا سا خاندانی قبرستان بن گیا تھا جو بعد میں ایک باقاعدہ وسیع قبرستان کے لئے بطور مرکز کے کام آیا اور رفتہ رفتہ یہاں سکہ بند قبرستانوں کے تمام لوازمات، مثلاً ایک لمبی قبر، چار دیواری، بُرج، دیئے، کنواں، جوہڑ اور بڑے کے بڑے بڑے درخت' مہیا ہو گئے تھے۔ جس زمانہ میں ہم نے اسے دیکھا ہے' اس میں کیسو (ڈھاک) کے درختوں کا ایک جنگل اُگ رہا تھا۔ بڑے بوڑھوں کی روایت تھی کہ نواح میں پھیلی ہوئی زرعی زمین کے زیرِ کاشت آنے سے قبل یہ سارا علاقہ ہی ڈھاک کے جنگل سے آباد تھا' اور جوں جوں زمین ہل کے نیچے آتی گئی، جنگل کے نیچے سے نکلتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس لق و دق جنگل کا باقی صرف قبرستان میں رہ گیا کیونکہ تب تک وہاں ہل نہیں پہنچ سکا تھا۔

اس قبرستان کے ساتھ ہی مغل خاندان نے اپنی زمین کا کچھ حصہ عیدگاہ کے لئے وقف کر دیا تھا اور اس میں قبلہ کی سمت معین کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی محرابوں والی ایک دیوار بھی بنوادی تھی۔ اس دیوار کے عین عقب میں سکھوں کی زمین شروع ہوتی تھی۔ اس زمین میں ایک نہایت خوبصورت مندر بنا ہوا تھا جس کے ارد گرد حاشیہ بناتے ہوئے سیمنٹ سے لپے پتے چبوترے تھے جن پر دھریکوں (بکائن) اور نیموں کا مشترکہ سایہ ٹھنڈک پہنچاتا تھا۔ اس مندر کا دروازہ ہم نے ہمیشہ کھلا پایا۔ اس میں بُت یا مورتیاں وغیرہ کچھ نہ تھیں، بس دیواروں پر کچھ تصاویر بنی ہوئی تھیں جن کے کہیں چار ہاتھ تھے تو کہیں ہاتھی کی طرح سونڈ تھی اور کہیں یہ عجیب مخلوق چھاج جیسے کان پھیلائے خلا میں گھورا کرتی۔ اس مندر کے برابر کچے راستہ کے متوازی سکھوں نے زمین کے ایک ٹکڑے کو باغیچہ میں تبدیل کر رکھا تھا جس میں پھلدار پودے اس قدر گھنے لگائے گئے تھے کہ دور سے یہ جگہ جنگلات والوں کی 'رکھ' نظر آتی تھی۔ اس کے گرد اس قدر موٹی اور مضبوط کانٹے دار باڑ تھی کہ باغیچہ میں گھسنے کا تصور ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ پڑوس والے سکھوں کا ایک بوڑھا ہر تین ماہ بعد پرانی باڑ میں نئی کانٹے دار شاخیں گاڑ دیتا تھا اور یوں یہ باڑ ہوتے ہوتے چھ فٹ موٹی ہو گئی تھی۔ اس کے باہر چاروں طرف مٹی سے اُونچی منڈیر بنا کر اس پر جنگلی کیوڑہ اتنی مقدار میں لگا دیا گیا تھا کہ اگر جھاڑیوں کی اندرونی باڑ بھی نہ ہوتی تو اس منڈیر کو پھلانگنا آسان کام نہ تھا۔ قبرستان کی رکھوالی کرنے والے فقیروں کو قبرستان سے ملحق کچھ زمین بھی ملی ہوئی تھی جو عرصہ سے اُن کے قبضہ میں رہنے کی وجہ سے موروثی ہو گئی تھی اور اب وہ لوگ وہاں کچے مکان بنا کر بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے، اور زرعی زمین میں سبزیاں اگا کر گویا اپنے بڑوں کی خدمت گزاریوں کا معاوضہ وصول کر رہے تھے۔ اپنی زمین کو سیراب کرنے کے لئے ان فقیروں نے، جو اب 'شاہ' کہلاتے تھے، پرانے کنوئیں پر ایک رہٹ بھی لگا رکھا تھا جو بڑے ایک بوڑھے درخت کے نیچے روں روں کیا کرتا اور جس کے چوبچہ میں میٹھ کر کالے کالے پنڈوں والے فقیر 'تاریاں' (غوطہ) لگاتے وقت ڈکارا کرتے تھے۔

یہ سب کچھ جیسے ہم نے ہوش میں آتے ہی 'عیدگاہ' کے نام سے سنا اور اسے ہمیشہ یوں ہی پکارا، بستی کی اصل آبادی سے آدھ پون میل شمال مغرب میں تھا

اور یہاں پہنچنے کے لئے کھیتوں کے کنارے کنارے سبز گھاس سے بچی بنی ہوئی منڈیروں پر سے گزرنا پڑتا تھا اور راستہ میں رہٹ لگے ایک دو کنوئیں اور بھی پڑتے تھے جن کی زمین سکھوں، نومسلم چوہڑوں اور کچھ غریب مسلمان گھرانوں کی موروثی ہو چکی تھی۔ یہ لوگ شہر کی منڈی میں آسانی سے بک جانے والی سبزیاں، پونڈے اور چارہ بوتے تھے اور زمین کے اِن خورد بینی قطعوں سے اپنا رزق حاصل کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ عیدگاہ میں میرا سب سے پہلا گزر کہیں والد مرحوم کی انگلی پکڑے عید کی نماز ادا کرنے کے لئے ہی ہوا ہوگا، لیکن اس بارہ زمانہ کا تعین مشکل ہے۔ وہاں باقاعدہ آمد و رفت اس وقت شروع ہوئی جب میرا ایک چھوٹا بھائی فوت ہو کر عیدگاہ کے قبرستان میں دفن ہوا والدین کے لئے اولاد کی جانب سے یہ پہلا صدمہ تھا۔ اس کے چھ ماہ بعد ایک شیر خوار بہن بھی وہیں جا سوئی! سو ہم سب لوگ مہینہ میں ایک آدھ بار اکٹھے ہو کر ان قبروں کی زیارت کے لئے عیدگاہ جایا کرتے ـــــ

ہم بچوں کے لئے تو یہ محض سیر ہوتی تھی بلکہ میں تو کبھی کبھی اپنی گول چھرّے والی ڈائسی بندوق ساتھ لے لیتا اور فاختاؤں کو پریشان کیا کرتا تھا لیکن جب ان قبروں میں سے ایک کے سرہانے کلف لگی ہوئی ڈاڑھی والا میرا بوڑھا باپ' اور دوسری کے سرہانے آنکھوں میں دکھ بسائے ہوئے میری ماں' بیٹھ کر ٹپ ٹپ آنسو گراتے تو مجھے احساس ہوتا کہ معاملہ کچھ سنجیدہ سا ہے اور میں بندوق سے کھیلنا چھوڑ کر ڈھاک کے سوکھے پتوں پر بھاگتے ہوئے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو "شی شی" کہہ کر چپ کرانے لگتا اور ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دونوں جڑواں قبروں کے پائینتی کھڑے نصف دائرہ بنا لیتے۔ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے جب میری ماں ذرا اوپر دیکھتی اور ہمیں ٹکٹکی باندھے مصروف پاتی تو یوں لگتا جیسے اس کے کلیجے میں ایک ٹیس اٹھتی ہے جو نکلنے کا راستہ نہ پا کر گرم سلائی کی طرح اس کے کلیجہ کو داغ رہی ہے اور اس کرب کو دبانے کے لئے وہ ہم کو باری باری بھینچنا شروع کر دیتی۔ اس کی محبّت کی حدّت سے ہمارے کان سرخ ہو جاتے اور ہم بے وجہ ہانپتے ہوئے بے وقوفوں کی طرح کبھی اس کے چہرہ اور کبھی اپنے باپ کی آنسوؤں سے تر ڈاڑھی کی طرف دیکھا کرے۔ ہمیں پریشان پا کر ہمارا باپ رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے اُٹھ بیٹھتا اور ہمیں ساتھ لیکر 'شاہوں' کے کنوئیں کی طرف لے جاتا جہاں پہلے اپنا منہ دھوتا، خود پانی پیتا اور پھر ہمیں اوک سے بھر بھر کر پانی پلاتا۔ اس کی ہتھیلی سے ہونٹ لگا کر پانی سُڑکتے ہوئے بہت سا پانی باچھوں کے پاس سے بہہ کر گردن کو بھگوتا ہوا گریبان کے نیچے تک بہہ جاتا۔ ہوا کا ٹھنڈا فراٹا لگنے سے ایسا احساس ہوتا گویا کوئی برف میں لگی ہوئی قلفی جسم سے چھو رہی ہے! پھر وہ 'شاہوں' کی اجازت سے ہمیں اُن کے شہتوتوں کے پیڑوں سے لمبے لمبے ارغوانی شہتوت توڑ کر دیا کرتا اور واپسی پر ہماری انگلیاں پکڑے قبروں کے درمیان لیٹی ہوئی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے، ہمیں قبر پر پاؤں رکھنے سے منع کرتا ہوا چلتا۔ اتنی دیر میں ہماری ماں اپنے ہاتھوں سے تھوڑی سی مٹی اکٹھی کر کے ان قبروں پر چڑھا چکی ہوتی اور ڈھاک کے درختوں کے نیچے گرے ہوئے سرخ سرخ پھول اٹھا کر قبروں پر چننے لگتی، اس پر ہمارا باپ لپک کر ان پھولوں کو اٹھا کے دور پھینک دیتا اور ڈھاک کے پتوں سے لدی ہوئی دو گچھے دار ٹہنیاں کڑک کڑک کر کے توڑتا اور دونوں قبروں پر رکھ دیتا اور ہماری امّاں سے مخاطب ہو کر کہتا: "میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے یہ آگ ایسے سرخ پھول' اِن پھول ایسے بچّوں کو نہ دیا کرو، رسولِ پاکؐ نے فرمایا ہے کہ قبروں پر سبزہ رکھو"

میری ماں بے بسی سے اس کی طرف دیکھتی اور اپنا برقع سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوتی اور ابّا رسولِ پاکؐ کے اس ارشاد کا حوالہ دینے کے بعد عربی کی کوئی دعا زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے چل دیتے۔ پیچھے پیچھے امّاں ہو لیتیں اور ہم بھیڑوں کی طرح کبھی آگے کبھی پیچھے بھاگنے لگتے۔ راستہ میں کانٹا چبھتا تو خود ہی چیخ مار کر بیٹھ جاتے۔ ڈیڑھ انچ لمبے کانٹے کو مکھن کی طرح نرم گوشت سے ایک "سی" کے ساتھ کھینچتے جس کے ساتھ ہی لہو کی ایک ننھی سی بوند بھی ابھر آتی۔ انگلی پر ذرا سا تھوک لگا کر اس جگہ رگڑ دینے سے گویا علاج مکمل ہو جاتا اور ہم اُسی پہلی سی رفتار کے ساتھ کھیتوں میں بھتنوں کی طرح ناچتے ہوئے پھر چل پڑتے۔

عیدگاہ سے اس تعارف کے بعد جب وہاں تک پہنچنے والے تمام منڈیری راستے مجھے حفظ ہو گئے تو پھر اپنے اسکولی ہمجولیوں کے ساتھ بندوق لئے شکار کے بہانے وہاں تک پہنچنے کی جرأت ہونے لگی۔ گو اس شکار میں پرندہ تو شاید ہی کوئی ہاتھ آیا ہو لیکن اس سے کو ملبسا نہ ذوقِ تجسّس کو کماحقہٗ آسودگی ضرور پہنچی۔ اگر کبھی کسی پرند کو چھرّہ لگ بھی جاتا اور وہ ہماری کھلونے جیسی بندوق کی چوٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دوسرے پیڑ پر جا بیٹھتا تو ہم اس کے دو تین گرے ہوئے پروں سے 'وار کاری' لگا کا نتیجہ نکالتے ہوئے اس کا پیچھا کرتے۔ دوسرے پیڑ پر وہ پھر دوسری چوٹ کھاتا اور اُڑ جاتا اور ہم اسی طرح کاری اور ناکاری 'فائروں' سے اس کا تعاقب جاری رکھتے۔ یہاں تک کہ وہ بے چارہ نڈھال ہو کر خود سپردگی پر مجبور ہو جاتا اور ہم بڑے اہتمام سے اُسے چھیلے ہوئے سرکنڈے یا گنے کی تیز چھال سے اُلٹا سیدھا ذبح کرتے اور فاتحانہ جلوس کی صورت میں اپنے محلّے کو چل پڑتے۔

انہی دنوں جب جاڑے ماند پڑتے اور لحاف کی آنچ احساس دلاتی کہ اب چھتوں پر سونے کے دن آنے والے ہیں تو یکایک انکشاف ہوتا کہ امتحان سر پر ہیں۔ اور ساتھ ہی

مد آدم گیہوں اور ساحر چاندنی راتیں آنکھ مچولی کی دعوت دے رہی ہوتیں۔ بہرحال امتحان اور آنکھ مچولی خود بخود سمجھوتہ کر لیتے اور آنکھ جھپکتے میں ہم نئی کلاس میں پہنچ جاتے۔
ں تو امتحان کا آخری پرچہ کرنے کے بعد ہی سے ہم اپنی کاپیوں اور گھر کی دیواروں سے اپنے نام کے سامنے سے 'جماعت ہفتم فرق سی' مٹا کر 'جماعت ہشتم اے' موٹا کر کے
لکھ دیتے تھے، گو اپنے غول میں سے ایک آدھ کو ڈھیٹ بن کر اپنی روایات کو نبھانا پڑتا۔ امتحان کے بعد کی چھٹیاں گزارنے کے لئے پروگرام بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔
ہی سکہ بند مصروفیات جو ہمیں اپنے پیشرو لڑکوں سے وراثت میں ملتی آئی تھیں خود بخود ہماری رہنمائی کیا کرتیں۔ صبح سویرے ناشتہ کے بعد گھر سے نکلتے اور گلی کے نکڑ
پر کھڑے ہو کر انگلیاں منہ میں ڈال کے جو چیخ نما سیٹیاں بجائی جاتیں، وہ صور اسرافیل سے کم نہ ہوتیں اور آن کی آن میں گلی، محلے کے تمام لڑکے نکل پڑتے۔ کسی دیوار کے
سائے میں کانفرنس ہوتی کہ آج شکار ہوگا، کبڈی ہوگی، کھیتوں میں آنکھ مچولی ہوگی یا عید گاہ چل کر محض سیر و تفریح اور مہم جوئی ہوگی۔ اگر قبل دوپہر کے عرصہ کے
لئے آنکھ مچولی کی قرار داد منظور ہوتی تو سوال پیدا ہوتا کہ ٹیمیں بنیں گی یا ہاتھ جھٹک کر ہاتھ پر ہاتھ مار کر باری دینے والے کا فیصلہ ہوگا۔ اگر لڑکے زیادہ تعداد میں موجود
ہوتے اور عموماً یہی ہوتا تو کھلاڑی دو ٹیموں میں بٹ جاتے۔

ٹیمیں بن چکنے کے بعد ٹاس ہوتا۔ ٹاس جیتنے والی ٹیم کو چھپنے کا موقع دینے کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ دوسری کو کچھ وقت کے لئے مصروف رکھا جائے۔ اس کے لئے
بھی تو باری دینے والی ٹیم کو دُور کسی "دائی" کو ہاتھ لگا آنے کے لئے کہا جاتا اور اس دوران میں باری لینے والے گلیوں کو طے کرتے ہوئے کھیتوں کی طرف بھاگ جاتے۔
لیکن اکثر یوں ہوتا کہ بدنے والی ٹیم مقررہ جگہ تک پہنچنے سے پہلے ہی تعاقب میں دوڑ پڑتی یا ان میں سے ایک آدھ چھپ چھپا کر چھپنے والوں کے پیچھے ہو لیتا اور ان کی پناہ گاہ
کو دیکھتا رہتا۔ اتنے میں اس کے ساتھی آملتے اور سب جمع ہو کر یا بکھر کر محاصرہ کر کے چھپنے والوں کو ڈھونڈ نکالتے۔

اسی زمانہ میں عید گاہ پر بہار ہولے ہولے اُترنے لگتی اور چند ہی دنوں میں ڈھاک کے درخت ہلکے سبز رنگ کے شگوفوں سے لد جاتے۔ دندانے دار پتیوں میں لپٹے
ہوئے شگوفے سوئیوں کی طرح باریک ڈنٹھلوں کے سہارے بُندوں کی طرح جھولا کرتے اور دیکھتے ہی دیکھتے اِن بُندوں میں سے سرخ سرخ زبانیں جھانکنے لگتیں اور بہار
کے ضابطہ طور پر آجانے کا اعلان ہو جاتا۔ تیز سرخ رنگ کی یہ 'جیبھیں' (زبانیں) جب پوری طرح باہر لٹک پڑتیں تو یوں معلوم ہوتا جیسے سبز طوطوں نے چونچیں ڈھلکا
رکھی ہوں۔ شاید اسی لئے چھوٹے چھوٹے بچے ان پھولوں کو طوطے کہا کرتے تھے گو قبریں کھودنے والے ممدے گھمار (کمہار) سے ہم نے یہ سنا تھا کہ بعض دیہاتی عورتیں
انہیں کیسو کہتی ہیں اور عید گاہ سے لپٹے ہوئے بیل گاڑیوں کے کچے راستے سے گزرتے ہوئے ان کی جھولیاں بھر بھر کرلے جاتی ہیں اور ان سے اپنے کیسری رنگ کے
دوپٹے رنگتی ہیں۔ ہم نے کبھی ان عورتوں کو یہ پھول چنتے ہوئے نہیں دیکھا تھا بلکہ ہمیشہ یہی دیکھا کہ دو تین جاٹ اور ایک دو جاٹنیاں بڑے مزے سے جوتیاں ہاتھوں میں
اٹھائے پنجابی میں "ہاہو" "ہاہو" کرتے چلے آ رہے ہیں، قبرستان کے قریب آتے ہی وہ خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے پر نظر ڈالتے اور کسی لاشعوری تحریک سے سمٹ کر پاس پاس
ہو جاتے اور رفتار یکدم تیز کر دیتے جیسے انہیں ڈر ہو کہ کسی پرانی قبر سے ابھی کوئی بھتنا نکل کر ان کے سامنے آجائیگا اور قلابازیاں کھانے لگے گا۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ ہم اپریل کی
پسینہ لانے والی دوپہر میں آنکھ مچولی، چھون چھوہائی یا جٹ با مَن کھیلتے وقت ڈھاک کے درختوں میں چھپے ہوتے، اتنے میں چار پانچ جاٹ جاٹنیاں قبرستان میں داخل
ہوتے۔ دُور سے ان کی باتیں کرنے کی آواز یکدم دوپہر کے قبرستانی سناٹے میں تحلیل ہو جاتی اور وہ اپنے ننگے پیروں کو احتیاط سے اٹھاتے ہوئے چھپا چھپ گزرنے لگتے۔

ایسے میں انہیں کیسو جمع کرنے کا خیال کب آتا ہوگا' یا پھر ممکن ہے وہ 'طوطے' جو ہم ڈھیروں کے حساب سے توڑتے تھے اور ان کی گردن مروڑ کر شہد چوس کے
راستوں میں بکھیرتے جاتے تھے، انہی سے وہ بھی چلتے چلتے کچھ چن لیا کرتی ہوں۔

ڈھاک کے کیسو چننے کے لئے ہمارے محلے کا بوڑھا حکیم اپنی جوانی کی پہلوانی کے زور پر صبح سویرے دُڑکی (دُلکی) چال سے قبرستان میں جایا کرتا تھا اور دن چڑھے
پھولوں کی پوٹلی ہاتھ میں اور ہاتھ بھر لمبی مسواک منہ میں لئے جھومتا ہوا واپس آتا تھا۔ الشیر سنگھ کمبوہ کے رہٹ کے پاس آکر وہ نہانے کے لئے رُکتا، کھدر کا موٹا کرتا اور
کھجور کے پتوں کی ٹوپی اتار کر 'لائن کلیئر' کا منتظر رہتا اور جب گاڑی پر بیٹھا ہوا کمبوہ رہٹ کے چکر میں دوسری طرف منہ پھیرتا تو بجلی کی تیزی سے تہمد اتار کر اُولُو (حوض) میں
گھس جاتا اور ایک دو بار پانی کی چھ انچ موٹی دھار کو کندھوں پر بکھرا کر اپنی لٹکے ہوئے گوشت والی بانہوں کو رگڑتا اور پھر غوطہ لگا جاتا، سر اُبھار کر اِدھر اُدھر دیکھتا، میدان
صاف پاتا تو آگے پیچھے ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور ایک آدھ بار جسم کو جھٹک کر تہمد پہن لیتا اور سی سی کرتا "اللہ تو، اللہ تو" کہتا ہوا محلہ کی غربی جانب سے داخل ہونے
والی پگڈنڈی پر ہو لیتا۔ اگر نہانے کے دوران ہماری ٹولی کا گزر وہاں سے ہوتا تو لڑکے رہٹ کے اردگرد اگنے والے توت کے تین تین فٹ قطر کے درختوں کی آڑ میں ہو جاتے
اور جب حکیم ایک لمبی "سی" کرنے کے بعد نچلا ہونٹ دانتوں میں داب کر دھار کے نیچے سر دیتا تو کوئی لڑکا ایک بڑا سا مٹی کا ڈھیلا شڑاپ سے پانی میں پھینکتا اور حکیم گھبرا کر
جلدی سے سر باہر نکالتا، آنکھیں جھپکتا اور چاروں طرف دیکھتا۔ کچھ نہ پاسکنے پر سمجھتا ممکن ہے یہ اس کا وہم ہو لیکن کچی مٹی کا ڈھیلا پانی میں گھل گھل کر ایک مٹی کی لہر

سی بناتا ہوا نظر آتا تو وہ چونک کر پھر ماحول کا جائزہ لیتا اور سخت سست کہتا جس کے ردِّ عمل میں ہمارا قہقہہ بلند ہوتا اور ہم لپک کر سامنے آجاتے۔ وہ اپنی دیہاتی پنجابی میں اول فول بکتا اور ہم اسے یونہی چھوڑ کر چہکتے ہوئے عیدگاہ کا رُخ کرتے۔

اس وقت تک گرمی کافی بڑھ چکی ہوتی۔ دوپہر کو نیم گرم لُو بھی چلنا شروع ہو جاتی جس سے پکتی ہوئی گیہوں کی سنہری ناڑیں (رئیں) سوکھ کر اپنی لچک کھو بیٹھتیں اور کسان درانتیوں کے دندانے تیز کرانے لگتے۔ تُوتوں (شہتوت) میں لگی ہوئی گولیں (ٹینٹیں) گدرانے لگتیں اور عیدگاہ میں کیسوؤں کا الاؤ دہک اٹھتا۔ گہرے سبز رنگ کے ڈھاک کے درخت شعلے ایسے سُرخ پھولوں سے ڈھک جاتے اور دُور سے یوں دکھائی دیتا جیسے زمرّد کی ننھی ننھی پہاڑیوں کو بے شمار دیوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے جن کی لویں لٹ لٹ کرتی دہک رہی ہیں۔ جب دوپہر کو لُو چلتی تو اس چھوٹے سے خطے سے ترمرے اُٹھ کر فضا میں اس طرح تحلیل ہوتے جیسے جنگل کی یہ آگ شعلوں کی زبان سے بارش کی بھیک مانگ رہی ہے۔ سردیوں میں آنے والے تیترے (ملے جلے رنگ کا) اور چتکبرے تلیروں کی ڈاریں کوچ کر چکی ہوتیں اور ان کی جگہ دودھیا چھاتی اور براؤن بوٹ پالش کے رنگ کے پروں والے گرمائی تلیروں کے جھُنڈ دوپہر کی جھلس دینے والی لُو سے بچنے کے لئے اِس آگ کے جنگل میں پناہ گزیں ہوا کرتے۔

آنکھ مچولی سے اُکتا کر، بھوک سے نڈھال جب ہم گھروں کو لوٹتے اور ہوائیاں اُڑتے ہوئے چہروں کو لیکر کھانا مانگتے تو صبح سویرے سے گھر سے غائب رہنے کی فہمائش کے طور پر اماں کی ایک گھُرکی برداشت کرنے کے بعد منہ ہاتھ دھونے کا ناخوشگوار فریضہ ادا ہوتا اور پھر سیر ہو کر کھانا کھایا جاتا۔ کھانے کے بعد یونہی کونوں کھُدروں میں منڈلا کر موقع تلاش کیا جاتا کہ نظر بچا کر پھر بھاگا جائے۔ یکدم مجید کالو کی دُور سے آتی ہوئی سیٹی کانوں میں لہرا جاتی اور دِل بے اختیار لوٹنے لگتا۔ اب ہر قیمت پر گھر سے نکلنا ضروری ہوتا اور ہر روز کسی نہ کسی بہانے یہ موقع مل جاتا۔ ایک آدھ بار تو بیٹھک کے راستہ دروازہ کھلا چھوڑ کر بھی کھسکنا پڑا۔ مجید کالو محلّہ کے لڑکوں کا سردار تھا۔ گو نہ تو وہ عمر میں سب سے بڑا تھا اور نہ قد کاٹھ ہی کے لحاظ سے اس قابل تھا کہ لیڈر بن سکتا۔ لیکن اس کی غیر معمولی ذہانت، جرأت اور تجربہ ہم سب کو گرویدہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ گلی کے نکڑ پر راجہ صاحب کی بیٹھک کے سایہ میں کھڑا زبان کو انگلیوں سے دُہرا کر کے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بھیانک، تیز اور نوکیلی سیٹیاں گلی کے دونوں طرف پھینکتا۔ اس کے کالے رنگ اور کھڑے کانوں کے پس منظر میں پارہ کی طرح چمکتی ہوئی متحرک آنکھیں اور گوشت کی ایسی سُرخ جیبھ لئے وہ خواہ مخواہ شیطان سا نظر آیا کرتا تھا اور اس کی ہیئت کذائی سے وحشت برستی! آستینیں پھٹی ہوئی، گلے میں ربڑوں والی غلیل کا ہار، شلوار کا پائنچہ جو کسی جگہ اُڑ کر قریباً آٹھ دس انچ تک اُدھڑ گیا تھا اور اس نے نیفے کو ذرا اُڑس کر اونچا کیا ہوتا، یہ ننگے پیر اور خشک بال!!

جب اُس کی 'قوم' کے اتنے افراد جمع ہو جاتے جن سے وہ اُس روز کی مہم شروع کر سکتا تو وہ مطمئن ہو کر ایک بازو دیوار پر ٹیک کے خطیبانہ رنگ میں کہتا:

"بولو بھئی" اور پھر خود ہی تجویز کرتا۔ "نمبر ایک شکار تلیراں، نمبر دو ناس پورہ کے بیر، نمبر تین نہر میں تاری۔ بولو منظور را" اور جواباً کورس میں ہچکچاتی سی آواز آتی: "منظور ہے"۔ ہچکچاہٹ میں راز یہ تھا کہ تلیروں کے شکار کے لئے ہمیں اپنی غلیلیں لینے کے لئے پھر سے گھر جانا ضروری ہوتا اور یہ مرحلہ خاصا حوصلہ شکن ہوتا، تاہم کالو کی ہمت بندھانے والی نظریں اور حشر بپا کرنے والی آواز ہمیں گھر لوٹنے پر مجبور کرتی اور ہم جیبیں بھر کر مٹی کے غلّے لئے غلیل کو نیفے میں چھپائے پھر گاؤں کے 'جامع المتفرقین' رہٹ کے پاس اکٹھے ہو جاتے۔ مجید کالو جوان ہمّوں کا ہیرو تھا۔ بہت اچھا نشانہ باز تھا۔ اس کو مٹی کے بنے ہوئے گول غلّوں کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ بس رہٹ کے کچے چوبچہ میں سے ٹھیکری اٹھا کر یا ریل کی پٹڑی سے نوکیلے پتھر چن کر دے مارتا تھا۔ پرندے کو ٹہنی پر بیٹھے پا کر اس انداز میں قریب جایا کرتا تھا جیسے اسے پرندے سے کوئی سروکار نہ ہو اور جب وہ اس کی زد میں آجاتا تو غلیل سر کے پاس سے چلا دیتا اور تیکھی ٹھیکری زن سے چھوٹ کر پرندے کو زخمی کرتی ہوئی فضا میں قوس بنا جاتی۔ ایک بار تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ تازہ ہل چلے ہوئے کھیت سے مٹی کا کچا ڈھیلا اٹھا کر کالو نے غلیل میں رکھا اور ایک شارق پر داغ دیا اور وہ پکے آم کی طرح دھپ سے زمین پر آگری۔ اُٹھا کر دیکھا تو اس کا سر بھٹّے کی طرح ڈھیلے سے صاف اُڑ گیا تھا۔ شکار کے یوں حرام جانے پر کالو نے تلملا کر مری ہوئی شارق کو پاس کے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ شکار پر روانہ ہونے سے قبل کبھی کبھی کالو کمبوہ کے رہٹ کے چاروں طرف فوجی جرنیلوں کی طرح ریکی کرنے والی نظروں سے دیکھتا اور جب اسے دُور دُور تک کوئی آدمی نظر نہ آتا تو بند رہٹ کی گاڑی پر اُلٹا ہو کر چھپکلی کی طرح لیٹ جاتا اور ہم میں سے کسی کو کہتا: "رہٹ کا کتا رکھو کا، چھوڑ دو" کھٹکے کے ہٹتے ہی پانی کی بھری ہوئی ٹینڈوں (کوزوں) کے وزن سے رہٹ اُلٹا چلنا شروع ہو جاتا اور کالو مزے سے لیٹا ہوا پانچ چھ چکر پورے کرتا اور رہٹ کے ٹھہر جانے پر حکم دیتا: "کتا لگا دو اور اس کو پھر سیدھا چلاؤ" ہم سب مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر پھر سے رہٹ کو چلاتے۔ کالو مزے سے لیٹا رہتا۔ جب پانی سے بھری ہوئی ٹینڈیں پھر اُوپر آجاتیں اور ٹین کی نالی میں پانی گرنے کی آواز اسے پہنچتی تو چلّاتا: "باقی سب پرے ہٹ جاؤ اور مُنّے! تم کتا کھول کر بھاگ جاؤ" مُنّا بڑی فرمانبرداری سے

کھٹکا کھول کر پیچھے ہٹ جاتا اور رہٹ کا الٹا چکر کالو کو جھلانے لگتا اور لتنے میں رہٹ کے اس ناجائز استعمال کی آواز کمبوہ کو پہنچ جاتی جو دور کہیں کماد (گنے) کے کھیت میں بیٹھا خربوزوں کی ننھی ننھی بیلوں میں گوڈی (نلائی) کر رہا ہوتا اور وہ وہیں سے کھرپا ہاتھ میں لئے اپنے پوپلے منہ سے گالیاں بکتا دوڑنے کی رفتار پر ڈگمگاتا رہٹ کی طرف بڑھتا۔ اس کی گالیوں کا کوئی لفظ بھی سمجھ میں نہ آتا۔ کالو اطمینان سے اترتا اور حکم دیتا: "قوم کوچ کرے" اور ہم سب کٹی ہوئی گیہوں کے گٹھوں کی آڑ لیکر عید گاہ کی طرف بھاگ نکلتے۔

دن بھر کے شکار، بیر کھانے اور آوارہ گردی کے پروگراموں کے سلسلہ میں جب ہمارا قافلہ کالو کی قیادت میں عید گاہ پہنچتا تھا تو ہم اور دبے پاؤں درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوتے تو ذرا سی دیر کے لئے تمام پرندے اپنے چہچے چھوڑ کر خوفزدہ ہو جاتے۔ کالو بڑے اطمینان سے کسی پختہ قبر کے کتبہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور پھٹا ہوا پائنچہ اوپر گھسیٹ کر اپنی کالی ران کو کھرچنے لگتا جس پر سے مدتوں کی سوکھی ہوئی بھوسی سفید لکیریں بنا کر اترنے لگتی۔ یکدم سرخ پھولوں اور سبز پتوں کے درمیان سے کالو کو کسی تلیر کی مرمراتی چھاتی نظر آتی، وہ اسی انداز سے لیٹے لیٹے غلہ رسید کر دیتا اور ایک کراہتی ہوئی چہچہیں کے ساتھ تلیر پھڑ پھڑاتا ہوا نیچے آ رہتا۔ کالو وہیں سے حکم دیتا: "ابے او پکڑ کے لا اسے" اور رشید تیلی بھاگ کر تلیر کو پکڑ لاتا اور کالو کے دربار میں پیش کرتا۔ کالو اس کے مخملیں پروں میں پھونکیں مار کر چوٹ کا نشان تلاش کرتا اور پھر پالتو کبوتروں کی طرح اس کا بازو پھیلا کر اس کی سریں گننے لگتا۔ تلیر اس معائنہ کے احتجاج کے طور پر چونچ سے انگلی یا ہاتھ پر کاٹتا یا کالو کی کلائی پر پنجے نوکیلے پنجے سے سرخ لکیریں کھینچ دیتا تو اس کے منہ میں کف بھر آتا۔

عید گاہ کے شکار سے اکتا کر تجویز ہوتی کہ ناس پورہ کی بیروں پر حملہ کیا جائے۔ جھٹ سب ادھر چل پڑتے کچے پکے بیروں کو ڈھیلوں سے گراتے، کھاتے، کھاتے چلے جاتے کہ یکایک کسی احساس ہوتا پیاس لگ رہی ہے۔ وہیں سے رخ کسی رہٹ کی طرف ہو جاتا۔ چلچلاتی دوپہر میں کوئی جاٹ مزے سے گاڑی میں لیٹا سو رہا ہوتا۔ درختوں کے جھنڈ میں سے کالو جب اپنی تجسس آمیز نظروں سے منظر کا جائزہ لیتا تو اسے پانی پینا بھول کر شرارت سوجھتی اور کھٹاک سے رہٹ میں جتے ہوئے بیل کے پیٹ میں کالو کا غلہ آبیٹھتا۔ بیل ڈر کر بھاگتے۔ جاٹ اپنے الجھے ہوئے بالوں کو سنبھالتا، سر اٹھاتا اور بیلوں کے بدکنے کی وجہ پر غور کرتا لیکن پھر نیند سے مغلوب ہو کر گاڑی کی لکڑی پر سر کو ٹکا دیتا۔ اب کی بار غلہ گاڑی کی لکڑی پر لگتا، جاٹ کو مجبوراً اٹھنا پڑتا اور باوجود چھپنے کی ہر ممکن کوشش کے وہ ہم میں سے کسی نہ کسی کو دیکھ لیتا اور نیند کے خمار سے بوجھل اعضا میں تاب تعاقب نہ پاتے ہوئے وہیں سے دھمکیاں دیتا: "چلو نہیں تو......" اور کالو جان بوجھ کر لنگڑی چال چلتا لڑکوں کو بھگا کر دور لے جاتا۔ کھیتوں میں ناگن کی طرح گزرتی پانی کی باریک نالی پر جھک کر سب پانی پیتے اور پھر گیہوں کے ووڈھ (ٹھنٹھ) میں سے نہر کی طرف روانہ ہو جاتے۔

ایک ایسی ہی مہم میں کالو نے ناس پورہ کے کبوتر باز درشن سنگھ کے رہٹ پر اس کے پالتو کبوتر کو جانشانہ بنایا اور جب وہ کبوتر کو مرکنڈے کے چھلکے سے ذبح کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو درشن نے اسے موقع پر گردن سے آدبوچا۔ کالو کا رنگ فق ہو کر مٹیالا زرد ہو گیا اور وہ کچھ بے الفاظ گھگیایا۔ درشن نے اس کی غلیل چھین لی، چانٹے مار مار کر اور کان اینٹھ اینٹھ کر اس کے چہرہ کو راکھ کی تہ سے ڈھنپا ہوا انگارا بنا دیا اور اسے رسی میں باندھنے کے لئے لے چلا۔ راستہ میں اتفاقاً اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو کالو ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا کر ہوا ہو گیا۔ درشن نے اس کے پیچھے دو چار الانگیں بھری مگر کہاں کالو کی بجلی کی سی رفتار اور کہاں درشن کا بھدا جسم۔ ذرا پرے جا کر کالو نے تاخیر جتی ہوئی زمین سے مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر اس کی طرف پھینکا اور ساتھ ہی ایک گالی بک دی؛ اور اس گالی کا رد عمل دیکھے بغیر عید گاہ میں لوٹ آیا۔

یہ اسی روز کا واقعہ ہے جب ہم سب دن کے گیارہ بجے دوپہر گزارنے اور شہتوت کھانے کے لئے عید گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ارائیوں کے رہٹ پر ہم نے دیکھا کہ کالو حوبچہ میں بیٹھا نہا رہا ہے۔ کان سرخ اور منہ پہ ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ مری ہوئی آواز میں منمنایا: "قوم کو موت کدھر لے چلی ہے" قوم نے بیک آواز کہا: "چلو حیپے تمہیں توت کھلائیں" اور مجید کالو کے چہرے پر یکدم قائدوں جیسی سنجیدگی لوٹ آئی اور پر درد لہجہ میں کہنے لگا: "خدا کے لئے عید گاہ نہ جانا، آج وہاں جنوں کا قبضہ ہے!" اور پھر نہانا بھول کر ہاتھ ہلا ہلا کر داستان سنانے لگا: "وہ برجی کی چار دیواری کے پاس تھڑے پر جو آم کا پیڑ ہے نا، میں آج اس پر ڈھیلے پھینک پھینک کر کیریاں گرا رہا تھا۔ یکدم درخت کی ڈال سے ایک بونا لٹکتا نظر آیا جس کی تین ہاتھ لمبی ڈاڑھی تھی۔ ڈال سے ایک ہاتھ سے لٹک کر وہ نیچے کود پڑا اور میرے چٹکیاں بھرنے لگا۔ ساتھ ہی یہ کہتا جاتا تھا: "تم کبھی چین سے سونے بھی دو گے کہ نہیں؟ آج میں تمہارا علاج کر کے چھوڑوں گا۔" تب سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی لوہے کی سوئیاں آگ میں سرخ کر کے جسم میں چبھو رہا ہے۔ بھاگم بھاگ یہاں پہنچا ہوں اور تب سے پانی میں بیٹھا ہوں۔ ذرا سر باہر نکالتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے تنور میں جھانک رہا ہوں۔ اب بتاؤ کیا کروں؟"

یہ کہتے کہتے وہ حوض سے باہر نکل پڑا اور کپڑے پہن کر محلے کی طرف ہو لیا۔ ہم بھی اپنا دوپہر کا پروگرام ملتوی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ محلہ میں داخل ہونے سے قبل

مرزا اظہار بیگ کے مکان کے سائے میں ذرا رُک کر کہنے لگا: "یار آج بہت بری ہوئی ہے"۔ اور اس کے بعد دِتّن کے پنجہ میں قابو آنے اور کان مروڑے جانے کا قصّہ سنا کر کہا: "اس کی تو کوئی بات نہیں۔ دتّن کے بچے کو قلے مار مار کر یوں کر دوں گا جیسے بینگن کا بھرتہ، مگر افسوس یہ ہے کہ اس کمبخت نے میری غلیل چھین لی ہے"۔ اس کے بعد تجویز طلب نظروں سے سب کی آنکھوں میں ایک بار جھانکا۔ ذرا سے وقفہ کے بعد لطیف لمبا بولا: "وہ موٹا تھانیدار ہمارے پڑوس میں رہتا ہے، چلو اس سے کہیں۔" سب لوگ پوری سنجیدگی سے تھانے پہنچ گئے۔ لطیف کو دیکھتے ہی تھانیدار ڈکرایا: "اوئے جمورے! ادھر کدھر؟" اور لطیف لمبے نے رُندھی ہوئی آواز میں تمام کہانی سنائی۔ تھانیدار نے اسی وقت ایک پیادے کو ناس پورہ دوڑایا کہ وہ دتّن کو بلا لائے اور ہمیں کہا: "دن ڈھلے آنا"۔

ہم سب جمع ہو کر جب شام سے ذرا پہلے تھانے پہنچے تو دتّن کو کان پکڑ کر مرغا بنے ہوئے پایا۔ ہمیں دیکھ کر تھانیدار بولا: "لو بھئی کاکو (لڑکو) تمہارا مجرم حاضر ہے۔" یہ کہہ کر دتّن کو ایک لات رسید کی اور کہا بھاگ جاؤ اور صبح دن چڑھے سے قبل غلیل یہاں پہنچا دو۔ صبح ہم غلیل وصول کرنے کے لئے جب چوکی گئے تو دتّن کو منتظر پایا۔ تھانیدار ابھی گھر سے نہیں آیا تھا۔ دتّن نے ہاتھ باندھ کر ایک بھدّی سی غلیل جس کو سوت کی کچی ڈور سے باندھا گیا تھا۔ ہمارے سامنے پیش کیا اور منّتیں کرنے لگا۔ "واہگورو کے لئے یہ لے لو"۔ ہم نے اس سے پوچھا: "جیدے کی غلیل کیا ہوئی؟" تو قریباً رو کر کہنے لگا: "میں نے وہ گلول لے کر کھوہ (کنوئیں) میں پھینک دی تھی۔ پانی میں بھیگ کر اس کی دوشاخی لکڑی پھٹ گئی اور ٹیوب سے کٹی ہوئی ربڑ کی باریک کترنیں کھل گئیں۔ اس لئے راتوں رات گاؤں کے ترکھان سے یہی کچھ گھڑوا کر وال دیا کر کے لے آیا ہوں۔ اب کے ماف کر دو، پھر کبھی ایسی گلتی نہیں ہوگی"۔ اور ہم نے سچ مچ اسے معاف کر دیا اور تھانیدار کے آنے سے قبل ہی اپنی بگڑی ہوئی ہئیت کی گلول لے کر چلے آئے۔

کل مجھے اپنے روزمرّہ کے کام کے سلسلہ میں خاکی پتلون اور سولا ہیٹ پہنے ہوئے اپریل کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کو درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور میں سستانے کے لئے وہاں ذرا رکا۔ ہیٹ اتار اس سے پنکھا کرنے لگا کہ دور سے رُوں رُوں کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ درختوں کے جھنڈ کو چیر کر میں رہٹ پر پہنچا۔ پانی پیا، منہ دھویا، سر پر گیلا ہاتھ پھیرا اور جب ذرا دم میں دم آیا تو بے اختیار عیدگاہ یاد آگئی اور اس کے ساتھ ہی اُونٹوں کی قطار میں دُم اور نکیل کی طرح بات سے بات مربوط ہو کر سامنے آنے لگی۔ مجید کالو یاد آیا جو اب کسی کپڑے کی مل میں کھڈّی بنتا ہے، رشید اتیلی سوٹ پہنتا ہے، لطیف لمبا کسی کالج میں لیکچرر ہے۔ تایا پُتّا کا اب مونچھیں لگائے خانصاحب آفتاب احمد خاں بن گیا ہے اور کسی دفتر میں کلرک ہے۔ یونسی نے کھیوڑہ میں نمک کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور میں گاؤں گاؤں پیدل پھر کر اپنے رزق کے دانے مہیا کرتا پھرتا ہوں۔ عیدگاہ کسی دور 'پرائے' دیس میں رہ گئی ہے! وہاں مدفون میرے بہن بھائی کی قبروں پر ماتا کی گھٹاؤں سے ٹپکے ہوئے آنسو اب پھول بن کر نہیں گرتے۔ اب وہاں ڈھور چرتے ہیں۔ اب 'نشاہوں' کے کنوئیں پر کوئی اور ہی براجمان ہے۔ عیدگاہ کی چونے گچ دیوار پر کالی پھپھوندی نے روغن کر دیا ہوگا۔ عیدگاہ کے چٹیل میدان میں جہاں عید کے روز بار بار "اللہ اکبر — اللہ اکبر" سنائی دیتا تھا۔ اب اور لڑکے گلی ڈنڈا کھیلتے ہوں گے۔ پیرجی کی چوکھنڈی کی اینٹیں اُکھڑ چکی ہوں گی۔ ان کے مزار پر ہر جمعرات کو جلنے والے دیئے اب ٹھیکریوں کی صورت میں بکھرے ہوں گے۔ آم کی چوٹی پر لہرانے والا فیروزی رنگ کا جھنڈا کبھی کا تار تار ہو کر ہوا میں تحلیل ہو چکا ہوگا۔ عیدگاہ کے چاروں کونوں پر بڑ کے درخت ذرا اور بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ گہرے سبز رنگ کے جالے سے ڈھکے ہوئے جوہڑ میں بھینسوں کے لوٹنے سے اب یہ سبز قالین چیتھڑے ہو چکا ہوگا۔ مندر کے ساتھ والے باغیچہ کی باڑ اب چھ فٹ سے بڑھ کر بارہ فٹ موٹی ہو چکی ہوگی اور اب اس میں سے ہاتھی کا گزرنا بھی محال ہوگا۔ باغیچہ کے امرودوں، آڑوؤں اور شہتوتوں کے پودے جن کے تنوں کے درمیان سے گزرنا اب اور بھی مشکل ہوگا۔ ایک لق و دق چھتری کی صورت میں پہلے سے اونچے ہو گئے ہوں گے۔ لیکن ڈھاک کا وہ پُراسرار جنگل اب پہلے سے بھی گنجان ہو گیا ہوگا۔ اس کی ٹھنڈی، بھیلی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی قبروں کے گڑھوں میں کھٹی بوٹی زور شور سے اُگ آئی ہوگی اور درختوں کی چوٹیاں شعلہ رد کیسوؤں سے ڈھک گئی ہوں گی۔ پگڈنڈی پر سے گزرنے والے راہی یقیناً یہاں سے جھولیاں بھر بھر کر پھول لئے جاتے ہوں گے اور میری بستی میں بسنے والے بچے گروہ در گروہ 'طوطے' چننے کے لئے وہاں پہنچتے ہوں گے۔ تلیروں کے بچے اور بیباک ہو گئے ہوں گے۔ پہلے منہ والا بابا کمبوہ یقیناً مر کر راکھ ہو چکا ہوگا۔

اور اب اس کے بیٹے باری باری گاڑی پر لیٹ کر سوتے ہوں گے۔ لیکن آہ! اس کے تصور سے ہی میرے دل کے کسی گوشے میں محفوظ کیسو کھلا کر جمے ہوئے خون کا رنگ پکڑنے لگتے ہیں، پھر ان کی پتیاں سلگ اٹھتی ہیں اور ان کے گاڑھے دھوئیں کی تلخی جب میری آنکھوں میں پہنچتی ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے باریک سوئیوں کی تپی ہوئی لال سرخ نوکیں میری آنکھوں کو چھیدے ڈالتی ہیں اور ان لال بھبوکا سوئیوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے میری آنکھوں کا نور پانی کی بوندوں میں ڈھلنے لگتا ہے!

افسانہ:

عنایت اللہ

مختار بائیس برس کی عمر میں ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ ایک برس پرانی کھانسی شدید دمہ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ جوان تو جیسے ہوا ہی نہیں تھا۔ لڑکپن سے ایک ہی جست میں بڑھاپے تک پہنچ گیا تھا۔ چہرہ مرجھایا ہوا، بے نور۔ دور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں کے گرد سیاہ گھیرے، اور سر کے بال سفید ہونے لگ گئے تھے۔ اس کی ماں، مائی مریم، اس کے لئے دن بھر دوا دارو، تعویذ ٹوٹکوں اور خانقاہوں کے چکر میں گذار دیتی تھی یا ہر آئے گئے کو اپنے اکلوتے بیٹے، مختار کا دکھڑا سناتی رہتی تھی۔ ماں بیٹے کی زندگی مسلسل روگ بن گئی تھی۔ محلے کے ہر چھوٹے بڑے کو، قصبے اور مضافات کے حکیموں، سیانوں اور ڈاکٹروں کو، پیروں، فقیروں اور مولویوں کو اور سولہ کوس دور ایک جھگی میں دھرنا مارے بیٹھے سائیں عمرو کو بھی مائی مریم کے بیٹے کے روگ کی تفصیلات زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ ماتا کی ماری نے دمے کی گرفت میں کراہتے ہنکارتے اور تڑپتے ہوئے بیٹے کے گرد بوتلوں، پڑیوں، پھنکیوں، جڑی بوٹیوں، تعویذوں، اور کئی خانقاہوں کی خاک اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ڈھیر لگا دئے تھے۔ وہ بھی یوں جیسے محاذ پر سپاہی ریت کی بوریوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا کر موت کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے +

مائی مریم نے قصبے کا کوئی حکیم، ڈاکٹر، اور سیانا نہ چھوڑا۔ سب کو باری باری بارہ بارہ، چودہ چودہ روز آزما دیکھا۔ ڈاکٹروں وغیرہ نے مائی مریم کی بساط سے بڑھ کر پیسے وصول کئے اور علاج اپنی بساط کے مطابق کیا۔ مریض کو اس قدر انجکشن لگ چکے تھے کہ دمہ پسلیاں توڑ رہا تھا اور ڈاکٹروں نے بازو چھلنی کر کے ایک اور روگ پیدا کر دیا تھا۔ اس کے بعد حکیموں کے ٹھنڈے شربتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا +

مجبوراً ماتا اپنی محنت کی کمائی اکلوتے بیٹے کی اُکھڑی ہوئی سانسوں کا تسلسل قائم کرنے میں صرف کرتی رہی۔ زیور بک گیا۔ گھر کے کئی اچھے اچھے برتن جن میں زیادہ تر جہیز کے تھے اور جن میں مائی مریم کا ماضی مسکرا رہا تھا، کوڑیوں کے داموں نکل گئے۔ جو دھیلا ٹکا بچا تھا وہ پیر فقیر مولوی اور خانقاہوں کے مجاور لے گئے تھے۔ بیٹے کے اس جان لیوا مرض کے ساتھ اسے ایک اور بے چینی کھائے جا رہی تھی۔ سائیں عمرو نے اسے کہا تھا "ایک دُنبہ زندہ جس کی گردن میں سوا چھ روپے اور سات چھٹانک نمک کی ڈلی بندھی ہوئی ہو، لے آؤ۔ ہم چالیس روز اس پر دم کریں گے اور چالیسویں رات کے بارہ بجے مریض کو اس دنبے کی کلیجی کھلائیں گے ..... اس کے سوا مریض کا کوئی علاج نہیں"۔ لیکن مائی مریم تیس پینتیس کا دُنبہ اور سوا چھ روپے کہاں سے لاتی؟ آمدنی پہلے ہی کم ہو گئی تھی اور ساتھ کے ساتھ جو آمدنی ہوتی تھی وہ مختار کا دمہ چوستا جا رہا تھا۔ دو ایک جگہوں سے ادھار لیا تو وہ راستے میں ہی کسی ڈاکٹر، حکیم یا سیانے نے دھروا لیا +

مائی مریم کا اس دُنیا میں اپنا عزیز رشتہ دار کوئی نہ تھا، سوائے اس اکلوتے بیٹے کے۔ وہ قصبے کی تجربہ کار دائی تھی اور قصبے کے گلی گلی، کوچے کوچے میں اس کے ہاتھ کے سینچے ہوئے غنچے مسکرا رہے تھے۔ جانے کتنے بچوں نے اس کے ہاتھوں میں جنم پایا تھا اور جانے کتنی ہی عورتوں کو اس نے زچگی کے جانکاہ مرحلے سے بخیر و خوبی گذار دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں خدا نے ایسا جادو بھر دیا تھا کہ بچہ خواہ اُلٹا ہو، ٹیڑھا ہو یا مرا ہوا ہی کیوں نہ ہو، کیا مجال کہ زچہ کو زیادہ تکلیف ہو جائے۔ ہونے والی ماں اگر اس نازک اور اذیت سے بھرپور موقعہ پر ہوش میں ہو تو مائی مریم اسے ایسی باتوں میں لگا لیتی تھی کہ ماں فخر سے پیٹ میں چبھتی ہوئی چھریاں اور بچھوؤں کے ڈنک برداشت کر لیتی تھی۔ مائی مریم دائی کیونکر بنی تھی؟ یہ بھی ایک داستان ہے۔ مختصر یہ کہ یہ پیشہ اس کا آبائی نہ تھا۔ چوبیس برس پہلے کا حادثہ ہے کہ مریم کا خاوند شادی کے دو سال بعد اور مختار کی پیدائش سے دو ماہ پہلے، دور پردیس صوبہ بنگال، میں مر گیا تھا۔ مریم اس کے ساتھ تھی۔ روزی نے میاں بیوی کو اپنے دیس پنجاب سے بہت دور پھینکا ہوا تھا۔ مریم شادی کے تیسرے ہی روز اپنے خاوند کے ساتھ بنگال چلی گئی تھی۔ انہی دنوں میں اس کے ماں باپ بھی مر گئے۔ اتنے دور پردیس میں تنہا رہ جانا اور وہ بھی اس حالت میں کہ پیٹ میں بچے نے اپنی زندگی کے دعوے جتانے شروع کر دئے تھے۔ صرف دو مہینے باقی تھے۔ مریم نے اس کسمپرسی میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ زچگی کے بعد ہی اپنے

طن پنجاب کا رُخ کیا جائے۔ پنجاب میں بھی اس کے لئے اب کیا کشش تھی۔ اپنے جو تھے وہ اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ گئے تھے۔ اگر کچھ باقی تھا تو ڈھولک کے اُن گیتوں کی گونج باقی تھی جو اس کی سہیلیوں نے اس کی شادی پر گائے تھے۔ یہ گونج ابھی تک اس کے ماں باپ کے اُجڑے ہوئے گھر میں سو رہی تھی۔ اور سہیلیاں؟ مریم جانتی تھی کہ وہ بھی ایک ایک کر کے اپنے اپنے آشیانے جانے کہاں کہاں بنا چکی ہیں۔

مریم کے پیٹ میں یہ بچہ پہلا بچہ تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ مرحلہ کہاں سے اور کس طرح شروع ہوتا ہے اور کسی کو مدد امداد کے لئے بلانے کا صحیح وقت کونسا ہوتا ہے۔ وہ رات تاریک تھی اور سرد جب مریم کے پیٹ میں کرخت درد اٹھا تھا۔ یہ درد لہروں کے زیر و بم کی طرح آتا اور جاتا رہا۔ چڑھتا اور گھٹتا رہا تھا۔ تنہائی، آدھی رات کا وقت، پردیس، اڑوس پڑوس والوں کے ساتھ راہ و رسم تو اچھی تھی لیکن اس نے آدھی رات کو کسی کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں گر پڑی ہے اور مگرمچھوں کے لمبے لمبے دانت اس کے پیٹ میں اُترتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی لَو دھندلی ہو گئی تھی۔ پھر اندھیرا گھُپ اندھیرا۔ جب وہ اپنے آپ آتی تھی تو محلے کی دو ادھیڑ عمر عورتیں اور ایک معمر عورت اس کے اردگرد افراتفری کے عالم میں گھوم پھر رہی تھیں پیشتر اس کے کہ وہ پوچھتی "یہ کیا ہوا تھا؟ .... میں کہاں تھی؟ .... اب کہاں ہوں؟" کہ اس کے کانوں میں بچے کی "آغوں۔ آغوں" کی انتہائی پیاری آواز پڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک بھاری بھرکم گرسیلی آواز اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سنائی دی تھی جس نے مریم کا سارا درد چوس کر اس کے رگ و ریشے میں ایک مقدس سا سکون بھر دیا تھا ـــــ دُنیا میں مختار کی یہ پہلی صبح تھی۔

معمر عورت دائی تھی جسے یہ دو عورتیں پڑوس سے مریم کی چیخ و پکار اور واویلا سن کر بلا لائی تھیں۔ یہ سب کچھ اس کی غشی کی حالت میں ہوا تھا۔ اس روز کے بعد اس بوڑھی دائی نے مریم کی کسمپرسی پر ترس کھاتے ہوئے زیادہ تر وقت اسی کے پاس گذارنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ مریم پردیسن ہے اور بیوہ۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مریم کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ مریم نے اسے بتایا تھا کہ پنجاب کے ایک قصبے میں اس کے آبا و اجداد کا امکان ہے۔ بوڑھی دائی نے ایک نیک ارادہ دل میں لے کر مریم کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور اسے دائیوں کا کام سکھا دیا تھا مریم کو بھی چند مہینوں میں اچھی خاصی دائی جیسی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ بوڑھی دائی کا ایثار تھا کہ اس نے مریم کو قصبے کا آدھا حصہ دے دیا تھا اور اس طرح اس کی آمدنی شروع ہو گئی جو بڑھتے بڑھتے اس کے مرحوم خاوند کی ماہانہ تنخواہ سے تین بعض دفعہ چار گنا ہو جاتی تھی۔ مریم نے مختار کو لاڈ و پیار اور چاندی میں پالنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے سال کے آخر میں اس کے پاس ڈیڑھ پونے دو ہزار روپے جمع ہو گئے تھے اور اس نے بوڑھی دائی کے پاؤں چھو کر الوداع کہی اور پنجاب چلی آئی تھی۔ یہاں آ کر اس نے اسی پیشے کو ذریعہ معاش بنایا۔ ہر طرف مشہور ہوئی اور آمدنی بھی اچھی ہوتی رہی۔

کمایا تو اس نے خوب لیکن دماغ میں اتنی وسعت اور بلندی نہیں تھی کہ اس قدر کمائی کا کوئی بہتر مصرف سوچ سکتی۔ ہوا یہ کہ اس نے ضرورت سے زیادہ آمدنی سے مختار کو بگاڑنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی تمام تر توجہ کی طرح اس نے روپے پیسے اور اخراجات کا بھی مرکز مختار کو بنا لیا تھا۔ لاڈ پیار کی بھی یہ حد کہ بچہ آدھی رات کے وقت پیشاب کے لئے اٹھا اور کسی ایسی چیز کی فرمائش کر دی جو گھر میں نہیں ہے تو مریم نے اسے سلا دینے کی بجائے خواہ دس دروازے کھٹکھٹانے پڑے بچے کی فرمائش اور ضد ضرور پوری کی۔ چھٹے برس سکول بٹھایا تو بچہ سکول سے بھاگ کر ماں کی گود میں آ چھپتا تھا۔ ماں نے سختی کی تو مختار نے صحن کی مٹی ایڑیوں سے کھود کر آسمان تک پہنچا دی۔ مریم کے پاس دوسرا علاج پیسہ تھا۔ اس نے مختار کو دو چار پیسیوں کی جگہ دو چار آنے دے کر سکول بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ اس رشوت ستانی نے مریم کی آنکھوں میں یہ دھول جھونکی تھی کہ "بچے کا دل سکول میں لگ گیا ہے" لیکن پہلی کے ماسٹر سے پتہ چلا تھا کہ "بچہ سکول سے بھاگ جاتا ہے" مریم کو اور تو کوئی علاج نہ سوجھا، اس نے ماسٹر کو پانچ سات روپے ماہانہ دینے شروع کر دیئے تھے کہ مختار کو کسی نہ کسی طریقے سے پڑھائی میں لگا لے۔ اس رشوت یا اجرت نے یہ کام کیا تھا کہ مختار دوسری جماعت تک پہنچ گیا پھر دوسری جماعت کے ماسٹر کی بالائی آمدنی شروع ہو گئی تھی اور یہ آمدنی چھٹی جماعت کے ماسٹر پر جا ختم ہوتی تھی کیونکہ مختار اب سکول سے بھی اور گھر سے بھی غائب رہنے لگ گیا تھا۔ اس کے علاوہ چھٹی جماعت کا ماسٹر بھلا آدمی تھا۔ اس نے مریم کو دیانتداری سے خبردار کر دیا تھا کہ "لڑکا آوارہ ہو چکا ہے اس پر پیسہ برباد نہ کرو۔ گھر میں ماسٹر بٹھا لو اور لڑکے کو نظر میں رکھو۔"

مریم کو دکھ ہوا تھا۔ اس نے اس بچے کی خاطر جوانی کی اُمنگیں سینے میں دبالی تھیں اور زندگی کا سارا سوز اس اکلوتے بچے پر مرکوز کر دیا تھا۔ اس نے شادی کے کئی پیغام ٹھکرا دیئے تھے لیکن بچہ اس کی تمناؤں کا خون کر رہا تھا۔ "کاش! میں دوسری شادی کر لیتی۔ شاید مرد اس لڑکے کو راہ پہ چلا لیتا" لیکن مریم نے اس خیال کو جھٹک دیا اور اپنے اندر مردانہ خود اعتمادی اور استقلال پیدا کر لیا۔ اس نے مختار کو تعلیم کی طرف ڈالنے کے لئے نئی راہیں تلاش کرنی شروع کر دیں لیکن

ہر راہ لاڈ و پیار سے شروع ہوتی تھی اور لاڈ و پیار میں ہی جا ختم ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مختار بہت دور پہنچ چکا تھا۔ مریم کو اس فاصلے کا اندازہ اس روز ہوا تھا جس روز اس نے بارہ سالہ مختار کو گود میں لے کر پیار کیا تو اسے لڑکے کے منہ سے تمباکو کی تیز بدبو آئی تھی۔ مریم کا تو کلیجہ ہی ہل گیا تھا۔ اس نے اسے لاڈ پیار سے سمجھایا۔ پیسوں کا لالچ دیا لیکن مختار نے اب اپنی قیمت چڑھا دی تھی۔ اب وہ دو چار آنے پہ تو راضی ہی نہ ہوتا تھا۔ مانگتا تھا تو پورا روپیہ مانگتا تھا۔ اگر نہ ملے تو گھر کے کسی کسی برتن کی خیر نہیں۔ اس طرح کئی برتن ٹوٹ گئے تھے لیکن مریم کا دل ابھی ثابت و سالم تھا۔ محلے کی عورتوں نے اسے کئی بار کہا تھا۔ "مریم بہن! مختار ماشاء اللہ جوان ہو گیا ہے۔ ذرا ڈانٹ ڈپٹ رکھا کرو۔ سنا ہے لوفر لفنگوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔" اور مریم نے پیار بھری ہنسی ہنس کر ٹال دیا تھا۔ "اری بہن! بیوہ کا بیٹا بادشاہ کا بیٹا۔ بچہ ہی تو ہے۔ خود سنبھل جائیگا۔ دو چار برس بعد شادی کرا دوں گی اور بہو خود ہی سنبھال لے گی۔ ابھی تو کھیلنے کے دن ہیں بے چارے کے۔"

یہ دو چار برسوں بعد کا تصور مریم کو جانے کونسے سہانے سبزہ زاروں میں لے گیا تھا۔ اُس نے دو چار برس کا عرصہ خیالوں کی ایک چھلانگ میں طے کر لیا تھا لیکن مختار ماں کے ذہن میں بسے ہوئے ان سبزہ زاروں کی طرف جانے والی پگڈنڈی سے ہٹتا گیا، ہٹتا گیا، ہٹتا ہی گیا تھا اور بھٹک کر ایسی کھائی میں جا گرا تھا کہ ماں پورا پورا دن اور بعض دفعہ پوری پوری رات بیٹے کو دیکھنے کو بھی ترسنے لگی تھی۔

مختار کی عمر سولہ برس ہو چکی تھی اور مریم اب مائی مریم بن گئی تھی۔ بعضوں کا بچپن پیچھے رہ جاتا ہے بعض جھٹک دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو بچپن کو بڑھاپے تک اپنے اوپر آسیب کی طرح سوار پاتے ہیں۔ یہ حال مختار کا تھا۔ مختار بڑا ہو گیا تھا لیکن ماں نے اس کے کردار میں "بچے" کو بڑا نہ ہونے دیا تھا۔ ماں کے اس پیار بھرے تعاون نے اور بچپن کے زندۂ جاوید اثرات نے مختار کو گمراہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اب تو وہ بہت ہی دور نکل گیا تھا۔ اس دوری کا احساس مائی مریم کو اس روز ہوا تھا جس روز اس نے جانے کیوں ٹرنک کھولا تو اس کے کونے میں سے پڑوسن کی امانت کا سو روپیہ غائب پایا۔ جو اسے اپنے پیسوں میں سے پورا کرنا پڑا تھا۔ سو کے اس نوٹ کے ساتھ مختار بھی غائب تھا۔ مریم نے اپنا سر پیٹ لیا اور چوتھے روز مختار سامنے آیا تو اس کا سر چوم لیا۔

مختار جھومتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئیں جیسے کئی راتوں سے سویا نہ ہو۔ بال بکھرے ہوئے۔ ہونٹ خشک اور چہرہ اُترا ہوا تھا۔ چہرے کے ایک ایک نقش اور چال ڈھال سے آوارگی اور گناہ کی بو اٹھ رہی تھی اور یہ بو اس کے گرد اس طرح منڈلا رہی تھی جس طرح خارش زدہ کتیا کے گرد مکھیاں بھنبھنا رہی ہوتی ہیں۔ مختار کا اس وقت کا حال حلیہ اس منظر سے کم نہ تھا۔ مریم نے لپک کر بچھڑے ہوئے بیٹے کو بازوؤں میں دبوچ لیا تھا اور وارفتگی کا یہ عالم کہ مریم کو بہت دیر بعد یہ خیال آیا تھا کہ مختار کے منہ اور بدن سے انوکھی سی بدبو آ رہی تھی جو تمباکو سے زیادہ مکروہ اور گلی سڑی تھی۔ اگر وہ ماں نہ ہوتی تو شاید قے کر دیتی لیکن اس بدبو میں ماں کو اپنے بیٹے کی خوشبو آ رہی تھی۔ مائی مریم نے اسے نہلایا دھلایا۔ کپڑے تبدیل کرائے۔ پاس بٹھا کر کھانا کھلایا۔ وہ سولہ برس کا نہ ہوتا تو مریم اسے گود میں بٹھا لیتی۔ اس نے آہستہ سے مختار سے پوچھا کہ وہ کہاں رہا ہے اور "کیا سو روپیہ تم ہی لے گئے تھے میرے لال؟" مختار نے قہر آلود نگاہوں سے ماں کو دیکھا تھا اور نوالہ نگل کر بم کی طرح پھٹتے ہوئے کہا تھا "ہاں! میں لے گیا تھا۔" ماں تو دبک گئی تھی لیکن ممتا تڑپ اٹھی تھی۔

اس روز کے بعد مختار گم رہنے لگا تھا۔ کبھی رات کو گھر آتا تھا تو ماں کے قریب ہو کر بھی وہ گم رہتا تھا۔ کھویا ہوا۔ آنکھیں بے چین۔ ہاتھوں کی حرکتوں سے کسی بے قراری کا پتہ ملتا تھا۔ بات بات پہ وہ کھانے کو آ جاتا تھا۔ چڑچڑاپن بھی ایسا کہ مریم ڈر اور پیار کے مارے کچھ نہ کہتی تھی اور تنہائی میں۔ خونِ جگر پی کر آنسو بہا لیتی تھی۔ دن گذر رہے تھے۔ پھر مہینے گذرنے لگے اور مختار دن بدن زرد پیلا ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنستی جا رہی تھیں۔ کئی کئی روز کپڑے نہ بدلتا تھا۔ کنگھی بھی کبھی ماں نے کر دی تو بال سنور گئے ورنہ وہاں تو جوؤں کا بسیرا تھا۔ مریم کے پاس آنسوؤں کے سوا علاج ہی کیا تھا۔ بیٹے کی زبوں حالی کے غم سے وہ قبل از وقت مائی مریم بن گئی تھی ورنہ چونتیس پینتیس برس بھی کوئی عمر ہوتی ہے! اس نے روپے پیسے سے بیٹے کو واپس لانا چاہا تھا لیکن بیٹا گھر میں روپیہ پیسہ چھوڑتا ہی کہاں تھا۔ جہاں ماں نے ذرا مزاحمت کی بیٹا مرنے مارنے پر تُل گیا۔

اس وقت بھی مریم نے خانقاہوں پہ نذر نیاز مانی تھی۔ دی بھی تھی اور اونچی مسجد کے مولوی صاحب سے کتاب بھی نکلوائی تھی۔ مولوی صاحب اس روز موڈ میں نہیں تھے۔ ان کی بہو اُن کے اچھے بھلے بیٹے کو دھتکار کر میکے جا بیٹھی تھی۔ بیٹا روتا تھا اور بہو، سنا تھا، کہ ہنستی کھیلتی سرسوں کے پھولوں کے ہار بناتی رہتی تاہم مولوی صاحب نے بند کتاب پر مائی مریم سے سوا روپیہ رکھوا فال نکالی تھی اور اسے بتایا تھا: "تیرے بیٹے پر ایک عورت کا سایہ ہے۔ ہر شام پانچ پیسے کا تیل مسجد میں ڈالا کرو۔ اور جمعرات سوا سیر چاول باسمتی کا زردہ پکا کر مسجد میں لے آیا کرو جسے ہم دم کر کے دو نوالے مختار کے لئے دیا کریں گے۔" مولوی صاحب

نے ایک تعویذ بھی دیا تھا جسے ان کی ہدایت کے مطابق مریم نے مختار کی چارپائی کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ اس چارپائی کے ساتھ کہ جس پر مختار سویا بیٹھا ہو یا نہ ہو۔ چرس کا نجے اور افیون کی بو وہیں رہتی تھی ـــــــ اور تعویذ پر خدا اور رسولؐ کا نام لکھا ہوا تھا!

مائی مریم تعویذ کے اثر کی آس سے دکھی ہوئی زندگی کے شب و روز کو فریب دینے لگی تھی اور وہ اونچی مسجد میں رکھے ہوا کنستر تیل سے اور مولوی صاحب کا پیٹ باسمتی چاولوں سے باقاعدگی سے بھرتی رہی تھی۔ مختار پر جانے کس عورت کا سایہ تھا جو نہ ہٹا۔ مریم اس احساس سے بے بہرہ تھی کہ وہ عورت وہ خود تھی ہے اور اس کے بے جا لاڈ پیار کا آسیب اس کے بیٹے کو کھائے جا رہا ہے۔ پھر مریم کی زندگی نے وہ دن بھی دیکھا جب حاجی کرم دین نے اس سے پوچھا تھا: "مریم! مختار کا کچھ پتہ ہے کہاں ہے؟" "نہیں حاجی جی!" مریم کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ ایک دکھ نے اس کی آواز حلق میں ہی دبوچ لی تھی اور بصد مشکل اسی قدر کہہ سکی تھی۔

"آج پانچ روز سے وہ لاپتہ ہے۔ گھر میں جو پیسہ دھیلا ہے وہ بھی لے گیا ہے۔"

"خدا کی بندی! خدا کو یاد کر۔ نماز روزہ کر اور بیٹے کی سلامتی کی دعا کر۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ جا قبرستان والے تکئے میں۔ مختار وہاں بے ہوش پڑا ہے۔ کمبخت نے چرس پی پی کر بُرا حال کیا ہوا ہے۔" "چرس؟" مریم کی جیسے چیخ نکل گئی تھی۔

"آج سے نہیں۔ وہ دو برس سے چرس اور گانجا پی رہا ہے۔ جُوا بھی کھیلتا ہے۔ تمہیں ابھی پتہ ہی نہیں!" حاجی کرم دین نے کہا تھا: "ادھر آ میرے ساتھ۔ دو آدمی تیرے ساتھ بھیج دوں گا۔"

بے ہوش مختار کو دو آدمی تکئے سے اٹھا کر لائے تھے اور اس دن کے بعد اس کی کھانسی نہ تھمی جو کرتے کرتے دمہ بن گئی۔ علاج معالجہ شروع ہوا لیکن اسے ذرا سی فرصت اور افاقہ مل جاتا تو جا کے چرس کا کش لگا آتا تھا۔ پھر رات بھر اس کا سانس رکا رکا رہتا جیسے ابھی مرا کہ مرا۔ وہ تو نہ مرا لیکن مریم رات کو سو سو بار مرتی تھی۔ اور اب بگڑا ہوا دمہ اس کے انگ انگ کو جلا رہا تھا۔ ایسی ہی ایک رات جبکہ مختار کی سانس کتنی کتنی دیر رکی رہتی تھی۔ آنکھوں کے ڈھیلے باہر آ جاتے تھے اور وہ ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا تو مریم کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے:۔

"یا مولا! میں نے تو دعا کی تھی کہ میرا بچہ صحیح و سالم پیدا ہو۔ اس کا کوئی عضو مارا ہوا نہ ہو۔ پیدائشی اندھا نہ ہو۔ اچھے کی طرح لنگڑا لُنڈا نہ ہو۔ اے خدا اس اچھے بھلے لڑکے سے تو مجھے پیدائشی اندھا یا لنگڑا بچہ دے دیتا تو مجھ سے یوں تو نہ بھاگتا۔"

مریم کی یہ دعا بظاہر انوکھی سی لگتی تھی لیکن اس کے پس منظر میں چند حرف نیئے چھپے ہوئے تھے جن کا مریم کی زندگی میں بڑا دخل تھا۔ گذشتہ جو بیس برسوں میں مریم کے ہاتھوں میں ہزاروں بچوں نے جنم لیا تھا۔ ان میں بے شمار ایسے تھے جو قبل از وقت پیدا ہوئے تھے اور جنہیں زندہ رکھنے کے لئے مریم نے خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ اُلٹے اور ٹیڑھے بچوں کو بھی وہ بڑی احتیاط اور محنت سے اس دُنیا میں بخیر و عافیت لے آئی تھی۔ کسی بچے کا زچگی میں ضائع ہو جانا تو وہ اپنی موت سمجھتی تھی۔ بعض بچے جو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ہوئے پیدا ہوتے تھے مریم کے ہاتھوں میں یوں لگنے تھے جیسے وہ انہیں اپنی زندگی دے رہی ہے۔ بچے کے منہ میں منہ ڈال کر پھیپھڑوں کو ہوا دے کر سانس رواں کرنے میں تو اسے خداداد قابلیت اور تجربہ حاصل تھا۔ گو وہ پیشہ ور دائی تھی لیکن اس کے انداز میں کاروبار کو ذرہ بھر دخل نہ تھا۔

اُسے چڑ تھی تو ان بچوں سے کہ جو پیدائشی نقص دار پیدا ہوتے تھے۔ اندھے۔ ایک ہاتھ ٹیڑھا یا ٹانگ ٹیڑھی یا اس قسم کا اور کوئی نقص جو بڑے ہو کر انسان کو اپاہج اور لوگوں کے لئے تماشہ بنا دیتا ہے۔ یہ چڑ اس کے چھوٹے بھائی کی یاد سے وابستہ تھی جو تیرہ سال کی عمر میں مر گیا تھا۔ یہ بھائی مریم سے چار سال چھوٹا تھا اور اس کے بائیں بازو اور بائیں ٹانگ میں یہ پیدائشی نقص تھا کہ بازو کہنی سے نوّے درجے کے زاویے پر اکڑا ہوا تھا۔ بازو کندھے سے آگے پیچھے کو ہلتا تھا لیکن کہنی سے نیچے بالکل بے جان تھا۔ اس کا ہاتھ جو پیٹ پر رکھا رہتا تھا بے ڈھب طریقے سے مڑا ہوا تھا اور بائیں ٹانگ دائیں سے ذرا سی چھوٹی۔ ایڑی اوپر کو اٹھی ہوئی اور پاؤں باہر کو مڑا ہوا تھا۔ مریم کی ماں نے بہت جتن کئے تھے۔ ہر طرح کی مالشیں بھی کرائی تھیں لیکن بچے کا یہ نقص دور نہ ہو سکا تھا۔ جب بچہ بڑا ہوا تو اس کی چال دیکھ کر دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا لیکن بچے اسے لنگڑا تیتہ کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ جب وہ سکول میں داخل ہوا تو سکول میں بھی لنگڑا تیتر مشہور ہو گیا تھا۔ اور اس معذور بچے کا یہ حال کر دن بھر لڑکوں سے لڑتا رہتا تھا۔ جہاں کسی نے لنگڑا تیتر کہہ دیا اس نے پتھر اٹھا کر پھینکنے شروع کر دیئے اور ایک بار ایسے ہی ایک موقعہ پر جبکہ وہ لڑکوں سے تنگ آ کر انہیں پتھر مار رہا تھا تو ایک پتھر پاس سے گزرتے ہوئے ماسٹر کے قریب جا پڑا۔ ماسٹر رک گیا اور

قہر آلود لہجے میں کہا "لنگڑے کے بچے پتھر لگ جاتا تو ......؟"

جس ماسٹر سے وہ اپنی مظلومیت کی شکایت کیا کرتا تھا اسی نے اسے اس کی محرومی کا طعنہ دے دیا تھا۔ بچے کا چڑچڑاپن اور غصہ اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ اس نے گھر والوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا جس کی بظاہر کوئی وجہ نہ ہوتی تھی لیکن اس کے کردار میں اس محرومی نے اور اس محرومی پر ہنسنے والوں نے جو زہر بھر دیا تھا وہ بچے کے دل و دماغ کو جلانے لگ گیا تھا۔ ایک تلخی تھی کہ اسے کسی پل چین نہ لینے دیتی تھی۔ اس تلخ تشنگی کو وہ گھر میں دنگا فساد، لڑائی مار کٹائی اور برتن توڑنے میں بجھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ ماں باپ اس کی اندرونی کیفیت سمجھے بغیر اس سے اکتانے لگ گئے تھے اور دو تین بار ماں نے بھی غصے میں آ کر اسے لنگڑا اتیتر کہہ دیا تھا۔ صرف مریم تھی جو اس کے دل کا حال سمجھتی تھی اور وہ اسے گود میں لے کر پیار کیا کرتی تھی۔ وہ کئی بار رو بھی دی تھی کہ ایک بھائی ملا اور وہ بھی اس حالت میں۔ مریم نے بھی کئی بار محلے کے بچوں کو ڈانٹا تھا اور ایک بار پڑوس والوں سے لڑائی بھی ہو گئی تھی۔

اس ماحول و فضا اور محرومی کی اُلجھن میں بچہ تیرہ برس کا ہو گیا تھا۔ اس بے بسی اور دنیا کے ہر انسان کے ہنسی ٹھٹھے نے اس کے اعصاب کچل کے رکھ دیئے تھے اور اس پر دورے پڑنے لگے تھے۔ کسی نے مرگی کی تشخیص کی تھی۔ کسی نے شر شرارت بتایا اور بعض نے آسیب کہہ کر یہ حقیقت پس پردہ ڈال دی تھی کہ بچے کا شعور اس کے لاشعور کے پے بہ پے ڈنکوں کے زہر سے کبھی کا مر چکا ہے۔ پیشتر اس کے کہ اس کے ماں باپ اور گرد و پیش کے لوگ یہ حقیقت سمجھتے کہ بچے نے ایک دن دورے کی حالت میں آخری ہچکی لی اور چل بسا۔ مریم اس وقت سترہ برس کی تھی۔ روتی تھی اور روتی ہی رہی۔ پھر اس کی شادی ہوئی۔ پھر ماں باپ یکے بعد دیگرے مر گئے۔ خاوند مر گیا اور مختار پیدا ہوا لیکن وہ اپنے لنگڑے بھائی کو فراموش نہ کر سکی۔ وہ ہمیشہ دعا کیا کرتی تھی "خدایا! مجھے بچہ دینا ہے تو بھلا چنگا دینا ورنہ بے اولاد اچھی۔ اسی میں تیرا شکر ادا کرتی رہوں گی۔"

اس رات جب اس نے تڑپتے ہوئے مختار کے سرہانے بیٹھ کر دعا کی تو اسے معاً اپنے مرحوم بھائی کا لنگڑا پن یاد آ گیا تھا اور اس کا ذہن گذرے ہوئے چوبیس برسوں کی مسافت طے کرنے لگا۔ ذہن پیچھے کو چل پڑا۔ اسے ایک بچہ یاد آ گیا۔ جو پیدا ہوا تو مریم نے دیکھا کہ اس کا ایک بازو اور ٹانگ اس کے بھائی کی طرح تھیں۔ اس مولود کو دیکھ کر اسے اپنا بھائی، اس کی تیرہ سالہ تلخ زندگی اور اس کا انجام یاد آ گیا۔ اتفاق سے اس بچے کے سانسوں کا تسلسل درست نہ تھا جسے مریم منہ میں منہ ڈال کر یا بچے کو ٹا سید حا کر کے درست کر سکتی تھی لیکن مریم نے چشم زدن میں تصور میں دیکھ لیا تھا کہ بچہ بڑا ہو گیا ہے۔ سکول داخل ہو گیا ہے اور لنگڑا بھتر، لنگڑا بھتر، آوازیں اور بلند قہقہے اس پر گدھوں اور چیلوں کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں۔ اور بچہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگی کے دورے سے مر گیا ہے۔ کسی پیدائشی نقص پر ہنسنے والوں پر تو مریم کا زور نہ چلتا تھا۔ اس کا جہاں تک زور چلا چلا یا ــــ اس نے بچے کی ماں کی نظر بچا کر بچے کی ناک اور منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بچے کی سانسوں کا تسلسل تو پہلے ہی بے قاعدہ تھا۔ سانس جو رُکا تو دو ہی سیکنڈ بعد بچہ ذرا سا تڑپا اور ننھی کلی مرجھا گئی۔ مریم نے ماں کو کہہ دیا کہ "بی بی! بچہ مرا ہوا پیدا ہوا ہے۔"

ازاں بعد اس کی گذر رہی ہوئی زندگی کے چوبیس برسوں میں دو اور بچے ایسے آئے جنہیں مریم نے اپنے بھائی کے بھیانک انجام تک پہنچنے کی خار دار راہوں سے بچا لیا تھا۔ ان تین ننھی جانوں کی متوقع تلخیوں اور صعوبتوں سے بچانے کے لئے مریم نے انہیں خدا کے سپرد کر کے نیکی کی تھی جس سے اسے سکون ملا تھا لیکن اس سکون کے ساتھ احساسِ گناہ بھی تھا جس سے مریم اکثر گھبرا جاتی تھی۔ "شاید میں قاتل ہوں!" چنانچہ وہ یہ راز اپنے آپ سے بھی چھپانے لگ گئی تھی۔

اس رات تڑپتے ہوئے مختار کے سرہانے بیٹھے ہوئے اسے اچانک اپنا بھائی یاد آ گیا اور یہ بچے بھی یاد آ گئے اور اس نے اپنے بیٹے کو چلا چلا کر کراہتے ہوئے دیکھ کر اپنے آپ سے کہا "میرا مختار تو میری دعاؤں کے مطابق اچھا بھلا، تندرست اعضاء لے کر پیدا ہوا تھا لیکن کس کام کا؟ یہ اچھا بھلا دماغ اور یہ متناسب اعضا! کاش! یہ لنگڑا ہی پیدا ہوتا۔ جرس جھنگی نہ ہوتا......" مریم یک لخت ساکت و جامد ہو گئی۔ ایک جانی پہچانی تلخی اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئی۔ وہ لرز گئی اور اس نے مختار کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ سے کہا۔ "اللہ میرے مختار کو صحت دے گا۔ لنگڑے ہوں اس کے دشمن۔" اسے ایک گونہ قرار سا محسوس ہوا کہ "میرا مختار لنگڑا نہیں۔" اور اس کے دل میں ایک نفرت نے انگڑائی لی۔ ایک چڑ جو ہر لنگڑے بچے کو دیکھ کر اس میں پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ "لنگڑوں کی بھی بھلا کوئی زندگی ہوتی ہے؟ مصیبت! اپنے لئے بھی دوسروں کے لئے بھی۔ تف!" اس نے ان تینوں بچوں کی یاد کو ذہن سے نکالنے کے لئے ذہن کے پٹ کھول دیئے۔ ان یادوں کو اب وہ بالکل ہی بھول جانا چاہتی تھی۔ ذہن کے پٹ جو کھلے تو ایک اور بچے کی یاد طرح

گھس آئی جس طرح کھلے ہوئے منہ میں مکھی داخل ہو جاتی ہے دراصل یہ تھا وہ پہلا بچہ جسے اس نے مار دینا چاہا تھا لیکن . . .

جب یہ بچہ پیدا ہوا تھا تو مریم کی نگاہ سب سے پہلے اس کی پیشانی پر پڑی تھی۔ پیشانی غیر معمولی طور پر چوڑی تھی اور پیشانی کے بائیں طرف ایک ننھا سا نشان تھا جیسے کسی پرانے زخم کا نشان ہوتا ہے۔ ایسا نشان مریم کے لیے معجوبہ تھا۔ اگر تازہ زخم ہوتا تو قابلِ فہم تھا لیکن نشان بہت پرانا معلوم ہوتا تھا۔ مریم نے قدرت کا کھیل سمجھ کر سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بچے کی آنکھیں خاص طور پر بڑی اور دلنشیں تھیں اور اسی طرح چہرے کا ایک ایک نقش جاذبِ نگاہ تھا۔ یہ پہلا بچہ تھا جو اس کے دل کو بھا گیا تھا۔ قدرت نے پھولوں کی رعنائیاں نوزائیدہ کے چہرے مہرے میں سمو دی تھیں لیکن مریم کا دل دھک دھک کرنے لگ گیا تھا جب اس کی صد آفریں! صد آفریں! کہتی ہوئی نگاہیں بچے کی بائیں ٹانگ پر جم گئیں۔ بچے کی بائیں ٹانگ دائیں سے اس قدر چھوٹی تھی کہ اس کا پاؤں دائیں ٹخنے کی بلندی سے بھی اوپر تھا۔ مریم نے سوچا تھا کہ یہ بچہ جب جوان ہو جائے گا تو اس کی بائیں ٹانگ دائیں سے کم و بیش چھ انچ چھوٹی رہ جائے گی۔ اسے اپنا بھائی یاد آ گیا تھا اور وہ اپنے آپ میں ایک سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ پھر اس کے دل و دماغ میں ایک کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا کردار دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک حصہ کہہ رہا تھا "ہاں" اور دوسرا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "نہیں نہیں"۔

"مائی مریم!" زچہ کی نحیف آواز آئی۔ "چپ کیوں ہو گئی ہو۔ اگر لڑکی ہے تو کہہ دو کہ لڑکی ہے۔ تم جانتی ہو کہ ہمارا پہلا بچہ ہے اور ہم کس طرح آس لگائے بیٹھے ہیں۔ بچہ زندہ تو ہے؟" "مبارک ہو بی بی!" مریم کے منہ سے بے ساختگی سے نکل گیا تھا۔ "اللہ زندگی دے۔ لڑکا ہے"۔ اور ایک لنگڑا بچہ مریم کے ہاتھ سے بچ گیا تھا لیکن مریم ایک تاسف سے نہ بچ سکی تھی اور یہ تاسف اسے اکثر پریشان کرتا رہا تھا کہ اس بچے کو اس نے زندہ رکھ کر محلے اور سکول کے بچوں کے لئے تماشہ پیدا کر دیا ہے۔ ایسے میں اسے اپنا بھائی پھر یاد آ جاتا تھا۔ لیکن وہ بچہ بنگال رہ گیا تھا۔ "معلوم نہیں زندہ ہو گا یا مرگی کے دورے سے مر گیا ہو گا . . ." مریم نے مختار کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے دل میں کہا۔ "خدا کرے مر گیا ہو بے چارہ! زندہ رہ کر وہ کس کام آئے گا۔ لنگڑے پن کی بھی حد ہوتی ہے۔ ایک ٹانگ دوسری سے اسقدر چھوٹی . . . . ."

"ماں! ماں! پانی! ہائے۔ ہائے۔" مختار کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلیں تو مریم کو سب کچھ بھول گیا اور وہ تڑپ اٹھی۔ لپک کر پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی جست میں مختار کو بازو کے گھیرے میں لے کر اٹھایا اور اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا گلاس اس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ چرس تو اس نے مہینوں سے نہ پی تھی۔ چارپائی سے اٹھنا محال تھا لیکن چرس کی بو ابھی تک اس کے پھیپھڑوں میں باقی تھی۔ مریم نے زندگی کی ایک اور رات جاگتے اور روتے گزار دی۔

صبح مختار کی حالت زیادہ خراب ہو رہی تھی اور اب تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر، حکیم یا سیانا اسے بچا نہ سکے گا۔ کسی کی دوائی ذرہ بھر اثر نہ کر رہی تھی۔ تعویذ اور نذر نیاز بھی بے اثر تھیں۔ مرض میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بعض اوقات تو نزع کی حالت طاری ہو جاتی تھی اور مریم نے آج پہلی بار اپنے آپ کو اس جان لیوا حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار کیا کہ مختار بچ نہ سکے گا۔

"مائی مریم! ایک جیلا اور کر دیکھو"۔ چھٹی آئے ہوئے ایک حوالدار نے اسے کہا۔ "شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے انسان تو حیلہ کرتا ہے"۔

"تم کسی خانقاہ کا نام لو بیٹا! میں سر کے بل چل کے جاؤں گی"۔

"خانقاہ نہیں مائی مریم!" حوالدار نے جواب دیا۔ "مختار کو راولپنڈی لے جاؤ۔ جامع مسجد کے عین سامنے ایک بنگالی ڈاکٹر نے نئی نئی دوکان کھولی ہے۔ جانے آج تک دمے کے کتنے ہی مایوس مریض اس نے ٹھیک کر دیئے ہیں۔ دمے کے علاج کا وہ ماہر ہے۔ کہتے ہیں کہ چار پڑیاں دیتا ہے اور ایک انجکشن لگاتا ہے اور مریض اٹھ کے چل پڑتا ہے۔ پنڈی کونسی دور ہے یہ دو سٹیشن تو ہے"۔

مائی مریم تو ڈاکٹروں کے نام سن سن کر اکتا گئی تھی۔ جو بیمار پرسی کے لئے آتا تھا کسی نہ کسی ڈاکٹر، حکیم کا نام یا اپنا کوئی نسخہ بتا جاتا تھا۔ لوگوں کو نسخے بتانے کا تو خبط ہوتا ہے۔ مریم نے اسے بھی ٹال دینا چاہا لیکن بنگال کا نام سن کر سوتے ہوئے نغمے تھرک اٹھے اور جوانی کی کچھ یادیں امڈ آئیں۔ شادی کے آغاز کی بہاریں اس نے بنگال میں منائی تھیں۔ اسے بنگال کا ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ خوبصورت دکھائی دیتا تھا اور یوں بنگال اس کے رگ و ریشے میں سما گیا تھا۔ آج بیس بائیس برس بعد اس نے کسی بنگالی کا نام سنا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خود تو بوڑھی ہو گئی ہے لیکن یادیں ابھی جوان ہیں۔ اسے

بنگالی کے لفظوں میں کچھ ایسی کشش پائی کہ جانے کو تیار ہو گئی ورنہ یہ تو اسے یقین تھا کہ مختار اب ہاتھ سے گیا۔

مائی مریم نے قصبے کے گھر گھر کی خدمت کی تھی، کون انکار کرتا۔ ایک آدمی ساتھ ہو لیا اور مختار کو راولپنڈی لے آئے۔ مریم ساتھ تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! میں کیمبل پور سے آئی ہوں۔ میرے اکلوتے اور جوان بیٹے کی زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے.... " اور اس نے رو رو کر مختار کا سارا حال کہہ سنایا لیکن اس کے کہنے کے انداز میں کچھ ایسی جھلک تھی جیسے ڈاکٹر کو کہنا چاہتی ہو۔ "ڈاکٹر صاحب! میں اپنی جوانی بنگال میں چھوڑ آئی تھی۔ آپ نے دیکھی ہو گی کہیں؟ اور میرے دکھیارے بچے کا باپ بھی وہیں رہ گیا تھا۔ بنگال کی سرزمین سے مجھے بہت پیار ہے ڈاکٹر صاحب!" لیکن وہ مختار کا حال سناتی رہی اور مختار ڈاکٹر کے قریب کرسی پر بیٹھا بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب! سخت نادار ہوں...." مائی مریم کہہ رہی تھی۔"......

ڈاکٹروں اور حکیموں نے میرا خون بھی چوس لیا ہے۔ یہ پیسے بھی ادھار لے کر آپ تک پہنچی ہوں۔ بیٹے کی بیماری کی وجہ سے آمدنی......"

"مائی! ہم جب پیسہ مانگے گا تو پیسہ کا بولو۔ ہم پہلے دوا دے گا...." ڈاکٹر نے اس کا فقرہ کاٹتے ہوئے کہا۔ "پہلے تمہارا بیٹا کو ٹھیک کرے گا تو پیسہ کا بات بولے گا۔ ہم ڈاکٹروں کا بات نہیں بولے گا مائی۔ آدمی والا بات بولے گا۔ تم گریب ہے تو ہم پیسہ کا واسطے تم کو واپس نہیں جانے دیگا۔ علاج جرور جرور کرے گا...." ڈاکٹر بولتا جا رہا تھا اور مریم جہانِ دگر میں پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر نے نسخہ لکھا اور پرچی مریم کو دیتے ہوئے کہا۔ "...... ادھر سے میرے کمپونڈر کو یہ پرچی دکھاؤ اور دوائی لے جاؤ۔ دن میں تین دفعہ دیئو۔ ابھی ہم ایک انجکشن کرے گا۔ آٹھ روج کا بعد دوسرا انجکشن کریگا۔ تمہارا آنے کا جرورت نہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! پیسے کتنے دوں؟"

"تم پھر پیسے کا بات بولا...." ڈاکٹر نے کہا۔ "تم جو بولا ہے ہم دائی کا کام کرتا ہوں تو تم بھی ڈاکٹر ہم بھی ڈاکٹر۔ پیسے بعد میں لے گا مائی پہلے علاج پورا کرو۔ ایک مہینے بعد یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور تم دیکھو مسٹر!" ڈاکٹر نے مختار کو کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ جے تم چرس پیئے گا تو ہم علاج نہیں کرے گا۔ ایسا ہی تم مر جائے گا۔ ایسا ہی جور جور سے سانس لیتا لیتا مرے گا...."

"مجھے اللہ کی قسم ڈاکٹر صاحب! میں سخت دکھی ہوں...." مختار نے کہا۔ "اب چرس نہیں پیوں گا اور سگریٹ تک نہیں پیوں گا۔"

"یہ قسم پھر بولو۔"

"اللہ کی قسم ڈاکٹر صاحب!"

جب آٹھویں روز مائی مریم مختار کو پنڈی لانے کی تیاری کرنے لگی تو مختار نے کہا۔ "ماں! تمہارے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ دیکھو تو میں تین دن سے اچھا بھلا ہوں۔ دمے کا دورہ تو اٹھا ہی نہیں۔" مریم نے تو پہلے ہی محسوس کیا تھا کہ مختار بہتر ہو رہا ہے اور رات میں اچھی طرح سوتا بھی رہا ہے لیکن وہ اسے اکیلا بھیجنا نہ چاہتی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ پیسے لے کر پھر ہوا نہ ہو جائے لیکن مختار بضد تھا کہ وہ اکیلا ہی جائے گا۔

وہ اکیلا پنڈی گیا۔ انجکشن لگوا آیا اور آٹھ روز کی دوائی بھی لے آیا۔ اس میں صحت کے علاوہ یہ تبدیلی آئی کہ بچے ہوئے پیسے ماں کو لوٹا دیئے اور کہا۔ "ماں! میں نے صرف یہ فضول خرچی کی ہے کہ روٹی ہوٹل میں کھائی تھی اور بعد میں چائے پی تھی۔" اور مریم نے اسے سینے سے لگا کر زور سے بھینچا اور زار و قطار رونے لگ گئی۔ خوشی کے رونے میں کسقدر لذت ہوتی ہے۔ مریم کے تو جیسے دن پھر آئے تھے۔

ایک اور ہفتہ گذر گیا اور مختار نے یہ ہفتہ نہایت اچھی حالت میں گذارا۔ ہفتے بعد راولپنڈی گیا اور حسبِ معمول انجکشن بھی کرا آیا اور دوائی بھی لے آیا۔ اب اس میں یہ تبدیلی ظاہر ہوئی کہ "ماں! اب میں نے روٹی ہوٹل میں کھائی تھی لیکن چائے نہیں پی۔"

"کیوں میرے لال!" مریم نے پوچھا۔ "پی لینی تھی نا؟"

"فضول خرچی ہے نا ماں!" اس نے کہا۔ "ہماری حالت پہلے ہی خراب ہے۔"

دمے کے شکنجے نے مختار کے سب بل نکال دیئے تھے۔

ایک مہینہ گذرا تو مختار نے خود بھی اور ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا کہ اب آنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے خون کا دباؤ اور نبض وغیرہ دیکھ کر اطمینان

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

ماہِ نو، کراچی، اپریل ۱۹۵۸ء

اولیں افسانہ:

"سُورج مکھی!"

عذرا حسنین

ہماری معاشرت میں پھولوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو مغربی ممالک میں ہے۔ اچھے شاعروں کی طرح بلیک (BLAKE) کا بھی ایک علیحدہ فلسفۂ زندگی ہے۔ اس کے یہاں "سن فلاور" (SUN FLOWER) کو زندگی کی علامت مانا گیا ہے۔ اس فلسفہ سے قطع نظر سورج مکھی کا پیلا پیلا پھول کسی پژمردہ مریض کے چہرے کی یاد دلاتا ہے۔ کم از کم میرا خیال یہی ہے۔ یہی خیال اس افسانے کا محرک ہوا ہے۔ (عذرا حسنین)

ہمارے گھر کے سامنے والے کئی گھر خالی پڑے تھے۔ ہم لوگ بھی اس علاقے میں ابھی نئے نئے آئے تھے، نہ کوئی دوست نہ عزیز۔ دل بہت گھبراتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس خاموشی کے عادی ہو ہی گئے۔ پھر بھی کبھی کبھی دل یہی چاہتا کہ اور کچھ نہ ہو تو سامنے والے گھر ہی میں کچھ آبادی ہو جائے، کچھ چہل پہل تو ہو گی

آخر ہماری دعائیں جلد ہی پوری ہو گئیں۔ ایک دن سہ پہر کے وقت میں اور یوسف وقت گزارنے کے لئے بیڈ منٹن کھیلنے لگے۔ کچھ دیر تک تو کھیل اچھا ہوتا رہا لیکن تھوڑا کھیلنے کے بعد یوسف کا دل گھبرا گیا۔ وہ جان بوجھ کر چڑیا کو ادھر اُدھر پھینک دیتا۔ ایک مرتبہ تو چڑیا سڑک کے بھی پار جا پڑی۔ اس کو لینے دوڑے تو دیکھا کہ سامنے والے مکان میں لوگ آ گئے ہیں۔ ایک بے ہنگم سی اونٹ گاڑی کھڑی ہے جس میں سے نوکر سامان اتار اتار کر مکان میں رکھ رہے ہیں۔ ایک دبلی پتلی لڑکی ستون کا سہارا لئے کھڑی ہے۔ ہرے رنگ کا ماربل چیپس کا ستون، اس کے سہارے ایک کمزور پیلی لڑکی ساکت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کا پیلا پن تو بس دیکھنے کے قابل تھا۔ یوں لگتا تھا کہ رنگ اوپر سے چھڑکا ہوا ہے۔ چہرے کے پیلے پن سے بالکل مختلف اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے تو میں ان میں کھو ہی گئی۔ یوسف نے جو مجھے اس طرح منہمک دیکھا تو میرا کندھا پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ "سورج مکھی!" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا اور ہم دونوں واپس گھر آ گئے۔ پھر بھی کھیل میں دل نہ لگا۔ ہم لوگوں نے نئے ہمسایوں کو دیکھنے کی کوشش کی، لیکن وہاں تو مکمل خاموشی چھا چکی تھی۔

دن گزرتے گئے لیکن سامنے والوں سے ہماری کوئی دوستی نہ ہو سکی۔ اتنے بڑے گھر میں صرف ایک بڑے میاں اور بڑی بی کے ہمراہ ایک لڑکی تھی وہ بھی کچھ بیمار، اس لئے امی نے ہمیں ان کے یہاں آمد و رفت کی اجازت نہیں دی۔ وہ لڑکی کبھی کبھی کھڑکی میں آ کر بیٹھ جاتی اور ہمارے کمپاؤنڈ میں لگے ہوئے پھولوں کو بڑی حسرت سے دیکھا کرتی۔ ہمارے یہاں سے وہ فریم میں جڑی ہوئی تصویر کی طرح نظر آتی۔ کھیلتے کھیلتے جب ہماری نظر اس پر پڑ جاتی تو یکایک منہ کا مزہ بگڑ جاتا۔ میں منہ پھیر کر کہتی "سورج مکھی!" یوسف باغ میں دوڑا دوڑا پھرتا۔ "سورج مکھی" ہم دونوں کو کھیلتے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہتی۔ پھر بھی دوستی ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ایک دن مجھے کیا سوجھا کہ ہمارے کمپاؤنڈ کا وہ حصہ جو اس کے مکان سے نظر آتا تھا وہاں ایک کیاری بنا ڈالی اور کھاد وغیرہ ڈال کر سورج مکھی کے بیج بو دیئے۔ صبح شام میں اور یوسف اپنے اپنے فواروں سے پانی ڈالتے۔ "سورج مکھی" اپنے گھر سے بیٹھی دیکھتی رہتی۔ کبھی کبھی جب میں اور یوسف لڑ پڑتے تو وہ ہنستی۔ یوسف غصے کی نظر سے مجھے دیکھتا اور میں "سورج مکھی" کی طرف دبی ہوئی نظروں سے دیکھ کر ہنس دیتی۔ دن اسی طرح گذرتے رہے۔ مہینے بھر میں وہ کالے کالے بیج ہرے بھرے پودوں میں تبدیل ہو گئے۔ میں اور یوسف انہیں دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ایک روز ہم دونوں خوشی سے اچھل پڑے۔ "آپی! ہمارے پودوں میں کلیاں آ گئی ہیں" کلیاں بڑھتے بڑھتے پھول بن گئیں۔ میں نے اور یوسف نے مل جل کر ایک گلدستہ بنایا۔ اس میں سورج مکھی کے بڑے بڑے پھول سجائے اور نوکر کے ہاتھ "سورج مکھی" کو بھجوا دیا۔ وہ اپنی کھڑکی سے ہماری ساری تیاریاں دیکھ چکی تھی۔ اس نے بغیر کسی پس و پیش کے یا حیرت ظاہر کئے وہ گلدستہ لے لیا۔ دن بھر کی دلچسپیوں میں ہم لوگ اپنی صبح والی کارگذاری بھول ہی گئے۔ لیکن شام کو جب ہم اپنے پودوں کو پانی دینے آئے تو "سورج مکھی" کو سیاہ سوگوار ساڑھی میں ملبوس دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ ہمارے بھیجے ہوئے پھولوں میں سے ایک بڑا سا پھول اپنے سیاہ لمبے بالوں میں لگائے ہوئے تھی۔ اس کی شکل پر نقاہت اور خاموشی برس رہی تھی۔ میں اور یوسف اس غیر متوقع کامیابی پر پھولے نہیں سمائے۔

لیکن وہ آج مسکرا نہیں رہی تھی۔ صرف اپنی سیاہ آنکھوں کو خلا میں جمائے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

قسمت ہماری خوشیوں پر ہنس رہی تھی کیونکہ وہ آخری دن تھا جب کہ وہ اس جگہ مجھے نظر آئی۔ ایک ایک دن ہم دونوں نے بے چینی سے گذارا۔ بات کرتے ہماری نگاہیں اس کی کھڑکی پر جا پڑتیں لیکن ان کو مایوس لوٹنا پڑتا۔ دن میں کئی کئی بار ڈاکٹر کی آمدورفت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا تو کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اس کو دیکھنے کیسے جائیں، اسی سوچ میں ایک ہفتہ اور گذر گیا۔ نئے گھر جانے میں ایک قسم کی جھجک مانع تھی۔ اسی لئے باوجود شدید خواہش کے ہم لوگ اسے دیکھنے نہ جاسکے۔ اس پریشانی اور بے چینی کے زمانے میں ہم اپنے سورج مکھی کے پودوں کو بھی بھول گئے۔ ان میں پھول نکلتے اور لگے لگے مرجھا بھی جاتے۔ ان کو کوئی ہاتھ توڑنے والا نہ ہوتا۔ اس میں کلیاں نکلتی لیکن ان کو خوشی سے گننے والا کوئی نہ ہوتا۔ اس میں پتے مرجھا جاتے لیکن ان کو جھاڑنے والا کوئی نہ ہوتا۔ کئی دن یہی طرح گزر گئے۔ سامنے والوں کے یہاں کچھ تو خاموشی چھائی رہتی تھی، اور اب تو اور بھی ہُو کا عالم رہتا تھا۔ ان ہی دنوں برسات کا موسم آگیا۔ رات کو بڑی زور کی آندھی آئی۔ شاید کچھ بوندا باندی بھی ہوئی کیونکہ صبح کو زمین نم تھی۔ آندھی کے زور سے معلوم ہوتا تھا کہ بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھڑ جائیں گے۔ ساری رات میں اس خوف سے کانپتی رہی کہ کہیں گھر کی چھت نہ گر پڑے۔ صبح اٹھ کر دیکھا کہ باغ میں ان گنت پیڑ گرے پڑے ہیں، پودے ٹیڑھے ہوئے پڑے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ افسوس جس بات کا ہوا وہ یہ تھا کہ ہمارے سورج مکھی کے پودے بری طرح گرے ہوئے تھے۔ کئی ادھ کھلے پھول کچلے پڑے تھے اور کئی خوبصورت پھولوں کی پنکھڑیاں ہوا میں اُڑ رہی تھیں۔ شور کی آواز سُن کر میری توجہ سامنے والے مکان کی طرف گئی جہاں سے رہنے والوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان کے گھر میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

یوسف نے پیچھے سے آکر کہا: "آپا! 'سورج مکھی' اب اس دنیا میں نہیں!!"

مجھے بے ساختہ بلیک کی 'سن فلاور' (SUN FLOWER) کے متعلق وہ پُردرد اشعار یاد آگئے:

سُورج مکھی! سُورج مکھی!

اے ماندِ دن کے پھیر سے — گھبرائے، اکتائے ہوئے
جو گن رہا ہے دم بہ دم — اس ڈھلتے سُورج کے قدم
اور ڈھونڈتا ہے وہ جہاں — پیارا، سنہرا، بیکراں
جس تک پہنچ کر کارواں — قرنوں تلک آسودہ ہوں
سرگشتہ پائے رہرواں — تا حشر خواب آلودہ ہوں
وہ خطۂ جنت نشاں — جس میں کئی رنگیں جواں
رومانیت کے راز داں — ہو جائیں گھل کر بے نشاں
ان کے مزاروں پر رہے — حسرت ہی حسرت پرفشاں
جس میں ہزاروں نازنیں — البیلی، پیلی کنواریاں
اُجلا کفن پہنے ہوئے — جیسے ڈھکی ہوں برف سے
کھوئی ہوں خواب ناز میں — حیرت سرائے راز میں!
اور اٹھ کے سارے یک بیک — یہ چاہتے ہیں بے دھڑک
ہوں اس ہی منزل کو رواں — وہ منزلِ جادو نشاں

جس جا گیا سُورج مکھی!
سُورج مکھی! سُورج مکھی!!

★

غزل

جمیل الدین عالی

عالی جی اب آپ چلو تم اپنے بوجھ اٹھائے
ساتھ بھی دے تو آخر پیارے کوئی کہاں تک جائے

جس سورج کی آس لگی ہے شاید وہ بھی آئے
یہ تو کہو خود تم نے اب تک کتنے دیے جلائے

اپنا کام ہے صرف محبت باقی اس کا کام
جب چاہے وہ روٹھے ہم سے جب چاہے من جائے

ایک اسی امید پہ ہیں سب دشمن دوست قبول
کیا جانے اس سادہ روی میں کون کہاں مل جائے

دل کے دکھ بھی جھوٹ ہیں سارے ان کے سکھ بھی جھوٹ
بات چلی تو صاف کہیں گے اب جو بھی شرمائے

کیا کیا روگ لگے ہیں ہم کو کیا کیا ان کے بھید
ہم سب کو سمجھانے والے کون ہمیں سمجھائے

اور تو اس مجبوری میں ہو تجھ سے کیا اظہار
او عالی پر ہنسنے والے، تو عالی بن جائے

غزل

اختر ہوشیارپوری

ہماری آنکھ میں جب اشک بھرنے لگتے ہیں
تمہارا تذکرہ کیوں لوگ کرنے لگتے ہیں

جنونِ عشق پہ الزام پھر بھی آتا ہے
اگر کبھی ترے گیسو سنورنے لگتے ہیں

پکارتا ہے پسِ پردہ افق کوئی
جو بام و در سے وہ جلوے اترنے لگتے ہیں

خزاں کی آگ میں جلتی ہے جب بہار کی شام
خود اپنے سائے سے دیوانے ڈرنے لگتے ہیں

اندھیری رات سُلگتی ہے جب فضاؤں میں
نہ جانے کیوں ترے گیسو بکھرنے لگتے ہیں

جب اُن کی یاد سے جلتے ہیں آرزو کے چراغ
ستارے اور بھی اختر نکھرنے لگتے ہیں

غزل

ضمیر اظہر

محرمِ عشق ہیں، ہونٹوں کو سیئے بیٹھے ہیں
شیشۂ دل میں کئی داغ لئے بیٹھے ہیں

ماہ و انجم پہ پہنچ کر بھی نہیں رکتی نظر
رُخ کسی اور ہی منزل کا کئے بیٹھے ہیں

اب تو کچھ اور ہی عالم ہے فروغِ غم سے
صورتِ جاں ترے ہر غم کو لئے بیٹھے ہیں

بھولتا ہی نہیں اس نرگسِ شہلا کا کرم
ایک مے ہے کہ شب و روز پیئے بیٹھے ہیں

ایک ہی شکل ہے سو رنگ سے دل میں آباد
ایک ہی عکس کے سو عکس لئے بیٹھے ہیں

جب سے چھوڑی ہے تمنائے سکوں اے اظہر
ہر کٹھن راہ کو ہموار کئے بیٹھے ہیں

★

غزل

نظر حیدر آبادی

ہماری بزم میں اب چھیڑ کائنات کی بات
یہ ہجر و وصل کا قصّہ ہے ایک رات کی بات

دلِ اجل میں کھٹکتی رہی ہے صدیوں سے
بگڑ بگڑ کے سنورتی ہوئی حیات کی بات

چمن میں آگ لگا دی ہے شعلۂ گل نے
زبانِ برق پہ آئی تھی حادثات کی بات

حقیقتوں پہ چڑھا رنگ استعاروں کا
فسانہ بننے لگی جب سے واقعات کی بات

نظرؔ کو دیکھ کے کچھ کچھ یقین آتا ہے
سنی تھی ہم نے بھی اکثر تغیّرات کی بات

غزل

مشتاق مبارک

کوئی ارماں دلِ آتش بجاں باقی نہ رہ جائے
وہ آئے ہیں تو غم کی داستاں باقی نہ رہ جائے

ہم اہلِ عشق کو جس طرح چاہو آزما دیکھو
کسی پہلو سے کوئی امتحاں باقی نہ رہ جائے

جو سچ پوچھو یہی ہے رازِ تکمیلِ محبت کا
مزاجِ حسن میں وہم و گماں باقی نہ رہ جائے

کچھ اس انداز سے رسمِ محبت کی بنا ڈالیں
کوئی اندیشۂ سود و زیاں باقی نہ رہ جائے

کٹھن ہے راہِ غم یوں بھی تمہاری سمت سے لیکن
کسر کوئی نصیبِ دشمناں باقی نہ رہ جائے

پلانا ہے اگر خوننابِ غم ہی جامِ رنگیں میں
تو یہ حسرت بھی اے پیرِ مغاں باقی نہ رہ جائے

خرد مندانِ عالم ہیں اسی کوشش میں مدت سے
کہیں انصاف کا نام و نشاں باقی نہ رہ جائے

چلو دنیا کو ہم مفہومِ غم اس طرح سمجھا دیں
کوئی گنجائشِ شرح و بیاں باقی نہ رہ جائے

غزل کو آپ سے کوئی توقع ہے تو بس یہ ہے
مبارک شرحِ سرِّ دلبراں باقی نہ رہ جائے

★

غزل

طلعت اشارت

اداس روح، نشاطِ تخیل، تن افسردہ
یہ کس کی یاد میں حیراں ہے میری تنہائی

وہ چند اشک جو پلکوں پہ کانپ گئے
دیئے جلا کے جھروکوں میں آنکھ بھر آئی

رہا شرابِ تخیل سے جامِ دل لبریز
وہ میکدے کی فضا میں تری شناسائی

مرا سکوں ترے خوابوں کی تاب لا نہ سکا
خبر نہیں کہ سحر ڈھل گئی کہ رات آئی

قدم اٹھے تو نگاہیں جھجک کے لوٹ گئیں
ہمیں بھٹکنے لگی راہ کی فسوں زائی

تصورات کی دنیا میں آپ مل تو گئے
یہی بہت ہے جہاں تک ملے پذیرائی

فلک کے نیلگوں ساحر نے پھر نقاب الٹا
طلسمِ شب تری خوگر رہی نگوں سائی

جو بے نیازیٔ گردوں پہ خوابناک نہیں
انہیں کی روح کے نغمے سکوت برنائی

ہوا ہی کیا جو نسیمِ حیات بوجھل ہے
کبھی تو بادِ صبا لے ہی لے گی انگڑائی

یہ کس لئے روشِ گلستاں ہوئی نادم
یہ کس کے غم میں شگوفوں کی آنکھ بھر آئی

فن:

شاکر علی

اے - شمسی

شاکر علی کا شمار پاکستان کے ممتاز ترین فنکاروں میں ہے۔ نقاشی کا ذوق انہیں دیس بدیس لئے پھرا ہے۔ برصغیر میں وہ دہلی، بنگال، بمبئی، جنوبی ہند سب ہی جگہ رہے۔ انہیں جہاں بھی اپنے شوق کی تکمیل و تہذیب کی امید نظر آئی، وہاں پیاسے کی طرح پہنچے اور ہنر کا جو بھی سرچشمہ راہ میں آیا اس سے سیراب ہوئے۔ اس نے ان کی نظر میں وسعت پیدا کر دی ہے اور ان کا فن نئی، پُرانی قدروں کا بڑا ہی خوش آیند آمیزہ بن گیا ہے۔ مگر آج ہم انہیں جس منزل پر پاتے ہیں وہاں وہ اچانک نہیں پہنچ گئے۔ انہیں کئی راہیں بدلنی پڑی ہیں۔ کئی منزلیں ایسی ملیں جہاں پہنچ کر وہ پلٹ آئے، مگر ان کی مراجعت اپنے سفر کے مرکزی نقطہ پر ہی ہوئی۔ آج بھی وہ فن کے چوراستے پر کھڑے ہیں اور سامنے وہ سب شاہراہیں کھلی پڑی ہیں جن پر وہ کبھی چلے تھے اور پھر پہلی ہی جگہ واپس آ گئے تھے۔

فن کی پہلی راہ انہیں ۱۹۴۰ء میں ملی اس وقت ان کی عمر صرف ۲۱ سال تھی۔ دہلی میں مشہور بنگالی مصور "اُکیل" (شاردا چندر اُکیل) کے اسٹوڈیو کا چرچا تھا۔ وہ ماڈرن ہائی اسکول دہلی میں مصوری کا استاد تھا۔ اس کے ہاں کام کا اسلوب وہی تھا جو ڈاکٹر آبندرناتھ ٹیگور کے مکتبِ فن نے اس برصغیر میں اختیار کیا تھا۔ یعنی دھیمی دھیمی جذباتیت، سُبک سُبک کام۔ ۱۹ ویں صدی میں وکٹوریائی عہد کا تصور جمالیات فن پر چھایا ہوا تھا اور اس جکڑ بند سے سانس لینا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ آزادہ رو فنکار کے لئے اس سے آگے پرواز کرنا ممکن نہ تھا۔ آبندرناتھ ٹیگور کے فن نے کم از کم یہ تو ضرور کیا کہ اس روایتی پھندے کو فنکاروں کے گلے سے دُور کر دیا۔ مگر یہ دوسرا پھندا پہلے سے بھی زیادہ کسا ہوا نکلا۔ فنکاروں میں اب اپنائیت کا احساس تو ہوا مگر ان کی نگاہیں اجنتا کے غاروں اور مختصر مغل تصاویر کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی تھیں۔ بے دے کر یہی دو پھیرے رہ گئے تھے۔ ہاں ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ برصغیر کے فنکاروں نے مغربی انداز کی روغنی نقاشی کی تکنیک سے چھٹکارا پا لیا۔

برصغیر میں فن کی نشاۃ الثانیہ اس صدی کی پہلی دہائی میں شروع ہوئی اور اس کی ابتدا بنگال سے ہوئی۔ صرف ہنروری کی نظر سے دیکھا جائے تو اسے ایک آمیزہ سمجھئے چینی خطاطی، جاپانی رنگ کاری اور مغل نقوش کی آبداری کا۔

شاردا اُکیل کے نگارخانے میں شاکر علی نے ایک کام یہ سیکھا کہ اپنے ہاتھ کو خط کشی کے لئے خوب سدھایا۔ اظہارِ موضوع کے لئے مسلسل لہراتے ہوئے خط کھینچنا انہوں نے یہیں سیکھا۔ گیلے کاغذ پر ہلکے آب رنگی لمسوں سے رومانی روپ جھلک کا احساس منتقل کرنا بھی انہوں نے یہیں سیکھا۔ مگر اس نگارخانے میں نقاشی کے موضوعات بڑے گھٹے گھٹے تھے اور وہ ان کو متاثر نہ کر سکے۔ ماضی کی طرف مراجعت کی جو تحریک چل پڑی تھی بنگال اسکول والوں نے اس میں غلو سے کام لیا اور فن محدود ہو کر رہ گیا۔ وہی بندھے ٹکے موضوع جیسے مہاتما بدھ کے جیون چکر کی کہانی۔ ہر چند کہ بدھ مت اب ہندوستان میں تقریباً معدوم ہے مگر ہمارے یہ آرٹسٹ بدھ کے بچپن سے نروان پانے تک کے چکر کو دکھائے جا رہے تھے۔ اگر اور آگے تصور پرواز کرتا تھا تو ان کی اپنی تاریخ تھی اور اپنے اصنامیات۔ ادھر سے نگاہ ہٹی تو دیہات کی سادہ رومانی فضاؤں میں آ گھرے۔ ان چیزوں نے مُوقلم کی گردش کو مقید کر دیا تھا۔ حد یہ کہ جدید موضوع بھی اس چکر میں پھنس کر اپنی صحتِ تصور سے محروم ہو جاتے تھے۔ ویسے یہ ٹھیک ہے کہ ماضی پر نگاہِ بازگشت ڈالنے کی جہاں تک بات ہے وہاں تک یہ کوششیں بیشک بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔

تو شاکر علی اس راہ پر چلے مگر پھر واپس آ گئے۔ اب ہم انہیں بمبئی میں دوسری شاہراہ پر دیکھتے ہیں۔ یہ ۱۹۳۸ء کا زمانہ ہے۔ جہاں پہنچ کر انہوں

نے جے۔ جے اسکول آف آرٹ میں باقاعدہ داخلہ لے لیا۔ اس ادارۂ نقاشی میں اُس وقت جس ہُنر کا چرچا تھا اسے "ہندوستان کی آرائشی نقاشی" کا نام دیا جاتا ہے۔ سولومن اسلوب نقش گری کو اب یہاں سے ہٹا کر اس نئی تکنیک کا چلن پیدا کیا گیا تھا۔

یہ اسلوب کیا تھا ؟ جے جے اسکول آف آرٹ، بمبئی کے سابق ڈائریکٹر گلیڈسٹن سولومن نے اسے جنم دیا تھا — موضوع ہندوستانی مگر چولا مغربی۔

شاکر علی نے یہ نئی تکنیک سیکھی جس میں ہر رنگ اور اس کی ہر جھلک اپنی اپنی جگہ جھلا لا مارتی ہے۔ یہاں طرح پر، بڑا زور دیا جاتا تھا اور پھر پھر کر اسے "آرائشی نقاشی" کے روپ میں گھیر لیا کرتے تھے۔ گویا وہی تجدید ماضی کا جذبہ یہاں بھی چھایا ہوا تھا۔ یہی تکنیک کا کچھ فرق تھا اور بس۔

یہاں لوگوں کو محرک اجنتا سے ورے نہیں ملتا تھا، یا پھر چینی و راجپوتی نقوش ان کے رہنما تھے۔ کبھی کبھی ان کے موضوعات کی نظر موجودہ گرد و پیش پر بھی پڑ ہی جاتی تھی۔ یہاں پہنچ کر شاکر علی کو دو شخصیتوں کے کام نے متاثر کیا۔ ایک بنگالی مصور، جیمنی رائے اور دوسری پنجاب کی مشہور مصورہ امرت شیر گل۔ جیمنی رائے نے بنگال کے عوامی فن اور چینی نقاشی (۱۱ ویں تا ۱۸ ویں صدی) سے سہارا لیا۔ امرت شیر گل نے ہیئت اور رنگ کے باب میں یورپی فنکار سیزان نے (CEZANNE) اور گاگن (GAUGIN) سے تاثر لیا تھا۔ مگر ہندوستان واپس آنے کے بعد اس مصورہ نے بھی اجنتائی نقاشی اور مغل تصاویر کو اپنا رہنما بنا لیا تھا۔ مگر شاکر علی کی دُھن اور ہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ محرکات کے اصل سرچشموں سے فیض حاصل کیا جائے۔ تجدید ماضی کی راہوں پر بھٹکنے کے لئے وہ کچھ آمادہ نہ تھے۔ شکر ہے کہ یہ مراجعت بڑی جلدی ہوگئی۔

۴۶-۱۹۴۵ء میں وہ جنوبی ہند کے سفر پر چل پڑے۔ یہاں کی تعمیرات، مجسّے، اور دیواری نقاشی کو جا جا کر دیکھا اور ان کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ان کا اصل میلان تھا زندگی کی بولتی ہوئی حقیقتیں اور ان تک رسائی۔ ان کی متجسس نگاہیں ایسے ہی موضوعات ڈھونڈتی تھیں۔ ۴۶-۱۹۴۵ء کے سفر نے ان کی نگاہوں کو وسعت و آسودگی سے آشنا کر دیا تھا مگر ابھی ان کی منزل نہیں آئی تھی۔

اب ہم انہیں ایک بالکل ہی مخالف سمت میں چلتے ہوئے پاتے ہیں۔ اس برصغیر کے فن کی روایت تھی، عمومیت اور اشاریت، مثلاً یہی دیکھئے کہ مغلیہ مرقعوں کی شبیہوں تک میں، باوجود اختصاصی کیفیت کے، وہی عمومیت اور آفاق گیر پھیلاؤ ہے، مگر شاکر علی کو اور تلاش تھی۔

۱۹۴۶ء میں ہم انہیں لندن میں دیکھتے ہیں۔ اب وہ ایک ایسی راہ پر پڑ گئے جب سب راہوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ سلیڈ سکول آف آرٹ سے منسلک ہو گئے۔ یہاں فن کی نوعیت خالصتاً معین، محدود اور موضوعاتی تھی، یا پھر صرف علامتی۔ گو یہ مغرب کی دنیا تھی پھر بھی یہاں روایت پرستی موجود ہی تھی۔

۱۴ ویں صدی کے اواخر سے ۱۹ ویں صدی کے خاتمہ تک نشاۃ الثانیہ کی تحریک نے ذہنوں کو جکڑے رکھا۔ اس کا اثر فن پر اب تک موجود تھا۔ حقیقت پسندی پر زور تھا اور اس حقیقت پسندی میں لوگ خرافات کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ مثلاً یہ قصہ کہ انگور کا خوشہ ایسا ہو بہو بنایا جاتا تھا کہ چڑیاں ان کو اصل جان کر ٹھونگیں مارا کرتی تھیں!

خیر، شاکر علی نے اس دنیا کو بھی دیکھا۔ گو اب روایت پرستی کا زور کم پڑ چکا تھا مگر شاکر کو کلاسی فن کی روایات سمجھنی تھیں۔ اس لئے وہ اس کام میں لگ گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ مثلاً،

تناظر (PERSPECTIVE) دھوپ چھاؤں (CHIAROSCURO) اور کلاسی کام کا یہ مبالغہ کہ "نقش" دیوار میں بنے ہوئے دریچے" کی مانند ہو۔ یا پھر وہ سہ طرفی فریب نظارہ، یا ان سب کا ملا کر فطری روپ دھار لینا، کہ "حقیقت کو آئینہ دکھانا" کہیں جسے۔

اس اسلوب سے شاکر علی کو کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ ویسے یہ دلچسپی تو بمبئی کے قیام کے زمانے سے ہی تھی مگر دبی دبی سی تھی۔ وہاں بمبئی میں تو یہ مصیبت بھی درپیش تھی کہ سولومن صاحب نے اپنے زمانے میں اسکول کے نصاب سے زندگی (LIFE) اور قدیم نقاشی کی نقول کا کام سرے سے بند ہی کر دیا تھا۔ بہرکیف، تین سال تک شاکر علی سلیڈ اسکول لندن میں کام سیکھتے رہے اور کلاسی روایاتِ فن کو اچھی طرح سمجھنے میں محو رہے۔ تین سال پورے کر کے انہوں نے لندن یونیورسٹی سے فنون لطیفہ کا ڈپلوما بھی چلتے چلتے لے لیا۔

اب یاد کیجئے کہ شاکر علی نے اپنا سفرِ فن کہاں سے اور کب شروع کیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں دہلی (شاردا آکیل سٹوڈیو) سے۔ انہوں نے اپنے طویل گھومتے ہوئے سفر میں برصغیر اور یورپ دونوں کے کلاسی کام کا بخوبی مطالعہ کیا۔ اس برصغیر کے کلاسی فن کے اصل شاہکاروں کا خصوصی مطالعہ کرنے سے قبل انہوں نے "تجدیدیت" کے پہلوؤں پر بھی خوب غور کیا۔ اُدھر جب وہ انگلستان پہنچے تو سب سے پہلے کلاسی روایاتِ فن کو سمجھنے میں لگ گئے۔ جب دونوں کلاسی فنون سے خوب آگاہ ہو گئے تب انہوں نے ہیئت اور رنگ کے آزاد تجربوں کی راہ پر چلنا شروع کیا۔

۱۹۴۸ء میں وہ فرانس پہنچ گئے۔ نئے میدانوں کی تلاش میں۔ فرانس میں "آندرے۔لا۔ہوتے" (ANDRE L' HOTE) کے ساتھ کام کرنے لگے۔ اس صدی کی دوسری دہائی میں "مکعبیت" کی جو تحریک چلی تھی یہ صاحب ان کے داعیوں میں تھے۔ ان کے ہمراہ کام کرنے کی وجہ سے شاکر علی کو ڈیزائن سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ پہلے یہ دلچسپی ذرا بجھی بجھی سی تھی۔

۱۹۵۰ء میں شاکر علی زیکوسلاواکیہ پہنچ گئے اور پراگ یونیورسٹی کے "ادارۂ صنعتی فنکاری" میں داخلہ لے لیا۔ یہاں رہ کر انہوں نے پارچہ بافی کے لئے ڈیزائن تیار کرنے کا کام بھی نہیں سیکھا۔ دو سال تک اسی شغل میں لگے رہے اور ۱۹۵۱ء میں پراگ کی "ٹیکسٹائل کارپوریشن" کے ساتھ ایک بیرونی نقاش کی حیثیت سے منسلک بھی ہو گئے۔

۱۹۵۲ء میں شاکر علی کے قدم پھر اپنے وطن کی سرزمین پر واپس آ گئے۔ مگر فن کی راہ پر اب بھی ان کے قدم اسی سمت رواں تھے جو "آندرے۔لا۔ہوتے" کے ساتھ رہ کر انہوں نے دیکھی تھی۔ اصل میں ہیئت سے دلچسپی ان میں کافی پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔

۱۹۴۴ء میں وہ بمبئی میں تھے۔ اس وقت جے جے اسکول آف آرٹ کے ڈائریکٹر چارلس جیرارڈ تھے۔ اور وہ "مابعدِ تاثراتی" (POST — IMPRESSIONIST) اسلوب میں چیزیں بنایا کرتے تھے۔ اب یہ دیکھئے کہ واقعات کا تانا بانا وقت کے کارگاہ پر کس طرح ایک نیا جامہ تیار کرتا ہے۔

شاکر علی پہلے تو کراچی میں مقیم رہے۔ پھر لاہور چلے گئے اور اپنے کام میں منہمک ہو گئے۔ اب ان کی دقیق نظریں ہیئت کی تحلیل اور تجزیے پر زیادہ لگی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ان کی بعض تصویریں جیسے "بیل" (THE BULL) ان کے کام کے اسی پہلو کی آئینہ دار ہیں۔

گزشتہ دو سال سے شاکر علی کی فنی زندگی کچھ ٹھیری ہوئی سی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی تصویر "انناس میں ساکن زندگی" (STILL LIFE WITH PINE-APPLE) تیار ہوئی۔ یہ نقش ان کے عبوری دور کے کام کا نمونہ ہے۔ آجکل وہ اپنے آپ کو جمود کے اس خول سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاکہ ان کا شخصی تصورِ نقش پوری طرح نمو پا سکے۔ وہ اس جستجو میں ہیں کہ فن کار کے اصل منصب کو معلوم کر سکیں۔ انہیں اس سوال کا جواب مل چکا ہے۔

اس سلسلے میں پال کلی (PAUL KLEE) نے جو تشبیہہ برتی تھی وہ واقعی بڑی خوب تھی۔ اس نے کہا تھا کہ فنکار درخت کے تنے کی مانند ہوتا ہے۔ یعنی عضویاتی دنیا کی جڑوں تک پہنچنے کے لئے وہ اس کے رگ و ریشے میں پیوست ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس تشبیہہ میں جو بات ہے وہ سطحی نہیں ہے۔ درخت کی جڑ اور پھننگ میں ایک ربط و سلسلہ ہوتا ہے۔ کسی فنی کام کی تخلیق۔ (درخت کی پھننگ پیدا ہونا)۔ لازماً کئی تقاضے کرتی ہے۔ عکاسانہ نقاشی کی معین حدود میں جاگزین ہونے کے نتیجہ میں فطری شکل کی تنسیخ ضرور عمل میں آئے گی کیونکہ فطری ٹوٹ پھوٹ اور کتر چھانٹ ہی میں سے فطرت اپنا نیا روپ، پھر جنم دے کر نکالتی ہے۔

یہاں تک تو شاکر علی کے کام کی باتیں ہوئیں۔ اب آپ شاید ان کے شخصی تعارف کے بھی خواہاں ہوں گے۔ لیجئے۔ شاکر علی ۱۹۱۶ء میں بمقام رامپور پیدا ہوئے۔ ابھی بچے ہی تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور آغوشِ مادر سے محرومی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے وجود میں گھر گئے۔ تعلیم رامپور سے شروع ہوئی، دلی کے جامعہ ملیہ میں ہوئی۔ پھر وہاں سے نینی تال گئے جہاں انگریزی وضع کے اسکول، فلانڈرز میں پڑھتے رہے۔ ان فاصلوں اور دوریوں نے ان میں احساسِ تنہائی کو بہت بڑھا دیا اور وہ اپنے آپ میں بہت ہی گم ہوتے چلے گئے۔

شاکر طبعاً بہت حساس آدمی ہیں۔ اور سات سال تک بمبئی جیسے شہر میں رہنے کے باوجود ان کے جذباتی توازن میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی۔

پھر وہ رہے غیر ملکوں میں۔ وہاں احساس تنہائی اور بھی زیادہ رہا۔ وہاں کے پانچ سال بھی ایسے ہی گزرے۔ بات یہ ہے کہ احساس تنہائی میں اضافہ کرنے کے لئے کئی سماجی عناصر بھی کارفرما رہتے ہیں۔ آجکل کا معاشرہ جس قدر پیچیدہ ہو چکا ہے، سب جانتے ہیں۔ فنکار اس کی برق رفتار، سیماب وش کیفیتوں اور ادل بدل کو پا نہیں سکتا، اس لئے ہانپ کر رہ جاتا ہے! اس میں اقتصادی و اخلاقی تار و پود کا انقلابی عمل بھی شامل ہے۔ اس کے مقابلے پر فن ایک خود نمو عمل ہے، دونوں باتوں کا سمجھوتہ کیسے ہو؟!

روحِ عصر کی شعوری و منطقیانہ تعبیر کر سکنا ویسے بھی کوئی آسان کام نہیں ہے، اس لئے فنکار کی یہ مشکل ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ فنکار نے اب اس مشکل سے یوں سمجھوتہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے شخصی تصورات کو اظہار کا جامہ پہناتا چلا جاتا ہے۔ یہ اور اتفاق ہے کہ اس کے ذاتی تصورات کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی اندرونی روح بھی جلوہ پیرا ہوتی چلی جاتی ہے۔

خود شاکر علی کے باب میں بھی یہی چیز ہے کہ ان کا فن ان کے وجود کا ذریعہ اظہار ہے۔ ان کے نکھرے ستھرے خواب، "تنہائی کے تصورات" کی ایک دُنیا۔ اُن کے تجربات ان کے شعور میں گہرے پہنچ جاتے ہیں اور فکر و فن کے ڈانڈے آن ملتے ہیں۔ انفرادیت آفاقیت کا رُن لے لیتی ہے اور یہ انجذابی عمل قطعی بے ساختہ ہوتا ہے۔

شاکر کے کام میں جو جمالیاتی حسن ہے وہ فطرت سے الگ ہی کوئی چیز ہے۔ عالمِ محویت سے اس کی تخلیق اُبھرتی ہے۔ اس عالم میں زندگی دوسرے ہی قوانین کی تابع نظر آتی ہے یعنی فطری جکڑ بند سے آزاد، اُس سے باہر۔ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اس فنکار کو زندگی ایک طلسم و معمہ نظر آتی ہے جو اس کے حیطۂ اختیار سے باہر ہو، تو وہ اس سے گریز کر کے اپنی تخلیق کو سامنے لے آتا ہے۔ مگر کچھ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اُس کے کام پر نشاطِ زندگی کے بجائے اُداسی کی پرچھائیاں پڑی ہوئی ہیں۔

بیانیہ نقاشی شاکر کے موضوعات سے باہر ہے۔ اگر وہ فطرت کی کوئی شے برتتے بھی ہیں تو اس طرح کہ وہ اپنی مرغوب خطوط، الوانی کیف و کم اور رنگ داری کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ دُنیائے محسوسات کی نقش گری میں وہ خاص اہتمام کرتے ہیں اور ان کے مُوقلم بہت سے سنگلاخ خارجی مشاہدات سے چل کر تصاویر تک پہنچتے ہیں۔ انہیں بہت ہی صبر آزما کاوشوں کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا انداز تمام تر ایک صناع کا انداز ہے۔ وہ خط کو محض پیمائش ہی تصور کرتے ہیں، یعنی یہی لمبائی، چھوٹی یا بڑی زاویے حادہ یا منفرجہ۔ الوان کے درجۂ شدت کو وہ وزن اور رنگ کو خاصیت تصور کرتے ہیں۔ وہ ان تینوں صُوری لوازمات کو ایک نئی تنظیم و ترتیب کی تخلیق کے لئے استعمال کرتے ہیں اور یہیں سے فنکار کی مشکل شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب ان کی تصاویر میں جانی پہچانی چیز آ جاتی ہے تو دیکھنے والے الجھن میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالم محسوسات میں جو اشیاء ہم دیکھتے ہیں ان کے کچھ التزامی خصائص ہوتے ہیں، وہ ناظر کے ذہن میں رسے بسے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے وہ فنکار کے تصور سے خارج ہوں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جو کام موسیقار اپنی تخلیق میں موضوع اور دعندیہ سے لیتا ہے وہی شاکر علی اپنی تصاویر میں اشیا سے لیتا ہے۔

شاکر علی اپنے خطوط، رنگوں کے درجۂ شدت اور رنگ داری کے ذریعے تمام درمیانی زوائد کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں تاکہ احساس فوراً جاگ اٹھے۔ پہلا عمل نظر کا ہے دوسرا خبر کا۔ "نظر" (تعارف) اور "خبر" (جذبہ) کے درمیان کے سارے حجابات شاکر علی کے ہاں ایک دم اُٹھ جاتے ہیں۔ یہ ایک طلسم اور سحر ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا وہ موسیقار کا پیدا کیا ہوا آہنگ۔ اگر موسیقار یہ عمل کر سکتا ہے تو نقاش کو بھی یہ چھوٹ ملنی چاہیئے۔

شاکر علی اسکیچ بنانے میں تیز، تیکھے خطوط اور زاویے برتتے ہیں۔ جگہیں پُر کرنے کے لئے ملے جلے رنگوں کی استرکاری کرتے ہیں۔ خاکہ بندی میں تمام جزئیات خارج کر دیتے ہیں۔ بلکہ جاندار اشیا میں تو وہ آنکھیں تک نہیں بناتے۔ بس ہیئت یا سراپا کا محض خیال ناظر کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے کام میں ہیئت متضاد پہلوؤں کا آمیزہ ہے۔ پلاسٹکی ٹھوس پن جو اُبھرواں کام (RELIEF) میں ملتے ہیں۔ اور دوسری طرف تناظر، عمق کا فریب نظر اور بُعدِ سوم، تینوں چیزیں غائب۔ وہ ہماری نظروں کو جو چیز دیتے ہیں وہ ایسی سطحیں ہیں جو مجسمہ سازی میں برتی جاتی ہیں۔

حال ہی میں جو نقش انہوں نے بنائے ہیں ان میں رنگوں کی شدت اور دمک کا شائبہ خارج ہے۔ یہ ایک ایسی جھلک داری ہے جو آفتاب کی تیز کرنیں "رنگین شفافوں" (COLOUR TRANSPARENCIES) پر پڑ کر کرتی ہیں۔ یورپ کی نشاۃ الثانیہ کے زمانہ میں بھورے رنگوں کا

رواج چلا تھا۔ جدیدی لوگ "بنیادی رنگوں" PRIMARIES کے گرویدہ ہوگئے۔ مگر شاکر علی ان دونوں سمتوں سے الگ، ہلکے ہلکے، دھیمے دھیمے، رنگ برتتے ہیں، زور صرف کالی لکیروں پر ہوتا ہے۔ رنگ بھرنے کے لئے وہ موقلم اور (PALLETT- KNIFE) استعمال کرتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا زور اور ضرب الگ دکھائی پڑتی ہے، گویا نقش میں سے یہ چیزیں ہماری طرف گھور کر دیکھ رہی ہوں۔ اس کی مثال پہلے پہلے ہمیں ططیان (TITIAN) کے ہاں ملتی ہے جو اس کے بعد کے نقوش میں ہے۔ یعنی موقلم کی نمایاں نمایاں گردشیں۔ شاکر کے ہاں بھی یہ چیز ہے اور بڑے زور و قوت کے مظاہر۔ ویسے تو ان کے نقوش میں ایک طرح کا ضبط اور ٹھہراؤ ہے مگر رنگوں کی چھینٹیں، لکیریں اور دھبّے "باہمی قطع کاری" (CRISS-CROSSING) اور گھلاوٹ، حرکت کا عنصر پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کے ہاں آرائشی زیب اگر کسی چیز سے آتی ہے تو وہ یہی عمل ہے۔ ان کے ہاں رنگین لکیریں اور دھبّے (DABS) دراصل وہی کام کرتے ہیں جو موسیقی میں "درت"۔ اس سے "سم" بھی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ مگر ان کے ہاں رنگوں کا تاثر دبا دبا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قدیم یونان کے ان برنجی مجسموں میں جو عہد نشاۃ الثانیہ میں کھود کر نکالے گئے اور جن پہ ہرے رنگ کی جمی ہوئی پپڑی نے بجائے خود ایک فنّی طرحداری کا روپ دھار لیا ہے۔

بہرحال شاکر علی جو بھی کام کر رہا ہے اس میں زور ہے۔ وہ سپاٹ سطح کے عمل میں آذری ہیئتوں کا تصوّر سمو رہا ہے۔ یہ ضدین کو مجتمع کرنا ہے ـــــ وقت سے دوری کا عنصر بھی ان کے ہاں جذب ہوتا دکھائی دیتا ہے ۔

پیچ و خم ـــــــــــ بقیہ صفحہ ۴۴

کرلیا تھا۔ اس نے احتیاطاً ایک ہفتے کی دوائی دے دی اور کہا "اپنی ماں کو ہمارا اسلام بولو، ہاں؟"

جب مائی مریم کو ڈاکٹر کا سلام پہنچا تو وہ اسے ملنے کو تیار ہوگئی۔ پیسے دینے کے علاوہ وہ اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی تھی۔ وہ جب مختار کے چہرے پر کھوئی گذری جوانی کے واپس آتے ہوئے آثار دیکھتی تھی تو خیالوں میں سجدہ ریز ہو جاتی تھی۔ قصبے کے بچے بچے نے اسے مبارک باد کہی تھی۔ اور تو اور کتاب نکال کر تعویذ دینے والے مولوی نے بھی مختار کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اور ڈاکٹر کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے کھسیانی ہنسی کے ساتھ مریم کو مبارک باد کہی۔ تین روز بعد مریم ایک سو روپیہ پلّے باندھ اور مختار کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے ہاں پہنچی اور آنسوؤں کی روانی میں اسے دعائیں دیں پھر ایک سو روپیہ اس کی میز پر رکھ دیا اور کہا:

"یہ ایک سو روپیہ لائی ہوں ڈاکٹر صاحب! خدا کے لئے قبول کر لیجئے۔ بڑی غریب ہوں"

"غریب ہے تو اتنا روپیہ کدھر سے لایا تم؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تیس روپے اپنے ہیں ڈاکٹر صاحب! اور باقی ادھار لئے ہیں"

ڈاکٹر نے مسکرا کر تیس روپے اٹھا کر دراز میں رکھ لئے اور ستر روپے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "قرض مت لیو مائی! خدا ناراض ہوتا ہے۔ جاؤ۔ اب تمہارا بیٹا چرس کا نشہ نہیں کرے گا۔ کیوں رے؟"

اور مختار نے ندامت سے گردن جھکا لی۔

"ڈاکٹر صاحب!" ایک ادھیڑ عمر عورت ساتھ والے کمرے سے آئی اور ملتجی لہجے میں کہا۔ "مریضہ کی حالت بگڑ رہی ہے۔ ذرا جلدی کیجئے۔"

ڈاکٹر اٹھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک عورت لیٹی ہوئی کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے دایاں قدم تو ٹھیک اٹھایا جب بایاں پاؤں آگے رکھا تو یوں لگا جیسے اس کا پاؤں گہرے گڑھے میں جا پڑا ہے اور بائیں طرف گرنے والا ہے لیکن اس نے پھر دایاں قدم اٹھایا اور بائیں قدم پر پھر بائیں طرف گرنے کے انداز میں نیچے جھک گیا۔ اسی طرح جب وہ میز کی اوٹ سے مریم کے سامنے آیا تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر کی بائیں ٹانگ دائیں سے چھ سات انچ چھوٹی تھی۔ مریم کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں وقت و زمانہ کا ایک چکر چل پڑا۔ تیز بہت تیز۔ اور تیز۔ کمرے کی ہر ایک چیز گھوم رہی تھی اور اس کا ذہن جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ جب ڈاکٹر مریضہ کو دیکھ کر کمرے سے نکلا تو مریم نے گہری نگاہ سے ڈاکٹر کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی کے بائیں طرف منحنی سا ایک نشان تھا۔ پرانے زخم کا نشان۔

کوٹ ڈیجی :

بقیہ صفحہ ۲۶

نے ماہرین آثار قدیمہ اور ماقبل تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے وادیٔ سندھ کے پہلے ہی لاینحل مسئلوں یعنی اس کی اصل اور رسم الخط میں ایک اور پیچیدہ مسئلے کا اضافہ کر دیا ہے۔

چونکہ کوٹ ڈیجی میں کھدائی چٹان کی آخری قدرتی تہہ تک کی گئی ہے، اس لئے اس تمدن کی اصل بھی متنازعہ فیہ رہے گی۔ کیا یہ سمندر کے راستے عراق سے آیا یا خشکی کے راستے وادیٔ زوب سے جہاں زمانۂ ماقبل تاریخ اور ماقبل موئن جو دڑو سے متعلق اہم مقامات دریافت ہوئے ہیں یا یہ پاکستان کی سرزمین ہی سے کہیں مغربی پاکستان میں خود بخود پیدا ہوا ہے؟ یہ تمام معاملات ابھی دریافت طلب ہیں اور ان کے متعلق محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔ تاہم جو معلومات اب تک بہم پہنچی ہیں اُن سے یہ بات قطعی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ پاکستان ۵۰۰۰ ق۔م ہی میں تمدن کے کس قدر اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا تھا اور اس کے باشندوں میں شہریت کا شعور کس قدر ترقی پذیر ہو چکا تھا۔

تندرست لوگ باقاعدہ
لائف بوائے صابن سے نہاتے ہیں
LIFEBUOY SOAP
LIFEBUOY SOAP
یہ آئے دن کی گندگی اور اس کے جراثیم دھو ڈالتا ہے!
آئے دن ہمیں گندگی سے واسطہ پڑتا ہے جس میں جراثیم ہوتے ہیں
اور جن سے ہمیں بیماریوں کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لئے تو بے شمار
لوگ اپنی صحت کی حفاظت لائف بوائے صابن کے باقاعدہ غسل کو
کرتے ہیں جو گندگی اور اس کے جراثیم بھی دھو ڈالتا ہے۔
اور تازگی اور شگفتگی کا صحت مندانہ احساس دلاتا ہے
J2—193UD

بچت میں برکت

اسلم - تو آپ کی رائے میں افراط زر کی روک تھام سے ہمارے ملک کی اقتصادی پریشانیاں دور ہوسکتی ہیں - ہم غریبوں کی پریشانیوں کا کیا ہے - ہم غریبوں کا تو اللہ ہی حافظ ہے مگر یہ پریشانیاں افراط زر کو روکنے سے کیونکر دور ہوسکتی ہیں ؟

ایاز - قطعی طور پر - کیونکہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب ملک میں زر کا پھیلاؤ بڑھتا ہے تو روپے کی قیمت خرید میں کمی واقع ہو جاتی ہے - اسے روکنے کے بہت سے طریقے ہیں -

اسلم - مثلاً کیا کیا ؟

ایاز - ایک تو یہی کہ لوگ بچت کی طرف آمادہ ہوں - بچت ویسے بھی اچھی چیز ہے لیکن جب ملک میں افراط زر ہوتو بچت ہر شہری کے لئے لازمی ہو جاتی ہے اور آخرکار ان کو فائدہ پہنچاتی ہے -

اسلم - تو پھر بچت کی کوئی صورت تو بتائیے - یہاں آمدنی اتنی قلیل ہے کہ بچت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا -

ایاز - یہ خیال سطحی ہے - بچت میں بڑی برکت ہوتی ہے اور یہ کسی صورت میں بھی پریشان کن نہیں ہوسکتی - قلیل آمدنی میں بھی بہت کچھ کیا جاسکتا ہے - صرف مستحکم ارادہ کی بات ہے - یہ ایسے ہی ہے جیسے سگرٹ نوشی کو کم کرنے کے لئے مستحکم قوت ارادی کی ضرورت ہے - ویسے بڑا کٹھن مرحلہ معلوم ہوتا ہے مگر آدمی اس پر آمادہ ہو ہی جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیسے سر ہوتا چلا گیا - یہی کیفیت بچت کی بھی ہے بس بچت کو ایک طرح کی ورزش سمجھو -

اسلم - بھئی ورزش کیسے ؟

ایاز - جیسے ورزش میں کچھ جسمانی مشقت ہوتی ہے لیکن اگر روز تھوڑی تھوڑی عادت ڈالی جائے تو یہ تکلیف راحت بنتی چلی جاتی ہے - تازہ خون میں اضافہ ہونے لگتا ہے بس پابندی اور ذراسی ہمت چاہیئے - بےقاعدگی اور بے دلی سے کام نہیں چلتا - آپ ایک بار بچت کرنا شروع کردیں تو یہ آسان ہوجائے گی - اور آپ اس کا پھل پائیں گے - تازہ خون کے سرخ ذروں کی طرح آپ کی آمدنی میں بھی زر کے ذرے بڑھنے شروع ہو جائینگے ؟

اسلم - تو بچا بچا کے ڈھیر لگاتے جائیں اور بس ؟

ایاز - نہیں نہیں بچانے کے ساتھ بڑھائیے بھی یعنی سیدھی سی ایک بات تو وہی کرو جو میں کررہا ہوں اور کافی عرصے سے -

اسلم - یعنی کیا صورت ؟

ایاز - جتنا بچاؤ اس کے سرکاری سرٹیفکٹ خرید لو، اور اگر ایک دم نہیں خرید سکتے تو ڈاکخانہ سے بچت کے کارڈ لےآؤ اور اس پر چار آنے

آٹھ آنے روز کے حساب سے ٹکٹ ، جو اسی مقصد کے لئے چھاپے گئے ہیں، لے لے کر چپکا لیا کرو ۔

اسلم ۔ پھر کیا ہوگا ؟

ایاز ۔ جب پانچ یا دس روپے کے ٹکٹ اس کارڈ پر چپک جائیں تو اسے لیکر ڈاکخانے پہنچ جاؤ ۔ وہ یہ کارڈ لیکر آپ کو اصل سرٹیفکٹ دے دینگے ۔

اسلم ۔ ان سرٹیفکٹوں کا فائدہ کیا ہے ؟

ایاز ۔ تو بھئی تھوڑے فائدے کی بات ہے ۔ میاں ہم‌خرما و ہم‌ثواب ۔ تمہاری بچت پر حکومت منافع دیتی ہے اور حکومت کے پاس جو روپیہ جمع ہوتا ہے اس سے ملک کے ترقیاتی منصوبوں کو تقویت پہنچتی ہے ۔ اور آخرکار تم بھی ترقی میں رہتی اس سے فائدہ اٹھاؤ گے ہی ۔

اسلم ۔ اچھا یہ بات ہے ۔ تو پھر یہ سرٹیفکٹ کون کون خرید سکتا ہے ؟

ایاز ۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ۔ کوئی بھی چھوٹا ، بڑا ، بالغ نا بالغ ، مرد ، عورت ، انجمنیں، ادارے ، غرض سب ہی ۔

اسلم ۔ انہیں ضرورت پر بھنا بھی سکتے ہیں ؟ گھر میں رکھا ہوا روپیہ تو جب چاہو کام میں لے آؤ ۔

ایاز ۔ بھنا کیوں نہیں سکتے ۔ خریداری کے بارہ مہینے بعد اسے بھنا سکتے ہیں۔ بڑی آسانی سے ڈاکخانہ گئے اور روپیہ لے آئے ۔

اسلم ۔ اگر میں یہ سرٹیفکٹ اپنی بہن کی طرف سے خریدوں ؟

ایاز ۔ ہاں وہ ابھی چھوٹی ہے ۔ اس کی طرف سے تم یا تمہارے والد یا والدہ یا کوئی سرپرست خرید سکتا ہے ۔ وہی لوگ اسے جب چاہیں

خاندان کے مستقبل کا
خیال رکھیں

''بچت کارڈ'' پر چسپاں
کرنے کے لئے ٹکٹ

بھنا بھی سکتے ہیں ۔

اسلم ۔ مثلاً ہر مہینے میں ایک پانچ روپیہ کا سرٹیفکٹ خرید لیا کریں تو اس کی عمر کے بڑھتے بڑھتے تعلیم ، شادی بیاہ ، وغیرہ کے موقع پر یہ روپیہ کام آسکتا ہے ۔

ایاز ۔ اور کیا ، بھئی تو اوسط درجے کے لوگوں کو سوچنا چاہئے۔

اسلم ۔ لیکن اگر کسی مالک کا ، خدا نہ کرے انتقال ہوجائے تو ؟

ایاز ۔ اس کے وارث کو پوری قیمت مع منافع مل جائے گی ۔

اسلم ۔ اور اگر کوئی اعتراض کرے کہ منافع نہیں لوں گا ؟

ایاز ۔ تو نہ لے ۔ اس کے سرٹیفکٹ پر لکھدیا جائے گا ,, بغیر منافع ،، ۔

اسلم ۔ یہ ملتے کس ڈاکخانے سے ہیں ؟

ایاز ۔ کسی بھی ڈاکخانے سے مل سکتے ہیں ۔ علاوہ ازیں بہت سے ایجنٹ حکومت نے مقرر کئے ہیں ، ان کی معرفت بھی خرید سکتے ہیں ۔ کوئی کمیشن بھی نہیں دینی پڑتی ۔

اسلم ۔ یہ تو بڑی سہولت ہے ۔ مگر ایک بات اور پوچھتا ہوں ۔ فرض کرو میرا تبادلہ ہوجائے تو میں جہاں جاؤں گا وہاں سے اپنے سرٹیفکٹ کو بھنا سکوں گا ؟

ایاز ۔ ہاں کیوں نہیں ۔ پرچہ' شناخت ایک چیز ہوتی ہے ۔ خریدتے وقت اسے ڈاکخانہ سے لے لیں ۔ پھر آپ اپنا سرٹیفکٹ جہاں بھی پیش کریں گے یہ پرچہ' شناخت آپ کی ملکیت کی تصدیق کردیگا ۔ یعنی کوئی دقت ہی نہیں ہے ۔

اسلم ۔ اگر کوئی سرٹیفکٹ گم ہوجائے تو کیا کریں؟

بچت کے سرٹیفکٹ

ایاز - حواس باختہ ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ درخواست دیجئے - ڈاکخانہ تحقیق کریگا - پھٹے پرانے ، خراب ہوجانے والے سرٹیفکٹوں کو بھی ڈاکخانہ بدل دیتا ہے - یعنی ایک دستاویز لکھکر دے دیتا ہے جو اصل سرٹیفکٹ کا نعم‌البدل ہوتی ہے - مطلب یہ ہے کہ آپ کا روپیہ کبھی خطرہ میں پڑنا ہی نہیں -

اسلم - یہ تو رہی ذاتی منافع کی بات - اس کے علاوہ اور کیا صورت ہے جو آدمی کسی کو فائدہ پہنچانے کے لئے اس سلسلے میں کرسکتا ہے ؟

ایاز - اگر آپ کو خدا کسی بڑے کاروبار یا کارخانے وغیرہ کا مالک بنادے ، یا پھر ویسے ہی اگر آپ چاہیں تو اپنے عملے یا نوکروں کی طرف سے یہ سرٹیفکٹ خرید سکتے ہیں -

اسلم - اس کی کیا صورت ہوتی ہے ؟

ایاز - بہت معمولی - اپنے عملے یا نوکروں کو پیشگی روپئے دے دیجئے - وہ اس سے سرٹیفکٹ خرید لیں گے - یہ سرٹیفکٹ آپ کے پاس محفوظ رہینگے - جب آدمی سارا روپیہ اُتاردے تو اس کا سرٹیفکٹ اس کے حوالے کردیں - آپ کی اس مدد سے اس کی کچھ بچت بھی ہوجائے گی اور منافع بھی ملیگا - آپ کی پیشگی رقم اسکی تنخواہ میں مجرا ہوتی رہیگی - میاں ، بہت معمولی چٹکلے ہیں -

اسلم - مگر ہم لوگ جانتے ہی نہیں ؟

ایاز - ہاں یہ کہو جان بوجھ کر عمل نہیں کرتے۔ اور بھائی صاحب یہ دنیا جائے عمل ہے !

اسلم - بھئی وہ بچوں والی بات پھر ذرا سمجھا دو کہ بچوں کی طرف سے کس طرح خریدیں ؟

ایاز - میاں بہت معمولی سی ترکیب ہے - بچوں کو روزانہ جو جیب خرچ ملتا ہے وہ اکثر فضول چیزوں میں اڑا دیتے ہیں - آپ ان کو اگر بچت کا کارڈ لاکر دیدیں تو وہ جسطرح ڈاک کے پرانے ٹکٹ جمع کرتے ہیں اسی طرح بچت کے ٹکٹ روز یا دوسرے چوتھے بڑے شوق سے جمع کرنے لگینگے اور فخر سے دکھا یا کریں گے کہ اب اتنے پیسے جمع ہو گئے اور اب اتنے جمع ہوگئے - جونہی پانچ یا دس روپے کے مکمل ٹکٹ چسپاں ہو جائیں ، انہیں سرٹیفکٹ خرید دیں -

اسلم - اچھا ایک اور بات بتا دیجئے - منافع کیا ملتا ہے ؟

ایاز - میاں تمہاری بھی عجب حالت ہے - ابھی انڈوں میں سے بچے نکلے نہیں کہ چوزے گننے شروع کردئے !

اسلم - (ہنس کر) : شیخ چلی اور کسے کہتے ہیں -

ایاز - نہیں شیخ چلی والی بات نہیں ہے - اصل میں سارے بڑے خیال شیخ چلی پن سے ہی پیدا ہوتے ہیں مگر فرق صرف یہ ہے کہ لوگ جو کوئی کام کی بات کرجاتے ہیں وہ شیخ چلی سے ذرا آگے بڑھ جاتے ہیں — یعنی عمل میں لانے کا تہیہ کر لیتے ہیں اور پھر کرتے ہی چلے جاتے ہیں—اچھا خیر سنو ، منافع کافی ملتا ہے ابھی حکومت نے نیشنل ڈویلپمنٹ سیونگز سرٹیفکٹ کے نام سے بچت کے نئے سرٹیفکٹ جاری کئے ہیں جن پر ۵ فیصدی منافع ملتا ہے - اگر آپ دس سال تک کسی سرٹیفکٹ کو نہ بھنائیں تو آپ کے ہر روپے کا ڈیڑھ روپیہ ہوجائیگا - اور کیا چاہتے ہو ؟

ڈاکخانہ کے سیونگز بینک کی کھڑکی

اسلم—ذرا اطمینان کے لئے پوچھ رہا تھا— مطلب یہ ہے کہ منافع بھی کافی ہے—حفاظت و امانت کے لئے حکومت کی ضمانت موجود ہی ہے -

ایاز—اس میں شک بھی کیا ہے - مگر ایک خیال رہے—اور وہ یہ ہے کہ صرف پانچ دس روپے کے ہی سرٹیفکٹ نہیں ہیں - زیادہ مالیت کے بھی سرٹیفکٹ ملتے ہیں—جیسے پچاس روپے، سو روپے، پانچسو روپے، ہزار ، پانچ ہزار والے بھی ہیں—اگر کسی وقت کوئی شخص فضول قسم کے ، غیر یقینی ، منافع اور نقصان ہوجانے والے کاروبار کے قصے سے بچنا چاہے اور اس کے پاس کوئی معقول سی رقم ہے تو سیدھا ڈاکخانہ کا رخ کرے—کیوں میاں ٹھیک ہے یا نہیں؟ اصل میں یہ چیز کفایت کی عادت پیدا کرنے کے لئے ہے—دس سالہ سرٹیفکٹ پر حکومت ۵ فیصدی منافع دیتی ہے ایک بات اور سناؤں -

اسلم—ہاں وہ بھی سنیں -

ایاز—اس منافع پر انکم ٹیکس معاف ہے۔

اسلم—اچھا - پھر تو چھوٹے بڑے سبھی بچاتے ہونگے۔ مگر حکومت اس روپے کا کرتی کیا ہے اور اس پر منافع دیتی کہاں سے ہے ؟

ایاز—لو سارا قصہ سنکر کہتے ہیں زلیخا عورت تھی کہ مرد ! بھائی، آخر ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لئے روپیہ کہاں سے آئے؟ یہ سب کے فائدے کے کام ہیں اور ان میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا سرمایہ لگنا چاہئے—یوں تو حکومت صرف بڑے بڑے لوگوں سے بھی روپیہ لیکر لگا سکتی ہے، مگر مقصد اس چھوٹی بچت کی اسکیم کا یہ ہے کہ سب کو ان ترقیاتی منصوبوں میں روپیہ لگانے اور منافع کمانے کا موقع دیا جائے -

اسلم—تو یوں سمجھو کہ ہم بھی تھوڑا سا روپیہ لگا کر بڑے بڑے کاموں میں شریک ہوگئے۔ اچھا بھئی ، تو ہم چلے ایک سرٹیفکٹ لینے آج تو انٹی میں ہیں بھی روپے —

ایاز—آخر ہو نہ سمجھدار ! ہاں اگر کوئی اور بات پوچھنی ہو تو وہیں ڈاکخانے سے معلوم کرلیں—ورنہ ایک ٹھکانا اور بھی ہے—ذرا دم تولو- تم تو ایک دم شیخ چلی سے واقعی عمل یار خاں بن گئے !— میاں ،، اگر اور کچھ معلومات حاصل کرنی ہوں تو حکومت پاکستان کے سیونگز بیورو یا نیشنل سیونگز کراچی کے دفتر سے حاصل کرلینا - ٹھیک ہے نہ ؟ *

ان کی تندرستی اہم ہے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا سے کھانا تیار کرتی ہوں
اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں
اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت زیادہ غذائیت ہے۔ ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن اے کی اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی کہ اچھے اور خالص گھی میں ہوتی ہے۔ ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود ہے! آپ کے بچوں کی صحت مند پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان دونوں وٹامن کی موجودگی ضروری ہے۔
ہمیشہ محفوظ اور پاک و صاف
ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ نباتی تیلوں سے تیار کر کے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور ہوا بند ڈبوں میں بھرا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تازہ اور صاف ستھرا ہے۔ اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں کو صحت مند رکھئے۔
ڈالڈا
ڈالڈا برانڈ وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے
HVM. 18—193 UD

یہ خوف و ہراس کیوں؟
سیریڈون استعمال کیجئے اور
تکلیف دہ ایام سے نجات پائیے
ہر ماہ آپ کی زندگی کو تلخ کر دینے والی تکلیف اور درد سے
فوری طور پر نجات پانے کے لئے سیریڈون استعمال کیجئے
تسکین دیتی ہے
سیریڈون درد سے تقریباً فوراً نجات دلاتی ہے اور اس کے استعمال کے بعد نہ تو معدے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ بدحالی پیدا ہوتی ہے
آرام پہنچاتی ہے
سیریڈون اعصاب کو آرام پہنچاتی ہے اور درد کے ختم ہو جانے کے بعد آپ راحت و مسرت محسوس کرتی ہیں۔
تازگی بخشتی ہے
درد کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ پر سیریڈون قابو پا لیتی ہے اور اس کے استعمال کے چند ہی لمحوں بعد آپ پھرتی و تازگی محسوس کرتی ہیں۔
اصلی سیریڈون صرف اصولِ صحت کے مطابق مُہربند
کئے ہوئے ورقی پیکٹوں میں ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔
Saridon

PHONE:
35979
GRAM:
PUKARMIX
H.USMAN PERFUMERS
پُکار مکس عطر
اور
اسپیشل آملہ ہیر آئل
کے موجد
ایچ۔ عثمان پرفیومرس۔ بولٹن مارکیٹ کراچی
P.O.BOX 4321

چین سے دو خط
انڈین ایجنسی جنرل
چنگ کنگ - چین
۲۲-جولائی ۱۹۴۲ء
...... مجھے کچھ عرصہ سے گردن پر ایک قسم کی تکلیف ہے
دانے سے ہیں جن کی وجہ سے خارش بہت ہوتی ہے
نشانات تو رنگ ورم سے ملتے جلتے ہیں مگر باوجود
انگریزی علاج کے آفاقہ نہیں ہوا۔ اتفاقیہ آپ
کی دوائی "دل روز" کا اشتہار دیکھ کر خیال ہوا کہ اسے بھی
استعمال کر دیکھوں ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ شفا دے کیا آپ
مہربانی فرما کر ایک بڑی شیشی دل روز مندرجہ بالا پتہ پر
بذریعہ پارسل روانہ کر سکتے ہیں ......
ن-ا-خ میجر
انڈین ایجنسی جنرل
چنگ کنگ - چین
۲۵-اگست ۱۹۴۲ء
...... گذشتہ ہفتہ کی ڈاک میں آپ کی ارسال کردہ
دل روز کی شیشی ملی - شکریہ ! مجھے دس سال کے عرصے
یہ تکلیف تھی - ہر قسم کی دیسی و انگریزی ادویات استعمال
کیں مگر کچھ بھی آفاقہ نہ ہوا۔ دل روز کو صرف
چھ دن لگانے کے بعد تمام شکایت جاتی رہی۔
کاش ! مجھے پہلے ایسے تیر بہدف علاج کا علم ہوتا ......
ن-ا-خ
میجر
دل روز رجسٹرڈ تمام لا علاج جلدی امراض
ہر قسم کے پھوڑے پھنسی لاہوری پھوڑے
مغلائی پھوڑے ناسور بھگندر - بال توڑ - داد چنبل - خارش
گنج خنازیر - کھجلی - گنٹھی - رسولی - ماسخورہ - چنڈی - مستہ - مہاسہ
درد - جلن - سوجن - چوٹ - نئے اور پرانے زخم اور زہریلے جانوروں
کے کاٹے اور ڈسے کا بغیر اور تیر بہدف علاج ہے۔
چیر پھاڑ اور مرہم پٹی سے نجات دلاتی ہے
قیمت فی شیشی
دو روپیہ ــ ایک روپیہ ــ
۱۹۰۴ء سے استعمال میں ہے
ہر مشہور دوا فروش سے طلب کریں
حکیم طاہر الدین اینڈ سنز دل روز والا فیروز پور روڈ لاہور پنجاب

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور

ادارۂ

مطبوعات پاکستان

کی ایک اور

پیشکش

مسلم بنگالی ادب

ڈاکٹر انعام الحق
(بنگالی سے ترجمہ)

*

جس میں بنگالی زبان و ادب کی تاریخ اور اس کی ترقی میں مسلمانوں کے کارناموں کا نہایت تحقیق و تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے

*

صفحات ۴۰۰

مجلد، خوبصورت رنگین گردپوش

قیمت : ۴ روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

ماہِ نو
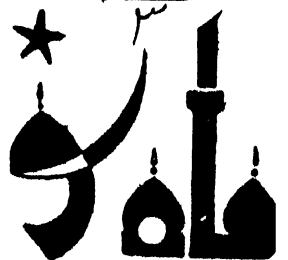
ڈاکٹر محمد باقر	ممتاز حسین	سراج الدین ظفر
فضل احمد کریم فضلی	ابو سعید قریشی	انور ممتاز
ضمیر اظہر	فضل حق قریشی	ماہر القادری

دسمبر ۱۹۵۸

۸/ر
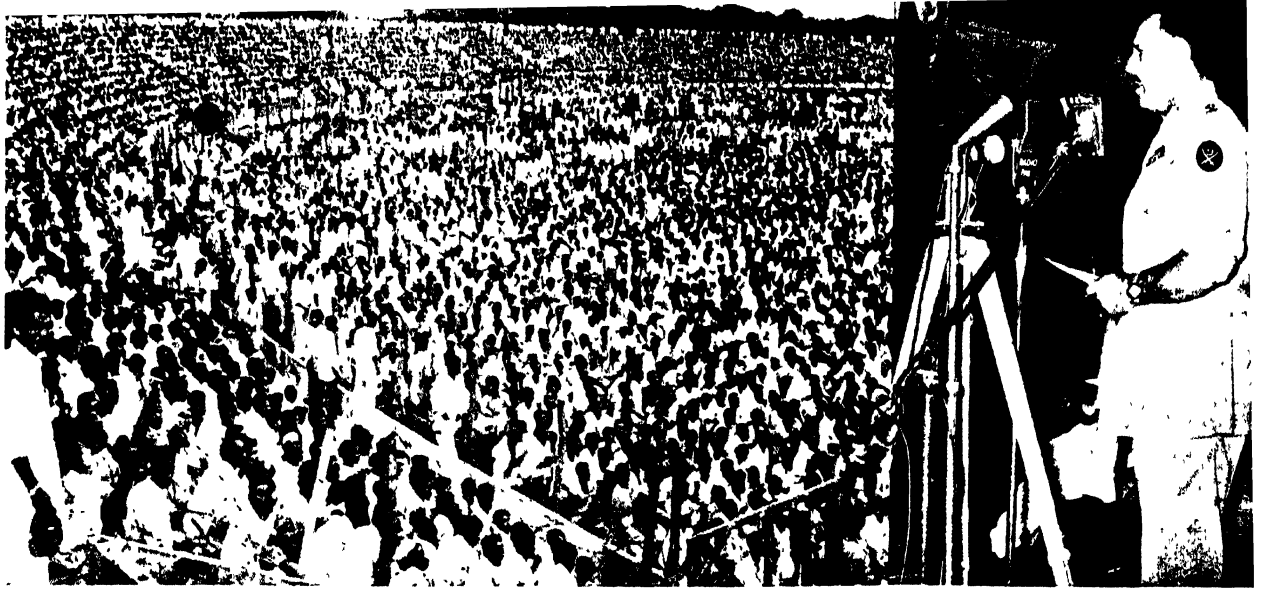
در پاکستان جنرل محمد ایوب خان، کا
اہالیان ڈھاکہ سے خطاب

نئی صدارتی کابینہ
کا اجلاس

جناب حبیب الرحمان صاحب
وزیر اطلاعات و نشریات وتعلیم،
نے کراچی میں
ہائی لیول پبلسٹی کانفرنس
کی صدارت کی

"لکس کا سفید رنگ اس کے خالص ہونیکا ثبوت ہے"
نادرہ کہتی ہے
"اسی لے میں ہمیشہ
لکس ٹائیلٹ صابن استعمال کرتی ہوں"
LUX
TOILET SOAP
فلمی ستاروں کا سفید خوشبودار

خوشحالی کی راہیں...
ان منصوبوں کے ذریعے زمین کو کارآمد بنانے کیلئے شب و روز
مصروف ہے ... ملک کی خوشحالی ہے اس جدوجہد
میں معدنی تیل سے بڑی مدد ملتی ہے انسان مشین اور معدنی تیل
کے اتحاد عمل سے ہی درجہ ہوتی ہے صنعت اور تجارت کو فروغ
ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ملک ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے
بڑھتا چلا جاتا ہے۔
کالٹیکس کو فخر ہے کہ اس نے وارسک ڈیم جیسے
عظیم الشان اور کثیر العوائد منصوبے کو کامیاب
بنانے میں حصہ لیا۔
CALTEX
کالٹیکس ۷۰ سے زائد ممالک کی ترقی میں رفیق
یورپ۔ افریقہ۔ ایشیا۔ آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ میں خدمت گذار
کالٹیکس پٹرولیم پروڈکٹس
STRONACHS

ماہِ نو

جلد ۱۱
شمارہ ۹
دسمبر ۱۹۵۸ء

مدیر
رفیق خاور
نائب مدیر
ظفر قریشی

سالانہ چندہ : ساڑھے پانچ روپے
فی کاپی : آٹھ آنے

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

اداریہ... آپس کی باتیں

بہ یادِ قائدِ اعظم، حدی خواں (نظم) محمد علی نیّر ۷

ایک یادگار سفر (مشرقی پاکستان) عبدالحق شہباز ۸

نیا نظام: طوفانِ نیل! (نظم) صہبا اختر ۱۱

"اُفق سے آفتاب ابھرا" ۱۲

مقالات: اسٹائل ممتاز حسین ۱۵

آشک رامپوری فضل احمد کریم فضلی ۱۹

سرحد کا پہلا اردو شاعر خیال بخاری ۲۲

افسانے: کمند انور ممتاز ۲۶

زہر خند ابو سعید قریشی ۳۴

احساس محمد عمر میمن ۴۰

غزلیں: سراج الدین ظفر ۴۴

ماہر القادری، ضمیر اظہر ۴۵

ثقافت: ہیر کا مقبرہ اور ہیر رانجھا کا عہد ڈاکٹر محمد باقر ۴۹

مسائلِ امروز: حقوقِ انسانی اور اقوامِ متحدہ فضل حق قریشی دہلوی ۴۶

اُفق تا اُفق: ہماری موسیقی (ایک مغربی نقاد کی نظر میں) ۵۵

آپس کی باتیں

اُس والہانہ محبت کی بنا پر جو ہمارے دل میں قائدِ اعظمؒ کے لئے ہے ہم ہر اُس تقریب کا انتہائی ذوق [illegible] مقدم سمجھتے ہیں جو اُن کی ذاتِ گرامی سے متعلق ہو اور آج پھر اسی روز افزوں عقیدت و احترام کی بنا پر ان کی یاد تازہ کر رہے ہیں [illegible] رہنما کی حیثیت سے نہیں بلکہ بانیٔ ملت کی حیثیت سے جس کو وطنِ عزیز کے دونوں حصوں، مشرقی و مغربی پاکستان، سے یکساں محبت تھی۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی ذات ہی پاکستان سے عبارت ہو، جو اس کا خالق، اس کا دل و دماغ اور روحِ رواں ہو، اس کی زندگی کا ہر پہلو ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔ [illegible] مشرقی پاکستان بھی شامل ہے جو درحقیقت اُن کی فطری محبت ہی کا نتیجہ تھا۔ اس بنا پر ہم اس شمارہ میں اس کی چشم دید کیفیت پیش کر رہے ہیں۔ ایک ایسے ناظر کی نگاہ سے جو [illegible] شوق میں قائدِ اعظم کے ہمراہ تھا۔

ہمیں مسرت ہے کہ ہم اب کی بابائے ملت کا ذکرِ خیر ایسے حالات میں کر رہے ہیں جو قائدِ اعظمؒ کے ساتھ خاص مناسبت رکھتے ہیں کیونکہ جس پُرخلوص جدوجہد سے انہوں نے ہماری حیاتِ ملیہ میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کیا تھا اور ہمیں بیگانوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی تھی اسی طرح عساکرِ پاکستان نے قوم کا صالح ترین عنصر اور دل و ضمیر بن کر ہمیں اپنوں کے ہاتھ سے نجات دلائی جو اپنے طرزِ عمل میں بیگانوں سے کم نہ تھے! اور اس طرح ایک اور خوشگوار انقلاب رونما ہوا جس کو ہماری دوسری اور حقیقی آزادی قرار دینا بیجا نہ ہوگا۔ اس شمارہ کا ایک نقش "افق سے آفتاب ابھرا" اس دورِ خوشگوار کی چند در چند جھلکیاں اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

☆

اک داغ تازہ اور ہے داغِ کہن کے ساتھ! —— ابھی ہم اپنے نامور صحافی، ادیب اور شاعر ظفر الملت مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے سانحۂ ارتحال کو بمشکل برداشت کر پائے تھے کہ ان کے فرزندِ ارجمند مولانا اختر علی نال بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے! جس سے ظفر الملت کی وفات کی یاد تازہ ہوگئی اور نہ صرف اردو جرائد کے سرخیل "زمیندار" کو، جس کی ان دونوں نے خونِ جگر سے آبیاری کی تھی، غمِ تازہ سے دوچار ہونا پڑا بلکہ دنیائے صحافت بھی ایک صدمۂ جانکاہ سے دوچار ہوئی۔ قوم اس دوگونہ محرومی پر سوگوار ہے کیونکہ شمعِ صحافت کے ایسے پروانوں کا بدل میسر آنا بہت مشکل ہے۔

☆

اقوامِ متحدہ نے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود اور امنِ عالم کی بحالی کے سلسلے میں جو جدوجہد کی ہے اس کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی پُرخلوص نوعیت اور نامساعد حالات کے باوجود مسلسل سعی و کوشش ہے جو اقوامِ عالم کی زندگی میں کافی خوشگوار نتائج پیدا کر چکی ہے۔ حقوقِ انسانی کا تحفظ وہ مہتم بالشان اصول ہے جس پر اس بین الاقوامی ادارۂ فلاح و بہبود کی بنیاد استوار ہے اور جس کا عالمی منشور ان گوناگوں آزادیوں کا ضامن ہے جو نوعِ انسان کا پیدائشی حق ہیں۔ چنانچہ امسال حقوقِ انسانی کے عالمی منشور کی جو سالگرہ منائی جا رہی ہے، اس کے سلسلے میں ایک مضمون اور تصاویر اس شمارہ میں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ہمارے دل میں اس منشورِ آزادی کی یاد تازہ رہے۔

☆

قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے یہاں مصوری کو جو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے اس کا ثبوت اُن متعدد نمائشوں سے ملتا ہے جو وقتاً فوقتاً پاکستان اور بیرونِ پاکستان منعقد ہوتی رہی ہیں۔ حال ہی میں پاکستان کے پانچ مصوروں کی تصاویر کی جو نمائش لندن میں منعقد ہوئی ہے وہ مصوروں کے ذوق و شوق اور اس فن کی غیر معمولی ترقی کا قابلِ قدر مظاہرہ ہے۔ اس سلسلے میں آرٹ کونسل آف پاکستان اور دیگر فنی اداروں کی بوقلموں سرگرمیوں سے اور بھی وقیع نتائج کی امید ہے۔

سرورق: صدرِ پاکستان کا باڈی گارڈ

حُدی خواں

(بیادِ قائدِ اعظمؒ)

محمد علی منیر

آزادیٔ نفس کا حدی خواں بشر تھا تو
ہو برق در کنار وہ آتش جگر تھا تو
صد ہا ہزار شعلوں کا حامل شرر تھا تو
ظلماتِ بیکراں میں پیامِ سحر تھا تو
بہرِ نجاتِ قوم کلیمِ دگر تھا تو

*

پنہاں تری نگاہ میں بیداریوں کے راز
خورشید وار شرق سے تا غرب ترکتاز
پیغامِ رستخیز ترا دستِ کارساز
اوجِ فلک پہ شانِ تجمل سے سرفراز
سوزِ درونِ قلب ترا ایک جہاں گداز

تھا مادرِ وطن کا تو فرزندِ ارجمند
ڈالی تھی جس نے بڑھ کے ستاروں پہ بھی کمند
فکرِ بلند و عزمِ بلند و دلِ بلند
جولاں عناں گسیختہ افکار کے سمند
شانِ جہاد کیوں نہ ہو تیری جہاں پسند

*

صبحِ حیاتِ تازہ کی تابندگی تھا تو
آئینہ دارِ شوکت و شانِ خودی تھا تو
یکتائے دہر پیکرِ آزادگی تھا تو
اک دل کے ساتھ حاملِ صد زندگی تھا تو
دورِ جمود میں ہمہ تن آگہی تھا تو

*

تاریخِ روزگار میں حاصل جسے دوام
اور آب و تاب جس کی ہے بالائے صبح و شام

★

ماہِ نو، کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۸ء

بیادِ قائدِ اعظمؒ:

ایک یادگار سفر

عبد الحق شہباز

مغربی پاکستان ہو یا مشرقی پاکستان، قائدِ اعظم کو دونوں سے یکساں محبت تھی۔ کیونکہ ان کے ساتھ ان کا رشتہ بابائے ملت کا رشتہ تھا۔ اگرچہ وفاقی پایۂ تخت میں مستقل قیام کے باعث مغربی پاکستان کو ان کے فیضِ محبت سے مستفید ہونے کا زیادہ موقع حاصل ہوا، پھر بھی مشرقی پاکستان ان کے دل کی گہرائیوں میں اسی طرح جاگزیں تھا اور ان کی محبت سے برابر بہرہ یاب رہا۔ یہی والہانہ محبت تھی جو انہیں گورنر جنرل کی حیثیت سے نہیں، بابائے ملت کی حیثیت سے دورۂ مشرقی پاکستان پر لے گئی۔ یہ دورہ محض ایک تاریخی دورہ نہ تھا بلکہ اس محبت کی یادگار تھا جو بابائے ملت کو فرزندانِ قوم سے تھی اور ان کا استقبال بھی مشرقی پاکستان میں بابائے قوم کی حیثیت ہی سے کیا گیا۔

جن لوگوں نے بچشمِ خود اس سفرِ شوق کا مشاہدہ کیا ہے، وہ اس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ راقم ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہے جنھیں یہ موقع نصیب ہوا۔ اس دورہ کے حالات درحقیقت ملت کا سرمایۂ عزیز ہیں اور اُس تک پوری وضاحت سے پہنچ جانے چاہئیں۔ بالخصوص اس لئے کہ یہ حیاتِ قائد کا ایک نہایت اہم جُزو ہیں۔

حصولِ آزادی کے بعد بابائے ملت قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مارچ ۱۹۴۸ء میں گورنر جنرل کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کا پہلی مرتبہ دورہ کیا۔ وہاں کے عوام نے پاکستان کے بانی کا جس گرمجوشی سے استقبال کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ آج گیارہ سال گزر جانے کے باوجود عوام یہ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ قائد کے اس دورے کی یاد کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

مارچ ۱۹۴۸ء کے اوائل میں جب قائدِ اعظم کے دورۂ مشرقی پاکستان کی خبر شائع ہوئی تو صوبے میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر ضلع کے عوام و حکام بابائے ملت کے استقبال میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لئے تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ صوبے کے صدر مقام "ڈھاکہ" کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ ہر موڑ پہ آرائشی دروازے اور محرابیں بنائی گئیں جو اسلامی ثقافت کی عکاسی کرتی تھیں۔ چٹاگانگ کی آرائش خاص مقامی ثقافت کی آئینہ دار تھی۔

پندرہ روز کی مسلسل تیاریوں کے بعد قوم اپنے عظیم رہنما کے شایانِ شان استقبال کے لئے ہر طرح سے تیار تھی۔ ۱۹ مارچ کو قائد کے ڈھاکہ پہنچنے کا دن تھا اور گھنٹوں پہلے یہاں کے شہری اور دیہاتی جوق در جوق ہوائی اڈے کی طرف چل پڑے۔ ہزاروں لوگ اپنے نجات دہندہ کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ شہر سے ہوائی اڈے تک سڑک کے دو رویہ پاکستان کی بری فوج کے نوجوان "تنظیم" کے مطمحِ نظر کو عملی جامہ پہنائے کھڑے تھے۔ ان کے چہروں سے شگفتگی اور بشاشت ٹپک رہی تھی جو ان کے عزم اور ذمہ داریوں کی مظہر تھی۔

صوبے کے وزیرِ اعلیٰ، ان کے ساتھی وزراء، اسمبلی کے اسپیکر اور ارکان، سرکاری افسر اور ممتاز شہری قائد کی آمد سے سوا گھنٹہ بیشتر ہوائی اڈے پر پہنچ چکے تھے۔

ڈھاکہ کی یہ سہ پہر کسی قدر گرم تھی، اس کے باوجود عوام دھوپ میں ہوائی اڈے کے گرداگرد ہزاروں کی تعداد میں کھڑے تھے۔ کراچی سے جہاز کی آمد میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ تمام وزراء اور سرکاری حکام گورنر کی معیت میں ہوائی اڈے کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے کہ مغرب سے گھٹا اٹھی، آناً فاناً بادل چھا گئے، اور بارش ہونے لگی۔ گویا قدرت بھی قائدِ اعظم کے استقبال میں عوام کی شریک تھی۔ بادلوں کی گرج کے ساتھ بارش تیز ہو گئی لیکن عوام نے اپنی جگہیں چھوڑنے کی بجائے "پاکستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دئے۔ چند ہی لوگ ایسے تھے جنھوں نے بارش سے بچنے کی خاطر سائے کی تلاش میں اپنی جگہیں چھوڑیں لیکن پھر انھیں وہاں جگہ نہ مل سکی۔

بارش تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ بادلوں پر قوسِ قزح عجیب سماں پیش کر رہی تھی جیسے آسمان بھی قائد کے استقبال میں

پیچھے نہ رہنا چاہتا ہو۔ عین اس وقت جبکہ قوس قزح اپنے پورے جوبن پر تھی۔ فضا میں ایک ہوائی جہاز نمودار ہوا اسی کے ساتھ ہی "قائداعظم زندہ باد" اور "پاکستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے سنائی دینے لگے۔

بانئ ملت بانئ پاکستان کا "ڈکوٹا" ہوائی اڈے پر اتر چکا تھا، اور آپ اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کی معیت میں جہاز سے اتر رہے تھے۔ گورنر اور وزیر اعلیٰ نے بڑھ کر آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ فضا ابھی تک "پاکستان زندہ باد" اور "قائداعظم زندہ باد" کے فلک بوس نعروں سے گونج رہی تھی۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی پہلی آمد متعدد سرکاری تقریبات کا پیش خیمہ تھی۔ آپ جونہی خاکی وردیوں میں ملبوس بری فوج کے ایک دستے اور سبز رنگ کی وردیوں میں ملبوس خواتین نیشنل گارڈز کے معائنے کے لئے آگے بڑھے۔ عوام نے پورے جوش اور ولولے سے تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔ فوجی دستے نے پاکستان کے اس مرد مجاہد کو سلامی دی۔ سلامی کے بعد آپ ایک کھلی کار میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہوئے جہاں سڑکوں پر دو رویہ ہزاروں اشخاص آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑے تھے، اور ہزاروں اشخاص ایسے تھے جو آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے چھ میل کا فاصلہ طے کر کے تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر پہنچے تھے۔

جونہی شام ڈھلی لوگ اپنے دلوں میں اس "عظیم دن" کی یاد لئے جس کی خاطر انہوں نے گذشتہ پندرہ روز تیاریوں پر صرف کئے تھے۔ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔

اگلے روز قائداعظم، محترمہ فاطمہ جناح، صوبائی گورنر اور دیگر حکام کے ہمراہ پاکستانی دستوں کے معائنے کے لئے کرمیتولا کے ہوائی اڈے پر گئے۔ پاکستانی فوج کے افسروں اور جوانوں نے، جو پاکستان کی سرحدوں کے محافظ ہیں، مملکت کے سب سے بڑے سربراہ کو سلامی پیش کی۔ قائداعظم نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> "بنگال کی عسکری سپرٹ اور ماضی میں مسلمانوں کا کردار تاریخی طور پر مسلم ہے۔ اب آزاد پاکستان میں جو دنیا کا ایک عظیم ملک بننے والا ہے۔ آپ ایک آزاد اور خود مختار حکومت کے ماتحت ہیں۔ اب آپ کو اپنی خاطر دنیا پر اپنی عسکری اسپرٹ واضح کر دینے کا ہر موقع میسر ہے۔"

اپنے انتہائی مصروف پروگرام کے باوجود قائداعظم اقلیتوں کے نمائندوں سے بھی ملے۔ پس ماندہ اقوام کے نمائندوں کی معروضات کو بڑی ہمدردی سے سنا، اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت کی پوری توجہ کا یقین دلایا۔ آپ نے کہا: "میں نے ہمیشہ آپ کی وکالت کی ہے اور کرتا رہوں گا۔"

صوبائی مجلس قانون ساز کے ہندو ارکان سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے اس امر پر زور دیا کہ ہندوؤں کو حکومت کے ساتھ دوسرے محب وطن پاکستانیوں کی طرح تعاون کرنا چاہیئے۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کا دن عوام الناس کا دن تھا۔ ڈھاکہ کا بڑا میدان "رمنا" انسانوں کا ایک عظیم سمندر نظر آرہا تھا۔ بے شمار لوگ دور دراز مقامات سے چلچلاتی دھوپ میں اپنے رہنما کی تقریر سننے کے لئے آئے تھے اور گھنٹوں سے منتظر بیٹھے تھے۔ آخر وہ لمحہ بھی آن پہنچا جب قوم کا رہنما قوم کے درمیان تھا۔ شہر کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین نے قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کا استقبال کیا۔ اور فضا نعرہ ہائے تحسین سے گونج اٹھی۔ مائکروفون کے قریب کھڑے ہو کر جب قائد نے اپنے عوام کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھا تو فضا "قائداعظم زندہ باد" کے نعروں سے ایک بار پھر گونج اٹھی۔ آپ نے قوم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان مشکلات اور ان مسائل کا تذکرہ کیا جن پر گزشتہ سات ماہ میں حکومت نے قابو پالیا تھا۔ آپ نے کہا:-

> "متحد رہیئے۔ ناموزوں حالات اور مشکلات کا مقابلہ کیجئے اور اپنے عوام کی بھلائی کے لئے ایثار سے کام لیجئے۔ قوم یا ملک کی بھلائی کے لئے انفرادی یا اجتماعی کوشش محنت یا ایثار سے پہلو تہی نہ کیجئے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر گامزن ہو کر آپ پاکستان کو پانچواں بڑا ملک بنا سکتے ہیں نہ صرف آبادی کے لحاظ سے، جیسا کہ یہ ہے، بلکہ طاقت کے لحاظ سے بھی تاکہ دنیا کی دوسری اقوام ہمارا احترام کریں۔"

ماضی و مستقبل کی قابل فخر "ڈھاکہ یونیورسٹی" نے اپنا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد بھی قائد کی آمد پر منعقد کیا۔ قائداعظم طلبہ سے خطاب کرنے کے لئے یونیورسٹی گئے، جہاں چانسلر اور وائس چانسلر کے علاوہ ہزاروں طلبہ نے بھی آپ کا خیر مقدم کیا۔ طلبہ سے مخاطب ہو کر بابائے قوم نے کہا:-

> "آپ میں سے اکثر اپنی تعلیمی زندگی ختم کر کے کارزار حیات میں داخل ہوں گے۔ مگر اپنے پیشروؤں کے برعکس،

خوش قسمتی سے آپ یونیورسٹی سے نکل کر ایک آزاد و خود مختار ملک میں اپنی زندگی کا آغاز کریں گے جو کہ آپ کا اپنا ملک ہے۔ پاکستان کے قیام پر جو انقلابی تبدیلی ہوئی ہے۔ اس کی پیچیدگیوں کو مکمل طور پر سمجھنا آپ اور آپ کے دوسرے ساتھیوں کے لئے اشد ضروری ہے۔ ہم طوق غلامی کو توڑ کر اب آزاد ہو چکے ہیں۔ یہ ہمارا اپنا ملک ہے۔ حکومت ہمارے عوام کی حکومت ہے، جو عوام کے سامنے جوابدہ ہے اور مملکت کی بھلائی کے لئے کام کر رہی ہے۔ تاہم آزادی کا مطلب بے لگامی نہیں ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ اب آپ جو چاہیں کریں یعنی مملکت اور دوسرے لوگوں کے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہی کریں جو آپ چاہتے ہیں۔ آپ اور ملک دونوں پر ایک عظیم ذمہ داری ان پڑی ہے۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم ایک متحد اور منظم قوم کی طرح کام کریں۔ اب ہمیں ٹھوس تعمیری جذبے سے کام کرنا ہے نہ کہ اس زمانے کے جارحانہ جذبے سے جب کہ ہم حصول آزادی کے لئے مصروف رہے تھے۔ "تعمیری جذبہ" پیدا کرنا، حصول آزادی کی جدوجہد کے جارحانہ جذبے سے کہیں کٹھن مشکل کام ہوتا ہے۔ جیل جانا یا آزادی کے لئے لڑنا حکومت چلانے کے مقابلے میں بہت آسان ہے۔

اگر آپ متحد ہیں تو زندہ رہ سکیں گے اور بکھر گئے تو زندہ رہنا مشکل ہے"۔

مستقبل کی عظیم بندرگاہ چٹاگانگ بھی کراچی کے مہمانوں کی آمد کی منتظر تھی۔ پہاڑیوں، دریاؤں اور سمندر کی اس حسین سرزمین کو آرائش کی ضرورت نہیں تھی لیکن چٹاگانگ کے باشندے اپنی سرزمین کے حسن میں اضافہ کا عزم کئے ہوئے مہمانوں کے استقبال کے لئے بالکل تیار تھے۔

چمکتے ہوئے سورج کی روشنی میں ہوائی جہاز ڈھاکہ سے چٹاگانگ پہنچا۔ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کے سربراہ اور صوبے کے وزیر اعلیٰ پہلے سے وہاں موجود تھے تاکہ پاکستان کے مشرقی دروازے پر بانیٔ مملکت کا استقبال کر سکیں۔

چٹاگانگ کی بحری اہمیت اور پاکستان کے بحری مرکز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پاکستانی بحریہ کے افسروں اور نوجوانوں نے جو بے داغ سفید وردیوں میں ملبوس تھے، قائداعظم کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ ہوائی اڈے پر جب قائداعظم غیر رسمی طور پر لوگوں سے ملے تو چٹاگانگ کے بحری سیاح قریب سے آپ کو دیکھنے کے لئے آپ کے گرد جمع ہو گئے ——— "لیکن قوم کو منظم ہونا چاہیئے" ——— قائد کا چہرہ اس اپیل کے ساتھ تمتما اٹھا اور قوم پر فوراً ہی اس کا اثر ہوا۔

قائداعظم مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ کے معائنے کے لئے بھی گئے جہاں سے کافی مقدار میں پٹ سن کی براہ راست برآمد ہوتی تھی۔ بندرگاہ نے اپنی خنک ہوا اور مختلف قوموں کے رنگین جھنڈوں کے ساتھ آپ اور آپ کی بہن کو خوش آمدید کہا۔ قائداعظم نے "جوالڈیا" نامی جہاز میں بیٹھ کر بندرگاہ بھی دیکھی۔

جب جہاز کرنافلی کے قریب پہنچا تو بندرگاہ کو ترقی دینے سے متعلق نقشہ جات اور خاکے گورنر جنرل کے سامنے پیش کئے گئے اور تمام نقاط کی تفصیل بتائی گئی۔ یہی وہ منظر تھا جسے چٹاگانگ کبھی نہیں بھول سکے گا کیونکہ ماضی کی غفلت کوشیوں اور مستقبل کی اہمیت سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ اسی جہاز پر چٹاگانگ کی نئی زندگی کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا جس کا مستقبل تابناک ہے۔

"اب یہ چٹاگانگ کے باشندوں کا کام ہے کہ وہ اپنا کام بخوبی سنبھالیں اور بندرگاہ کو وہ عروج دیں جس کی یہ مستحق ہے"۔

یہ تھا وہ پیغام جو عوام تک پہنچانے کے قائداعظم نے محترمہ فاطمہ جناح کی معیت میں جلسہ عام سے خطاب کیا۔ قائداعظم نے اپنے استقبال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"جب آپ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزم مستحکم بنیادوں پر رائج ہونا چاہیئے جو اخوت و مساوات کو تقویت دے تو آپ نہ صرف میرے، بلکہ لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہماری ترقی کے یہ مقاصد پاکستان میں نزاعی یا اختلافی نہیں کیونکہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا، اس کے لئے جدوجہد کی اور بالآخر ہم نے اسے حاصل کر لیا۔ اب ہم اپنی روایات کے مطابق اپنے امور کا فیصلہ کرنے میں روحانی اور جسمانی طور پر آزاد ہیں"۔

۲۹ مارچ قائداعظم کے اس یادگار دورے کا آخری دن تھا جس نے مشرقی پاکستان میں ترقی کیلئے ایک نئی قومی امنگ پیدا کر کے صوبے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔ بے شمار لوگ بانیٔ مملکت کو الوداع کہنے کے لئے ہوائی اڈے پر اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اپنے عوام سے رخصت ہونے کے بعد قائداعظم الوداعی سلام لینے کے لئے ڈائس پر تشریف لائے۔ روانگی کے وقت ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ رقصاں تھی جو مصائب و مشکلات میں بھی ان کے چہرے پر عیاں رہتی تھی۔

جب ڈکوٹا نے پرواز کی تو ہزاروں نظروں نے عقیدت مندی کے ساتھ جہاز کا تعاقب کیا۔ قائد کھڑکی سے اپنا سفید رومال باہر نکالے مشرقی پاکستان کو الوداع کہہ رہے تھے۔

طوفانِ نیل!

صہبا اختر

وہ رات ہم جسے عفریت زاد کہتے تھے
وہ ایک تیشۂ فرہاد سے تمام ہوئی
جو رات خاصۂ خاصانِ شب کا حصّہ تھی
سحر ہوئی تو ستارہ گرِ عوام ہوئی

★

وہ رات ہم جسے اک دیوِ باد کہتے تھے
مرے چمن کے لئے پھر صبا خرام ہوئی
وہ رات ہم جسے ظلمت نژاد کہتے تھے
وہ طبلِ صبح کے بجتے ہی شعلہ فام ہوئی

★

ہر اک مکان کے ظلمت نصیب آنگن میں
اُفق میں کھوئی ہوئی روشنی اُتر آئی
کئی بجھے ہوئے ماتھوں سے چاندنی پھوٹی
دلوں میں ڈوبی ہوئی کہکشاں اُبھر آئی

★

کشیدِ ماہ، خُمِ نیلتاب سے برسی
کشیدِ ماہ، جو ہر تیرگی مٹا آئی
شفق عذار سحر روشنی کے پھول لئے
مرے وطن کے در و بام جگمگا آئی

★

وہ سانپ، بچھو، سنپولے، وہ اژدرانِ سیاہ
جو میرے ملک کی شہرگ کا خون پیتے تھے
وہ کنکھجورے کہ پیوست تھے رگ و پے میں
وہ بھیڑیئے جو لہو چاٹ چاٹ جیتے تھے

★

وہ سنگ رنگ مگرمچھ جو تیز موجوں میں
شکار کرتے رہے تھے ہر ایک بے بس کو
ہزار پائے، جو بحران کے سمندر میں
جکڑ کے بیٹھ گئے تھے ہماری نس نس کو

★

سمندروں کے وہ ڈاکو، زمین کے کالے چور
کہیں اماں نہ تھی جن سے وطن پرستوں کو
جو ہڈیوں کو چبا جائیں گوشت کھا جائیں
ہم آدمی بھی سمجھتے تھے اُن درندوں کو!

★

ہر ایک کھیت کا چاندی سا روپ جھلسا کر
ہر اک شگوفے ہر اک روشنی کا خون پیا
مری زمین کہ سونا اُگلنے والی تھی!
مری زمین کو ان ڈاکوؤں نے لوٹ لیا

★

خدا کا شکر، وطن دشمنوں کو موت آئی
خدا کا شکر کہ ظلمت نژاد غرق ہوئے
خدا کا شکر کہ طوفانِ نیل آپہنچا
خدا کا شکر کہ "فرعون زاد" غرق ہوئے

"اُفق سے آفتاب اُبھرا"

مارشل لاء کے تحت نئی حکومت کو قائم ہوئے ڈیڑھ مہینہ سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے مگر یہ مدت فی نفسہٖ بہت قلیل ہے خصوصاً حکومتوں کی مضبوطی و استحکام کے سلسلہ میں کیونکہ ان کی بقا تمام تر امتداد وقت ہی کی رہین منت ہوتی ہے۔ اس مختصر عرصہ ہی میں نئی حکومت نے جو استقامت، اعتماد اور ہردلعزیزی پیدا کرلی ہے، وہ بجائے خود اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ اس کے ساتھ اگر اس ترقی کی رفتار کو پیش نظر رکھا جائے جو اس تھوڑے سے عرصہ میں بروئے کار آئی ہے، اُن زبردست اقدامات کو ملحوظ رکھا جائے جو زندگی کے ہر شعبے میں کئے گئے ہیں، اور ان کے دُور رس نتائج پر نظر ڈالی جائے، تو اس کی توانائی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انقلاب عوامی خواہشات کے مطابق ہے، اس کی فی الحقیقت ضرورت تھی کیونکہ یہ تمام قوم کے حقیقی تقاضوں کا نتیجہ ہے، اور عوام جس سے بجا طور پر اپنی تمناؤں اور ضرورتوں کے پورا ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔ اس کی بنیادیں اُن ہی مقاصد پر اُستوار ہیں جن کے لئے برصغیر پاک و ہند کے تمام مسلمانوں نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں متفقہ طور پر حصہ لیا تھا، اور وہ یقین رکھتے تھے کہ اس نصب العین کو عملی طور پر حاصل کر لینے کے بعد وہ آزادی کے فیوض و برکات سے مستفیض ہو سکیں گے۔ قیام پاکستان اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا بہترین ذریعہ تھا۔ اور حق یہ ہے کہ ابتدا میں عنانِ قیادت جن بے لوث رہنماؤں کے ہاتھوں میں تھی انہوں نے حتی الامکان جمہور کی آرزوؤں اور مطالبوں کو پورا کرنے کی سرتوڑ کوشش کی، اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ یہ قائد اعظم محمد علی جناح اور شہید ملت لیاقت علی خاں ہی کی پُرخلوص کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پاکستان کی بنیادیں استوار ہوئیں، قوم اتحاد و یگانگت کی بنا پر آسودگی و خوش حالی کی دولت سے مالا مال ہوئی اور نہ صرف اندرونِ ملک ترقی کا دور دورہ ہوا بلکہ بیرونی ممالک میں بھی ہماری نوزائیدہ مملکت کی ساکھ قائم ہو گئی۔ لیکن شومیٔ قسمت سے یہ صورتِ حال ان پُرخلوص قائدین کے حین حیات ہی تک قائم رہ سکی، اور اس کے بعد تخریبی عناصر کا ہیجان دیکھئے، مدد گار بے گونا گوں راہزن، رہنماؤں کا روپ دھار دھار کر سامنے آئے اور آئے دن وزارتی بحرانوں کا دور دورہ ہوا جس کا نتیجہ ہمہ گیر بدنظمی و انتشار کے سوا اور کچھ نہ ہوا۔ تخریبی عناصر کے روزافزوں غلبہ نے نہ صرف نظم و نسق پر تباہ کن اثر ڈالا بلکہ معاشرہ میں چند در چند خرابیاں پیدا کیں۔ ان حالات میں ایک ایسے انقلاب کی ضرورت تھی جو جمہور کو اُن کا حق دلائے، جو قوم میں زندگی کی نئی رُوح پھونک دے، اس کی خواہشات و ضروریات کو پورا کرے، اس کے مسائل کو حل کرے، اس کو آزادی اور خوشحالی سے روشناس کرائے، بدنظمی و انتشار کو دور کرے، سیاسی، معاشرتی اور انتظامی خرابیوں کا قلع قمع کرے اور زندگی کے ہر شعبہ کی تطہیر کے بعد اس میں نیا خون دوڑا کر از سرِ نو ترقی اور جدوجہد کرنے کی صلاحیت عطا کرے، اور ان سب کے ثمرۂ شیریں کے طور پر قومی فکر و ثقافت کے مایۂ ناز عناصر بھی برگ و بار پیدا کریں۔

ہماری خوش قسمتی سے قوم میں ایک پُرخلوص اور بے لوث عنصر ایسا تھا جو "برسلطنتِ جم زن" کی دشوار مگر اہم خدمت انجام دے سکتا تھا۔ چنانچہ عساکر پاکستان نے جو قوم کا صالح ترین عنصر اور ضمیر بیدار تھا، مارشل لاء کے ناظم اعلیٰ اور موجودہ صدر جنرل محمد ایوب خاں کے زیر قیادت عین وقت پر یہ کردار ادا کیا اور اس طرح تاریخ ملت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ایک ایسا دور جس نے آزادی کا احیائے ثانیہ کر کے قوم میں پھر ایک نیا ولولہ، نئی حرکت، نئی تاب و تب پیدا کر دی ہے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نئی امید بھی۔ لہٰذا جمہور اس نئے اقدام کو اپنا ہی اقدام سمجھتے ہیں، اس انقلاب کو اپنا ہی انقلاب تصور کرتے ہیں، اصلاح و تجدید کے سلسلہ میں قائدین کی ہر تدبیر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور ابتدائی دورِ مختصر کے بعد پہلی بار حکومت کو صحیح معنوں میں اپنی ہی حکومت سمجھتے ہیں۔ اسے اپنے رہنماؤں پر پورا اعتماد ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اب حکومت حقیقی معنوں میں جمہوری ہے۔ کیونکہ اس کا واحد مقصد عوام ہی کی فلاح و بہبود ہے۔ اور اس سلسلہ میں اصطلاحات کا امتیاز قطعاً بے معنی ہے۔

اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ ہمارا موجودہ انقلاب نہایت پُرسکون ہے اور حقیقی معنوں میں آیۂ رحمت۔ یہ ایک ایسا انقلاب ہے جو بغیر کسی خون خرابے کے رونما ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد نیک تھا، اس لئے کہ اس کا منشا اصلاح و تجدید اور عوام کی فلاح و بہبود کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسلئے کہ عوام اپنے سابقہ حکمراں طبقہ سے بیزار اور یوم نجات کے منتظر تھے۔ اور سب سے بڑھ کر اس لئے کہ قوم کا کوئی سنجیدہ عنصر اس کے خلاف نہ تھا۔ اور نہ ہے۔ یہ ایک ایسا انقلاب ہے جس میں ردعمل کا کوئی شائبہ نہیں جیساکہ سطحی اور ہنگامی قسم کے انقلابات میں بالعموم ہوا کرتا ہے۔ داعیانِ انقلاب نے شروع ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ مارشل لا کا نفاذ تمام تر عارضی ہے اور بہت جلد شہری نظم و نسق کو بحال کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اب اس حکمت عملی پر عملدرآمد بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ خلوصِ نیت کی بین علامت ہے۔ اس سے حکومت کے مقاصد مکمل طور پر واضح ہو جاتے ہیں۔ شکوک و شبہات دور ہو جاتے ہیں اور اس اعتماد کو تقویت پہنچتی ہے جو ہمارے دلوں میں اس کے متعلق جاگزیں ہے جنرل محمد ایوب خاں نے بار بار بالتصریح اعلان کیا ہے اور عوام کو یقین دلایا ہے کہ ان کا مقصد ایک خوشگوار فضا پیدا کرنا اور معاشرہ کو بے راہ روی سے نجات دلا کر صحیح اقدار کو فروغ دینا ہے۔ موجودہ حکومت کا مقصد عوام کی خیرخواہی اور ہمدردی ہے، وہ تعذیب و سیاست کے ایک خونیں باب کا آغاز نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لئے کسی کو بھی بے جا طور پر تعزیر و عقوبت کا تختۂ مشق نہیں بنایا گیا۔ مدعا نظم و نسق کی بحالی تھا اور معاشرہ کی کایا پلٹ۔ اس کے لائحۂ عمل سے صریحاً روشن خیالی اور بہبودئ عوام کی خواہش جھلکتی ہے۔

اس موقع پر انقلاب کی بدولت جو حیرت انگیز تبدیلیاں صادر ہوئی ہیں ان کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ ہم ان سے پہلے ہی واقف ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ حکومت نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ، وسیع، گوناگوں، دور رس اور ہمہ گیر تغیرات کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ اور جو کچھ گذشتہ سات آٹھ سال میں انجام نہیں دیا جا سکا، وہ بہت تیزی سے انجام پا رہا ہے۔ ناجائز درآمد و برآمد، نفع اندوزی، چور بازاری، اقربا پروری، بددیانتی، اور دیگر مکروہ اور سنگین مفاسد کے خلاف جو برق رفتار اقدام کیا گیا ہے اور جس طرح گرانی کے مسئلہ کو حل کیا گیا ہے: وہ خوش تدبیری اور مستعدی کی ایک بے نظیر مثال ہے۔ اسی طرح انتظامی اور دفتری نظم و نسق میں جس کارکردگی کا ارفع و اعلیٰ معیار بھی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ بیش بہا زرِ قوم اور ناجائز درآمد شدہ مال وغیرہ کی بازیابی سے ملک کی اقتصادی حالت میں جو بہتری پیدا ہوئی ہے، خصوصاً زرمبادلہ میں جو گراں قدر اضافہ ہوا ہے، نیز اناج کی ناجائز برآمد کی روک تھام سے ملک کی غذائی حالت پر جو خوشگوار اثرات مرتب ہوئے ہیں، انہوں نے ہماری ساکھ تمام ملکوں میں بڑھا دی ہے۔ ان تمام تدابیر سے قومی وقار میں اندرون و بیرون ملک جو فرق رونما ہوا ہے وہ ان تمام امور پر مستزاد ہے۔ اور بلاشبہ معرکہ آرا حیثیت رکھتا ہے۔

اس سلسلہ میں زرعی اصلاحات کے لئے کمیشن کا تقرر، جو عنقریب اپنی سفارشات پیش کرنے والا ہے اور تعلیمی امور پر توجہ دو اور نہایت اہم اقدامات ہیں۔ ایک قوم کی خوشحالی کا موثر ترین ذریعہ اور دوسرا اس کی ذہنی و ثقافتی نشوونما کا کفیل۔ اور یہ دونوں باہم گر مربوط ہیں۔ ان تدابیر سے قوم کی فکری، تہذیبی اور تمدنی زندگی سے کیا نتائج مرتب ہوں گے وہ ارباب نظر کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہیں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جب ملک میں بے اطمینانی، بدنظمی، انتشار، بدحالی اور پریشانی کا دور دورہ ہو، جب انفرادی و اجتماعی آزادی سرگرمئ عمل اور غور و فکر کی راہیں مسدود ہوں، قوتِ لایموت کے لئے دیانت دارانہ سعی و کوشش خاطر خواہ نتائج نہ پیدا کرے، تعلیم و تربیت کے لئے ذرائع و مواقع میسر نہ ہوں تو علم و ادب اور تہذیب و تمدن کے پروان چڑھنے کے لئے فضا چنداں سازگار نہیں رہتی۔ خوش گوار فضا کے ساتھ نئے نئے تصورات جنم لیتے ہیں، ذہنی پرواز کی فضائیں کشادہ ہوتی ہیں، فکر و نظر کے نئے نئے طلسمی دریچے وا ہوتے ہیں، حدیث شوق و جنوں نئے سرے سے تازہ ہوتی ہے، افق افق پر ایک نئی روشنی کھیلتی ہوئی نظر آتی ہے، قدم قدم پر نئے نئے کوندے لپکنے لگتے ہیں اور دل و نگاہ سرشاری کیف کے عالم میں نئے نئے بلند سے بلند تر مقامات تک رسا ہوتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس قدر غیر محسوس طور پر، اس قدر بے ساختگی سے ہوتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے پس و پیش ایک جہانِ دیگر دکھائی دیتا ہے۔ ایک عرصہ سے ہمارے

بعض ادبی حلقوں کو جمود کی شکایت رہی ہے۔ یہ شکایت صحیح ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ کیونکہ بسا اوقات نئے رجحانات آہستہ آہستہ پیدا ہوتے اور چپکے ہی چپکے نشو و نما پاتے رہتے ہیں۔ زندگی اور ادب و ثقافت کے دھارے کبھی چھوٹے چھوٹے زیرِ دھاروں کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ باہم مل جل کر ایک دریائے بے کراں بن جاتے ہیں۔ شاید یہی کیفیت پچھلے سات آٹھ سال بھی رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

ہمارے لئے بھرپور آزادی کی سحر اب آن کر طلوع ہوئی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر ہمارے قوائے فکر کو بھی نشو و نما کا حقیقی موقع اب ہی ملنا چاہیئے۔ نیا دور ہمارے لئے سیرِ حاصل علمی و ادبی اور فکری و ثقافتی جولانیوں کا پیغام بھی لے کر آیا ہے۔ قبل ازیں ایک مدت نامناسب حالات و ذرائع اور ساز و سامان کے فقدان کی وجہ سے صحافت بھی کافی اضمحلال کا شکار رہی ہے۔ اور ادیب و فن کار بے دلی و بے سر و سامانی میں مبتلا ہو کر تخلیقی حیثیت سے کچھ زیادہ سرگرم نہیں رہے۔ لیکن اب جب کہ دشواریوں نہیں بلکہ آسانیوں، پریشانی نہیں بلکہ آسودگی کے دور کا آغاز ہو چکا ہے، ارباب فن میں از سرِ نو جوشِ تخلیق پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ لہٰذا ہمیں ادب و فن کے میدان میں بھی نئی نئی سرگرمیوں کی امید ہے۔ جب ہم موجودہ انقلاب سے پیدا شدہ صورت حالات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں تا حدِ نظر روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ صدرِ پاکستان نے علوم و معارف کی وسیع خدمات انجام دینے والوں کی رفاہ و بہبود کے لئے جو خاص فنڈ کھولا ہے، وہ اس کی خوش آئند علامت ہے اور ادب و فن کی خدمت کے لئے بہت عمدہ اور پُر زور ترغیب ہے جیسا کہ اعلان کیا گیا ہے۔ "یہ فنڈ ان قدر دانی کے مستحق لوگوں کیلئے کھولا گیا ہے جنہوں نے پرورش لوح و قلم کے سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہوں۔ لیکن ناسازیِ حالات یا کسی اور بنا پر حصولِ معاش سے معذور ہوں۔ بلاشبہ صدرِ پاکستان کے الفاظ میں "معاشرہ ان تخلیقی فن کاروں اور ارباب قلم کا ممنون ہوتا ہے جو اپنی کوشش علوم و فنون کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اگر جسمانی معذوری یا کوئی اور وجہ ان کی تخلیقی سرگرمیوں میں سدِ راہ ہو تو ہم ان کی پوری پوری مدد کریں۔"

کیا ان شواہد کے بعد اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اب پاکستان کا مستقبل غیر معمولی طور پر تابناک ہے؟

"ہمارے بعض ایسے مسائل ہیں جن کو فوری طور پر حل کرنا ہے اور بعض ایسے ہیں جو طویل المیعاد نوعیت کے ہیں۔ ہم ان کو حل کرنے اور خرابیوں کو دور کرنے کی حتی الوسع کوشش کریں گے لیکن اس کام میں مجھے آپ کے دلی تعاون اور ضبط و تحمل کی ضرورت ہوگی۔ میں آپ سے یہ بھی کہوں گا کہ محنت سے کام کریں اور اپنی پوری کوشش صرف کریں۔ یہ وہ دور ہے جب ہماری مملکت کو تعمیر کرنے کی ضرورت ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے عوام اپنی پوری توجہ اور کوشش اس کام میں لگائیں۔"

(جنرل محمد ایوب خان: قوم سے خطاب: ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء)

اسٹائل

ممتاز حسین

خواہ آپ اسٹائل کا ترجمہ اپنی زبان میں اسلوب سے کیجئے یا طرز سے یا کسی اور لفظ سے لیکن بعض موقعوں پر جو بات کہ اسٹائل کے کہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ اسلوب یا طرز کے کہنے سے نہیں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً جب ٹینس کا ایک کھلاڑی کوئی خوبصورت ہاتھ دکھاتا ہے تو اس وقت تحسین و آفریں یا داد دہی کے موقع پر اسٹائل ہی کا لفظ زیب دیتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ فرنگیوں کا کھیل ہے اور اس کی اداؤں کی داد دہی کے لئے انہیں کی زبان کے الفاظ موزوں ترین ہوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہاں اسٹائل کا مفہوم اچھے اسٹائل یا حسنِ ادا سے ہے نہ کہ یہ مفہوم ہے کہ اچھا ہو یا برا' اسٹائل ہر اک کا ہوتا ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ انگریزی زبان میں اسٹائل کا یہ محل استعمال کچھ بلا وجہ نہیں ہے' اسٹائل کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اس کا تعلق حسنِ ادا سے ہے نہ کہ ادائے محض سے یا انفرادیت محض سے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا کہ ہر شخص کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے خواہ وہ اناڑی ہی کیوں نہ ہو جس کے خرام قلم میں کوئی حسن نہ ہو، جس کے صریر خامہ میں نالئہ سروش نہ ہو' اس کا اسٹائل کیا؟ اسٹائل انفرادیت کا مترادف نہیں ہے ہر چند کہ اس میں انفرادیت موجود ہوتی ہے۔ اسٹائل کا ایک معیار ہوتا ہے جو کہ مذاقِ سخن کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ہم ایک مخصوص عہد کے ایک مخصوص طرزِ نگارش کو بھی اسٹائل کہتے ہیں۔ مثلاً کلاسیکل اسٹائل یا موڈرن اسٹائل۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی دور کی مختلف طرزِ نگارش کو بھی کیا بہ اعتبار موضوع اور کیا بہ اعتبار تکنیک' اسٹائل کہتے ہیں مثلاً تاثر نگاری کا اسٹائل، مجرد پرستی کا اسٹائل، بیانیہ اسٹائل، رزمیہ اسٹائل وغیرہ۔ اور لطف یہ ہے کہ ایک ہی شخص بہ اعتبار موضوع اپنے اسٹائل کو بدلتا بھی رہتا ہے۔ وہ بہ یک وقت مختلف قسم کی اسٹائلوں پر قادر ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود فارسی کا جو یہ شعر ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

اس کا اطلاق اس کی ہر قسم کی تحریروں پر کیا جا سکتا ہے یعنی ہر چند کہ وہ اپنے کو اپنی مختلف اسٹائلوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے' وہ چھپ نہیں پاتا ہے۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ اسٹائل کا صرف ایک فنی معیار ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا ایک رشتہ مصنف کی شخصیت سے بھی ہوتا ہے۔

اسٹائل کے سلسلے میں یہ دونوں باتیں کتنی متضاد ہیں۔ اگر ایک طرف یہ کہنا صحیح ہے کہ ادیب کا کام اپنی شخصیت کے اظہار کرنے کا نہیں ہے بلکہ اپنے خیالات اور جذبات کو مناسب ترین اور موزوں ترین الفاظ کے ذریعے ادا کرنے کا ہے تو دوسری طرف یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ وہ نہ صرف اپنی شخصیت کے رشتے سے آزاد نہیں ہو پاتا ہے بلکہ اس کی نگارش میں جان اس کی شخصیت ہی کے رشتے سے پیدا ہوتی ہے۔ صحیح لکھنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جو چیز کہ لکھی گئی ہے وہ موثر دلنشیں اور جاذب بھی ہے، اور اگر اسے بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اثر آفرینی اور دلنشینی کی بھی تکنیک ہوتی ہے' تو پھر ایک شے الفاظ کی شعلہ فشانی، سرخی اور گرمی بھی ہوتی ہے، وہ کیفیت الفاظ میں شخصیت ہی کے اکتساب نور سے پیدا ہوتی ہے۔

اول الذکر صورت میں ادیب کی شخصیت غیر اہم اور اس کی فنکارانہ کوشش ہی اہم ہے لیکن آخر الذکر صورت میں اس کی شخصیت ہی اہم ترین قرار دی جا سکتی ہے' اب سوال یہ ہے کہ ہم ان دونوں متضاد چیزوں کو کیونکر ایک دوسرے سے ہم آہنگ کریں؟ وجود جملہ اشیاء بہ ضد است۔ ہمیں اس کے تضاد سے گھبرانا نہیں چاہیئے، دیکھنا یہ ہے کہ آرٹ یا شعر و ادب کیونکر وجود میں آتا ہے، یہ پیدا ہی ہوتا ہے" اس نفسیاتی کش مکش سے جو کہ فنکار میں اس کے ماحول کے تضاد سے پیدا ہوتی ہے، فن کار کے پاس پکے پکائے ہوئے خیالات اور بنے بنائے ہوئے جذباتی سانچے موجود نہیں ہوتے ہیں کہ اس کے سامنے مسئلہ صرف ان کے اظہار کا ہو۔ فن اس کی شخصیت کے اظہار کا اتنا ہی اہم ایک مظہر ہے جتنا کہ اس مظہر کو مناسب اور موزوں ترین الفاظ کے جامہ پہنانے کا ایک اہم کارنامہ۔ ایسی صورت میں اصل مسئلہ شخصیت کو فن سے خارج کرنے کا نہیں' جیسا کہ ایلیٹ کا خیال ہے، بلکہ شخصیت کو فن کے تابع کرنے کا ہے۔ ہاں ایسا ضرور ہے کہ

ایسی صورت میں اس کی شخصیت اتنی اہم نہیں رہ جاتی ہے جتنا کہ اس کا فن۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی درست نہ ہوگا کہ اس کی شخصیت غیر اہم ہو جاتی ہے، نہ صرف اس رعایت سے کہ فن کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ فن تو صرف اس کی ایک شعوری کوشش کا نتیجہ ہے، جسے وہ اوپر سے عاید کرتا ہے۔ ورنہ اصل میں تو اس کی شخصیت ہی بولتی ہے ؎

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

اس رشتے کو ابھارنا اس لئے ضروری تھا کہ اسلوب میں جو انفرادیت پیدا ہوتی ہے، وہ شخصیت ہی سے اثر پذیر ہوتی ہے ورنہ فن تو قوانینِ حسن کے تابع ہے، جس کا ایک خارجی معیار ہوتا ہے اور اسے کوئی بھی شخص حاصل کر سکتا ہے اور اس صورت میں ایک فنکار کے اسلوب کو دوسرے فنکار کے اسلوب سے پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔ اور یہ کہنا غلط ہے کہ ایک ہی شے کے بیان کرنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، اور اگر ہو بھی تو اسلوب اس سے نہیں پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف طریقوں میں سے کسی نے کوئی ایک طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ یہ کسی منشی کے لئے صحیح ہو تو ہو فنکار کے حق میں صحیح نہیں ہے، اور چونکہ ہم اسٹائل کی بات محرروں اور منشیوں کے رابطے سے نہیں کر رہے ہیں بلکہ فنکار، شاعر اور ادیب کے رابطے سے اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ بھی انہیں اس موقع پر نظر انداز کریں گے۔ یہ بات اور بھی زیادہ یوں صاف ہو سکتی ہے کہ ہم کسی شاعر یا ادیب کے اسٹائل کو اس کے خیالات اور جذبات کی قسموں سے نہیں بلکہ اس کے طریقِ فکر اور اس کی آواز یا لب و لہجے سے پہچانتے ہیں، اسلوب کی انفرادیت خیال یا جذبات کی انفرادیت سے نہیں بلکہ طریقِ فکر اور آواز کی انفرادیت سے پہچانی جاتی ہے، ایک انسان دوسرے انسان سے اپنی شکل و صورت وغیرہ کے امتیازات کے علاوہ اپنے ایگو کی تفریق سے بھی پہچانا جاتا ہے جو اس کے طریقِ فکر اور افتادِ طبیعت کو متعین کرتی ہے۔ اسلوب میں انفرادیت اسی ایگو کے طریقِ فکر، جذباتی افتاد اور ذوقِ احساس کی انفرادیت سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک لفظ میں اسی کو شاعر کی آواز کہتے ہیں جو کہ اس آواز سے مختلف ہوتی ہے جس سے کہ آپ اپنے کسی دوست کو پہچانتے ہیں ؎

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

ہم اس پر بحث آگے کریں گے کہ میرؔ کی وہ آواز کیا ہے۔ فی الحال تو اسی کو ذہن نشین کرانا ہے کہ اسلوب اس سے پیدا نہیں ہوتا ہے کہ ایک ہی بات کے کہنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، شاعر یا ادیب ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیتا ہے، یا یہ کہ کسی کی تقلید میں اسلوب پیدا ہو سکتا ہے، اسلوب طریقِ فکر کی انفرادیت سے پیدا ہوتا ہے، اور وہی انفرادیت اس کے اندازِ بیان کو بھی منفرد کر دیتی ہے۔ غالبؔ کا جو اندازِ بیاں اور ہے تو اس کا بھی مطلب وہی ہے کہ ان کا طریقِ فکر ہی منفرد تھا۔ ان کے منفرد ایگو کا ایک مخصوص اسلوبِ فکر تھا جو کہ غالبؔ کی نشاندہی کرتا ہے۔ یوں تو ہر آدمی سوچتا ہے لیکن مفکر ہر ایک نہیں ہوا کرتا ہے، اسلوب مفکر کا ہوا کرتا ہے نہ کہ ہر آدمی کا یا کہ ہر منشی کا۔

استاد ذوقؔ استادِ شاہ بھی تھے اور ہر فن میں طاق بھی تھے، لیکن وہ اپنا کوئی اسلوب پیدا نہ کر سکے، معلوم نہیں آپ میرے اس خیال سے کہاں تک متفق ہوں گے، لیکن مجھے تو یہ کہنا ہی پڑے گا، کیونکہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہر کس و ناکس، اسلوب نہیں ہوا کرتا ہے، تو پھر مجھے تو کچھ شعراء کو چھانٹنا ہی پڑیگا۔ لیکن اس چھانٹی کا اصول بھی مقرر کرنا ہوگا۔ شروع میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس راہ میں صرف استادی کام نہیں آتی ہے، اس کے لئے ایک شخصیت اور پھر اس کا ایک مخصوص اسلوبِ فکر درکار ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ استاد ذوقؔ کے پاس کوئی شخصیت نہ تھی تو شاید آپ اور بھی زیادہ خفا ہو جائیں گے۔ اس لئے فی الحال یہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ وہ سوچتے تو تھے لیکن سوچنے کا کوئی مخصوص اسلوب نہیں رکھتے تھے۔ جیسے ہمارے، مدرسین سوچتے تو ہیں لیکن وہ سوچنے کا کوئی اسلوب نہیں رکھتے ہیں۔ نوٹس بنا کر سوچنے اور سوچنے کی صلاحیت کو فروغ دینے میں بڑا فرق ہے۔ تا وقتیکہ فکر کا مادہ بالطبع شاعر میں نہ ہو، وہ کوئی اسلوبِ فکر پیدا نہیں کر پاتا ہے۔ استاد ذوقؔ کے یہاں شاید کچھ اسی شے کی کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ اور کیا عجب جو اس کا احساس انہیں بھی رہا ہو۔ آزادؔ مرحوم سے معذرت کے ساتھ ؎

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

رہ گئی شخصیت کی بات تو اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ میں اسے بھی اسٹائل کی طرح ایک مثبت شے تصور کرتا ہوں یا تو آدمی کے پاس شخصیت ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی ہے۔ شخصیت کے مدارج ہو سکتے ہیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس شے کے نہ ہوتے ہوئے بھی کسی شخص میں شخصیت پائی جائے جس سے کہ ہم شخصیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ شخصیت کی وہ بنیادی شے کیا ہے جس کے پائے جانے میں شخصیت کا اطلاق کیا جاتا ہے اور جس کے نہ پائے جانے میں شخصیت کا اطلاق نہیں کیا جاتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اسے زیر بحث لاؤں، اسے ذہن نشین کر لیجئے کہ شخصیت انفرادیت کے مترادف نہیں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ اسلوب انفرادیت کے مترادف نہیں ہے۔

علم النفس کے مطابق شخصیت منظم ہوتی ہے ایگو یا خودی کے گرد، اور ایگو کی تعریف خود نگری اور خود گری ہی نہیں ہے بلکہ اپنی محافظت بھی ہے، کسی بھی انسان میں کیریکٹر ایگو کی اسی مدافعت سے پیدا ہوتا ہے، کیریکٹر شخصیت کی ضد نہیں ہے جیسا کہ ہربرٹ ریڈ ہمیں بتانا چاہیں گے بلکہ شخصیت کا جزو اعظم یا اس کا سنگ بنیاد ہے، کیریکٹر کے بغیر کوئی شخصیت نہیں ہوا کرتی ہے، اور کیریکٹر کے یہ معنی نہیں ہے کہ وہ اٹل اور ہٹس ہو۔ اس میں کوئی لچک اور کوئی بہاؤ نہ ہو، وہ ہر طرف جھکتا ہے اور اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرتا ہے، لیکن وہ اپنے مرکز ثقل سے ہٹتا نہیں ہے۔ اس میں ایک پبندی ہوتی ہے جو کہ شخصیت میں وزن پیدا کرتی ہے، اور اس کی ترقی میں وقار پیدا کرتی ہے اور شخصیت کا یہ معیار نہ صرف عام انسانوں کے بارے میں صحیح ہے بلکہ فن کار، ادیب اور شعراء کے بارے میں تو خاص طور سے صحیح ہے، کیونکہ اگر فن اس کے ایگو کے کشمکش کا نتیجہ ہے جو کہ وہ اپنے ماحول کے بالمقابل محسوس کرتا ہے تو پھر اس کی کش مکش کا وزن تو اسی وقت محسوس کیا جا سکتا ہے جبکہ وہ اس کش مکش میں کسی جگہ پر کھڑا ہو۔ ادب کسی حقیقتِ مطلق یا کسی ازلی صداقت کی دریافت نہیں ہے۔ کہ اس میں دریافت کرنے والے کی شخصیت بے معنی ہو جائے اور ہم یہ کہہ سکیں کہ ہمیں دریافت سے دلچسپی ہے نہ کہ دریافت کرنے والے کی شخصیت سے، یہ تو صرف اس دکھ درد کی کہانی ہے جو کہ شاعر یا ادیب اپنے ماحول کے تصادم میں محسوس کرتا ہے اور اسے قبول کرنے یا نہ کرنے یا تبدیل کرنے کا رویہ اختیار کرتا ہے، اس ادب کی زندگی تمام تر فنکار کی داخلیت میں ہے اور اس کا حسن اسے خارجی نقطۂ نظر سے بیان کرنے میں ہے۔ اور وہ اپنے اس طریق کار سے جس عالمگیر صداقت یا (RELATIVE CONSTANT) اضافی دائمیت تک پہونچتا ہے اس میں اس کا نفس ایک حصہ لینے والے، جانب دار فاعل کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ کسی بھی فنکار کے فن کو سمجھنے کے لئے اس کی شخصیت کا مطالعہ اسی لئے اہم ہوتا ہے کہ وہ اس کے مصدرِ شخصیت سے صادر ہوتا ہے لیکن اگر شخصیت میں کوئی مرکز ثقل نہ ہو تو پھر اسے ہم کیونکر جانچ سکتے ہیں، جذبات کی گہرائی ہو یا شخصیت کی پہنائی، ان دونوں ہی کو ہم اس وقت جانچ سکتے ہیں جب کہ ہمیں اس کے کسی مستقر کا علم ہو۔ ان حالات میں یہ کہنا صحیح ہے کہ شخصیت اسی کے پاس ہوتی ہے جس کے پاس کیریکٹر یا نشستِ مدافعت ہو۔ صرف اسی حالت میں اس کے تجربات ایک انفرادیت اختیار کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کیریکٹر نہیں بلکہ چال چلن (CONDUCT) اچھا یا برا ہوا کرتا ہے، کہ کیریکٹر یا تو ہوتا ہے یا پھر نہیں ہوا کرتا ہے، اور یہاں ہم شاعر یا ادیب کے کیریکٹر سے بحث کر رہے ہیں نہ کہ اس کے چال چلن سے، اب ایک جزوی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیریکٹر شخصیت کے مترادف ہے؟ نہیں۔ کیریکٹر تو صرف اس کی شخصیت کا سنگ بنیاد یا مرکز ثقل ہوتا ہے جس کے گرد اس کی شخصیت نمو کرتی ہے بشرطیکہ اسے اپنی شخصیت کے فروغ دینے کا موقع ملے، ہاں شخصیت کو آپ منفرد انسانیت (INDIVIDUALIZED HUMANITY) کا نام دے سکتے ہیں، یعنی اس میں احترام نفس کے ساتھ احترام انسانیت بھی ہوتی ہے، اور یہ ایک ایسی شے ہے جس کا معیار تکمیل شخصیت کے مادی اور روحانی وسائل کے مطابق ہر زمانے میں بدلتا رہے گا، انسان کی شخصیت کے ارتقا کی کوئی حد اور منزل نہیں ہے۔ اب ہم اس جگہ پہنچے ہیں جہاں شخصیت کی خودی (EGOISTIC CHARACTER) ہی اہم نہیں ہے بلکہ اس کی غیر خودی (ALTRUISTIC CHARACTER) یا انسانیت بھی اہم ہے۔ یہاں ہم پھر ایک نئے تضاد سے دوچار ہوتے ہیں کیونکہ خودی غیر خودی سے بغیر کسی تصادم کشمکش اور تناقض کے ہم آہنگ نہیں ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح کہ ایک بڑا فن کار اپنے اظہار شخصیت اور فن کے مطالبات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی خودی اور غیر خودی کے درمیان بھی ایک ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور جو شخص کہ توازن پیدا نہیں کر پاتا ہے اس کی شخصیت پارہ پارہ اور منتشر ہو کر رہ جاتی ہے، شعراء اور فنکار کی فہرست ہر زمانے میں بڑی طویل ہوا کرتی ہے لیکن ان میں سے شاعر اور فنکار یہی بقول غالب دو ڈھائی ہی نکلا کرتے ہیں، غالب تو شیفتہ کو بھی بہ حیثیت شاعر قبول کرنے میں تامل کرتے تھے، کیونکہ کبھی کبھی ان کی بھی ٹھیک نکل جایا کرتی، تو عرض یہ ہے کہ یہ لفظ ٹھیک بڑا مناسب لفظ ہے، اس میں شخصیت کی ٹھیک اور فن کی ٹھیک دونوں ہی کا اشارہ ہے۔ کلام لچلچا صرف اسی وقت نہیں ہوتا ہے جب کہ بندش میں سستی اور الفاظ میں دروبست نہ ہو بلکہ اس وقت بھی ہوتا ہے جبکہ شخصیت میں گٹھاؤ اور ٹھیک نہیں ہوتی ہے، آرٹ میں مسئلہ صرف کہنے یا صرف ابلاغ کا نہیں ہے۔

بلکہ جذباتی قوت کے ساتھ کہنے کا ہے، اس کی تحریر میں کبھی بھی اسٹایل نہیں ہوتا ہے جس میں جذباتی قوت نہ ہو' اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ خطابت سے لازمی طور سے اسٹائیل پیدا ہوتا ہے۔ خطابت تو جذباتی قوت کا ایک برا بدل ہے۔ یہ شے اپنی شخصیت کے مستعار جاموں (MANNERISM) کو اتارنے اور اپنی آواز کو پلنے سے پیدا ہوتی ہے، واعظ کے لہجے سے گزر کر آدمی کے لہجے میں بات کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی اصل شخصیت وہیں اجاگر ہوتی ہے جبکہ وہ آدمی کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ میر تقی میر کی آواز کو پہچاننا اسی لئے مشکل ہو گیا ہے کہ انہوں نے جوگی کا سوانگ بھرا۔ وہ ان کی اصل شخصیت پر کچھ اس طرح مستولی ہو گیا کہ بالعموم ان کی اسی آواز کو لوگ میر تقی کی آواز سمجھنے لگے ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

یہ صحیح ہے کہ بے نیازی اور استغنا ان کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے لیکن ان کی دردمند آواز کی صرف یہی ایک لے نہیں ہے۔ ایک لے وہ بھی ہے جس کا تعلق ان کے اپنے احترام نفس سے ہے ؎

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں   کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

تاوقتیکہ ان کی شخصیت کی اس پیچیدگی کو ہم سامنے نہ رکھیں جو ان کے احترام نفس اور احترام آدمیت کے درمیان ایک توازن کا رشتہ قائم کرتی ہے ہم ان کی آواز کو پہچاننے میں غلطی بھی کر سکتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری بڑے میر پرست ہیں لیکن ایک بار ان سے بھی غلطی ہو ہی گئی ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر   مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اس شعر کو انہوں نے میر تقی میر سے منسوب کر دیا۔ اور یہ بھول گئے کہ یہ لہجہ تو لکھنؤ اسکول کی شاعری کی مخصوص نسائیت کا حامل ہے۔ میر ستم دیدہ کے لہجے میں ایسی کوئی بھی نسائیت نہیں ہے۔ وہ اظہار شکست کرتے بھی ہیں تو ان کے لہجے میں ایک مردانگی ہوتی ہے ؎

بارے کل بھڑ گئے اس ظالم خونخوار سے ہم   منصفی کیجے تو کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا

"کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا": یہ ہے میر کا لہجہ نہ کہ "مقابلہ تو نہ دلِ ناتواں نے خوب کیا"۔ میر زخمی ہوتے ہیں، قتل ہوتے ہیں، لڑتے بھڑتے ہیں اور بے حمیت ہو کر بھی جاتے ہیں ؎

آج پھر تھا بے حمیت میر واں   کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

لیکن نہ تو وہ اپنی آن بان میں فرق آنے دیتے ہیں اور نہ ان کے لہجے میں نسائیت پیدا ہو پاتی ہے۔ دردمندی کی آواز اور نسائیت کے لہجے میں بڑا فرق ہے ؎

سخن کی نہ تکلیف ہم سے کرو   لہو ٹپکے ہے اب شکایت کے بعد

اصل شخصیت میر کی یہ ہے جو کہ کبھی کبھی اس قدر بلند بانگ بھی ہو جاتی ہے ؎

میں کون ہوں اے ہمنفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جوں* شعلہ فشاں ہوں

یہ جو ایک مثال میں نے اسلوب کی شناخت سے متعلق دی ہے اور اس کی انفرادیت کو شخصیت کے آئینے میں دکھلایا ہے تو وہ کچھ بے وجہ نہیں ہے۔ اسلوب کو افکار اور جذبات کی نوعیت سے نہیں بلکہ شخصیت کے رشتے سے پہچانا جاتا ہے' اسلوب اس نقش کا نام ہے۔ جو کہ شخصیت تحریر میں چھوڑتی ہے، یہ اس کے منفرد اندازِ فکر، اس کی منفرد افتادِ طبع اور اپنے سلیقے سے زندگی کے نبھانے سے پیدا ہوتی ہے اور اپنے اس نقش کو انسان اس وقت مرتسم کرتا ہے جبکہ وہ اندازِ بیان کے تمام مستعار اسلوبوں سے درگزرتا ہے۔ بہترین اسٹایل اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ اپنی اسٹایل سے بے خبر اور اپنی شخصیت سے باخبر ہوتا ہے۔ لیکن اسٹایل جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا' تمام تر شخصیت ہی کی شے نہیں ہے' اس کا کچھ تعلق ابلاغ کے فن سے بھی ہے جس کا ایک معیار ہوتا ہے' جو کہ زمانے کے مذاق کے ساتھ بدلتا بھی

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

---

* ہمارے خیال میں یہ مصرع یوں ہے: 'اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں'۔ لیکن مضمون نگار کو اصرار ہے کہ 'جو' کی بجائے 'جوں' لکھا جائے۔ اس لئے ہم نے اسے بجنسہ رہنے دیا ہے (مدیر)

تذکرۂ رفتگاں:

اشک رامپوری

فضل احمد کریم فضلی

کئی سال کی بات ہے میں اس زمانے میں ڈھاکے میں تھا۔ کسی کام سے کراچی آیا ہوا تھا۔ مولانا ماہر القادری سے ملاقات ہوئی۔ انہیں جہاں اللہ نے اور بہت سی خوبیاں عطا فرمائی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ انہیں دوسروں کے اچھے اچھے شعر بہت یاد رہتے ہیں اور وہ احباب کو بڑے شوق سے سنایا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ایک شعر سنایا ؎

میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ
آپ للہ چلے جائیے میخانے سے

میں شعر سن کے اچھل پڑا۔ بڑی دیر تک اس کی گوناگوں لطافتوں سے ہم لطف اندوز ہوتے رہے۔ میں نے پوچھا شعر کس کا ہے۔ کہنے لگے ایک صاحب ہیں اشک رامپوری۔ اس سے پہلے میں نے اشک صاحب کا نام نہ سنا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ جو شخص ایسا اچھا شعر کہہ سکتا ہے وہ گوشۂ گمنامی میں کیسے پڑا ہوا ہے۔ حالات دریافت کئے معلوم ہوا کسی زمانے میں رند لاابالی تھے، اب فقیر گوشہ گیر ہیں اور راولپنڈی کی کسی خانقاہ میں رہتے ہیں۔ ان کے یہ مختصر حالات سن کے ان سے ملنے کا اشتیاق زیادہ ہوا۔ لیکن کہاں ڈھاکہ کہاں راولپنڈی۔ دل میں شوق ملاقات لئے ہوئے ڈھاکے واپس گیا۔

قدرت کا کرنا کچھ ایسا کہ چند روز کے بعد میرا تقرر راولپنڈی کا ہو گیا۔ وہاں پہنچا اشک صاحب کے متعلق دریافت کیا۔ معلوم ہوا کوئی مقام ہے گولڑہ۔ وہاں کا راستہ ایسا اللہ کا سنوارا ہے کہ وہاں پہنچنا بھی ایک طرح کا جہاد کرنا ہے۔ الغرض ملاقات تو نہ ہو سکی البتہ غائبانہ تعارف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ مشترک احباب بھی مل گئے۔ ان کے ذریعہ سے سلام و پیام آتے جاتے رہے۔ ایک دن ایک دوست کے یہاں دیکھا کہ ایک صاحب جو وضع قطع سے ملا بھی نہیں بلکہ ملیٹے معلوم ہوتے ہیں، بیٹھے ہوئے ہیں۔ کندھے پر بڑا چار خانے والا رومال پڑا ہوا ہے، ڈاڑھی ایک مشت چار انگل سے بھی آگے قدم بڑھائے ہوئے ہے۔ ہونٹ باچھوں تک پان سے رنگین ہیں۔ بلکہ ریش مبارک کا بھی معتد بہ حصہ پان خوردہ ہے۔ معلوم ہوا حضرت اشک یہی ہیں۔ جی تو میرا بے اختیار چاہا کہ لپٹ جاؤں لیکن ان کی وضع قطع سے جھجکا۔ وہ بھانپ گئے اور انہوں نے خود بڑھ کے میرا شوق پورا کیا۔ اس وقت سے جو میری نیاز مندی کا سلسلہ شروع ہوا وہ بحمد اللہ بڑھتا ہی گیا۔ اور وہ اکثر مجھے شرف میزبانی عطا فرماتے رہے۔

ان لوگوں کی زبانی جو ان کی پہلی زندگی دیکھ چکے تھے، معلوم ہوا کہ حضرت اشک کسی زمانے میں مسٹر واجد علی خاں عرف اچھن صاحب کہلاتے تھے۔ بڑے بانکے چھبیلا تھے۔ بڑی آن بان تھی، بڑے ٹھاٹ ماٹ، بڑے کر و فر۔ ٹاپ ہیٹ اور فراک کوٹ وغیرہ میں ملبوس ایک دو سال نہیں بلکہ چودہ برس انگلستان اور جرمنی میں گذار چکے تھے۔ اپنے عہد کے نوجوانوں میں ان سے زیادہ خوش پوش، خوش باش شاید ہی کوئی رہا ہو۔ قیمتی سے قیمتی لباس اور قیمتی سے قیمتی چیزیں ان کے استعمال میں رہتیں۔ جدید ترین فیشن کا وہ معیار تھے اور انہیں دیکھ دیکھ کے لوگ فیشن اختیار کرتے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم والئی رامپور کی اولاد میں سے تھے۔

اشک صاحب کا ظرف ملاحظہ ہو کہ اگرچہ وہ مجھ سے بہت قریب آ گئے تھے۔ لیکن کبھی انہوں نے بے خیالی میں بھی ایک حرف ایسا اپنی زبان سے نہ نکالا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ امیرانہ زندگی بھی گذار چکے ہیں۔ اگر کوئی ذکر بھی کرتا تو ہنس کے ٹال جاتے، اور کوئی دوسرا ذکر شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ ان کے اصرار پر گولڑے جانا ہوا۔ حضرت اشک کی جائے سکونت دیکھی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ سامان صرف ایک پلنگ، ایک پرانی دری اور ایک مٹی کا گھڑا، اور وہاں ایک کھونٹی بھی جس پر ان کے معدودے چند کپڑے ٹنگے تھے۔ تھوڑی دیر میں خانقاہ کے لنگر خانے سے

کھانا آگیا۔ کھانا کیا تھا خمیری روٹی اور سالن جیسا لنگر خانوں سے ملتا ہے۔ وہیں دری پر بیٹھ کے ہم لوگوں نے کھایا۔ اشک صاحب اس طرح خوش خوش کھا رہے تھے جیسے رامپور کے رئیسانہ دسترخوان پر بیٹھے الوان نعمت کھا رہے ہیں۔ زندگی کی مشکلات کو اس خوشی سے جھیلنا کہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ وہ مشکلات سے دوچار بھی ہیں۔ اشک صاحب کا بڑا کمال تھا۔

باوجودیکہ ان کی ظاہری زندگی میں اتنا عظیم انقلاب آگیا تھا۔ لیکن دل سے وہ اب تک ویسے ہی رندلا اُبالی تھے جیسے کہ پہلے تھے۔ دل کی شگفتگی چہرے سے بھی ٹپکی پڑتی تھی۔ اور باتوں سے بھی زہد کی خشکی اور یبوست ان کے پاس پھٹکی تک نہ تھی۔ ہر وقت خوش نظر آتے تھے۔ جن دنوں جگر صاحب تشریف فرما ہوتے اور رنگی کا ذکر لگتا تو اس میں بھی اشک صاحب برابر کے شریک ہوتے اور گھنٹوں زور آزمائی کیا قسمت آزمائی کیا کرتے۔ کبھی جگر صاحب کو فلش کا شوق چراتا تو اس میں بھی وہ بند نہ تھے مگر ساتھ شغل و ذکر اور چلہ کشی بھی جاری رہتی۔ چالیس چالیس دن کے چلّے تو معلوم نہیں کتنے کھینچ چکے تھے۔

کچھ عرصہ ہوا خبر ملی تھی کہ چودہ مہینے کا چلّہ کر بیٹھے ہیں۔ کیا حوصلہ تھا! اللہ اکبر!

وہ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے۔ تحت اللفظ پڑھتے۔ سخندانوں کی محفل ہو تو پھر یہی وہ نظر آتے۔ کچھ عرصہ ہوا میرے اصرار پر کراچی تشریف لائے۔ یہاں کے چند مشاعروں میں شریک ہوئے تو اس طرح کہ سب پر چھا گئے۔ سامعین نے بہ اصرار کئی کئی غزلیں سنیں اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ غالباً ان سے بڑا اس وقت کوئی اور فن شعر میں دستگاہ رکھنے والا نہ تھا۔ اپنا کلام کبھی محفوظ نہ رکھتے۔ میرے بار بار کہنے سے وہ کلام جمع کرنے پر راضی ہوئے اور اپنی کچھ غزلیں اپنے شاگردوں کو لکھانی شروع کیں۔ جب کراچی تشریف لائے تو اپنے ساتھ پچاس ساٹھ غزلوں کا تحفہ بھی لائے۔ اور میرے حوالے کر گئے۔ فرماتے کچھ اور غزلیں ان کے شاگردوں کے پاس راولپنڈی میں ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ سب کلام یکجا ہو جائے۔ اور اس کی معقول اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

مہینے ڈیڑھ مہینے ہوئے ان کا ایک خط ملا جس میں یہ خبر وحشت اثر لکھی تھی کہ ڈاکٹروں نے ان کے پھیپھڑوں میں کینسر تشخیص کیا ہے۔ اور وہ اپریشن کرنے والے ہیں۔ میں نے لکھا کہ خدا کرے یہ تشخیص غلط ہو۔ انہوں نے پھر اطلاع دی کہ ڈاکٹروں کو اپنی تشخیص پر اعتماد ہے۔ اور اپریشن عنقریب ہونے والا ہے۔ ایک دوست نے اطلاع دی کہ اپریشن ملتوی کر دیا۔ کیونکہ اشک صاحب ابھی کمزور ہیں انہیں قوت کی دوا دی جا رہی ہے۔ یکایک گذشتہ جمعہ کی صبح کو ان کے انتقال پر ملال کی خبر آئی۔ ان کے ایک عزیز شاگرد کے خط سے یہ تفصیل معلوم ہوئی کہ گذشتہ جمعرات کو ان کا اپریشن ہوا۔ بارہ بجے دن سے ساڑھے تین بجے شام تک اپریشن ہوتا رہا۔ ڈاکٹروں نے لکھا کہ اپریشن کامیاب ہوا۔ آٹھ بجے ہوش آجائے گا۔ لیکن پانچ بجے شام کو ان کے دل کا دھڑکنا بند ہو گیا۔ اس طرح نہ صرف ایک بڑا شاعر اٹھ گیا۔ بلکہ ایک بڑا انسان بھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

چاک داماں اور چاک گریباں کا مضمون کس قدر پائمال ہے لیکن دیکھئے اشک صاحب نے اسے کتنا نیا بنا دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اب وحشت میں
ہائے دامن نہ ہوا ہائے گریباں نہ ہوا

محاورے کے برمحل استعمال سے شعر میں بڑا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ اشک صاحب کے کلام میں یہ لطف بہت ہے لیکن جیسا مندرجہ ذیل شعر میں محاورے کا انہوں نے بھرپور استعمال کیا ہے ویسا بہت کم میری نظر سے گذرا ہے ؎

خامئ وحشت نہ کر زنداں میں اتنا شرمسار
سر نہیں اٹھتا مرا دیوار و در کے سامنے

چند اور شعر ہیں ؎

ان کا وہ دورِ جوانی ان کی وہ کافر نگاہ
جس طرف آنکھ اٹھ گئی ہے کہہ گئی جام آگیا

ماہِ نو، کراچی - دسمبر ۱۹۵۸ء

روزِ ازل ملا بھی تو کیسا ہم کو زادِ راہ
اک زندگی جو باعثِ شرمندگی رہی
جس سے نباہ کر کے چلے ہم تہِ زمیں
اس خلق کا یہ حال کہ منہ دیکھتی رہی
اک وہ کہ خود بلانے گئے بزمِ ناز میں
اک ہم کہ اپنے آپ کو سمجھا کے رہ گئے

"اپنے آپ کو سمجھا کے رہ گئے" کی کیا داد دی جا سکتی ہے۔ اس ایک ٹکڑے میں ایک جہانِ معنی سمٹ آیا ہے۔
ایک داغ کے رنگ کا بھی شعر ملاحظہ ہو۔ یہ رنگ بھی اشک صاحب کے کلام میں جا بجا پایا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

للہ یہ تو آپ کسی دن بتائیے
کے دور اور وعدۂ فردا کے رہ گئے

اب ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہ گزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں
اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھئے
میری نظر کہیں ہے تو ان کی نظر کہیں
ان ہمدموں کی کارگزاری نہ پوچھئے
دل سے بنا بنا کے اِدھر کی اُدھر کہیں
اے راز داں یہ سب ترے کہنے کی بات ہے
رکھتے ہیں ورنہ کان بھی دیوار و در کہیں

یہاں "سب ترے کہنے کی بات ہے" نے کیا مزہ دیا ہے اور کیا معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ مقطع ہے ؎

اس نکتہ چیں کو حال سنانے چلے تو اشک
اپنی زباں جواب نہ دے وقت پر کہیں

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

سرحد کا پہلا اردو شاعر

(معز اللہ خان افغان)

خیال آفاقی بخاری

اردو زبان کہاں اور کیسے پیدا ہوئی، یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے جس کے حل کرنے کے لئے ابھی بہت تحقیق اور تدقیق کرنی پڑے گی۔ پہلے تو دکن، دلی، لکھنؤ اور اودھ کو اس کی جائے پیدائش اور گہوارہ ہونے کا دعویٰ تھا۔ بعد میں پنجاب بھی اس دعوے میں شامل ہو گیا۔ مگر برصغیر ہند و پاکستان کے شمال مغربی گوشے میں ایک علاقہ اور بھی ہے۔ جو اس بات کا دعویدار ہے۔ کہ اردو زبان نے اسی کے میدانوں میں جنم لیا، اسی کے آغوش میں پرورش پائی۔ اور جب یہ زبان کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی۔ تو وہ برصغیر کے حصوں تک پہنچ گئی۔ بلکہ اس علاقہ کے رہنے والوں نے ہی اپنی تلواروں کی جھنکار اور علم و فضل کے بیش قیمت خزانوں کے ساتھ اسے وہاں تک پہنچا دیا۔ اور پھر وہاں کے شاہنشاہوں، تاجداروں، نوابوں اور امیروں کی سرپرستی میں اپنی بھرپور جوانی کو پہنچی۔

دریائے سندھ کے اس طرف رہنے والوں کے متعلق اہل ہند (غیر تقسیم شدہ) کا یہی خیال رہا ہے کہ وہاں افغان یا پختون بستے ہیں۔ جو پختو یا پشتو زبان بولتے ہیں۔ اور دوسری زبانوں میں زیادہ سے زیادہ فارسی بول لیتے ہوں گے، مگر حقیقت یہ ہے کہ "اباسین" کے اس طرف رہنے والے زمانۂ قدیم سے ایک اور زبان بھی بولتے آئے ہیں۔ جو زمانۂ قدیم کے رواج کے مطابق اس دریا کے نام پر "ہندکو" کہلاتی ہے۔ ہند دراصل سند یا سندھو دریا ہی کا نام ہے۔ (ہند میں سنسکرت کا (س)، (ہ) سے بدل جاتا ہے)۔ کہا جاتا ہے کہ اسی "ہندکو" نے اردو کو جنم دیا۔ اس نظریہ کی تائید یا مخالفت میں جو بھی کہا جائے، تاہم وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سرحد (سابقہ) نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے وہ دکن، دلی یا لکھنؤ سے کچھ کم نہیں۔

ابتک یہاں کے شعراء میں قاسم علی افریدی اور حیدر پشاوری وغیرہ کو اردو کے قدیم ترین شعراء خیال کیا جاتا تھا۔ ان میں قاسم علی خاں نسلاً افریدی تھا۔ مگر اس کے آبا و اجداد اپنے وطن (اخور ضلع کوہاٹ) کو خیرباد کہکر یوپی چلے گئے تھے۔ اور وہاں لکھنؤ کے قریب "کوہاڑ" نامی ایک قصبہ میں مستقل طور پر بود و باش اختیار کر لی تھی۔ قاسم علی خاں وہیں پیدا ہوئے اور تقریباً ساری عمر وہیں گذار دی۔ قاسم علی کا زمانۂ حیات ۱۷۶۳ء سے ۱۸۳۲ء تک بتایا جاتا ہے۔ چونکہ وہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں یوپی کے مختلف شہروں میں رہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے کلیات کو (جو پختو، فارسی اور اردو زبانوں میں ہے) فرخ آباد میں ۱۲۳۷ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا، جیسا کہ ان کے کلیات کے قلمی نسخہ پر لکھی ہوئی تاریخ سے ظاہر ہے۔ (یہ نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری کی ملکیت ہے۔ اور پشتو اکیڈیمی اسے شائع کرنے کے انتظامات کر رہی ہے)

حیدر پشاوری کے کلام کے دستیاب شدہ اوراق سے پتہ چلا ہے کہ ان اوراق (جو غالباً اسی دیوان کا ایک حصہ ہیں) کی تاریخ تحریر محرم ۱۲۱۶ھ ہے[1]۔ ظاہر ہے کہ قاسم علی کی زبان یوپی میں خوب منجھ گئی اور حیدر پشاور کے رہنے والے تھے۔ پشاور میں "ہندکو" کی ایک ترقی یافتہ شکل مروج ہے۔ جو اردو کے بہت قریب ہے۔ اسی لئے ان دونوں قدیم شعراء کی زبان بہت صاف، شستہ اور منجھی ہوئی ہے۔ اور الفاظ و محاورات کے لحاظ سے ولی دکنی سے بہت بعد کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ مگر آج ہم سرحد کے جس اردو شاعر کا تعارف کرا رہے ہیں وہ نہ صرف صحیح معنوں میں ولی کا ہمعصر تھا۔ بلکہ اس کی زبان بھی خالص اسی وقت کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

یہ گمنام مگر قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر معز اللہ خاں مہمند ہے [illegible] کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں "کوٹلہ محسن خاں" کا رہنے والا تھا۔ اس کے آبا و اجداد مشہور مہمند قبیلہ کے ملک یا سردار تھے۔ مغل شاہنشاہوں کی طرف سے ان کو اس قبیلہ کے تمام علاقہ کی نوابی عطا کی گئی تھی۔

---

[1] ادبیات سرحد۔

اس عہدہ کو "اربابی" اور عہدہ دار کو بجائے نواب کے "ارباب" کہتے تھے۔

معز اللہ خاں کی پیدائش کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں ہوسکی۔ مگر اس کی ایک پشتو غزل سے، جو اس نے اپنے ایک معاصر شاعر عبدالقادر خاں خٹک کی ایک فخریہ غزل کے جواب میں لکھی ہے، یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی پیدائش ۱۰۸۰ھ کے لگ بھگ ہے۔

معز اللہ خاں کا دیوان اس کی وفات سے تقریباً سوا دو سو سال کی گمنامی کے بعد پشتو اکیڈیمی نے پیدا کیا ہے۔ یہ نسخہ شاعر کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس پر لکھی ہوئی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسے ۱۱۵۹ھ میں مکمل کیا۔ یہ دیوان تین زبانوں یعنی پشتو، فارسی اور اردو میں ہے۔ عام دستور کے مطابق وہ اپنا نام یعنی "معز اللہ" لکھتا ہے۔ مگر اردو اور فارسی میں "افغان" تخلص کیا ہے۔ اگرچہ پشتو اکیڈیمی کی طرف سے چھپے ہوئے نسخہ کے مطابق یہ دیوان صرف ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے، مگر غالب کے دیوان کی طرح یہ مختصر سا دیوان بھی کافی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ پشتو میں وہ صف اول کا شاعر تو ہے ہی۔ مگر فارسی اور اردو میں بھی اس کا کلام بہت بلند ہے۔ یہاں اس پر پوری طرح تبصرہ نہیں کیا جا سکتا مگر اس کے فارسی کلام کے معیار کی طرف اشارۃً یہ ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ پچھلے دنوں لاہور میں منعقدہ بین الاقوامی اسلامی مجلس مباحثہ میں حصہ لینے والے ایرانی وفد کے اراکین جب پشتو اکیڈیمی تشریف لائے تو یہاں معز اللہ خاں افغان کا کلام دیکھ کر آقائے علامہ فیروز نفوا ور ڈاکٹر معین صاحبان نے، جو موجودہ ایران کے سب سے بڑے علما اور ارباب کمال میں شمار ہوتے ہیں، بے ساختہ فرمایا کہ یہ تو حافظ اور صائب کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ اور حیرت کا اظہار کیا کہ ایک غیر اہل زبان نے اتنا بلند پایہ کلام چھوڑا ہے۔ اور ادبی دنیا ابھی اس سے بے خبر ہے۔

افغان کا اردو کلام جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، بہت ہی کم ہے یعنی یہ صرف چند غزلوں اور ایک مخمس پر مشتمل ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت سی اردو کتابوں کا بھی مصنف تھا۔ اس لئے ممکن ہے دستیاب شدہ دیوان کے علاوہ اس کا اور بھی کوئی مجموعہ ہو۔ مگر اس وقت یقین کے ساتھ اس بارہ میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس کی اور کوئی تصنیف و تالیف ابھی تک ہاتھ نہیں آئی۔

اس دیوان کی غزلوں کو افغان کے اردو کلام کا نمونہ سمجھ لیں، تو اس سے اس کے کلام پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

سرحد کے دوسرے قدیم اردو شعراء کے کلام میں وہ الفاظ جن کو اب متروک کہا جاتا ہے، بالکل ناپید ہیں۔ صرف افغان ایسا شاعر ہے جس کے کلام میں وہ تمام الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ جو ولی دکنی کے زمانہ کے شعراء کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:-

سیں (سے)، یا دستیں (یاد سے)، موں (میں)، کون (کو)، کسی کون (کسی کو)، ہووے (ہو) لیویں (لیں)، اور انکھیاں وغیرہ۔

بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو اردو زبان میں تو نہیں، مگر ہندی کبتوں وغیرہ میں اب تک مروج ہیں۔ جیسے:-

برہوں - برہہ - لالن - ساجن - کہہ - پیتم - پیا وغیرہ۔

ان کے علاوہ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں۔ جو لغت کی عام کتابوں میں بھی نہیں۔ اور آج کل ان کا استعمال بالکل نہیں ہوتا اور اس وقت کے عام دیوانوں میں مشکل سے ہی ملتے ہیں۔ جیسے:

پنیہ:- چادر یا پگڑی سے اپنے منہ سر کو اس طرح لپیٹ لینا کہ سارا چہرہ وغیرہ چھپ جائے۔ صرف دیکھنے کے لئے آنکھوں کے سامنے تھوڑی سی جگہ چھوڑ دی جائے۔ پشتو میں اسے "بوزئی" یا "تربوزک" کہتے ہیں۔ بالعموم ڈاکو چور یا قاتل ایسا کیا کرتے ہیں، تاکہ پہچانے نہ جا سکیں۔

مِی: مچھلی، ماہی

چونکہ یہ نسخہ معز اللہ خاں کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس لئے ہم اس کے رسم الخط کے متعلق بھی دو ایک باتیں قابل ذکر ہیں۔ اس نے ٹ کی بجائے ت لکھی ہے اور ڈ، ڑ کو پشتو کے رسم الخط کے مطابق ډ، ړ لکھا ہے۔ ڈ اور ڑ کے متعلق تو یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ سرحدی شاعر ہونے کی وجہ سے اس نے ان حروف کو پشتو کے رسم خط کے مطابق لکھ دیا ہے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ٹ کو پشتو کے رسم خط کے مطابق ټ کیوں نہیں لکھا؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ٹ ڈ ڑ کی موجودہ یا چار نقطوں والی شکلیں یعنی ٹ ڈ اور ڑ یا تو سرے سے اس وقت ایجاد ہی نہیں کی گئی تھیں۔ یا ان کا رواج دستور عام نہ تھا۔

ایک خصوصیت اور بھی قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ بعض الفاظ کے آخر میں ایک فالتو ہ لگادی گئی ہے۔ جیسے :

ابہ (اب)، ایکہ (ایک)، تبہ (تب)، آپہ (آپ) اور تکہ (تک)۔

میرے پاس اردو کے قدیم رسم الخط کا کوئی نمونہ موجود نہیں جس سے یہ معلوم کیا جاسکے کہ یہ فالتو ہ اس وقت کے مروجہ خط میں موجود تھی۔ یا یہ صرف افغانؔ کے رسم الخط کی خصوصیت ہے۔

ایک خالص پختون یعنی وہ جس کی مادری زبان پختو یا پشتو ہو، چاہے کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو۔ اور اردو کے ساتھ اس کا تعلق کتنا ہی گہرا اور زیادہ کیوں نہ ہو۔ لیکن نہ کہیں، کبھی نہ کبھی بے جان اسماء کی تذکیر و تانیث میں ضرور ٹھوکر کھاجاتا ہے۔ یہ افغانوں کی خصوصیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو اور ہندکو کے بہت سے بے جان اسماء کی تذکیر و تانیث پشتو کے بالکل برعکس ہے۔ افغانؔ نے بھی دو ایک جگہ یہی ٹھوکر کھائی ہے۔

افغانؔ کی زندگی کے عام حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کا پشتو و فارسی کا دیوان اس امر کی بین دلیل ہے کہ اس نے اپنے وقت کے مروجہ علوم جیسے تفسیر، حدیث، فقہ، علم بیان اور معانی وغیرہ میں کافی دسترس حاصل کی تھی۔ اور باوجودیکہ وہ ایک خوشحال اور جنگجو خاندان کا فرد تھا، پھر بھی وہ صوفیانہ طبیعت رکھتا تھا اور زہد و تقویٰ کا بہت پابند تھا۔ اس کا بیٹا اور پوتا بھی بڑے عالم گذرے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیخ احمد سرہندی کا بہت عقیدت مند تھا، اس لئے اکثر سرہند شریف جایا کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں ولیؔ اورنگ آبادی کے ایک دورہ کی طرف اشارہ کر دینا شاید نامناسب نہ ہوگا۔

جناب رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" کے صفحہ ۴۲ پر ولیؔ کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ اس نے شہنشاہ عالمگیر کے عہد میں (۱۷۰۰ء) دہلی کا ایک سفر کیا۔ جہاں اس کو شاہ سعد اللہ گلشنؔ نے، جو مشہور صوفی اور فارسی گو شاعر تھے، فارسی شاعری کی طرز پر ریختہ کا ایک دیوان لکھنے کی رائے دی۔ ولیؔ اس سفر سے واپس آکر احمد آباد گیا جہاں وہ ایک عرصہ سید ابوالمعانی کے پاس رہا۔ جب سید صاحب نے دہلی اور سرہند کے بزرگوں اور مزارات کی زیارت کا ارادہ کیا تو ولیؔ بھی ۱۱۱۲ھ میں اس کے ہمراہ آیا۔ یہ شہنشاہ اورنگ شاہ کے عہد سلطنت کا تیسرا سال تھا اب کے وہ اپنا دیوان بھی اپنے ساتھ لایا تھا جس کی وجہ سے وہ یکدم آسمان شہرت پر چمک اٹھا۔ ۔ ۔ ۔ بہت ممکن ہے کہ ولیؔ بھی سید صاحب کے ساتھ سرہند آیا ہو۔ اور یہاں اس کی ملاقات معز اللہ خاں سے ہوئی ہو۔ کیونکہ غزل (یا ریختہ) کا رواج دہلی میں ولیؔ کے اس دورہ کے بعد شروع ہوا۔ اور بقول سکسینہ، وہ شعراء جو اب تک فارسی میں شعر کہا کرتے تھے، اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور انہوں نے اس کے بعد اردو میں دیوان مرتب کرنے شروع کئے۔ معز اللہ خان کا نام بھی تو انہی فارسی گو شعراء میں آتا ہے۔

آخر میں اردو کے نام سے متعلق ایک عجیب بات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ اس تاریخ ادب میں مذکور ہے "ہندوستانی" کا لفظ اردو زبان کے نام کے طور پر سب سے پہلے ڈاکٹر گلکرسٹ نے ۱۸۰۳ء (۱۲۰۲ھ) میں استعمال کیا ہے۔ مگر افغانؔ نے اپنے کلام میں اس کو "اردو" کی بجائے "ہندوستانی" لکھا ہے۔ گویا اس نے ڈاکٹر گلکرسٹ سے بھی پچاس ساٹھ سال پہلے یہ نام اردو کو دیا۔

جہاں تک شاعرانہ کلام کا تعلق ہے عام قاعدہ کے مطابق اس پر تبصرہ کرنے اور چیدہ چیدہ اشعار پیش کرنے کی بجائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی چند غزلیں قارئین کے مطالعہ کے لئے پیش کردی جائیں۔ یہ غزلیں معز اللہ خاں کے اس دیوان سے لی گئی ہیں۔ جو پشتو اکیڈیمی نے حال ہی میں طبع کرایا ہے۔

جس نے جو دیکھا رو ئے تو دیوانہ ہو رہا
آئینہ خانہ تجھ سوں پریخانہ ہو رہا
پکڑے تمہارے بال اپنی ساعت موں تبھی
شمشاد تا دو زلف تراشانہ ہو رہا
تیری کٹاری پریم کی دل موں مرے لگی
پیتا لہو ہوں دل مرا میخانہ ہو رہا

نرگس تری دو نین سوں بیمار پڑ رہا
سرو از خیالِ قدِ تو مستانہ ہو رہا
پوشیدہ دل مرے موں جو تھا راز عاشقی
افغاں تمام خلق موں افسانہ ہو رہا

★

میں رونا رونا بہوت جو ہوں دو لوں نینوں موں ناسور ہوا … یہی رونا تیری یاد ستیں تب چلتا ہوں دستور ہوا
اب کیا پکاروں رو رو کر مکھ لال لہو سوں دھو دھو کر … کیا راز چھپاؤں برہوں کا جوں عالم موں مشہور ہوا
مجھے لالن جو دیدار دیا منے تن من صدقہ وار کیا … حبیب اپنا ہم نے جار لیا جب گھونگھٹ مکھ سوں دور ہوا
منے آپ سوں لاج بڑا مارا ہے مرے من سوں صبر سدھارا ہے … مرا گھر تجھ بن اندھارا ہے تری یاد ستیں پر نور ہوا
نہیں چین مجھے بن تیرے سوں یہ امید نہ کرنا میرے سوں … ترا مکھ زلفوں کے اندھیرے سوں مجھ ظاہر شعلۂ طور ہوا
جب دل مو محبت ہاگا ہے ترے غم سوں تن مرا تاگا ہے … جوں اجل مرے سوں بھاگلے ہے اب جینا مجکوں ضرور ہوا
ٹک افغاں مجکوں قرار نہیں جوں ساجن مجسوں یار نہیں
وہ بتا تا کب دیدار نہیں بہوت اپنے پر مغرور ہوا

★

مجکوں نہ زاہد سیں صلح نہ برہمن سیں عناد … میں غلام اُوس کا ہوں جس کا پاک ہووے اعتقاد
جس کے دیواں میں دو مصرع بھواں کے فرد تھے … اب تو چار ابرو میں پایا ہے رباعی کا سواد
خاک پڑتی سرا اوپر ہے سرکشوں کے غیب سیں … گر یقین کس کوں نہیں تو دیکھ لیوے گرد باد
دیکھ کر تجھ حسن کوں قاضی بھی مفتی دیوے دل … عاشقی کی شرع میں کیا پیش جاوے اجتہاد
فاختہ کے بر میں دیکھو شالِ طوسی کی قبا … سرو قدّوں کے جلالیوں کی ہے دولت خانہ زاد
انکھیاں کے دیکھتے افغاں بچارہ دل گیا
عشق کی نگری میں چھوٹے چور جا پکڑے ہیں ساد

★

نکل پیارے گھر اپنے سوں جو بن تجھ سوں خرابی ہے
بتا مکھ آپنا مجکوں جو مجکوں اضطرابی ہے
اگر مرنے کا کس کوں شوق ہے آکر ملے اس سوں
جو وہ نازک بدن پھیر آج مخمور شرابی ہے
در و دیوار سوں عاشق مبارکبا د سنتا ہے
نشانی قتل کی ساجن تیرا چہرہ گلابی ہے
ترے رخسار زلفوں کے خموں موں زیب کرتے ہیں
عجب سنبل کی شاخوں موں یہ ہر گل آفتابی ہے
کہی دانا محبت کے سنے بات آہستہ افغاں کوں
جو دیواں حسن کے موں [illegible] ہے

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

افسانہ:

کمند

انور ممتاز

وہ سنسنی خیز خبر، جو چھ ماہ ہوئے، اخباروں میں شائع ہوئی تھی اور جس میں بیان کیا گیا تھا کہ ایک نیا شادی شدہ جوڑا اپنی نئی کار میں کلفٹن کے ساحل پر پہلی تفریح گاہ سے دور، غروب آفتاب کا لطف اٹھا رہا تھا، کہ اچانک خانقاہ کی جانب سے ایک جیپ آئی اور اس میں بیٹھے ہوئے تین مسلح بدمعاشوں نے اس معصوم نوجوان جوڑے پر ریوالور سے پانچ فائر کئے۔ عورت تو وہیں ہلاک ہو گئی۔ اس کا شوہر بُری طرح زخمی ہوا۔ بدمعاش زیورات اور نقدی لے کر جیپ میں فرار ہو گئے۔ یہ دل ہلا دینے والی سنسنی خیز خبر غلط ہے۔ وہ عورت جو بدمعاشوں کے ریوالور سے وہیں ہلاک ہو گئی تھی، شادی شدہ نہیں تھی اور وہ شخص جو ریوالور کے فائروں سے بُری طرح زخمی ہو گیا تھا، میں تھا۔

میں آج ہی ہسپتال سے باہر آیا ہوں، اور اس وقت اصغری بیگم کی قبر پر کھڑا ہوں، اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور میرے دل میں غم کا طوفان بپا ہے۔

دراصل اس خبر کا سنسنی خیز حصہ درست ہے لیکن اس کا دل ہلا دینے والا حصہ کسی کو معلوم نہیں۔ صرف مجھے معلوم ہے، اور آج صبح جب میں ہسپتال سے باہر آ رہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں موت کے منہ سے نکل کر دنیا کو زندگی کا کوئی پوشیدہ راز بتلانے جا رہا ہوں، اور اب اصغری بیگم کی قبر پر کھڑے ہو کر میں محسوس کر رہا ہوں جیسے قدرت نے مجھے اس حادثے کے پیچھے چھپی ہوئی دل ہلا دینے والی کہانی سنانے کے لئے ہی زندہ رکھا ہے۔

اُس دن میں بہت خوش تھا۔ پہلی ریس کو چھوڑ کر باقی سب ریسوں میں میرے گھوڑے جیت گئے تھے۔ پہلی ریس میں مجھے کوئی ایک ہزار روپے کا نقصان ہوا تھا لیکن باقی جیتی ہوئی ریسوں میں تین فلوک تھے اور چار فیورٹ۔ اس طرح میں سیزن کا نقصان پورا کر کے اب کوئی اٹھائیس ہزار روپے اَپ تھا۔

چھٹی ریس میں جب سبز پری اوّل آئی تو ریس کورس پر سناٹا چھا گیا۔ سبز پری پر لگانے والے میرے علاوہ صرف تین اور تھے جن کو میں نے ٹپ دیئے تھے۔ سبز پری عجیب و غریب گھوڑی ثابت ہوئی اور بہت زرخیز فلوک۔ اس نے پانچ روپے کے ٹکٹ پر پانچ سو چالیس روپے ادا کئے۔ جب انتقام سے ایک فرلانگ پہلے سبز پری نے دوسرے گھوڑوں کو کاٹنا شروع کیا ہے تو ریس کورس میں صرف چار آوازیں چیخ رہی تھیں: سبز پری۔ سبز پری۔ سبز پری۔ سبز پری۔ جب سبز پری ایک پوری لنگتھ سے ریس جیت گئی تو میری دُوربین دھڑپ سے میرے سینے پر آ گری، اور میں اپنی فائل اور اپنی تھرموس بوتل بنچ پر چھوڑ کر بے تحاشا ریلنگ کے بائیں کنارے کی طرف بھاگا، اور جب بورڈ پر جیتنے والے گھوڑوں کے نمبروں کے اُوپر سبز پری کا نمبر نمودار ہوا، اور جب سبز پری اپنے سبزی مائل سیاہ سینے کو تلتے ہوئے ریلنگ کے پاس سے گذری تو میں پاگلوں کی طرح چلا اٹھا: سبز پری زندہ باد! سبز پری زندہ باد!!

اور جب میں واپس اپنی سیٹ پر آیا تو میں نے دیکھا کہ میری تھرموس بوتل کے پاس سبز پری بیٹھی ہے۔ اُس کا سنگِ مرمر کا بنا ہوا چہرہ نافرمان کی ساڑی کے کناروں کے درمیان سرچ لائٹ کی طرح دمک رہا تھا۔ اور اُس میں ایک اور غیر معمولی بات تھی، کوئی ایسی غیر معمولی بات جو مجھے نہایت غیر مہذب انداز میں اُس کو دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ غیر معمولی بات کیا تھی! وہ غیر معمولی بات کیا تھی!!

لیکن میں تو اُس لمحے میں دنیا کا مشغول ترین اور امیر ترین انسان تھا۔ میرے پاس عورتوں کی دلکشیوں پر ضائع کرنے کے لئے وقت کہاں تھا۔ میں نے اپنی تھرموس بوتل اور فائل اٹھائی اور کیش کاؤنٹر کی طرف چل پڑا۔

لیکن طاؤس کے تاروں میں ایک نہایت حسین نغمہ جھنجھنا اٹھا:

"معاف کیجئے! زحمت ہو گی سائن دو ٹکٹوں پر میرا کیش لے آئیے۔"

اُف ترنم! اُف موسیقی! اور اُس کو ایک دفعہ پھر دیکھنے کا موقعہ! میں ایک لمحے کے لئے اُس کی اُس غیر معمولی پنہاں جاذبیت میں گم ہو گیا اور پھر جیسے نیند

سے بیدار ہو کر بولا :

"کونسا گھوڑا ؟"

"نمبر ۵"

"سبز پری !"

"سبز پری"

"اور ـــــ کس نے بتایا آپ کو ؟"

"پھر بتاؤں گی۔ کیش لے آیئے۔ تھرمس اور فائل یہیں رکھ دیجئے۔ میں ان کی حفاظت کر سکتی ہوں۔"

"اور آپ کے ـــــ"

"میرے شوہر ؟ وہ دفتر میں ہوں گے۔ مجھے ٹیلیفون کیا تھا کہ سیدھی ریس کورس پہنچ جاؤں۔ ابھی تک نہیں آئے۔ شاید کوئی ضروری کام آپڑا ہوگا۔"

"لیکن آج تو اتوار ہے۔"

"جی نہیں، آپ بھولتے ہیں آج سیٹرڈے ہے، اور سیزن کا آخری دن۔ کل اتوار سے رمضان شروع ہو رہا ہے اور رمضان کے احترام میں ریس کورس بند کیا جا رہا ہے۔"

"ارے ہاں، میں بھول رہا تھا۔ آپ نے اس یاد سے میری خوشی میں اضافہ کر دیا ہے۔ میں سارے سیزن میں بری طرح ہارتا رہا ہوں۔ آج میں نے اپنا سارا خسارہ پورا کر لیا ہے اور کافی آپ چلا گیا ہوں۔ آج سیزن بند ہو جائے گا اور مجھے اگلے اتوار ہارنے کے لئے یہاں نہیں آنا پڑے گا۔"

وہ ہنس پڑی اور فضا میں موتی بکھر گئے۔

میں نے تھرمس بوتل اور فائل وہیں رکھ دیئے اور کیش لینے کے لئے چلا گیا۔

کاؤنٹر پر جا کر میں نے اس خاتون کے ایک ہزار اٹھاسی روپے لئے اور ان کو اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اور جب میں اپنا کیش گن رہا تھا تو ایک حقیقت بجلی کی طرح میرے ذہن پر کوندی، اور وہ غیر معمولی جاذبیت جو میں اس خاتون میں محسوس کر رہا تھا لیکن سمجھ نہیں سکا تھا، اچانک میرے سامنے آگئی، اور وہ غیر معمولی جاذبیت ایسی معمولی بات ثابت ہوئی کہ میں بے حد مایوس ہوا۔ وہ غیر معمولی جاذبیت اس خاتون کے ہونٹوں کی لپ سٹک تھی۔

لپ سٹک سے مجھے بڑی نفرت ہے۔ لپ سٹک کے ساتھ موڈرن عورت بڑی خونخوار نظر آتی ہے۔ موڈرن عورت کے ہونٹوں پر لپ سٹک کی بڑے اہتمام سے بنی ہوئی لکیریں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مردوں کا خون بڑے آرٹسٹک طریقے سے چوستی ہے۔ بدصورت عورت بغیر کسی لپ سٹک کے بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے مجھے سانولی عورت کے اُودے اُودے ہونٹ، سفید عورت کے گلابی گلابی ہونٹ اور زرد عورت کے سفید سفید ہونٹ بڑے اچھے لگتے ہیں۔ وہ آپ کو فریب میں مبتلا نہیں کرتے۔ وہ سچ بولتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں : دیکھو، ہم بدصورت ہیں۔ ہم پر اپنا وقت ضائع مت کرو۔ جاؤ اپنے اپنے گھروں کو۔ اور دوسری طرف کسی انیمیا کی ماری ہوئی عورت کے لپ سٹک سے لپے ہوئے، جھوٹے، دغاباز اور مکار ہونٹ کہتے ہیں : ہمیں دیکھو! ہم کتنے حسین ہیں! کتنے صحت مند! کتنے تندرست! ہماری طرف دیکھو! ہمارے پاس آؤ! آؤ!! آؤ!!!

پھر اس خاتون کے لپ سٹک میں چھپے ہوئے ہونٹوں میں مجھے غیر معمولی جاذبیت کیوں نظر آتی ہے۔ یہ کیا اُلجھن ہے! یہ کیا راز ہے!

جب میں گیلری میں واپس آیا، تو وہ خاتون میری ریسوں کی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی اور اس کے پاس چائے کی ٹرے پڑی تھی۔ میں نے اس کو ایک ہزار اٹھاسی روپے کے نوٹ دیتے ہوئے کہا : "چائے کی ٹرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے شوہر آگئے ہیں۔" اُس نے تھینک یو کہہ کر نوٹ لئے، گنے اور اپنے پرس میں رکھتے ہوئے جواب دیا : "جی نہیں۔ میرے شوہر نہیں آئے۔ لیکن چائے کا ٹائم آگیا ہے۔"

میں نے مشورہ دیا : "بہتر ہوتا اگر چائے کے لئے ان کا انتظار کیا جاتا۔"

وہ مسکرا کر بولی : "گھبرایئے نہیں۔ آپ کو میرے ساتھ چائے پیتے دیکھ کر وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ میرے شوہر بڑے ایڈوانسڈ ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوش

ہوں گے خصوصاً جب اُنہیں معلوم ہوگا کہ سبز پری کا ٹپ مجھے آپ سے ملا تھا۔"

"مجھ سے؟"

"جی ہاں۔ اگر آج میرے شوہر یہاں ہوتے، تو سبز پری ان کو بھی مالامال کر دیتی۔ میرے شوہر ریس کے بہت رسیا ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ افسر ہیں اور اپنی تمام تنخواہ ریسوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر اس ملک میں رشوت کی رسم نہ ہوتی تو ان کی فیملی بھوکی مر جاتی۔ اُن کو ریس سے منع کرنا ایسا ہی ہے جیسا کسی پیاسے کو پانی پینے سے منع کرنا۔ اُن کی پہلی بیوی بڑی بیوقوف تھی۔ اُن کو ریس کورس سے باز رکھنے کے سلسلے میں اُن سے ہمیشہ فساد رکھتی تھی۔ آخر وہ طلاق دینے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ اپنے چھ بچوں کے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ میں ان کو ریس کورس سے منع نہیں کرتی۔ ہر ریس میں اُن کے ساتھ آتی ہوں تاکہ اگر میں اُن کو ریس سے باز نہیں رکھ سکتی تو کم از کم ریس میں زیادہ روپیہ لگانے سے منع کروں۔ آج وہ نہیں آئے اور میں کاؤنٹر کے پاس سے گذر رہی تھی۔ آپ کو سبز پری پر پانچ سو روپے لگاتے دیکھا۔ جی چاہا کہ آپ کو اتنا روپیہ لگانے سے منع کروں لیکن معلوم نہیں مجھے کیا ہوا۔ آپ کو منع کرنے کی بجائے میں نے بھی سبز پری پر دس روپے لگا دیئے ——— کتنے چمچے چینی؟"

میں نے جلدی سے کہا: "معاف کیجئے، میں چائے نہیں پیتا۔ کوئی پیتا ہوں۔ میری تھرموس میں بہت کوئی ہے۔"

وہ بھی جلدی سے بولی: "معاف کیجئے، میں کوئی نہیں پیتی۔ چائے پیتی ہوں۔ اس لئے آپ چائے پئیں گے اور میں کوئی۔"

★

ساتویں ریس کے گھوڑے پیڈک میں آ گئے تھے۔ خاتون میری دُوربین لیکر گھومتے ہوئے گھوڑوں کو دیکھنے لگی اور دیکھتے دیکھتے بولی: "اس ریس کیلئے آپکو کونسا گھوڑا پسند ہے؟"

میں نے کہا: "آج رات کو میں نے خواب میں ایک ایسا گھوڑا دیکھا ہے جس کی دُم کٹی ہوئی تھی۔ ذرا غور سے دیکھئے ان گھوڑوں میں کوئی ایسا گھوڑا تو نہیں جس کی دُم کٹی ہوئی ہو۔"

وہ دوربین سے سب گھوڑوں کو دیکھنے کے بعد بولی: "جی نہیں۔ کوئی نہیں۔"

میں نے مشورہ دیا: "اچھا کتاب سے سب گھوڑوں کے نام پڑھئے۔"

وہ پڑھنے لگی: "مائی ڈاسن۔ سپوٹنک۔ گولڈ ڈسٹ۔ لنڈی کوتل۔"

میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "ٹھہریئے، لنڈی کوتل جیتے گا۔ لنڈی کا اشارہ کٹی ہوئی دم کی طرف ہے اور کوتل گھوڑے کو بولتے ہیں۔"

چنانچہ لنڈی کوتل جیتا لیکن اس ریس میں میں زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ کیونکہ اُس خاتون نے مجھے زیادہ روپے لگانے سے منع کر دیا تھا۔

★

شام ہو گئی۔ ریسنگ سیزن ختم ہو گیا۔ خاتون کا خاوند نہ آیا۔ میں نے کہا: "اگر کہیں تو میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ آؤں۔ میرے پاس کار ہے۔"

وہ بولی: "نوازش ہوگی۔ میں نے آپ کو آج بہت زحمت دی۔"

"جی، بالکل نہیں۔ آئیے۔"

میں نے اُس کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا لیکن وہ بولی: "اگر آپ کار خود ڈرائیو کر رہے ہیں، تو میں آپ کے پاس آگے بیٹھوں گی۔ تاکہ آپ کو اپنے بنگلے کا راستہ بتلانے میں آسانی ہو۔"

"جی بہتر۔ کدھر چلئے گا؟"

"کلفٹن۔ وہ جو کلفٹن بینڈ سٹینڈ کے پاس نئے بنگلے بنے ہیں۔ اُن میں ایک۔"

کار چل پڑی۔ باتھ آئیلنڈ کے پاس جا کر اُس نے خاموشی کا طلسم توڑا: "وہ سامنے نیلا بنگلہ۔ بینڈ سٹینڈ کی طرف سے چوتھا۔"

تھوڑی دُور جا کر وہ پھر بولی: "آپ اتنا تیز کیوں جا رہے ہیں؟ کیا آپ کو بہت جلدی ہے؟"

میں نے کہا: "جی نہیں، میرا خیال ہے آپ کا انتظار ہو رہا ہوگا۔"

"اس بنگلے کے ماحول میں کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ برج شروع ہوگئی ہوگی۔ کوئی نئی پارٹنر آگئی ہوگی، شراب کی بوتلیں کھل گئی ہوں گی۔ میرے بنگلے کا ماحول کوئی زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔"

"کہیں تو کار آہستہ کر دوں؟"

"جی نہیں۔ آپ کی والدہ انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"جی نہیں۔ میں نے ابھی شادی نہیں کی۔ میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں۔"

"تو پھر میں آپ کو تھوڑی سی اور زحمت دوں گی۔ مجھے کلفٹن کے ساحل پر چھوڑ آیئے۔ میں اس وقت سیر کرنے کی عادی ہوں۔"

"لیکن کیا اس وقت کلفٹن کے ساحل پر ایک لیڈی کا اکیلے سیر کرنا محفوظ ہوگا؟"

"بالکل محفوظ۔ میں پچھلے دو سال سے اس وقت وہاں روزانہ پیدل سیر کرنے جاتی ہوں اور آج اگر آپ کو میرا فکر کھائے جا رہا ہے تو آپ میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہیں۔"

میں لاجواب ہو گیا۔

★

ہم نیلے بنگلے کے پاس سے گزر گئے۔ کلفٹن کا ساحل آگیا۔ اس کی خواہش پر میں کار کو ہجوم سے پرے غیر آباد ساحل پر لے گیا۔ ہم کار سے نیچے اترے۔ سمندر کی لہریں فضا میں موسیقی بکھیر رہی تھیں۔ دھیمی دھیمی مرطوب ہوا چل رہی تھی۔ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

یکایک لپ سٹک کی غیر معمولی جاذبیت کا راز کھل گیا۔ وہ لپ سٹک کی سرخی کہاں تھی۔ وہ تو مصوّر کے مو قلم کا اعجاز تھا۔ وہ تو سنگِ مرمر کے چہرے کا ایک مرکزی مقام تھا۔ وہ تو آرٹ کی تکمیل کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ اس نے مجھے چونکا دیا: "آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

"اوہ — معاف کیجئے!"

"میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں آپ سے ایک بہت اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کو میرا چہرہ دیکھنے سے فرصت ہوگئی ہو، تو عرض کروں۔"

"فرمایئے، میں شرمندہ ہوں۔"

"میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر آپ کے سامنے کسی بلڈنگ میں آگ لگی ہو اور دھوئیں اور شعلوں میں الجھی ہوئی انسانی آوازیں پکار رہی ہوں: مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!! تو آپ کیا کریں گے؟" اس کے الفاظ نے میرے ذہن کے پردوں پر میری زندگی کا ایک نہایت مکروہ واقعہ اُجاگر کر دیا۔ میری زندگی کا یہ مکروہ واقعہ مجھے جب بھی یاد آتا ہے۔ میری نظریں ندامت سے جھک جاتی ہیں۔ میری نظریں خاتون کے حسین چہرے سے جھک کر اس کے پاؤں کے پاس آگئیں اور میں بُت کی طرح سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔

وہ پھر بولی: "میں پوچھ رہی ہوں کہ اگر سیڑھیوں پر کسی کا پاؤں پھسل جائے اور وہ سمندر میں گر جائے اور اپنی جان بچانے کے لئے چیخنے لگے: مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!! تو آپ کیا کریں گے؟"

میں اسی طرح خاموش، اس کے پاؤں کے پاس اپنی نظریں گاڑے کھڑا رہا۔

اب وہ جھنجھلا کر بولی: "مجھے آپ کی خاموشی نے حیران کر دیا ہے۔ کیا آپ ایسے سادہ سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتے؟ کیا آپ دُور کھڑے ہو کر کسی کو جلتے ہوئے اور ڈوبتے ہوئے دیکھتے رہیں گے؟ کیا آپ کے دل میں اس کو بچانے کی تمنا پیدا نہ ہوگی؟"

میرے ذہن سے صدمے کا اثر زائل ہو رہا تھا اور اب میں اس کی باتوں کا جواب دینے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں نے کہا "ہوگی۔"

"پھر آپ بولتے کیوں نہیں؟ آپ کی زبان بند کیوں ہوگئی ہے؟"

"محترم خاتون، میں ایک بزدل انسان ہوں۔ میرا قد چھ فٹ لمبا ہے۔ میرا سینہ ۳۶ انچ چوڑا ہے۔ میرے بازو لوہے کی طرح سخت ہیں۔ میں تندرست و توانا ہوں لیکن بزدل ہوں، اور جب مجھے یہ یاد آتا ہے تو میں پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو جاتا ہوں۔ میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلتا۔ میری زبان بند ہو جاتی ہے۔"

"میں نے تو آپ کو بزدل نہیں کہا۔"

"تھوڑی دیر ہوئی آپ نے دو ایسے دردناک منظر پیش کئے تھے جن میں سے مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!! کی آوازیں آ رہی ہیں۔ یہ الفاظ میرے دماغ پر بھاری بھاری پتھر ہیں"

کی طرح گرے۔ ان الفاظ نے مجھے میری زندگی کے ایسے شرمناک واقعے کی یاد دلائی جس میں مَیں پہلی دفعہ اس حقیقت سے دوچار ہوا کہ میں بزدل ہوں۔ میں چھ فٹ لمبا ہوں ۳۶ انچ چوڑا سینہ رکھتا ہوں۔ لوہے جیسے بازوؤں کا مالک ہوں اور بزدل ہوں اور جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے تو ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک بزدل انسان اگر کسی جلتے ہوئے اور ڈوبتے ہوئے انسان کو بچانا بھی چاہے تو نہیں بچا سکتا۔"

"کیا میں وہ واقعہ سن سکتی ہوں؟"

"اتوار کا دن تھا۔ ریسنگ سیزن زوروں پر تھا۔ میرا دوست اور میں تباہ کن بیٹنگ موڈ میں تھے۔ وہ جیت رہا تھا، میں ہار رہا تھا۔ وہ ہار رہا تھا، میں جیت رہا تھا۔ آج جیسا دن نہیں تھا لیکن اچھا دن تھا۔ اور شام کو جب ہم پیلیس چائے پینے گئے۔ ہماری جیبیں کافی بھاری تھیں۔ چائے پینے کے بعد میرے دوست نے اپنی بیوی کے لئے چند قیمتی زیورات خریدے اور ہم کار میں بیٹھ کر ڈرگ روڈ سٹیشن کی طرف چل دیئے۔ میرا دوست ڈرگ روڈ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ایک بنگلے میں رہتا تھا، اور اس دن اس کی بیوی نے مجھے ڈنر کے لئے بلایا تھا۔ میرا دوست جب بھی ریس کورس میں آتا تھا مجھے اُس کو چھوڑنے کے لئے ڈرگ روڈ جانا پڑتا تھا۔ وہ ان دنوں کار چلانا سیکھ رہا تھا۔ اور کراچی سے واپس جاتے وقت میری کار وہی چلاتا تھا۔ اس لئے وہ ان سڑکوں سے بچتا تھا جہاں ٹریفک زیادہ ہو اور ہم ریس ختم ہونے کے بعد ڈرگ روڈ سٹیشن کو واپس جانے کے لئے ہمیشہ اس اکیلی اور سنسان سڑک کو استعمال کرتے تھے۔ جو ڈللیا میٹ فیکٹری کے سامنے سے ہو کر آرڈیننس ڈپو کے پاس سے گذرتی ہوئی ڈرگ روڈ سٹیشن پر جا پہنچتی تھی ــــ رات سخت کالی تھی اندھیرا بہت ڈراؤنا تھا۔ ہیڈ لائٹوں کی روشنی کار کے گزرنے کے لئے اتھاہ اندھیرے کے سینے میں دھندلا سفید سوراخ بناتی جا رہی تھی۔ یکایک سڑک کے دائیں کنارے سے ایک عورت ہیڈ لائٹوں کی روشنی میں آ گئی، بال بکھرے ہوئے، کپڑے پھٹے ہوئے۔ اُس نے اپنے دونوں بازو ہوا میں بلند کئے اور چلانے لگی: مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!!! میرے ریوالور نکال لیا میرے دوست نے کار کی رفتار تیز کر دی میں چلایا: "عزیز! کار کو سٹوپ کرو، بریک لگاؤ، روکو!" عزیز نے میری طرف دیکھے بغیر کہا:- "DON'T BE SILLY" اور کار کی رفتار اور بھی تیز کر دی ــ عورت کی دردناک پکار سنائی دے رہی تھی: مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!!! ــ میں نے کہا: "عزیز! روکو کار کو۔ وہ سڑک کے درمیان ہے۔ کچلی جائیگی۔" عزیز نے کہا: "بیوقوف! ہم سخت خطرے میں ہیں" ــــ وہ مایوس ہو کر سڑک کے دائیں کنارے کی طرف ہو گئی۔ کار اسکے پاس سے گذر گئی۔ میں عزیز کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا اس نے کہا: "ابے گدھے کے سینگ الو کے کبھی اخباروں میں جرائم کا کالم پڑھا ہے؟ اگر ہم یہاں ٹھہر جاتے تو ہماری ہڈیوں اور بوٹیوں سے چیلوں اور کوّوں کی ڈنر پارٹی ہوتی، اس عورت کے ساتھ ایک پورا گینگ تھا ــــ ڈرگ روڈ سٹیشن آ گیا میں نے زبردستی کار رکوائی اور عزیز سے کہا: "بچو! تو اب یہاں اپنے گھر تک پیدل مارچ کر۔ ڈنر میں شامل نہ ہو سکنے پر بھابی سے معذرت، میں اس عورت کی مدد کے لئے جا رہا ہوں۔" اور میں طوفانی رفتار سے واپس چل پڑا۔ اس مقام پر پہنچ کر میں کار سے اترا، اور سڑک کے نزدیک ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اپنی ریوالور کو ہوا میں ہلاتے ہوئے میں زور زور سے چلانے لگا: "کون مجھے مدد کے لئے پکار رہا تھا؟ کون تھا جس نے مجھے مدد کے لئے پکارا تھا؟" میری آواز ارد گرد کی پہاڑیوں میں گونج اور گم ہو گئی ــ میں ایک دوسری پہاڑی پر چڑھ گیا اور پھر چیخنے لگا: "محترمہ! میں آپ کی مدد کے لئے آ گیا ہوں محترمہ! آپ کہاں ہیں؟" ــ کوئی جواب نہیں ــ میں ایک اور پہاڑی پر چڑھ کر چلانے لگا: "بہن آؤ! مجھے بتاؤ تمہیں کیا تکلیف تھی؟ بہن! مجھے بتاؤ، تمہیں کس نے تکلیف پہنچائی تھی؟" ــــ وہی خاموشی، وہی سناٹا، وہی اندھیرا ــ میں مایوس ہو کر اپنی کار کی طرف چل پڑا، اور کار کے دروازے پر کھڑے ہو کر رقت آمیز لہجے میں بولنے لگا: "بہن! مجھے معاف کر دو، میں ایک بزدل انسان ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے تمہاری حرمت لٹ گئی اور میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکا۔" میں چپ ہو گیا اور خاموشی تکلیف دہ ہو گئی۔

وہ دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر بولی: "آپ بزدل نہیں ہیں، جذباتی ہیں اور جذبات میں بہہ کر حالات کی نزاکت کو محسوس نہیں کرتے۔ میں آپ کے دوست کی عقلمندی کی داد دیتی ہوں۔ اگر وہ آپ کے کہنے پر اس خطرناک علاقے میں کار کو روک دیتے تو ممکن ہے آپ دونوں کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان سنسان پہاڑیوں میں بکھیر دیا جاتا۔ اس واقعہ سے آپ کے دوست کی معاملہ فہمی کا ثبوت ملتا ہے، اس سے آپ کی بزدلی ثابت نہیں ہوئی۔ اس واقعہ نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ اگر کوئی بے بس عورت آگ میں جل رہی ہو یا پانی میں ڈوب رہی ہو، تو آپ اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھی اس کی مدد کو پہنچیں گے۔"

"ہو سکتا ہے کہ میں کسی آگ میں جلتی ہوئی یا پانی میں ڈوبتی ہوئی مظلوم عورت کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دوں لیکن مجھے افسوس ہے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

اس کا سانس رک گیا اور وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی: "میں نے آپ سے کونسی مدد مانگی ہے؟"

"محترمہ! اِدھر اُدھر کی فضول باتیں کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ آپ اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتیں، آپ کی اور آپ کے شوہر کی عمروں میں فرق ہے، آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو

آپ کے شوہر کے پنجے سے چھڑاؤں۔ معاف کیجئے، میں شادی شدہ عورتوں اور ان کے شوہروں کے درمیان آنا پسند نہیں کرتا۔"

اس کے جواب نے مجھے حیرت زدہ کر دیا: "کون شادی شدہ عورت؟ کس کا شوہر؟"

اس ظاہر و باہر سوال کا جواب کیا تھا؟ میں نے کہا: "آپ اور آپ کا شوہر!"

میرا کوئی شوہر نہیں، میری ابھی شادی نہیں ہوئی، میں کنواری ہوں"

یکایک ڈرامے کا سین بدل گیا۔ ایک نیا کردار میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور میری دلچسپی کا پیمانہ کناروں تک اچھل پڑا۔ میں دیر تک حیرت سے چپ چاپ مبہوت اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر حیرت سے بوجھل الفاظ میں بولا۔ "خاتون! آپ کون ہیں؟"

"میرا نام اصغری بیگم ہے۔ میں ایسے ماحول میں پیدا ہوئی تھی جہاں شادیوں کے سوال پیدا نہیں ہوتے، اور جہاں ہر ہر لمحہ شادیاں ہوتی ہیں۔ میری ماں کی چھ لڑکیاں تھیں جن میں سے پانچ کو اُس نے پانچ پانچ سو روپے میں خریدا تھا۔ میں چھٹی تھی اور صرف میں اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ میرے باپ بننے کے دعویداروں میں بڑی بڑی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ سب سے پہلے ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد گوہر خاں کو میرا باپ تسلیم کیا گیا۔ گوہر خاں نے بڑا اقتدار حاصل کیا، اور اپنے مکّے اور مونچھوں کے زور پر سارے بازار کا چودھری مقرر ہوا۔ ایک دن اُس نے میری ماں کو بُری طرح مارا اور میری ماں نے دوسرے دن موقعہ پا کر اُس کو پارا کھلا دیا جب پارا اس کے گھٹنوں میں اتر گیا تو فوراً امان اللہ نے میرا باپ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ گوہر خاں کی پارٹی نے بری طرح شکست کھائی اور امان اللہ کو میرا باپ تسلیم کر لیا گیا۔ دراصل میرا باپ ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میری ماں اپنے وقت کی بہت بڑی ناچنے اور گانے والی تھی اور جب اُس نے فلموں میں ناچنا اور گانا شروع کر دیا تھا، تو اُس کی آمدنی کسی وزیر باتدبیر کے برابر ہو گئی تھی اور ہمارے ان وزیر نے میری ماں کو اپنے سوشل فنکشنوں میں مدعو کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے امان اللہ کے اقتدار سے بہت جلد لوگ جلنے لگ گئے اور اس کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہو گئیں۔ آخر ایک سازش میں اس کے بھتیجے حامد حسین نے امان اللہ کو چاقو سے ہلاک کر دیا، اور میرا باپ بن بیٹھا۔ میرے نئے باپ نے میری تعلیم، میرے ناچ اور میرے گانے کی طرف خاص توجہ دینی شروع کی۔ میرا نیا باپ مجھے اپنی سوسائٹی کے اعلےٰ طبقہ کے لئے اور فلم کے لئے تیار کر رہا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ وہ دنیا میں اسی طرح نام پیدا کرے جس طرح بعض ایکٹرسوں کے "باپوں" نے پیدا کیا ہے۔ میرا تیسرا باپ بڑا طاقتور ثابت ہوا۔ اس نے اپنے تمام دشمنوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ سوائے ایک دشمن کے ———"

میں اصغری بیگم کے گفتگو کے انداز سے اس قدر متاثر ہوا کہ میرے لئے ایک خاموش تماشائی کا پارٹ ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے میں اصغری بیگم کی بات کاٹ کر بولا: "وہ دشمن کون تھا؟"

اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں جواب دیا: "میں"

"آپ؟"

"میں نے اس ماحول کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس دن میری سولھویں سالگرہ تھی۔ بڑی پُر تکلف چائے تھی۔ میرا ناچ تھا۔ شہر کے تمام اعلیٰ طبقہ کے دولتمند تاجر مہمان تھے۔ تقریب کے اختتام پر مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا اور میری پہلی رات کے کرائے کا نیلام شروع ہوا۔ میں دروازے کے پاس کھڑی سب کچھ سن رہی تھی: پانچ سو۔ چھ سو۔ آٹھ سو۔ ایک ہزار۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں باہر نکلی، اور سب سے مخاطب ہو کر بولی: "معزز مہمانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں عصمت فروش لڑکی نہیں ہوں۔ میں ایک پڑھی لکھی پاکیزہ خیالات کی لڑکی ہوں۔" میرے باپ کا آہنی پنجہ میرے بازو پر پڑا، مجھے گھسیٹ کر سب سے اندر کے کمرے میں لے جایا گیا۔ باپ کا ہنٹر کھونٹی سے اُترا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک بے بس بے دست و پا، بدنصیب لڑکی ہوں۔ جب میں روتے روتے تھک گئی تو میں نے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ وہ ایک ہزار روپیہ ادا کرنے والا تاجر تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں امید کی پہلی کرن نظر آئی۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ایک ہفتہ کے اندر اندر اس ماحول سے لے جائے گا اور مجھ سے شادی کر لے گا۔"

"پسند تھا وہ آپ کو؟"

"اگلے دو تین دن میں مجھے اس کے بارے میں جو معلومات فراہم ہوئیں، وہ بڑی تشویشناک تھیں۔ وہ بلیک مارکٹ کا بادشاہ اور سمگلروں کا شہنشاہ تھا۔ اُس نے ایک ممتاز سیاسی جماعت کو ایک لاکھ روپے چندہ دیا تھا اور اس کے ٹکٹ پر دس روپے فی ووٹ کے حساب سے قیمت ادا کر کے اسمبلی کا ممبر منتخب ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک نئے

زمین میں صرف اپنے خرچ پر مسجد بنوائی تھی اور اُس کے چاروں طرف دکانیں بنا کر ان کو دس دس ہزار روپے پگڑی لے کر کرائے پر دیا تھا۔ وہ ان پڑھ تھا۔ اس لئے علم کی روشنی پھیلانے کے لئے اس نے ایک خیراتی اسکول اور ایک یتیم خانہ کھول رکھا تھا جس پر وہ تمام روپیہ لگا دیتا تھا جو خواہ مخواہ حکومت کو انکم ٹیکس کی شکل میں دینا پڑتا۔ اُس کی صرف ایک بیوی تھی اور اتنی دولت ہوتے ہوئے صرف ایک بیوی پر اکتفا کر لینا بڑی نامعقول حرکت تھی۔ یہ باتیں بہت تشویشناک تھیں لیکن میری تشویش بے معنی تھی۔ میرے سامنے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا سوال نہیں تھا۔ مجھے تو ایک تنکے کا سہارا چاہیئے تھا۔ اس کا پیغام آیا کہ وہ دوسرے دن بارہ بجے مجھے لینے آئے گا!"

"پھر وہ آیا؟"

"دوسرے دن بارہ بجے معلوم ہوا کہ وہ ایک صوبے کا چیف منسٹر ہو گیا ہے!"

"اور اب وہ کہاں ہے؟"

"جیل میں"

وہ ہنس پڑی۔ میں بھی ہنس پڑا۔

پھر وہ بولی: "جب میری ماں کو اور میرے باپ کو میری سکیم کا پتہ چلا تو ان کی گرفت مجھ پر زیادہ مضبوط ہو گئی لیکن کچھ عرصے کے بعد امید کی دوسری کرن نظر آئی۔ میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ میں خوش ہوئی کہ میری ماں راستے سے ہٹ گئی ہے اور اب مجھے اپنا راستہ ڈھونڈنے میں آسانی ہو گی لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ میرے باپ نے میری ماں کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے اور مجھے تالے میں بند رکھا جانے لگا۔ کچھ مدت کے بعد امید کی تیسری کرن نظر آئی۔ حکومت نے عصمت فروشی کو ممنوع قرار دے دیا لیکن اس کا بھی کوئی زیادہ فائدہ نہ ہوا۔ اس نے میرے باپ کو اور مجھے دوسرے مکروہ جرائم کی طرف دھکیل دیا۔ آج امید کی چوتھی کرن نظر آئی ہے، کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

میں سوچ میں پڑ گیا۔

"آپ سوچتے ہوں گے، میں بہت گندے ماحول میں پلی ہوں۔ بہت گندے ماحول میں رہتی ہوں۔ اس لئے آپ کے قابل نہیں ہوں۔ جی ہاں، میں آپ کے قابل نہیں ہوں، جائیے۔ آرام کیجئے۔"

میں تھوڑی دیر چپ کھڑا رہا۔ پھر بولا: "اصغری بیگم، آپ کا سوال بہت سنجیدہ ہے۔ اس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔"

"آپ بزدل ہیں۔ آپ کا چھ فٹ لمبا قد، آپ کا چھتیس انچ چوڑا سینہ، آپ کے طاقتور بازو، سب بے کار ہیں۔ آپ کسی مظلوم عورت کی جان بچا سکتے ہیں لیکن اس کی زندگی نہیں بچا سکتے۔ کسی مظلوم عورت کو بچانا کوئی بڑی بات نہیں۔ اُس کی زندگی کو بچانا بڑی جوانمردی ہے، اور آپ وہ ہیں جن کی زندگی میں ایک ایسا شرمناک واقعہ پیش آ چکا ہے جس کی یاد آپ کی گردن جھکا دیتی ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ اگر آپ کی زندگی میں وہ شرمناک واقعہ پیش نہ آیا ہوتا اور آپ اس مصیبت زدہ عورت کو جس نے ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری سے آگے، اُس کالی ڈراؤنی رات کو، اس سنسان سڑک پر آپ کو مدد کے لئے پکارا تھا بچانے کے لئے ٹھہر جاتے، تو آپ اس کی کوئی مدد نہ کر سکتے، کیونکہ وہ عورت آپ کو اپنی حرمت اور جان بچانے کے لئے نہیں پکار رہی تھی۔ اپنی زندگی بچانے کے لئے پکار رہی تھی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے؟"

"میں اُس عورت کو جانتی ہوں۔"

"اصغری بیگم، وہ عورت کہاں ہے؟ میں اُس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس سے ملا سکتی ہیں؟"

"ہاں"

"کون ہے وہ؟"

"میں!"

"اصغری بیگم!"

"میں پچھلے چھ ماہ سے آپ کا تعاقب کر رہی ہوں۔ میں کراچی کے سب سے بڑے جرائم پیشہ گینگ کی ایجنٹ ہوں۔ ان چھ مہینوں میں کئی دفعہ آپ کی زندگی میرے

پیروں کے نیچے آئی لیکن میں زندگی سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے ہر دفعہ آپ کو چھوڑ دیا۔ صرف دو منحوس موقعوں پر گینگ کی پستولوں کی نالیوں کے سامنے مجھے آپ کو موت کے نزدیک لانا پڑا لیکن دونوں دفعہ میرے ذہن میں ایک سکیم تھی۔ اُس سنسان سڑک پر میں نے بکھرے بالوں اور پھٹے کپڑوں والی مصیبت زدہ عورت کا پارٹ ادا کیا کہ شاید آپ کو مجھ پر رحم آجائے اور گینگ کے آنے سے پہلے آپ مجھے کار میں بٹھا کر اس ماحول سے دُور کہیں لے جائیں، اور آج میں اپنے بہترین لباس میں اور اپنی بہترین رعنائیوں میں آپ کے سامنے آئی ہوں کہ شاید آپ کو مجھ پر پیار آجائے اور آپ مجھے اس ذلت کے غار سے نکال لیں۔ آپ کا کام آسان تھا! آپ کو صرف ایک زندگی بچانی تھی۔ میرا کام مشکل تھا مجھے دو زندگیاں بچانی تھیں"۔

"اصغری بیگم، یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ آپ نے مجھ جیسے ذلیل انسان کی زندگی کو اپنے پیروں کے نیچے کیوں نہ روند ڈالا؟"

اصغری بیگم نے میری طرف بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر بولی: "چھ ماہ کا عرصہ بڑا قیامت ہوتا ہے، اور قیامت کے دن، جب کوئی کسی کا نہیں ہوتا پھر بھی کوئی کسی کا ہو جاتا ہے۔ میرے گینگ کو کچھ معلوم نہ تھا۔ میرا گینگ سمجھتا تھا کہ میں پچھلے چھ ماہ سے آپ کو اس کے جنگل میں پھنسانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرے گینگ کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں پچھلے چھ ماہ سے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ آج آپ کی اور میری آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد میں آپ کا تعاقب نہ کروں گی۔ اس کے بعد میں گینگ کے لئے کام کرنے سے انکار کر دوں گی، اور گینگ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا، ظاہر ہے پستول کی گولی! میری موت! خدا حافظ! جائیے، آپ فوراً یہاں سے چلے جائیے۔ آپ سخت خطرے میں ہیں۔ گینگ صرف سورج کے غروب ہونے کا انتظار کر رہا ہے"۔

اور جیپ خانقاہ کے پاس نمودار ہو گئی۔ وہ چلائی: "وہ آگئے۔ جاؤ! خدا کے لئے جلدی جاؤ!"

میں نے کار کا دروازہ کھولا۔ اور اصغری بیگم سے کہا: "گھبراؤ مت! کار میں بیٹھو! وہ ہمیں نہیں پکڑ سکیں گے"۔

وہ گھبرائی ہوئی بولی: "نہیں! نہیں!! اب میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میرے جانے کا وقت نکل گیا ہے، اب وہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانے دیں گے"۔

میں نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "اور اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے اصغری سے جدا نہیں کر سکتی"۔ میں نے اصغری بیگم کو بازو سے پکڑ کر کار میں بٹھا لیا اور کار سٹارٹ کر دی۔

ڈز! ڈز! ڈز! ڈز! ——— کار کے پہیے ریت میں دھنس گئے۔ اصغری بیگم سخت گھبراہٹ میں بولی: "انہوں نے کار کو پنکچر کر دیا ہے!"

میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا: "گھبراؤ نہیں، میرے پاس ریوالور ہے"

جیپ میری کار سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئی۔ اصغری بیگم دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میں ریوالور لیکر دوسرے دروازے سے باہر نکلا۔ اصغری بیگم رونے، گڑگڑانے اور چلانے لگی:

"ابا! ابا!! ان کو چھوڑ دو۔ ان کی جان بخش دو۔ یہ میرے دوست ہیں۔ مجھے ان سے محبت ہے!"

ڈز! ڈز! ڈز! ڈز! ——— اصغری بیگم ریت میں اور خون میں ڈھیر ہو گئی۔ میں اس کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھا۔

ڈز! ڈز! ڈز! ——— پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا +

★

"اسٹائل" ——— بقیہ صفحہ: (۱۸)

رہتا ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ وہ بہ اعتبار موضوع یا تکنیک کس قدر متنوع ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے (یہاں میں شخصیت کی انفرادیت کو سامنے نہیں رکھتا ہوں) اسٹائل کو بہ حیثیت مجموعی پانچ بڑے خانوں میں تقسیم بھی کیا جا سکتا ہے۔

ایک اسلوب زیر لب گنگنانے، خود اپنی ذات سے ہمکلام ہونے یا اپنے ہی خواب میں در آنے کا ہوتا ہے۔ دوسرا خواب سے بیدار ہو کر دوسروں کو جھنجھوڑنے اور جگانے کا۔ تیسرا کاروباری جسے ان دنوں صحافتی کہتے ہیں۔ چوتھا خالصتاً فکری اور پانچواں طنز و مزاح کا کہ بڑا اثر یہ ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد میرا یہ کہنا اپنی بات کو دہرانا ہو گا کہ نہ صرف یہی صحیح ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ بلکہ یہ بھی صحیح ہے کہ جس طرح نے کی آواز میں نے نواز کا سوز دروں ہوتا ہے نہ کہ کانا مرسنے۔

اسی طرح شعر و ادب کی جلوہ ریزی میں فنکار کا سوز دروں یا اس کی شخصیت ہی بالآخر اہم ہوتی ہے نہ کہ اس کی زبان دانی ؎

بقدر حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

اور اسلوب اس کی اسی شخصیت کی انفرادیت ہی سے متعین ہوتا ہے لیکن نکھار اس اسلوب میں فن پہ کمال حاصل کرنے ہی سے پیدا ہوتا ہے +

افسانہ:

ابو سعید قریشی

کلفٹن کے فرکری و برلیمپ یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے اجالے کو دور کرنے کے لئے کسی نے اندھیرے کے دیئے جلا دئے ہوں، باغ کے تختے، زمین پر چھوٹتے ہوئے معلق ہونے کا احساس اور کراچی کا ہجوم! سایوں کے اس انبوہ میں میری نظریں ایک ایسے چہرے پر پڑیں جسے میں نے کہیں دیکھا تھا۔ مجھے سمی یاد آگئی اور اس کے قہقہے میرے کانوں میں گونج اٹھے۔

اس کا نام ثمینہ تھا لیکن ہم لڑکیاں اسے سمی کہا کرتیں۔ اس کے پاؤں چلتے وقت زمین کو تھوڑی چھوتے تھے۔ بجلیاں بھری ہوں جیسے، ہوا میں ناچ رہی۔ اس کا وجود ہوسٹل کی بند فضا میں آزاد چڑیوں کی ہوا کا جھونکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ کسی گیت کا ٹکڑا ہوتا۔ اور جیسے بھونرا کبھی باغ کے ایک کنج میں ہوتا ہے کبھی دوسرے میں، سمی کی گنگناہٹ کبھی ڈارمیٹری میں سنائی دیتی، کبھی کسی سینئر کے کیوبیکل میں اور کبھی کومن روم میں۔ وہ کہا کرتی چگلیو اس مل بیٹھنے کو غنیمت جانو۔ ناؤ کے مسافر، ترکھن کی مٹیاریں اور ہوسٹل کی سہیلیاں کب کب اکٹھی ہوتی ہیں۔ اور ہماری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ نکلتے۔ مگر اس کے حسین مسکراتے چہرے کو دیکھ کر ہمیں اپنے دکھ درد سب بھول جاتے۔ اس کی جگنوؤں سی آنکھیں بجھے دلوں کے دیئے جلاتی تھی۔ وہ کہا کرتی، میری باتیں کہیں لکھ رکھو۔ یہ تمہیں فلسفے کی کتابوں میں نہیں ملیں گی۔ افلاطون اگر آج زندہ ہوتا تو سقراط کے بجائے میری شاگردی کرتا۔ "ایک دن آئے گا کہ تمہیں میرے اقوالِ دانش یاد آئیں گے۔ تو سنو:......

بوڑھی شکی مزاج وارڈن کے بارے میں اس نے ایک روز کہا تھا کہ اگر تم میں سے کسی کو ایسی ساس مل گئی تو کیا کرو گی؟ یہ تو تمہارے پارٹ کی ریہرسل ہے۔ آئندہ زندگی کے لئے ریاضت ہے!۔ فوج ہم کہتیں: زہر نہ دے ڈالینگی ہم ایسی ساس کو۔ اس کا جواب ہمیں یہ ملا تھا کہ زہر اتنا آسان نہیں ہوتا، کھاتا نہ کھلانا ہوتا تو موٹروں کے بجائے لوگ زہر کے پرمٹ لیتے۔ اور ہاں بوڑھی وارڈن جوان سوتیلی ماں سے تو بری نہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ چھٹیوں میں جب میں گھر جاتی ہوں تو مجھے تمہارے خط بھی سنسر ہو کر ملتے ہیں۔ اور ہم چیخ اٹھی تھیں۔ ہائے اللہ! اس روز ہمیں اپنی بوڑھی وارڈن مس برق، جس کو ہم مس کیکٹس کہا کرتی تھیں، فرشتہ بن کر دکھائی دی تھی۔ اور ہمارے دل سمی کے لئے ہمدردی کے جذبات سے معمور ہو گئے تھے لیکن اس نے ہمارے جذبات کو تمسخر آمیز قہقہوں میں اڑا دیا تھا۔ اور ہم ایسی خفیف ہوئی تھیں کہ بس۔

سمی کو مصوری کا بے پناہ شوق تھا۔ کارٹون بنانے کا تو اسے کچھ ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ بس۔ بڑی بڑی ناک چڑھی صاحبزادیاں کوٹلے کے اس ٹکڑے سے کاپیا کرتی تھیں جس سے وہ بیگمات کی چڑیلیں بنا کر رکھ دیتی تھی۔ لیکن قدرتی مناظر اور سٹل لائف سے اس کو خاص لگاؤ تھا۔ وہ کہا کرتی کہ مجھے ان کا تعاون کا جذبہ بہت پسند ہے۔ یہ احتجاج کے لفظ سے ناآشنا ہیں۔ کاسنی پھول کو لال رنگ کر دو تو بھی وہ اعتراض نہیں کرے گا۔ یعنی اسے دوسرے کی رائے کا احترام کرنا آتا ہے اور اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ کہو کیا فلسفہ ہے؟ تم لوگ تو بے کار برٹرینڈ رسل اور جانے کس کس کے پیچھے بھاگتی ہو۔

اس طرح ہنسی ہنسی میں وہ جانے کیا کچھ کہہ ڈالتی اور ہمارا دل بہلاتی رہتی لیکن ہم اس سے جلد محروم ہو گئیں۔ ایک مرتبہ جب وہ چھٹیوں میں گھر گئی تو کالج کھلنے کے قریب اس کا خط آیا کہ میری والدہ زیادہ تعلیم کی قائل نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زیادہ لکھ پڑھ کے لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں۔ ابا سے کہہ رہی تھیں کہ اس چڑیل کو ٹھکانے لگاؤ۔ الیف اے تو پاس کر لیا۔ یا نوکری کراؤ گے اور خاندان کی ناک کاٹو گے۔ اچھا اب خدا حافظ۔ مس کیکٹس سے میرا اسلام کہنا خدا کرے کہ وہ سسرال میں میرا انتظار نہ کر رہی ہو۔ اچھا رخصت۔ دیکھیں اب ناؤ کے مسافر پھر کب اکٹھے ہوتے ہیں۔

اس روز کلفٹن کے باغ میں یہ باتیں مجھے پھر یاد آ گئیں۔ لیکن کیا یہ سمی ہی ہے؟ میں سوچ میں پڑ گئی۔ وہ تو ڈھائی گز کے دوپٹے کا بوجھ بھی برداشت

نہیں کر سکتی تھی۔ بس ایک چیز ہی ہوتی تھی گلے میں اور یہ برقع پوش۔ ٹھیک کہ اس نے نقاب الٹ رکھا تھا لیکن تھی اور برقع! چاہے پیرس کی ایجاد کیوں نہ ہو یہ بات میرے ماننے ہی میں نہیں آ سکتی تھی اور قریب تھا کہ میں پاس سے نکل جاتی لیکن شاید وہ میرے دل کا حال جان چکی تھی۔

"ہاں ہاں میں تمہی ہی ہوں بھئی۔ کیوں؟" — اللہ! اس کیوں، میں جو اس کے منہ سے ادا کیا تھا جانے کیا بات تھی کہ میرے جی میں آئی تھی سے لپٹ کر خوب زور زور سے روؤں۔ مگر اس نے میرے ہاتھ تھام لئے۔ "ادھر آ جاؤ۔ اس کنج میں، اگر ہم یہیں رونے لگیں تو وضع داری کے خلاف ہوگا، نہیں سمجھیں؟ ارے تم میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ یہ برقع! ارے بھئی ساڑھی، غرارے اور شلوار قمیص کی طرح یہ بھی لباس ہے۔ ٹھہرو۔ میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں۔ لیکن پہلے یہ کہو کہ شادی ہو گئی تمہاری؟

"نا" میں نے کہا۔ "امی کہہ رہی تھیں ایسی کونسی جلدی ہے۔ جہاں بی اے کیا ہے وہاں ایم۔ اے بھی کر لو۔ ہم تو یہی جہیز تیار کر رہے ہیں تمہارے لئے۔ دبابا۔ ہم نہیں مانتے۔ اگر لڑکیاں بھی ایم۔ اے کر کے بیٹھ گئیں تو مرد بیچارے کیا کریں گے۔

انہیں تو آنریری ڈگریاں بھی مل جاتی ہیں۔ میں نے کہا۔

وہ ہنسی۔ اور میرے کانوں میں ایک بار پھر وہی آواز گونج اٹھی جو روٹھی ہوئی روحوں کو منایا کرتی تھی۔

مگر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہ بولی۔ میں تمہیں ایک راز بتانے والی تھی۔ گرہ سے باندھ لو، چٹیا میں گوندھ لو یا تعویذ بنا کے گلے میں ڈال لو۔ سنو: انسانی جسم۔ اور خاص طور پر یہ عورت کا چہرہ بڑی گھناؤنی اور خوفناک چیز ہے۔ اس لئے اس کو ہمیشہ چھپائے رکھو۔ جس طرح آدمی ناسوروں پر پٹی باندھ لیتا ہے، اسی طرح اس کو غلافوں اور نقابوں میں ملفوف رکھو۔ تم کو بھی میں یہی مشورہ دوں گی کہ برقع پہنو۔ قوم کی نجات برقعے اور محض برقعے میں ہے۔ سب ناسوروں کو چھپا دو اور سمجھو کہ وہ نہیں ہیں۔ اور ہاں۔ اس کا لہجہ انتہائی رازدارانہ ہو گیا۔ اور ہاں، حسن کو کیا سمجھیں۔ حسن کو خدا کا عذاب سمجھو۔ اور ان بدبخت شاعروں، مصوروں، سنگتراشوں اور افسانہ نگاروں کی ایک نہ سنو، ایک نہ مانو۔ وہ تو اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ کہو کیسی تقریر تھی؟ آخاخاخا۔ اور پھر وہ یکایک خاموش ہو گئی۔ خیر ہٹاؤ۔ تم اپنی کہو نجو۔ کیا حال ہے تمہارا؟ جی چاہتا ہے تم سے خوب زور سے گلے ملوں اور اونچی اونچی آواز میں چیخیں ماروں۔ اتنی خوش ہوں میں، اتنی خوش ہوں میں مگر تماشہ بن جائے گا۔ اور یہ تو پہلے ہی تماشائیوں کا شہر ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ فریدہ اور ریحانہ اور نکہت کہاں ہیں۔ میکے میں یا سسرال گئیں؟ اور سچی میں نے سنا ہے کہ مس کیکٹس، اللہ معاف کیجیو، مس برچ مرے ہوئے آدمی کے نام رکھنا گناہ ہوتا ہے بھئی۔ ہاں تو مس برچ چل بسیں بے چاری۔ چلو کوئی بات نہیں۔ اگر اُس دنیا میں بھی کوئی ہوسٹل ہے تو اس کو ضرور جگہ مل جائے۔ تجربہ کار آدمی ہے بے چاری اور یہ ایکسٹنشنز کا زمانہ ہے۔ خدا غریب کے گناہ معاف کرے۔ اور ہماری بھی عاقبت سنوارے۔ خیر، اب یہ بتاؤ کہ تم کب آئیں اور کیسے آئیں زندوں کے اس قبرستان میں؟

میری خالہ یہیں ہیں نا آجکل۔ یونیورسٹی بند تھی۔ میں نے کہا چلو کراچی ہی کی سیر کر لو، ٹھہرنے کی جگہ تو ہے ہی۔

اری اس کی یہاں کوئی کمی نہیں۔ وہ کیا کہا تھا مرزا غالب نے ؎ ...... یہ وہ کافر دل ہے۔ لو بس۔ مگر تم نے ابھی ابھی وہ کیا نام لیا تھا بھلا سا۔ یونیورسٹی نا! وہ کیا ہوتی ہے بہن۔ دیکھو بھئی تم ہمارے ساتھ انگریزی مت بولو۔ ہمارا تمدن غرق ہو جائے گا۔ ثقافت غالودہ ہو جائے گی، میرا مطلب ہے کثافت آلودہ ہو جائے گی۔ ارے! ایک تو یہ "ق" مجھ سے کبھی ادا نہیں ہوتا۔ ہمیشہ گھپلا کر جاتی ہوں۔ ہمارے یہاں ایک بڑی بی آیا کرتی تھیں۔ حیران کو حریان اور بالکل کو کلبل کہتی تھیں بے چاری میں نے اس کی نقل اتاری تھی۔ اور میں جو الفاظ کو یوں گڈ بڈ کر جاتی ہوں تو یہ اسی کی سزا ہے شاید۔ وہ کس کا قول ہے ؎ بڑا بول بولو نہ ہرگز کبھی۔ شیخ سعدی تو نہیں؟ مگر وہ تو فارسی گو تھے۔ دماغ کیا خراب ہو گیا ہے۔ اب فارسی بھی نہیں پہچانی جاتی۔ یہ سب تمہاری نگوڑماری اردو کی مہربانی ہے۔ اب عربی داں ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔ اس کا عین غین ہمیشہ صاف ہوتا ہے۔ ہمارے محلے کے منّاجی اردو کو بھی، شربی، ہی کہتے ہیں جناب۔ کیا سمجھیں۔ یہ چیز پکتی کیسے ہے، اس کا مجھے علم نہیں۔ شاید مصادر کا مسالہ لگتا ہے۔ ہاں، ابھی یہ تو بتا نا کہ 'مسا' س سے ہے، ص سے یا ث سے۔ اور وہ دوحشی ہے یا کانی، یا وہ حلوے والی۔ ارے توبہ اب ہمارے حجوں کی حالت یہ ہو گئی۔ اور یہ سب عربی سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ جبھی تو وہ کہتے ہیں کہ عربی بولو، عربی لکھو اور عربی کھاؤ — تم بھی عربی کا ایم۔ اے کر رہی ہو نا!

نہیں۔ AESTHETICS میں نے کہا

اچھا۔ ANESTHETICS یعنی بے ہوش کرنے والی ادویہ کی ماہر بن رہی ہو تم۔ ڈاکٹری، ڈاکٹری ۔ اور پھر وہ ہنسنے لگی۔ وہی اگلے وقت کی کھنک تھی جیسے پائل بول رہی ہو۔ مگر وہ یکایک خاموش ہو گئی۔ اور اس کی نظریں سامنے جھاڑیوں پہ گڑ گئیں۔ لو بھئی بڑی بی بھی آگئیں۔ اس عمر میں بھی وہ نظر پائی ہے کہ سوئی میں دھاگہ ڈلوالو چاندنی رات میں مجھے تو لاکھوں کے ہجوم میں بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ یاد دلانے آئی ہے مجھے گھر چھوڑ کے ڈرائیور کو انہیں جہانگیر پارک سے لاتا ہے۔ مجلس ثقافتِ شرقیہ کا خاص اجلاس ہے نا آج۔ حقوقِ نسواں پہ مذاکرہ ہے کوئی۔ جانے کیا ہوتا ہے۔ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ یہ کہتے ہیں کہ بڑا بڑا وہ آیا ہوا ہے سمجھو لو مصر شریف سے، بغداد المقدس اور عربیہ سے۔ گھر میں پھر باتیں کرنے بیٹھ گئی۔ کار لیٹ نہ ہو جائے کہیں۔ اور میں نے آج تک انہیں شکایت کا موقع نہیں دیا۔ رخصتی کے وقت والد صاحب نے کہا تھا کہ اب تو اس گھر کی ہوئی۔ ایسے میں آدمی مالک کو ناراض نہیں کر سکتا۔ اچھا بھئی اب چلتی ہوں۔ کل تم سے پھر ملاقات ہو گی، جی بھر کے۔ تین بجے چلی آنا۔ چائے وہیں پینا۔ خوب گپ رہے گی۔ ابھی تو مجھے تمہاری کہانی سننی ہے۔ آج تو میں ہی بکواس کرتی رہی۔ تمہیں دیکھ کے اگلی عادت پھر زندہ ہو گئی۔ رسی کا بل! میری خوشدامن بھی مجھ سے یہی کہا کرتی ہیں کہ بہو تیری زبان تو سروتے کی طرح چلے ہے۔ بوڑھی ہو گئیں بے چاری۔ جان ان کی پاندان میں بند ہے۔ کہانیوں کے جن کی طرح۔ کھانا چاہے ملے نہ ملے پان ضرور ملنا چاہئیے۔ ہاتھوں پہ بس مہندی لگی معلوم ہوتی ہے۔ ارے تو بہ پھر وہی داستانِ امیر حمزہ شروع کر دی میں نے۔ اب بڑی بی کو کیسے بتاؤں کہ تم میری کون ہے۔ یہ میری سہیلی ہیں بڑی بی۔ کل ہمارے یہاں آرہی ہیں۔

مجھے اپنے گھر کا پتہ دے کر وہ چلی گئی۔ اور میں سوچتی رہ گئی کہ سمی کو ملنے سے مجھے خوشی ہوئی تھی یا رنج ہوا تھا۔ ٹھیک کہ وہ ہمیشہ کچھ اسی انداز سے باتیں کیا کرتی تھی اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ کونسی بات سنجیدگی سے کہہ رہی ہے اور کونسی محض دل لگی سے لیکن اب کے اس کے لہجے میں کچھ اور بھی تھا۔ جیسے ستار کی ایک طرب غلط آواز دے رہی ہے۔ لیکن یہ خود میرے کانوں کا بھی قصور ہو سکتا تھا۔ اس سے ملے آخر دس سال گذر چکے تھے۔

مگر۔ مگر اس کا چہرہ؟ ایسے میں چند غیر ملکی عورتیں میرے سامنے سے گذریں۔ ان کے چہروں پر بھی وہی نیلاہٹ اور مردنی تھی۔ مرکری ویپر لائیٹ کا شعبدہ لیکن برقع! میں نے سنا تھا کہ انہیں دنوں کچھ دیوانے بے نقاب پھرنے والی خواتین کی چٹیاں کاٹنے کے لئے اپنی آستینوں میں قینچیاں چھپائے پھر رہے تھے۔ چنانچہ بعض آزاد خیال خواتین بھی مستورات بن گئی تھیں اور برقع دوزی کا کاروبار چمک اٹھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی بے شمار خواتین کھلے چہرے پھرتی تھیں۔ تو؟ اور میں یہی سوچتی گھر پہونچ گئی۔ رات کھانے پہ خالہ خود بلانے آئیں تو مجھے خیال آیا کہ میں نے ابھی کھانا بھی نہیں کھایا۔ لیکن بھوک نہیں تھی۔ جی چاہتا تھا کہ رات جلد ختم ہو اور جلد سمی سے ملوں اور پوچھوں کہ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ رات کٹی تو دن ڈھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ایک ایک گھنٹہ سال سال بھر کا ہوا جا رہا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے گھڑی نے اڑھائی بجائے۔ میں نے ٹیکسی منگوائی اور سمی کا پتہ دیا۔

ٹیکسی جمشید روڈ کے ایک عظیم الشان بنگلے کے سامنے آکے رکی، جسے دیکھ کر ایک بار تو میں گھبرا گئی۔ اور سوچنے لگی کہ یہ مکان سمی کا نہیں ہو سکتا۔ مکان کے باہر الحاج مرزا عبدالمتین چاندی والے کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ اور لوہے کے جالی دار دروازے پر "دارالبرکات" کے حروف چمک رہے تھے۔ میں اسی شش و پنج میں تھی کہ اتروں یا لوٹ جاؤں کہ اتنے میں وہی رات والی بڑھیا دروازے کی جانب آتی دکھائی دی اور میری ڈھارس بندھی کہ پتہ ٹھیک ہی تھا۔

چلی آؤ نا بٹیا۔ بڑھیا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ بہو بیگم تو صبح سے تمہارا انتظار دیکھ رہی ہیں۔

یہ کہتے وقت بڑی بی مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں سے میں گھبرا گئی کہ کہیں کپڑوں میں شکن تو نہیں پڑے تھے، لیکن میری توجہ ہٹ گئی۔ فوارہ، پھول اور سبزہ زار۔ کراچی میں یہ چیزیں! جہاں تربت پہ چڑھانے کو پھول نہیں ملتے وہاں کارنیشن اور ٹیولپ۔

برآمدے کا فرش سنگِ مرمر کا تھا اور چھت پہ۔ لیکن بڑی بی نے دروازہ کھولا۔ غلام گردش میں سبز قالین فرش بہار کی طرح چمک رہا تھا۔ اور فضا ایر کنڈیشننگ کا پتہ دے رہی تھی۔

ایک اور دروازہ کھلا جس کے آگے ایک بھاری پردہ تھا۔ اور پردے کے پیچھے سمی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

میرا کمرہ ادھر ہے بھئی۔ اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ گھڑیوں کو آج جانے کیا ہو گیا تھا۔ وقت

ٹھ

تھم گیا ہو جیسے۔ اب رک جائے تو احسان بھی مانوں۔ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ یہ کراچی کی آب و ہوا بھی ایک مصیبت ہے۔ یہ تو گلا ہی بٹھا رہتا ہے۔

بنتی کیوں ہو ثمی۔ میں نے کہا۔ کیا میں تمہیں نہیں جانتی؟

یا میں تمہیں نہیں جانتی!

مجھے معلوم نہیں تھا کہ خود میرا گلا بھی رندھ گیا ہے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے ہیں۔ ہم دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

کچھ عجیب میلوڈرامہ ہے۔ ثمی نے کہا۔ لیکن سسٹر قرزڈم کہا کرتی تھیں کہ میلوڈراما ادب عالیہ میں شمار نہیں ہوتا۔ خدا معلوم کیوں؟ دراصل یہ نقاد بڑے فراڈ ہوتے ہیں۔ رعب ڈالنے کے لئے ایسے ہی انٹ شنٹ اصول بنا لیتے ہیں۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ سہیلیاں، ناؤ کے مسافر کہیں اتفاقاً قفلِ ابجد کے حروف کی طرح مل جائیں تو کیا انہیں رونے کا بھی حق نہیں؟ یہ کہہ کر وہ پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ آخر جب ہمارے دل کی بھڑاس نکل گئی تو اس نے ایک تپائی میرے سامنے کھینچتے ہوئے کہا:

لو سیب کھاؤ۔ سنا ہے رقیق القلب، توبہ ہے ان قافوں سے، میرا مطلب ہے سیب ہم جیسے کمزور دل والوں کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ کیا کہتے ہیں ایسی چیز کو؟ ہاں۔ مفرح الحکیم پتہ نہیں کیا نوتس کہ فوتس نے ہاں ہاں جعلینوس، میرا مطلب ہے جالینوس نے اسے حتمی علاج بتایا ہے۔

میں ہنس پڑی مجھے پھر وہی ثمی یاد آ گئی جو سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو بھی ہنسی میں اڑا دیا کرتی تھی۔ نقلیں اتارنے کا تو اسے خاص ملکہ تھا۔

ارے تم میری عربی سے مرعوب نہیں ہوئیں؟ شین قاف اور عین غین کی مشق کرتے کرتے میرا کنٹھ ابھر آیا اور تم ہنس رہی ہو۔ خیر ہٹاؤ۔ فی الحال سیب کھاؤ۔ چھلکے سمیت کہ چھیل دوں؟ ویسے حیاتین جنہیں تم لوگ وٹامن کہتی ہو، چھلکے ہی میں ہوتے ہیں۔ سوچ کیا رہی ہو!

یہ رنگ، یہ خوشبو، میں نے کہا۔ پھولوں کی طرح سیب تو دراصل دیکھنے کی چیز ہے۔ مگر اس نے میری بات کاٹ دی۔

لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ سیب ہو یا پھول زیادہ عرصہ شاخ بھی اسے اپنے ساتھ نہیں رکھتی۔ مگر میں پھر جانے کیا فلسفہ بکنے لگی ہوں۔ دراصل تمہیں ملنے کی خوشی سے میرا دماغ چل گیا ہے۔ چلو میں تمہیں، اپنا مکان دکھاؤں۔ اہلِ ذوق کی زیارت گاہ ہے یہ بنگلہ۔

بے شک۔ میں نے کہا۔ اتنا سنگِ مرمر تو میں نے مغلوں کے محلوں ۔۔۔

یا مقبروں ہی میں دیکھا ہوگا۔ ثمی نے میری بات کاٹی۔ اور قہقہہ لگایا۔ ایک تو میری قہقہہ بازی نہیں جاتی کمبخت۔ یاد ہے نا، ہماری کیمسٹری ٹیچر کیا کہا کرتی تھیں مجھے: "YOU ARE A FLASK OF LAUGHING GAS, SAMINA." ناک میں دم تھا بے چاری کا۔ شکر کرتی ہوئی کہ بلا ٹلی۔ لڑکیوں کو لوگ پیار سے بھی بلا ہی کہتے ہیں بجو، ماں باپ بھی، تم نے کبھی سوچا: کیوں؟

مگر اتنے میں اس کی خوابگاہ آ گئی۔ اور یہ میرا پلنگ ہے بھئی۔ اس کے ساحل کا مجھے کبھی پتہ نہیں چلا۔ آڑے ترچھے کیسی طرح لیٹ جاؤ۔ چاروں طرف پلنگ ہی پلنگ ہوتا ہے۔ جب میں اس پہ لیٹتی ہوں تو سمت کا احساس نہیں رہتا۔ کہا تا سمت کی حس سُن ہو جاتی ہے۔ چھت پہ ٹریفک سگنل لگوانے کی سوچ رہی ہوں۔

۔۔۔ اور یہ ادھر بچوں کا ہوسٹل سمجھ لو۔ ایک فقط مس برج نہیں ہے۔ ثمی نے کہا۔ اس وقت چائے پی رہے ہوں گے۔

اس نے دروازے پہ آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے آواز آئی: تشریف لے آئیے۔ ہم نے دروازہ کھولا تو السلام علیکم کے کورس نے ہمیں سر پہ اٹھا لیا۔ بیٹھ جاؤ بھئی۔ ثمی نے کہا۔ اور ہاں وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔ یہ میری سہیلی ہیں۔ میں نے کہا تم سے بھی ملتی جائیں۔ ایک ایم اے کر رہی ہیں۔ ہر چند کہ لڑکیوں کو اتنی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن کسی کو جتنا پڑھنا ہو اس کے لئے تو استاد کی ضرورت ہوتی ہی ہے نا۔ اور کالج میں استاد کی اپنی تعلیم کم از کم ایم۔ اے تک ہونی چاہئے۔ اگر تم میں سے کسی کو کبھی جمالیات کے مضمون سے دلچسپی ہوئی تو شاید تمہیں میری انہی سہیلی سے پڑھنا ہوگا۔ ان کا نام یاد رکھنا نجمہ۔ میں انہیں بے تکلفی سے بجو کہا کرتی ہوں۔ ہاں تو آدمی جس طرح نیم حکیم سے ڈرتا ہے اسی طرح اس کو نیم استاد سے بھی خوف کھانا چاہئے۔ کیوں ہے نا بشریٰ۔

جی امی جان۔ بشریٰ نے کہا۔ وہ کوئی سولہ سترہ برس کی لڑکی تھی لیکن قد ثمی سے نکلتا ہوا۔ بدن قدرے بھاری اور چہرے پہ تمسخر، خوف اور ادب کے ملے جلے جذبات۔ میری بوکھلاہٹ جو ثمی کی مبہم باتوں سے پہلے ہی بڑھتی چلی آ رہی تھی، اب بالکل ہی پہیلی بن گئی۔ میں نے ثمی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے نازک ہونٹ تھرتھرا رہے تھے جیسے تذبذب میں ہیں کہ ہنسیں یا رو دیں۔

سلمیٰ بڑی نیک لڑکی ہے ماشاءاللہ۔ سمی نے کہا۔ اب کے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن حاصل کیا ہے۔ عربی میں اول آئی ہے۔ مجھے اس سے صرف ایک شکایت ہے۔ میں چاہتی تھی کہ یہ سب بچے مجھے آپا باجی کہیں۔ لیکن ان کے ابا مصر ہیں کہ امی، میرا مطلب ہے امی ہی کہا جائے۔ اور یہ کبریٰ، طغریٰ، صغریٰ اور طوبیٰ ہیں۔ بڑی ارجمند، ایسی سلیقہ شعار، باتمیز، مہذب کہ ان کی موجودگی کا گھر میں پتہ ہی نہیں چلتا۔ اب میں ٹھہری ہوسٹل کے شور کی عادی ایسے میں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کبھی کبھی کہ ماشاءاللہ بھرا گھر ہو اور اتنی چپ چاپ —— مگر بیٹھ جاؤ نا بھئی۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے تمہاری۔ اور یہاں سیب دے جائے خانساماں نے؟ چائے کے ساتھ پھل ان کا معمول ہے بچو۔ ان کے ابا تو چائے پسند ہی نہیں کرتے۔ بس رواج ہے اس لئے بنتی ہے۔ اور اس گھر میں اس رواج کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری مجھ پہ ہے۔ اچھا بھئی خدا حافظ!

اس خدا حافظ کی بازگشت نے ہمیں کمرے سے باہر پھینک دیا۔ سمی نے کہا: دیکھا۔ یہ ہے تربیت۔

سمی کے کمرے میں چائے تیار پڑی تھی آبنوس کی ٹرالی پہ چاندی کے برتن اندھیری رات میں جگنوؤں کی طرح جگمگا رہے تھے کیا کھاؤ گی؟ سمی نے میز کی طرف اشارہ کیا جہاں کوئی بیس قسم کی مٹھائیاں پڑی تھیں۔

صرف چائے۔ میں نے کہا۔

وجہ، باعث، سبب، جواز؟ سمی نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

تمہاری باتوں سے بھوک مٹ گئی۔

پھر تو میں واقعی بڑی قیمتی جنس ہوں۔ نافہ آہو کی طرح مجھے صندوقچی میں بند رکھنا چاہیئے —— شکر؟ جاہل لوگ چینی کہتے ہیں۔ کے چمچے؟

میں کہنا چاہتی تھی چاہے کتنی الٹ دو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن پردے کی سلاخ پر پیتل کے چھلے جھنجھنائے۔ اور ایک بزرگ صورت سامنے نظر آئی۔ چھوٹی موہری کا پاجامہ، پاؤں میں مخملی جوتی۔ اوپر سفید ریشمی اچکن جس کے ساتوں بٹن گلے تک بند۔ اور سر پہ دوپلی ٹوپی۔ بدن دوہرا۔ اچکن کے نیچے توند کا ابھار۔ چہرے پر بھرپور ڈاڑھی، لبیں ترشی ہوئیں۔

اوہ بھئی معاف کیجئے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ پردہ ہے۔ اور وہ الٹے پاؤں لوٹ گئے۔ لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دروازے میں اس جگہ پہ کھڑا ہمیں گھور رہا ہے۔ اتنے باہر سے آواز آئی اللہ جانے یہ بڑی بی کہاں مر گئی ہے۔ کسی نے بتایا تک نہیں کہ مہمان آئے ہوئے ہیں بیگم صاحب کے! اور پھر ایک بڑی سی لاحول کا ریڈ دور میں گونجی۔

خسر ہیں تمہارے؟ میں نے سمی سے پوچھا۔ جواب ملا۔ توبہ! بڑی آئیں صورت شناس۔ میرے۔ میرے میاں ہیں بھئی۔ شوہر میرے۔ سفید بالوں سے دھوکا ہوا تمہیں۔ پگلی! بال تو آدمی کے سائے میں بھی سفید ہو جاتے ہیں۔ دھوپ کی بھی شرط نہیں۔ یہ دیکھ لو! —— اور سمی نے اپنا جوڑا کھول کے ہتھیلی پہ پھیلا دیا۔ لو؟ آیا خیال شریف میں۔ چہرہ شناسی اور عمر کا اندازہ لگانا کالج کی لڑکیوں کا کھیل نہیں جناب! —— مگر پردوں کے چھلے پھر چھنکے۔ اور بڑی بی نمودار ہوئیں۔

میاں کہتے ہیں کہ مہمان سے معافی مانگئے گا میری طرف سے۔ میں غلطی میں چلا آیا۔ اور پوچھتے ہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

نہیں بڑی بی۔ کچھ نہیں چاہیئے۔ شکریہ! بڑھیا چلی گئی تو سمی مجھ سے مخاطب ہوئی، دیکھا!

ہاں۔ دیکھا! میں نے کہا۔

حسد نہ کرنے لگنا خدا کے لئے۔ ایسا برخوردار شوہر کسی نصیبوں والی کو ملتا ہے۔ اور اس نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور میرے بدن سے گویا جان ہی نکل گئی۔ اتنا دھیان رکھتے ہیں میرا کہ بس۔ ذرا گرمی پڑی اور کولر لگوا دیئے۔ نوکروں کو حکم ہے کہ دلہن بیگم کو ذرا تکلیف نہ ہو۔ اور تو نے خسر بنا دیا۔ واہ! میں کہنا چاہتی تھی کہ بنو نہیں اب۔ مگر اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ جب وہ بول رہی ہو تو پہلے بھی کسی کو باری نہیں ملا کرتی تھی۔ اور اب تو ——

—— مرا زیور نہیں دیکھا تو نے۔ ایک تو ہی ہے جس نے مجھ سے یہ فرمائش نہیں کی۔ دانہ۔ خیر۔ یہ دیکھ۔ وہ ایک پوشیدہ طاقچے سے زیور کا صندوقچہ نکال لائی۔ عام استعمال کی چیزیں رکھی ہیں۔ یہاں۔ باقی بینک میں ہیں کہ کون حفاظت کرتا پھرے۔ میرا تو خیر جی ہی نہیں چاہتا کچھ پہننے کو۔ کون وزن اٹھائے پھرے۔

مگر ان کی خاطر۔ یہ موتیوں کی مالا نہیں دیکھی تم نے۔ وہ سراج کرنے گئے تھے تو لوٹتے وقت عدن سے لائے تھے۔ میرے بیاہ سے پہلے کی بات ہے یہ — اس نے ہار میرے گلے سے لگا دیا۔ اور کتنا پیارا لگتا ہے تمہیں۔ یہ تمہارا ہوا نجو۔ جب شادی ہوگی تمہاری —

شادی؟ میں نے کہا۔

کیوں۔ سوچ میں پڑ گئی۔ کہیں مس برچ کا اثر تو نہیں ہو گیا؟

شادی کا اگر یہی مآل ہے تو؟ — میں نے کہا۔ اور پھر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں پھوٹ پڑی۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے کہیں۔ رحم آتا ہے واقعی کہ تمہارا یہی انجام ہونا تھا۔

رحم، ہمدردی! وہ پھڑک اٹھی۔ یہ کیا بک رہی ہو۔ میں کوئی کوڑھی ہوں، اپاہج ہوں، بیمار ہوں، مفلوج ہوں کہ رحم اور ہمدردی کی طالب ہونے لگی۔ ان الفاظ سے مجھے نفرت ہے نفرت! اور پھر جیسے اپنی آواز کی بلندی سے گھبرا گئی اور چپ ہو گئی۔ پردے کے چھلے اس وقت پھر جھنجھنائے اور بڑی بی نمودار ہوئی۔

آپ نے مجھے آواز دی تھی بیگم صاحب؟

ہاں بڑی بی۔ سمی نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔ سمی کیا کہنا تھا مجھے۔ توبہ ہے! ہاں چلنے کچھ ٹھنڈی ہو گئی ہماری باتوں میں۔ میں نے کہا بڑی بی کو زحمت دوں۔ اچھا اور کہو، نجو،

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ معاً مجھے اس کی مصوری یاد آ گئی۔ میں نے پوچھا صورت گری کا کیا حال ہے؟

صورت گری۔ صورت گری کہا نا تم نے؟ جیسے کسی نے جگا دیا ہو۔ ہوں تصویریں۔ ایسے ہی لڑکپن کا خبط تھا وہ۔ اور اس کے ہونٹوں پہ ایک راضی برضا سی مسکراہٹ نظر آئی۔ صورت گری نجو؟ — سچ تو یہ ہے کہ اب دل کا زور نہیں رہا!

مجھے دفعتاً محسوس ہوا کہ سمی کے کانوں میں ہیروں کی بجلیاں یکایک بجھ گئی ہیں اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہے۔ مگر عین اس وقت کلاک کی کوئل پانچ بار کوکی۔

ارے؟ سمی نے کہا۔ پانچ بج گئے۔ اور تم ابھی آ کر بیٹھی بھی نہیں۔ کالج میں لیسس ہوئی ہو جیسے اور بیٹھ بھی نہ چلے۔ آج کے ٹائم ٹیبل میں لیسن کے بعد بچوں کو دودھ پلانے کا پیریڈ ہے۔ یہ لو آیا بھی آ گئی۔ منوں کو آج یہیں لے آؤ آیا۔ شاباش! ان کی خالہ بھی دیکھ لینگی۔ بڑی پکی دوستی ہے بھئی ہم میں ہوسٹل میں ہم اکٹھی رہا کرتی تھیں۔

ہاں! میں بھی کہوں۔ آج بیگم صاحب بڑی خوش خوش نظر آوت ہیں۔ ضرور کوئی سہیلی ہوں گی پرانی۔ اچھی سہیلیاں سکھیاں مشکل سے ہی ملت ہیں ہو رانی۔

بس! تم خود سیانی ہو۔ اب ذرا منوں کو لے آؤ جلدی سے۔

اب کے پردہ جھنجھنایا تو بچہ گاڑی نظر آئی۔ گاڑی میں دو ننھے منے کلوٹے سے پڑے تھے۔

یہ ہیں جناب ہمارے صاحبزادے۔ ہمارے یہاں تمام غیر فطری رسموں سے نفرت ہے۔ چنانچہ یہ برخوردار محض ماں کا دودھ اور پھلوں کا عرق پیتے ہیں۔ مگر اس کا بھی وقت مقرر ہے — تمہیں ان میں کوئی خاص بات نظر آتی نجو؟

میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ ان دو میں حد درجہ مشابہت! صرف کپڑوں کا فرق تھا۔ سمی بھانپ گئی۔ تمہارا قیافہ درست ہے، اس نے کہا۔ لوگ ایک کو ترستے ترستے ہوئے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور یہاں اللہ نے —

مگر ان کی پرورش؟ اور تم کہتی ہو کہ ڈبے کا دودھ بھی منع ہے۔

ہاں۔ یہ تو ہے! سمی نے کہا۔ مگر سوچتی ہوں کہ اگر دو کے بجائے رباعی ہو جاتی تو میں کیا کرتی۔ کیا کر سکتی تھی میں! یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ یہ صاحب چند گھنٹے پہلے تشریف لائے تھے۔ انہیں زیادہ بھوک لگی ہوگی۔

اس وقت سمی کے چہرے پر مجھے پھر وہی روشنی نظر آئی جو میں نے گذشتہ شام اس عورت کے چہرے پہ پھیلی ہوئی تھی۔ جسے میں نے کبھی دیکھا تھا۔

احساس

محمد عمر میمن

چاچا فضلو نے چونک کر چوکنا نظروں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ گلی کے سرے پر کوئی گوالا اپنی دھن میں کچھ گنگناتا اپنی گائے بھینسوں کو ہانکتا جا رہا تھا۔ اور گلی کے داہنے سرے پر بڑے سے پیپل کے درخت کے نیچے گاؤں کے مکھیا اللہ دیا کی چوپال تھی جہاں ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا رہتا۔ اس وقت بھی حقّے کا دور چل رہا تھا اور گاؤں کے چند نکھٹو قسم کے بے پروا کسان چوپال میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بابا فضلو کو یہاں سے گزرتے ہوئے سخت کوفت ہوتی تھی مگر زمیندار کے مال گوداموں تک بس یہی تو ایک پُرپیچ، نیم روشن گلیوں سے ہوتا ہوا راستہ جاتا تھا۔ مصیبت ساری یہ تھی کہ ہر روز صبح کام پر جاتے ہوئے بابا فضلو کو یہ چوپال میں بیٹھے ہوئے ناکارہ لوگ بلا کر چند ایک منٹ تک عجیب لایعنی سی باتیں کر کے اس کا وقت ضائع کر دیتے تھے۔

وہ حسبِ سابق بالکل انجان بنا سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ اللہ دیا کی نظر اس پر پڑ ہی گئی۔

"ارے چاچا پھجلو جرا اودھر کو تو آؤ۔ کہاں سبیرے سبیرے جات ہو؟" اور وہ پیچ و تاب کھاتا چوپال میں پہنچا۔

"کیا ہے بھائی اللہ دیئے؟" اس نے کھڑے کھڑے پوچھا۔ "ہونا کیا تھا بادشاہو۔ جرا ایک آدھ چلم کا دم ہی لگا لو۔ سبیرے جاوت ہو!" رحمو نائی نے اللہ دیئے کی بجائے جواب دیا اور بابا فضلو نے جلدی جلدی دو چار دم لگائے اور کھانستا ہوا تیزی سے چل دیا۔

"پھجلو تو پاگل ہوئے گیل ہے! روج سبیرے ہی سبیرے کام پر جات ہے، بھلا اس سے کا پھائدا ہوت ہے۔ دوسرے لوگن تو ابیر (دیر) سے کام پر آت ہیں!" کرم دین بولا اور چوپال میں بیٹھے ہوئے سبھی لوگ ہنسنے لگے۔

چچا فضلو کی عمر ایسی کوئی زیادہ بھی نہ تھی۔ یہی کوئی چالیس سال کی رہی ہو گی لیکن ذمّہ داری کے احساس نے اسے قبل از وقت ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ بیوی اللہ نلال تھی۔ یہی کوئی اس سے ایک دو سال چھوٹی ہوئی مگر جسم ابھی تک گٹھا ہوا تھا۔ اور وہ کیا کچھ نہیں چاہتی تھی۔ خود تو کچھ نہ کہتی مگر اس کی ایک ایک حرکت سے دل کی بات جھلک جھلک پڑتی۔ مگر فضلو اسے نہ تو اپنی بیوی سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اپنی جوان لڑکی کی فکر!

★

خریف کی فصل پک کر تیار کھڑی تھی۔ چند ایک کھیت تو کٹ بھی چکے تھے اور برابر والے گاؤں میں بڑے زور شور سے میلہ لگا تھا۔ غریبوں کی زندگی میں خوشی اور مسرت کے بس یہی تو چند ایک موقع ہوتے ہیں جب وہ گھڑی دو گھڑی ہنس بول لیتے ہیں۔ شادیوں میں یا کبھی تین چار سال میں لگنے والے ان میلوں میں۔ گاؤں کا زمیندار بے رحم نہیں تھا۔ اسے اپنے گاؤں کے ان غریب دہقانوں کی زندگی کا پورا پورا علم تھا۔ اس لئے اس نے اپنے تمام ملازمین کو تین روز کی چھٹی دے دی۔ جا کر میلہ ہی دیکھ آئیں۔

دہقانوں کے گروہ کے گروہ حسبِ توفیق اچھے کپڑے پہنے، خوشیاں مناتے، اچھلتے کودتے گاتے ہوئے میلہ دیکھنے جا رہے تھے۔ اور اب گنتی کے چند آدمی ہی گاؤں میں باقی رہ گئے تھے۔ وہ بوڑھے اور چلنے پھرنے سے معذور تھے یا پھر چند ایک ایسے جنھیں جینے کے لئے میلہ دیکھنے سے ضروری کچھ اور کام بھی تھے۔ لیکن فضلو بابا کو تو کوئی کام نہیں تھا اور نہ کوئی ذمہ داری، پھر بھی وہ میلہ دیکھنے نہیں گیا۔ وہ زمیندار کی کل پیداوار، خام مال، بھوسہ، بورے اور دیگر سامان کے ذخیروں کا ذمہ دار رکھوالا تھا۔ وہ روزانہ کھیتوں پر جاتا اور ملازمین کی چوکیداری بھی کرتا، انہیں مناسب ہدایات دیتا۔ تنخواہ بھی اتنی زیادہ نہ تھی لیکن زمیندار سے اس نے کبھی اس کو بڑھانے کا مطالبہ نہ کیا۔ جب اخراجات بڑھ گئے تو اس نے دن کے ساتھ رات گئے تک کام کرنا شروع کر دیا۔ عجیب کم گو قسم کا بابا فضلو بڑی مستعدی سے اپنا کام کرتا۔ اور مستعدی سے کام کرنا تو گویا اب اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ذمہ داری کے احساس نے اس کی ذاتی زندگی اور خانگی زندگی کے تمام احساسات کو برف کی طرح منجمد اور سرد کر دیا تھا۔ خوشی کسے کہتے ہیں یا غم کیا ہے؟ کبھی اس کے مشغول اور منہمک دماغ نے یہ سوچنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی، اور ایک دفعہ جب اس کے کسی قریبی

رشتہ دار کا ننھا سا لڑکا بیل گاڑی سے بری طرح کچل کر مر گیا تو وہ اپنی بیوی کے پیہم اصرار کے بعد چند لمحات کیلئے وہاں گیا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ آخر کیا کرے۔ اور جب کچھ نہ بن پڑا تو اپنی صدیوں پرانی پگڑی کے پلو کو درست کرتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ چلتے چلتے اس کے کانوں میں وہاں آئے ہوئے لوگوں کے جملے پڑے: "اُف کس قدر بھیانک موت ہے!" کوئی کہہ رہا تھا۔ "ہائے رے ننھی سی جان! جب اس کے نازک بدن پر بیل گاڑی کے من من بھر وزنی پہیئے گزر رہے ہوں گے تو ...... ہائے ہائے — آہ!" کہنے والا جیسے اس تکلیف کو اپنے اوپر محسوس کر رہا تھا۔ لیکن بابا فضلو اب ان جملوں کی محدود سرحد کو تیزی سے پار کر کے کرم دین کے کھیت کی منڈیر پر نکل آیا تھا، اور اب تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس تخلیق کا واحد مفہوم اپنے کام کو مستعدی اور ذمہ داری سے حسن و خوبی انجام دینے ہی میں مضمر ہے۔

اس کے کمربند سے ہمیشہ چابیوں کا ایک بڑا سا رنگچھا لٹکا رہتا جس میں ہر قسم اور ہر سائز کی لاتعداد چابیاں ہوتیں اور وہ ان میں سے ہر ایک چابی سے انفرادی طور پر اس قدر واقف اور مانوس ہو گیا تھا کہ بغیر دیکھے ہی ضرورت کے وقت مطلوبہ چابی اپنی انگلیوں سے نکال لیتا۔ اس کے ہاتھ ہر ہر کنجی کے نقوش کو باوجود کھردرے اور سخت ہونے کے بخوبی محسوس کر لیتے۔ وہ ان چابیوں کے گچھے کو اس قدر احتیاط سے لیکر چلتا کہ کہیں وہ ٹکرا نہ جائیں۔ اور اگر کبھی ٹکرا بھی جاتیں تو ان کی کھنکھناتی آواز سن کر اسے محسوس ہوتا جیسے چابیاں آپس میں نہیں ٹکرائیں، اس کے دل سے ٹکرا گئی ہیں اور کسی سے بھی باتیں کرتے وقت وہ ان چابیوں کو ضرور گردش دیتا جاتا، گویا وہ چابیاں بھی اس کی بات چیت میں برابر کی شریک ہیں۔ جن کو حرکت میں لائے بغیر وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا۔

وہ اپنا کام بڑی سنجیدگی، خوش اسلوبی اور مستعدی سے کرتا۔ کوئی بھی چیز اس کی نگاہوں سے نہیں بچ سکتی تھی۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ کسی سے باتیں کرتے کرتے یا چلتے چلتے سرِ راہ یکلخت، بالکل غیر ارادی اور لاشعوری طور پر رک جاتا اور زمین پر سے کوئی ٹوٹا پھوٹا، لوگوں کی عدم توجہی کا شکار لوہے کا کوئی ٹکڑا یا ایسی ہی بے کار چیز بڑے فخر سے اٹھاتے ہوئے بڑبڑاتا: "اوہ: لوگ کسی چیز کی پرواہی نہیں کرتے۔" اور پھر گرد جھاڑتے ہوئے بالکل غیر ارادی طور پر اس کی چابیاں حرکت میں آجاتیں۔ اور وہ اپنی بات مکمل کئے بغیر اسے گودام میں رکھنے کے لئے بڑھ جاتا۔ اس کے اس قسم کے افعال میں اس کے ارادے اور شعور کو قطعاً کوئی دخل نہ ہوتا۔ بس بالکل مشینی سا انداز ہو چلا تھا اس کا۔ اور زمیندار بیچارا مال گودام میں ٹوٹے پھوٹے لوہے کے ان ٹکڑوں اور گھسی پٹی چیزوں کو دیکھکر خاصا جھنجھلا جاتا۔ لیکن وہ جانتا تھا یہ سب چچا فضلو کی عادت بن چکی ہے اور جب تک چچا فضلو رہے گا تو اس کے گوداموں میں گندم، مکی اور اوزاروں کے ساتھ یہ تمام چیزیں بھی رہیں گی۔ یا پھر چچا فضلو ہی نہ رہے اور یہ زمیندار کو منظور نہ تھا۔

★

تعطیل کی پہلی صبح ہی کو زمیندار کی ملاقات، بالکل اتفاقیہ سرِ راہ چچا فضلو سے ہو گئی۔

"ارے تم یہاں کیا کر رہے ہو چچا فضلو؟" اس نے پوچھا۔ "تو کیا تم واقعی میلہ دیکھنے نہیں جاؤ گے؟ مگر کیوں؟"

"میری بیوی چاہتی ہے کہ میں اسے میلہ دکھانے لے جاؤں!" فضلو نے جواب دیا۔ "لیکن میں اس قسم کی تفریحوں کے لئے خاصا مشغول انسان ہوں۔ کمبخت ہر وقت یہی چاہتی ہے کہ اسے تفریح کراؤں۔ جیسے میرے ذمہ کوئی کام ہی نہیں۔"

"چلو جاؤ۔ میلہ دیکھنے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تمہارے ذمہ کوئی اہم کام بھی تو نہیں۔" زمیندار ہنستے ہوئے بولا۔ "تمہیں بھی دوسروں کی طرح آرام اور تفریح کی ضرورت ہے چچا۔ جاؤ بیچاری کو میلہ ہی دکھا لاؤ!"

"یہ بھی خوب ہے میرے ذمہ کوئی کام نہیں۔ میں اپنے ذمہ بہت کام رکھتا ہوں، مثلاً یہی کہ گودام کی دیکھ بھال کروں اگر بالفرض کوئی چیز گم ہو گئی، خواہ وہ معمولی سی رسی کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، تو میں تو اس کا ذمہ دار گردانا جاؤں گا!" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

★

اگلی صبح جب زمیندار میلہ دیکھنے گیا تو اس نے لوہار خانے کے باہر چچا فضلو کو آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے دیکھا۔

"تو گویا تم آ گئے ہو چچا!" زمیندار نے ہنستے ہوئے دریافت کیا۔ "لیکن چچا تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"میں یہاں تفریح کرنے نہیں آیا ہوں!" چچا فضلو نے عجیب ناگواری سے کہا اور پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ اسے میلہ دکھانے لے جاؤں۔ اور یہ کدال اور درانتیاں جو آپ دیکھ رہے ہیں انہیں تیز کروانے لایا ہوں تاکہ ضرورت کے وقت ہمارے

آدمی فالتو نہ بیٹھیں بلکہ فوراً فصل کی کٹائی کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کے علاوہ میں بیل گاڑیوں کے لئے موٹ اور مضبوط رسّی بھی دیکھنے آیا ہوں۔ یہیں کہیں میلے میں میری لڑکی بھی ہوگی۔" نفضلو نے یونہی بے مقصد اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کہنے لگا۔" وہ یہاں اپنی خالہ کے پاس رہنے آئی ہے تاکہ میلہ آسانی سے دیکھ سکے۔ اس کا منگیتر بھی اسکے ساتھ ہے۔ وہ اس کی خالہ کا لڑکا ہی ہے۔ دونوں یہیں کہیں گھوم رہے ہوں گے۔" محض ضمنی طور پر فضلو نے اپنی لڑکی کا ذکر کر دیا تھا۔ بعد میں اسے محسوس ہوا بھلا زمیندار کو اس قصہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اس لئے وہ پھر کہنے لگا۔" کل ہی ہمارے گاؤں سے ایک شخص کسی ضروری کام سے شہر جا رہا ہے۔ کیوں نہ ہم اس کے سپرد چند گندم کی گاٹھیاں کر دیں؟ وہ بیچ آئے گا۔ کام بھی جلدی ہو جائے گا اور سنبھالنے کی بھی دقت نہ ہوگی۔ بس آپ اس سے کہدیں۔"

"مگر چاچا وہ شہر نہیں جا رہا ہے۔ وہ قصبہ جا رہا ہے جہاں سے شہر کوئی پانچ چھ میل دور ہے۔ ہمیں اتنی جلدی بھی نہیں۔ اس بیچارے کو چھٹیاں تو آرام سے گذارنے دو۔" زمیندار مسکراتے ہوئے بولا۔

"لیکن جس قدر جلد ہم گندم شہر بھیجدیں۔ اسی قدر بہتر ہوگا۔ منڈی میں سب سے پہلے مال پہنچے گا تو دام بھی مناسب مل جائیں گے۔ ورنہ بعد میں دام بھی کم ملیں گے!" چچا فضلو ایک مشّاق تاجر کی طرح بڑے اضطرار سے بولا اور پھر سڑک کی دوسری جانب کھڑے ہوئے آدمی کے پاس زمیندار کو کھینچ لے گیا جو کل شہر سے نزدیک کسی قصبے میں جانے والا تھا۔

★

ابھی صبح صادق کے آثار نمودار ہونے میں بھی کافی دیر تھی۔ چاروں اور گھمبیر اندھیاروں کی حکمرانی تھی مگر فضلو بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھا۔ ابھی سردیاں باقی تھیں اور اس صبح تو کچھ غیر معمولی سردی پڑ رہی تھی۔ فضلو کو پوری رات نیند بھی نہیں آئی تھی وہ بڑا بے چین تھا کہ کب صبح ہو اور کب وہ جاکر گودام سے گندم تول کر اس آدمی کے حوالے کرے جو قصبہ جا رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گودام پہنچا لیکن جب دروازہ کھولنے کے لئے چابی تلاش کی تو وہ غائب تھی۔ وہ مارے جھنجھلاہٹ کے جواں بخت ہو گیا۔ کئی بار اس نے بغور گُھچّے کا جائزہ لیا — لیکن بے سود۔

تب تقریباً وہ بھاگتا ہوا گودام سے گھر آیا۔ زور سے دھکا مار کر کواڑ کھولا اور کانپتی انگلیوں سے لالٹین کی بتّی سلگائی۔ اس کی بیوی ہنوز محوِ خواب تھی لیکن اس نے عجیب وحشیانہ انداز میں جھنجھوڑ کر اسے بیدار کر دیا اور پھر اس کے اور اپنے بستر کی چادر، گدوں اور تکیوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کیا۔ لیکن چابی پھر بھی نہ ملی، چچا فضلو کی حالت بالکل اس بھیڑیئے سے مشابہ تھی جس کا شکار اِدھر اُدھر کہیں جھاڑیوں میں جا چھپا ہو اور وہ دیوانہ وار بھوکا پیاسا عجیب جنونی انداز میں ان جھاڑیوں کو روندرہا ہو۔

"آخر بات کیا ہے؟" اس کی بیوی بیحد ناگواری سے بولی۔" کیا تم مجھے آرام سے سونے بھی نہ دو گے؟" وہ اس سے ابھی تک ناخوش تھی۔ کل کے ناخوشگوار حادثہ کا اثر ابھی تک اس کے ذہن پر نقش تھا جب چچا فضلو نے عجیب بیدردی سے اس کی میلہ دیکھنے والی آرزو کو کچل ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ رات ہی کو دونوں میں سخت جھگڑا ہوا تھا۔ چچا فضلو مصر تھا کہ زمانہ خراب ہے اور اس نے بغیر اس کی اجازت کے لڑکی کو کیوں اس کی خالہ کے یہاں جانے دیا جبکہ اس کا منگیتر بھی وہیں موجود ہے۔ جوان لڑکیوں کو یوں شترِ بے مہار کی طرح چھوڑ دینے کا وہ حامی نہ تھا۔ اسے زمانے کی اُونچ نیچ کا پورا پورا احساس تھا لیکن وہ بھی بضد تھی۔

"آخر میں نے کونسا ایسا جرم کیا ہے؟ جب ان دونوں کا آپس میں رشتہ طے پا ہی چکا ہے تو پھر ان دونوں کا ملنا جلنا کوئی اعتراض کی بات نہیں۔"

اس پر چچا فضلو نے اسے بری طرح ڈانٹا اور پھر دونوں میں دیر تک خاصی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ لیکن ان تمام تلخ تجربات کے بعد جب سکون سے اس نے نگاہ چچا فضلو کے چہرے پر ڈالی تو اسے محسوس ہوا در حقیقت وہ کسی چیز کے لئے بیحد پریشان ہے۔ "کیا کچھ کھو گیا ہے؟" اس نے نہایت حلیمی سے پوچھا اور پھر وہ بھی ڈھونڈنے لگی لیکن بذات خود اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا ڈھونڈ رہی ہے۔ چچا فضلو نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کی پیشانی خاصی شکن آلود ہو گئی اور چند لمحات میں اچھا بھلا سلیقے سے سجا سجایا کمرہ اتھل پتھل کر کے رکھدیا۔

"جانے اسے کس چیز کی تلاش ہے؟ اس سے قبل اس نے مجھے اپنے ہر دکھ درد میں برابر کا شریک کیا ہے۔ لیکن آج اس کا انداز اس قدر اجنبی کیوں ہے؟ جب سے وہ گودام کا ذمہ دار چوکیدار بنا ہے۔ بیچارے کی یہی گت بن گئی ہے۔ تن من کا کچھ ہوش ہی نہیں، اور اب ہی پر کیا منحصر ہے، پہلے ہی کب اسے گھر کی پروا ہوتی ہے۔ آخر دوسرے چوکیدار بھی تو ہیں۔ وہ تو یوں اپنے کو ہلکان نہیں کر لیتے۔ ہائے! اُف!! آہ!!!" وہ جیسے اپنی بدقسمتی پر ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے خود سے بولی۔

"اوہ ۔ یہاں بھی نہیں !" فضلو شدید نا اُمیدی سے بولا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی سنتی ۔ وہ دیوانہ وار پاؤں پٹختا جا چکا تھا۔ تب اس بیچاری نے کپڑے بدلے اور زمیندار کے گھر کا راستہ ناپا۔ شاید وہیں کچھ معلوم ہو سکے ۔

*

چچا فضلو پر عجیب اضطراری کیفیت طاری تھی۔ ابھی خاصا اندھیرا تھا اور وہ دیوانہ وار ہاتھوں میں لالٹین لئے گھر سے مال گودام تک زمین کا ایک ایک چپہ بغور تلاش کرتا جا رہا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ لالٹین کی مدھم روشنی کا کمزور سا ہالہ اس گھناؤنے اندھیارے میں کہاں تک اس کا ساتھ دے سکے گا۔ کہاں تک اس کی رہنمائی کر سکے گا۔ کم از کم اسے صبح تک تو انتظار ہی کرنا چاہیئے ۔ لیکن اس وقت تو اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا اور حواس معطل ۔ وہ اپنی دھن میں نہایت ہی متفکر چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ یوں جھک کر چلتے ہوتے اس کی کمر درد سے چیخ اٹھی ۔ وہ دم لینے کو زمین پہ لالٹین رکھ کر ذرا سا سیدھا ہوا اور پھر وہی.....!

اسی تلاش میں وہ مال گودام تک پہنچ گیا لیکن کہیں بھی اسے چابی کا ہلکا سا مبہم سا نشان بھی نہ مل سکا جس کا ردِ عمل کچھ یوں رونما ہوا کہ اس کے چہرے پر دبیز اداسیاں چھا گئیں ۔ وہ ٹوٹے دل کے ساتھ گودام کی دیوار سے پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اس کڑاکے کی سردی میں اس کی پیشانی پر پسینہ کی بوندیں اُبھر آئیں لیکن وہ ان تمام خارجی کیفیتوں سے بے خبر اپنے دل میں ہر لحہ تیز سے تیز تر ہونے والے اندرونی ہیجان کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے میں ہمہ تن مشغول تھا۔ اس کی مصروفیت کے عالم کا اندازہ کچھ اس طور پر صحیح لگایا جا سکتا ہے کہ اس تاریکی میں جب چاروں طرف ایک ہو کا عالم طاری تھا تو اس کی یوں بے وقت آمد سے گاؤں کے کتوں کا ایک غول کا غول بیدار ہو کر اس کے پیچھے پیچھے اپنی پوری طاقت سے بھونکتا آ رہا تھا لیکن وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی پر اپنا سر رکھ لیا اور پھر اسی سوچ میں گم ہو گیا۔ وہ شدت سے سوچ رہا تھا۔ اس نے چابی بھلا کہاں کھوئی ہو گی !

"جب میں نے آج سے پانچ روز پہلے کھیتی باڑی کے اوزار گودام میں رکھے تھے تب ۔ اور چار روز قبل گندم کو دھوپ کھلانے کے لئے باہر نکالا تھا تب بھی شاید میں نے کنجی استعمال کی تھی۔ اور تیسرے روز جب میں نے دوسرا سامان گودام میں رکھا تھا تب بھی وہ غالباً تھی اور جب کل میلے گیا تھا تو مجھے معلوم ہے وہ اپنی جگہ پر تھی۔ میری انگلیوں نے اسے محسوس کیا تھا۔ تب پھر۔ پھر.....!" وہ تقریباً گھنٹہ بھر تک یہی سوچتا رہا، یہاں تک کہ صبح کی سپیدی فضا پر چھا گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ زور سے اپنی ران پر مارا۔ "مل گیا پتہ !" وہ خوشی سے آپ ہی بڑبڑایا۔

اسے یاد آ گیا تھا کہ کل جب میلہ میں وہ مضبوط رسّی کی تلاش میں سرگرداں تھا تب اسے اپنی لڑکی اور ہونے والا داماد نظر آیا تھا۔ وہ ان دونوں کے ساتھ چند ہی قدم چلا تھا کہ ایک تالے والا نظر پڑا اور اس کے ساتھ ہی بالکل اتفاقیہ طور پر اسے خیال آیا تھا کہ اسے گودام کی ایک زائد چابی بھی بنوانی ہے جب اس نے چابی کو گچھے سے علیحدہ کیا تھا، اور کسی ضروری کام سے اپنے داماد اور لڑکی کو وہاں تالے والے کے پاس اپنا انتظار کرنے کے لئے چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ اور وہاں سے وہ سیدھا لوہار کی بھٹی پر پہنچا تھا۔ جہاں اس کی زمیندار سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور وہ اس وقت تک چابی اور اپنی منتظر لڑکی کے بارے میں بالکل بھول چکا تھا۔

تب اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی لڑکی کو دل ہی دل میں اپنی کمزوری پر سخت سست کہا : اگر میں بھول گیا تھا تو کم از کم وہی بر وقت پہنچا دیتی لیکن ان لوگوں کو بس اپنے آرام کا خیال ہے۔ بوڑھے باپ کی پروا نہیں !

لیکن اب وہ کیا کرے گا ؟ بس یہی ایک خیال رہ رہ کر شدت سے اس کے ذہن میں گونج رہا تھا یہاں تک کہ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے نظریں اٹھا کر دُور خلاؤں میں گھورا جہاں کہر کی دبیز چادر کو پھاڑتا ہوا ایک مبہم مبہم سا سایہ لرزاں لرزاں آگے بڑھ رہا تھا۔ اور قریب آنے پر یہی سایہ اس کی بیوی کی شکل میں ڈھل گیا۔

"اوہ دیکھو ۔ کیا تمہیں اسی کی تلاش ہے ؟" ہانپتے ہوئے اس کی بیوی نے مال گودام کی دو چابیاں اس کی طرف بڑھا دیں ۔ چچا فضلو نے عجیب الّوؤں کی طرح دونوں چابیوں کو گھورا اور پھر اپنی بیوی کو ـــــ اور پھر بلا تامل بغیر کچھ بولے پیٹھ موڑ کر گودام کھولنے لگ گیا۔ تب اس کی بیوی نے کل ماجرا کہہ سنایا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس کی لڑکی اور ہونے والا داماد دیر تک تالے والے کے پاس اس کا انتظار کرتے رہے اور جب دیر تک وہ لوٹ کر نہ آیا تو انھوں نے گاؤں جانے والے اپنے ایک پڑوسی کو کنجیاں دیتے ہوئے سمجھا دیا کہ وہ جا کر انہیں ان کے گھر دے دیں ۔ جب رات گئے چچا فضلو گھر لوٹا تو اس وقت تک اس کی بیوی سو چکی تھی، اور صبح بھی چچا فضلو نے اسے اپنی تلاش کے بارے میں کچھ نہ بتایا ورنہ اتنی آفت ہی کیوں آتی ۔

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

غزل

سراج الدین ظفر

رندی کو میگسار ہمہ گیر کر گئے
عالم کو رقصِ جام سے تعبیر کر گئے

منزل سے آگہی کی جو گذرے قدح پرست
پرزے نقابِ چہرۂ تقدیر کر گئے

بنیادِ زہد، اٹھا کے خداوندگانِ خیر
اک قصر تھا کہ ریت پہ تعمیر کر گئے

خلوت میں اس ہنر سے کھلے حلقہ ہائے زلف
وحشت کو بے سلاسل و زنجیر کر گئے

سرزد جو عرشیوں سے ہوا کاتبانِ راز
اس کو بھی میری فرد میں تحریر کر گئے

شیخ حرم کہاں ہے کہ اس شہر کے غزال
کفرِ نگاہ سے مری تکفیر کر گئے

کل شب قبائے زہرہ جمالاں کے قوس و خط
ابھرے کچھ اس طرح انہیں تصویر کر گئے

آئینہ دارِ صدق تھے یارانِ انجمن
ساغر سے ردِ حیلہ و تزویر کر گئے

جائیں کدھر کو رند کہ اوہام خیر و شر
ذہنوں کو بھی حوالۂ زنجیر کر گئے

اسمائے دلبراں ترے حسنِ مقال کو
مانندِ نطقِ طوطئ تصویر کر گئے

جرأت نہ اہلِ زہد کو جس چیز کی ہوئی
آخر میں اس کو لائقِ تعزیر کر گئے

گفتار رہ روِ شاں تھی کہ جیسے دمِ سحر
جھونکے نسیم کے کوئی تقریر کر گئے

پیرانِ میکدہ کی کرامت میں شک نہیں
میرے لئے شراب کو اکسیر کر گئے

معنی کا اک لغت تھے دمِ رقص ان کے ہاتھ
ہر زاویے کو حاملِ تقریر کر گئے

میرے وقار میں سرِ خلوت مرے ہنر
کچھ اور بھی اضافۂ توقیر کر گئے

دنیا عذاب سخت تھی لیکن اٹھا کے جام
یارانِ شب نجات کی تدبیر کر گئے

حیرت کے سلسلے سرِ آئینۂ جمال
مجھکو سپردِ عالمِ تصویر کر گئے

منظور تھا جو وقت کی رو میں مرا ثبات
اسرار مجھکو مرکزِ تغییر کر گئے

زنجیرِ ارتقا میں مرے ولولے ظفر
مجھکو بھی ایک حلقۂ زنجیر کر گئے

غزل

ماہر القادری

فضا نشاط کی پھر دل کو راس آئی ہے
سکوں نے لُوٹ لیا، درد کی دُہائی ہے

یہ تیوروں پہ جو وارفتگی سی چھائی ہے
تری نظر بھی کہیں چوٹ کھا کے آئی ہے

جبین و رُخ کو ذرا دیکھنا توجہ سے
مری نگاہ بھی کچھ نقش چھوڑ آئی ہے

نہ التفات جسے کہہ سکیں، نہ بیزاری
اس اہتمام سے اُس نے نظر چُرائی ہے

یہ خارزارِ محبّت، یہ سنگلاخ زمیں
اِسی سفر میں تو لطفِ برہنہ پائی ہے

یہ کون جانبِ عرشِ بریں ہے گرمِ خرام
فلک نے زیرِ قدم کہکشاں بچھائی ہے

میں اُن کی بزم میں شایانِ یک نظر بھی نہیں
اسی کا نام مقدّر کی نارسائی ہے

جنابِ شیخ کی توبہ کو کیا کہوں ماہر
میں جانتا ہوں بڑھاپے کی پارسائی ہے

⁂

غزل

ضمیر اظہر

یا رب وہ درد دے کہ تمنا کہیں جسے
تکمیل زندگی کا تقاضا کہیں جسے

پھینکا ہے لا کے وحشتِ خانہ خراب نے
اک عالمِ سراب میں صحرا کہیں جسے

ہمت کہاں کہ تیری تمنا کو چھوڑ دیں
ہر دردِ زندگی کا مداوا کہیں جسے

محوِ خرام رہتا ہے صحرائے قلب میں
تیرا خیال، آہوئے رعنا کہیں جسے

اب تک ہے یاد کیف کسی چشمِ ناز کا
تخئیلِ رند و حسرتِ صہبا کہیں جسے

پھر ضَو فگن ہے دل پہ محبت کا ماہتاب
آئینۂ بہارِ تمنا کہیں جسے

اظہرؔ ہجومِ یاس میں آواز دیں کسے
ایسا بھی کوئی ہے کہ ہم اپنا کہیں جسے

انسانی حقوق اور اقوام متحدہ

فضل حق قریشی

معاشرتی ترقیوں کا اندازہ لگانے کے لئے بہت سے معیار ہیں۔ مثلاً ایک معیار یہ ہے کہ قومیں، حکومتیں اور افراد کس حد تک انسانی حقوق کا احترام کرتے ہیں۔ ثقافتی ترقی کا معیار تہذیب نہیں کہا جاسکتا تاوقتیکہ یہ ترقی بنی نوع انسان میں معاشرتی احساس کی نشوونما اور فروغ کا باعث نہ بن سکے۔ اسی اصول کے پیش نظر اس سال بھی دنیا بھر کے ملکوں خصوصاً اقوام متحدہ کی ۸۱ حکومتوں نے تہیہ کیا ہے کہ ۱۰ دسمبر کو اُس عالمی منشور کی دسویں سالگرہ بہت تزک و احتشام کے ساتھ منائی جائے جو انسانی حقوق کو تسلیم کرنے اور ان کا احترام کرنے کے لئے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء سے نافذ ہے۔ انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے منظور کیا اور تمام قوموں سے کہا تھا کہ اس کی روشنی میں قومی آئین وضوابط مرتب کئے جائیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس تاریخ سے قبل انسانی حقوق کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالی جائے تو فوراً ماننا پڑے گا کہ انسانی حقوق کے تحفظ کی جدوجہد اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانیت کی تاریخ۔ حموربی، فرمانروائے بابل کے عہد سے آج تک دنیا کے بڑے قانون ساز کوشاں رہے ہیں کہ جائز طریقوں سے کمزور ہستی کو ظلم و استبداد کے پنجے سے بچایا جائے۔ مذہبی راہنماؤں سے لیکر ارباب سیاست تک ہر مفکر و مدبر نے اپنے زمانے کے غلط نظام پر اعتراض کیا جب بھی اس میں کوئی نقص نظر آیا اور انسانی وقار کو تسلیم کرانے کے لئے زور دیا جب بھی انہیں موقع ملا۔ ان حقوق کو منوانے کے لئے بہت سے انسانوں نے اپنی جانیں تک دی ہیں، قربانیاں پیش کی ہیں، سختیاں اور مصیبتیں جھیلی ہیں اور ان میں سے بہت سے انسان اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ ہم تاریخ میں بار بار پڑھتے ہیں کہ جابر حکمرانوں اور بادشاہوں نے جب بھی اپنی رعایا کے حقوق غصب کئے، چند نڈر اور بہادر انسانوں نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔

قدیم چین کے ایک مذہبی پیشوا نے سب سے پہلے اعلان کیا کہ سلطنت کے استحکام میں عوام کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہود و نصاریٰ کے تاریخی قصوں میں بھی ایسے ہی خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ یونان کے عہد عتیق میں ہر خاص و عام کو مساوی حقوق دینے کے علاوہ اظہار خیال کی آزادی کا حق بھی دیا جاتا تھا۔ روما کے فلسفی کہتے تھے کہ انسان فطرتاً آزاد ہے اور اسے آزاد رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ مفکر اور فلسفی ہمیشہ حکومتوں کی طرف سے معتوب رہے کیونکہ وہ غلاموں اور کنیزوں کی فروخت کے انسانیت سوز رواج کو ترک کرنا یا غلاموں اور کنیزوں کو عام انسانوں یا کم سے کم دوسرے ملازموں کے برابر کوئی درجہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ کچھ بعد کے زمانے میں اسلام نے حریت و آزادی، اخوت و مساوات، عدل و انصاف اور وقار انسانی کا بہترین سبق دیا ہے۔ اس نے بردہ فروشی کو قطعاً ناجائز قرار دیا اور صرف لڑائی میں حاصل کئے ہوئے غلاموں اور کنیزوں کو چند شرطوں کے ساتھ رکھنے کی اجازت دی جن میں وقار انسانیت کا خاص خیال رکھا گیا۔

انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا موجودہ تصور جمہوری نظام کی ترقی کے ساتھ ساتھ ذہن نشین ہوا ہے اور آج سے پچاس سال پہلے تو اس دائرے کو اتنا وسیع کر دیا گیا کہ سیاسی آزادی کے دوش بدوش اقتصادی اور سماجی حقوق بھی انسان کو تفویض کر دیئے گئے۔ بیروزگاروں کے لئے ذریعۂ معاش اور بوڑھوں یا بیماروں کے مفاد کا لحاظ بھی رکھا جانے لگا لیکن فاشی اور نازی نظام نے بساطِ سیاست پر قدم رکھ کر صحیح جمہوریت کے تار و پود کو درہم برہم کر دیا۔ انسانی حقوق کے جملہ تصورات طاق نسیاں کی زینت بن گئے۔ بعض اور ملکوں میں نسل و مذہب اور زبان و رنگ کے امتیازات نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا اور اس طرح انسانیت مغلوب و مفلوج ہو کر رہ گئی۔ مثال کے طور پر جنوبی افریقہ میں پاکستانی اور ہندوستانی باشندوں پر وہاں کی حکومت نے ایسی پابندیاں لگا رکھی ہیں کہ ان کے ذکر سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ مختصراً یہ کہ وہاں کے قانون کے مطابق پاکستانی اور ہندوستانی باشندے اس ملک میں گوری نسل کے باشندوں کے ساتھ مل جل کر معاشرتی زندگی کے کسی شعبے میں حصہ نہیں لے سکتے۔

حسن اتفاق سے دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کی فتح کے آثار رونما ہونے لگے۔ چنانچہ لڑائی کا میدان جیتنے کے ساتھ ساتھ کوشش کی جانے لگی کہ غلط رفتار

مہروں کا رخ پھیر کر بساطِ انسانیت کی سطح کو بلند کر دیا جائے کیونکہ صلح جُو اور عافیت پسند ہستیاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ اس کے بغیر دنیا بھر میں صحیح امن و عافیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء کا معاہدۂ اوقیانوس اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ پھر ۱۹۴۳ء میں واشنگٹن کانفرنس، ۱۹۴۳ء میں ماسکو کانفرنس اور ۱۹۴۴ء میں ڈمبارٹن اوکس کے مذاکرات اپنی تصورات کو ترقی و توسیع دیتے رہے۔ حتیٰ کہ جب سان فرانسسکو کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں دنیا کے بہت سے غیر سرکاری اداروں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی اور انہوں نے اپنی حکومتوں کے ایما پر یا ذاتی رائے کے مطابق ان تجاویز پر مہر توثیق ثبت کر دی جو ڈمبارٹن اوکس میں زیر غور تھیں۔ خصوصاً اس تجویز کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ بین الاقوامی اعتبار سے اقتصادی، معاشرتی اور انسان دوستی کے جملہ مسائل کو حل کرنے اور انسانی حقوق کا احترام کرنے کے لئے متحدہ کوششیں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں جو انہی دنوں وجود میں آیا، اس پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا گیا۔ اس کی تمہید میں لکھا ہے :-

"ہم اقوام متحدہ کے باشندوں نے مصمم ارادہ کیا ہے، انسان کے بنیادی حقوق پر دوبارہ ایمان
لانے کا اور انسانی افراد کی عزّت اور قدر و قیمت کو ماننے کا۔ یہ ہمارا ایمان ہوگا کہ عورت اور مرد کے
حقوق برابر ہیں اور چھوٹی بڑی قومیں ایک جیسے حقوق کی مالک ہیں۔"

اس قرارداد کے بموجب مسودۂ منشور تیار کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس نے مسز فرینکلن روزویلٹ کی قیادت میں ۲۷ جنوری ۱۹۴۷ء سے کام شروع کر دیا۔ کمیشن کے کل اٹھارہ اراکین تھے جو مختلف ملکوں سے منتخب ہوئے تھے۔ ابتدا میں اس کمیشن کو تمام ملکوں اور علاقوں سے معلومات اور اعداد و شمار جمع کرنے میں خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخرکار ۴۰۰ صفحات کی ایک دستاویز تیار ہو گئی۔ اس کی بنیاد پر منشور کا ابتدائی مسودہ مرتب کیا گیا جو بڑی بحث و تمحیص کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو انقطاعی طور پر منظور کر لیا گیا اور تمام حکومتوں نے اسی روز اس پر مہرِ توثیق کر دی۔ چنانچہ اسی تقریب کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہر سال دسمبر کی ۱۰ تاریخ کو ساری دنیا میں "یومِ حقوقِ انسانی" منایا جاتا ہے۔

سب سے پہلے اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر ٹوریز بوڈے کے دل میں خیال آیا کہ دنیا بھر میں "یوم حقوق انسانی" کی سالگرہ منائی جایا کرے۔ انہوں نے ۱۹۴۹ء کے شروع میں یونیسکو کی تمام ممبر حکومتوں کو مراسلے لکھے کہ سرکاری اور غیر سرکاری مدرسوں میں ایک خاص پروگرام کے ماتحت ۱۰ دسمبر کو اُصولِ آزادی اور وقارِ انسانی کے سلسلے میں کامیاب جدوجہد ہوئی ہے اسے خراج تحسین ادا کیا جائے۔ اس تجویز کو بہت پسند کیا گیا۔ پھر اپریل ۱۹۴۹ء میں چند بین الاقوامی غیر سرکاری اداروں کی کانفرنس لیک سکسیس میں منعقد ہوئی اور فیصلہ کیا گیا کہ اقوام متحدہ کے زیرِ ایوان یہ سالگرہ منائی جایا کرے۔ لہٰذا اسی سال اس قرارداد پر عمل ہوا اور ہر سال عمل ہوتا ہے۔

انسانی حقوق کے عالمی منشور میں شہری، سیاسی اور مذہبی آزادیوں کے تصورات کو جمع کر دیا گیا ہے جن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انسان اب تک جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں نئے اقتصادی اور معاشرتی حقوق بھی شامل ہیں جن کا اس زمانے میں بتدریج احساس ہو رہا ہے۔ ان پر سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

تمہید میں انسانی شخصیت کے وقار و احترام پر زور دیا گیا ہے۔ پہلی دو دفعات میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ یہ حقوق اور آزادیاں ہر شخص کو ہر جگہ ملنی چاہئیں۔ دفعات ۳ تا ۱۵ میں پرانے مسلّمہ حقوق کا اعادہ کیا گیا ہے یعنی یہ کہ ہر شخص کو اپنی جان، آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق ہے، قانون اس کی شخصیت کو تسلیم کرے اور منصفانہ طریقے پر اس کے مقدمے کی سماعت ہو۔ ان دفعات میں غلامی، جسمانی اذیت، انسانیت سوز بُرے سلوک، ظالمانہ سزا، بے قاعدہ گرفتاری، نجی اور خانگی زندگی اور ذاتی خط و کتابت میں مداخلت کو معیوب کہا گیا ہے۔ قومیت کے حق کو تسلیم کیا ہے اور یہ بھی مانا ہے کہ اسے ہر ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہو۔

دفعہ ۱۶ میں مردوں اور عورتوں کے اس حق کی حمایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق شادی کا فیصلہ کریں۔ دفعہ ۱۷ میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو جائداد رکھنے کا حق ہے اور اسے زبردستی اس سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد آزادیٔ مذہب، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ اظہار رائے کا ذکر ہے۔ دفعات ۲۰ اور ۲۱ میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو پرامن طریقے پر میل جول رکھنے اور انجمنیں قائم کرنے کا حق ہے اور وہ اپنے ملک کی سرکاری ملازمت میں بھی حصہ لے سکتا ہے۔

دفعات ۲۲ تا ۲۶ میں اقتصادی اور معاشرتی حقوق کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان میں کام کرنے، مقررہ وقفوں کے بعد تنخواہ سمیت چھٹیاں لینے، بے روزگاری

سے بچنے، اپنے لئے روزگار پسند کرنے، تجارتی انجمنوں میں شریک ہونے اور مساوی کام کے عوض مساوی معاوضہ لینے کا حق شامل ہے۔ منشور میں ہر شخص کے لئے معقول معیارِ زندگی کے حق کو بھی تسلیم کیا گیا ہے جس میں رہائش، طبی دیکھ بھال، بیماری، بیوگی اور بڑھاپے کی صورت میں تحفظ شامل ہے۔ تعلیم پانے، اپنے فرقے کی ثقافتی زندگی میں شریک ہونے اور سائنسی تحصیلات سے استفادہ کرنے کے حقوق بھی شامل ہیں۔

دفعہ ۲۹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جاسکتیں اور آخر میں اعلان کیا ہے کہ اس منشور کی کسی دفعہ سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جاسکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں معروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو، جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی تخریب ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

۱۹۵۴ء میں اس موضوع سے متعلق اقوام متحدہ کے دو مسودے نافذ ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خواتین کے سیاسی حقوق سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا مہاجرین کے مرتبے اور حیثیت سے متعلق ہے۔ اول الذکر میں لکھا ہے کہ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ ان تمام اداروں کے لئے انتخابات کے لئے حصہ لے سکیں گی جنہیں قانون کے مطابق عام انتخابات سے قائم کیا گیا ہو۔ انہیں عہدہ سنبھالنے اور تمام سرکاری فرائض ادا کرنے کا حق حاصل ہوگا اور یہ حق کسی فرق و امتیاز کے بغیر مردوں کے حق کے برابر ہوگا۔ یہ پہلا عالمگیر مسودۂ قانون ہے جو سیاسی حقوق کے ضمن میں بلحاظِ جنس ہر فرق و امتیاز کی تنسیخ کرتا ہے۔

مہاجرین کے مرتبے اور حیثیت سے متعلق ضابطے میں ایسے بین الاقوامی قاعدے درج ہیں جن پر عمل کرنے سے ان بدنصیب لوگوں کے مصائب و آلام میں کمی ہوسکتی ہے جو سیاسی واقعات کی بنا پر اپنا وطنِ مالوف چھوڑنے اور ایک غیر ملک میں نہایت مصیبت و پریشانی کے عالم میں آباد ہونے کے لئے مجبور ہوگئے ہیں۔

شادی شدہ عورتوں کی قومیت سے متعلق بھی ایک قانون نافذ کیا گیا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ شادی، طلاق، یا شادی کے دوران میں خاوند کی قومیت بدل جانے سے بیوی کی قومیت پر خود بخود کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس کی رُو سے یہ اجازت دی گئی ہے کہ کوئی غیر ملکی بیوی اگر چاہے تو درخواست دینے پر اپنے خاوند کی قومیت حاصل کرسکتی ہے لیکن اس مقصد کے لئے اسے متعلقہ ملک میں آبادکاری کے طریقۂ کار کا پابند ہونا پڑے گا۔

* * *

جنگ سے نڈھال انسانیت اقوام متحدہ کی طرف امید و بیم کے جذبات کے ساتھ دیکھ رہی ہے، کیونکہ بنی نوعِ انسان کی نجات اور تہذیبِ حاضرہ کا مستقبل اس بات پر موقوف ہے کہ یہ ادارہ جنگ کے اسباب اور امنِ عالم کو لاحق ہونے والے خطروں کو دور کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ پاکستان، جسے حال ہی میں "اقوام متحدہ" کا رکن بنایا گیا۔ ہر اس ادارہ کی تقویت کے لئے حتی المقدور کوشش کرے گا، اور جو نصب العین اس ادارہ نے اپنے سامنے رکھے ہیں، انہیں حاصل کرنے میں مدد دے گا۔

.........ہم اقوام متحدہ کے منشور (چارٹر) کی پوری تائید کرتے ہیں.....

(قائدِ اعظمؒ)

(اقتباس از خطاب بہ بحریۂ پاکستان : ۲۳ جنوری ۱۹۴۸ء)

* * *

انسانی حقوق کا عالمی منشور

۱-

۲-

۳-

۴-

۵-

۶-
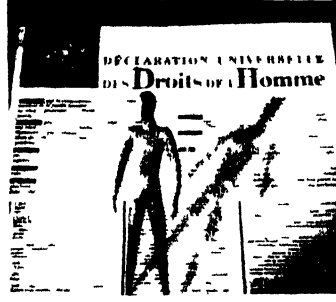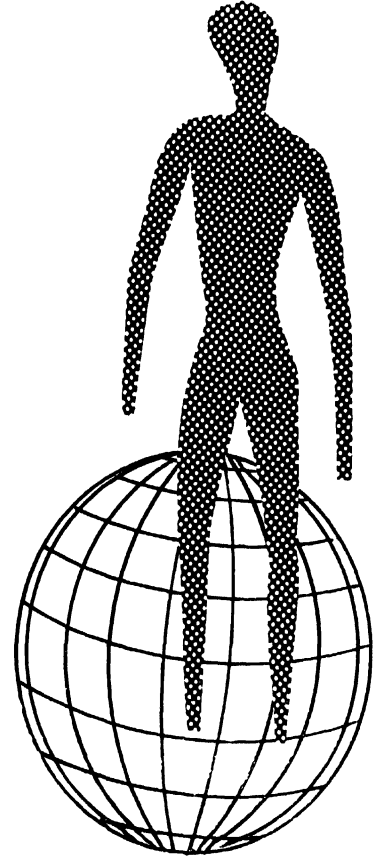
۱:- آیئے ہم فرض کریں کہ ایک نسانی پیلر
س اعلان سے نمودار ہوا اور جیتا جاگتا
انسان بن گیا۔

۲:- یہ انسان مرد ہو۔

۳:- یا عورت ...

۴:- اس انسان کا رنگ گندمی ہو یا کالا
سفید ہو یا پیلا....

۵ .- بہرحال یہ انسان ہر جگہ رہتا ہے۔ اسکا
ملک چھوٹا ہو یا بڑا۔ آزاد ہو یا آزادی کا
خواہشمند....

۶:- حقیقتاً یہی انسان ہم کرۂ ارض کے رہنے
والوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ چاہے ہم کوئی بھی
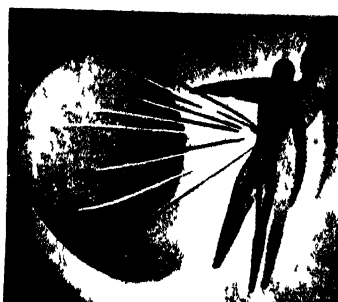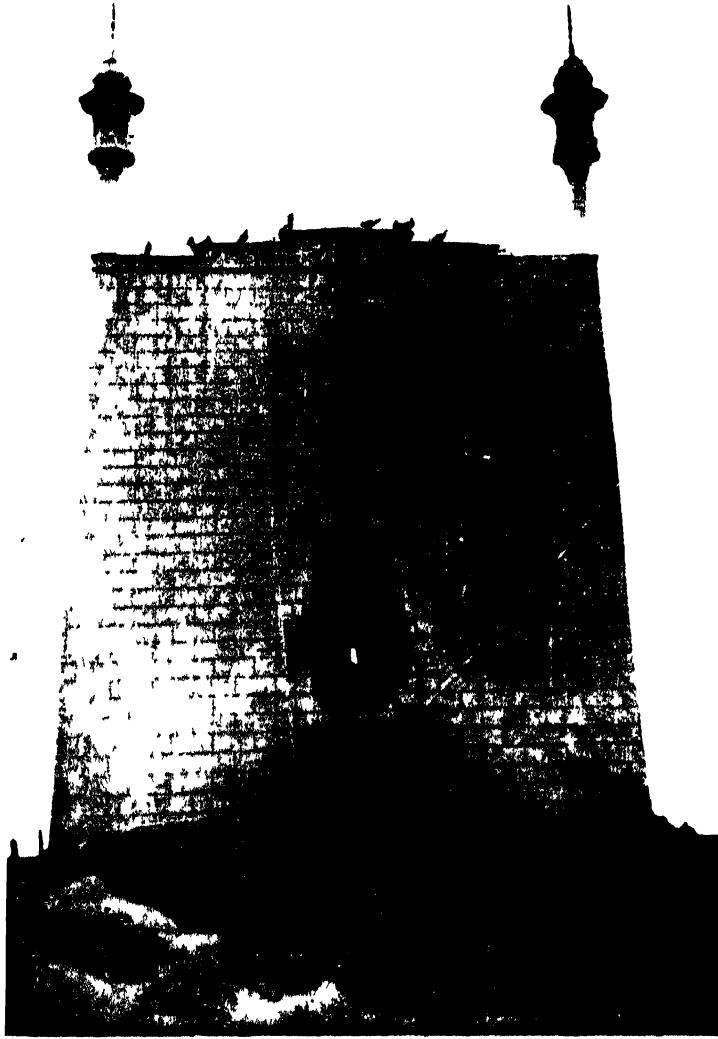
ہیر کا مقبرہ

(جھنگ)

(۱)

ہیر کا پنگورہ (طاقچہ میں)

(۲)

۱-- مقبرہ کی عمارت

۲-- مقبرہ کا اندرونی منظر

ثقافت:

ہیر کا مقبرہ اور ہیر رانجھا کا عہد

ڈاکٹر محمد باقر

افسانوی روایات کے کرداروں کے زمانے کو معین کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ بسا اوقات ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ پنجاب کے مشہور رومانی افسانے "ہیر رانجھا" کے عہد کو معین کرنے کی چند مساعی کی گئی ہیں۔ اور عام طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس افسانے کے کردار "ہیر" اور "رانجھا" اکبر کے عہد (۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ء) میں زندہ تھے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ پنجابی میں سب سے پہلے ہیر رانجھا کے قصے کو جھنگ کے ایک اروڑہ، دمودر نے نظم کیا تھا۔ وہ اس قصے کو جلال الدین اکبر کے زمانے کا واقعہ لکھتا ہے۔ اور تفصیلات کو اس طرح بیان کرتا ہے گویا وہ خود انہیں دیکھ رہا ہے۔ دمودر نے یہ بھی کہا ہے کہ چوچک خاں سیال یعنی ہیر کا والد اکبر کے زمانے میں ہو گزرا ہے۔ لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ دمودر کا یہ بیان صحیح نہیں اور اس نے یہ قصہ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانوں میں نظم کیا۔

دمودر کا بیان صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اب ہم فارسی ادب کی مدد سے ہیر اور رانجھا کی روایت کو اکبر کے عہد تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ افغانستان کی سرحد شمال میں جہاں بخارا سے ملتی ہے وہاں بخارا کے جنوب میں ایک قصبہ ابھی تک آباد ہے جسے کولاب کہتے ہیں۔ یہ مقامی صوبہ ختلان کا دار الخلافہ ہے۔ تقریباً چار سو سال پہلے اسی قصبہ کا رہنے والا شاعر باقی کولابی بخارا سے ہند میں وارد ہوتا ہے اور اکبر کے عہد میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوا ۱۵۷۹ میلادی جونپور میں معصوم خاں کابلی کی بغاوت کے زمانے میں مارا جاتا ہے۔ بدایونی نے اپنی معروف تالیف منتخب التواریخ میں باقی کا ذکر کیا ہے (جلد سوم، ص ۱۹۴)۔

اس سے زیادہ تفاصیل باقی کے متعلق اور کسی تذکرے سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ آج سے ۳۳ سال پیشتر باقی کی لکھی ہوئی ایک مثنوی "ہیر و رانجھا" خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب نے مرحوم سر شہاب الدین کے کتابخانہ میں دیکھی تھی۔ چونکہ انہیں اس وقت اس مثنوی کا زیادہ غور سے مطالعہ کرنے کی فرصت نہ ملی، اس لئے وہ صرف یہ اطلاع دے کر خاموش ہو گئے کہ "یہ نسخہ ناقص الاول ہے۔ پہلا عنوان ہے: در صفت بادشاہ عالم پناہ اکبر شاہ گوید"۔ سندھی ادبی بورڈ نے اس سال (۱۹۵۸ء) میں جب "مثنویات ہیر و رانجھا" شائع کیں تو مقدمہ میں یہ بیان کیا کہ اس مثنوی کا ایک نسخہ نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے۔ راقم نے اس خطی نسخہ کو کراچی سے منگوا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ وہ نسخہ ہے جو کسی وقت سر شہاب الدین کے کتابخانے میں موجود تھا اور جسے ڈاکٹر شفیع صاحب نے ملاحظہ فرمایا تھا۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ نسخہ چند سال پیشتر میرے پاس بھی فروخت ہونے کے لئے آیا تھا کیونکہ میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند اشارے اس پر موجود ہیں۔ نہ جانے اس وقت کس وجہ سے خریدا نہ جا سکا۔

بہرصورت، کہنا یہ مقصود ہے کہ ہیر رانجھا کے فارسی معروف قصوں میں اب تک یہ سب سے قدیم منظوم قصہ ہے۔ کیونکہ یہ ۱۵۵۶ء اور باقی کی وفات یعنی ۱۵۷۹ء کے درمیان لکھا گیا ہے۔ باقی نے اس مثنوی کے آغاز میں اکبر کا ایک قصیدہ لکھا ہے اور اس قصیدہ کے بعد ایک ساقی نامہ نظم کیا ہے جس میں اکبر کو "شاہ عادل" کے نام سے یاد کیا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ پنجابی کے معروف قصوں میں یہی تعریف "عدلی راجہ" کا لقب اختیار کر گئی ہے۔ اس بیان سے اس حقیقت کی طرف واضح طور پر راہنمائی ہوتی ہے کہ ہیر رانجھا کا قصہ اکبر یا اکبر سے پہلے معروف ہو چکا تھا۔ اور اگر ان دو کرداروں کی کوئی حقیقت تھی تو یہ اکبر کے عہد میں یا اس سے پہلے زندہ تھے۔

از روئے کرم بکن تو یاری	ساقی بدہ آں مے کہ داری
گر نیک بود خیالِ باقی	لطفی بنما بحالِ باقی
بکشا در گنج معنوی را	بنما رہ ملک مثنوی را
گفتم من ناتوان بیدل	ایں نامہ بنام "شاہِ عادل"
چوں ملک شدہ ز عدلش آباد	عالم ہمہ در نگینِ او باد

آگے چل کر قصے کے دوران میں جب رانجھا اور ہیر کے خاوند کی نزاع عدالت تک پہنچتی ہے تو اس وقت مولانا باقی نے پھر "بادشاہِ عادل" کا ذکر کیا ہے جس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ واقعہ غالباً عہدِ اکبر سے متعلق ہے :

رفتہ برِ "بادشاہِ عادل" فریاد و فغاں کشیدہ از دل
کردہ دہ ہزار داد فریاد کای بادشہِ جہاں بدہ داد

یہ تو مولانا باقی کے بیانات ہیں جن سے اس امر کی تصدیق ہو رہی ہے کہ ہیر اور رانجھا اکبر کے عہد کے قریب قریب روایتی طور پر زندہ تھے۔ اب ہیر کے معروف مقبرہ کی طرف آیئے جو آج کل کے جھنگ سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے متعلق مقامی روایت یہ مشہور ہے کہ یہ مقبرہ پہلے یہاں نہیں تھا اور اس جگہ سے ہٹ کر دریائے چناب کے کنارے پر واقع تھا۔ اتفاق سے دریائے چناب میں ایک بادشاہ یا تاجر کشتی میں سفر کر رہا تھا، اور اس کی کشتی ایک دفعہ اس کنارے پر لگی جہاں ہیر کا مزار تھا۔ رات اس نے اسی مزار پر بسر کی اور ہیر نے خواب میں آکر اسے کہا : میرا مزار یہاں سے ہٹا کر فلاں جگہ پر بنا دو لیکن اس طرح کہ اس کی چھت کھلی رہے تاکہ بارشِ انوارِ الٰہی اس پر ہوتی رہے۔ بادشاہ یا تاجر نے صبح اُٹھ کر ہیر کی اس خواہش کی تکمیل کی اور جھنگ کے قریب موجودہ جگہ پر ہیر کا تابوت منتقل کر کے اس پر مقبرہ بنا دیا۔

عالمگیر کے عہد میں ایک شاعر میتا چنابی گذرا ہے۔ اس نے ۱۱۱۰ھ قمری میں ہیر رانجھا کا قصہ فارسی میں نظم کیا ہے۔ اس نے بیان کیا ہے کہ پہلے ہیر کو چوچک کے گاؤں "چوچکانہ" میں دفن کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہ تھی لیکن کچھ مدت گذرنے کے بعد ایک حاکم کو خواب میں ہیر دکھائی دی اور اس کے کہنے کے مطابق ہیر کا مقبرہ نواحِ جھنگ میں تعمیر کیا گیا۔ چنابی اپنی مثنوی میں رانجھا کے لئے "ماہی" کا لفظ استعمال کرتا ہے اور واقعہ یوں بیان کرتا ہے :

ماہی چوں برفت زیں جہاں ہیر در رفتنِ خود چہ کرد تاخیر
مدفونش بہ چوچکانہ کردند در خاک ودیعتش سپردند
جای موزوں دراں زمانہ بودی نہ ورای چوچکانہ
یکچند بریں سخن چو بگذشت ہم جھنگ بحسن سمر گشت (کذا)
ہیرش بشبی بخواب فرمود گفتا بہ برم ازیں زمیں زود
دفنم کن در نواحِ جھنگ در طرف جنوب او دو فرسنگ
حاکم چو شنید زاں پری کیش ایں امر پیٔ سعادت خویش
تابوت از آں زمیں ربودہ زیرش بصواب فرق سودہ
مدفونش درہماں زمیں کرد تعمیر سزای آفریں کرد
خوش ساختہ روضۂ سرافراز لیکن سرِ او بسانِ در باز
آں روضہ نشانِ عشقبازیست مظہر پیٔ شانِ عشقبازیست
من ہم کردہ ام زیارتِ او دیدم روِشش عمارتِ او

چنابی کے آخری شعر سے اس امر کی شہادت بھی ملتی ہے کہ اس کی مثنوی کی تکمیل یعنی ۱۱۱۰ھ قمری (۱۶۹۸ء) سے پہلے ہیر کا مقبرہ یہاں موجود تھا اور چنابی نے اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اب عمارت کے فنِ تعمیر پر تفحص کی ایک نظر ڈالیں تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سولھویں صدی عیسوی کی عمارت ہے۔ اس کی اینٹیں وہی ہیں جو اکبری عہد میں استعمال ہو رہی تھیں، اور مقبرہ کی اٹھان بھی سولھویں صدی کے مزارات کی طرح ہے۔ مقبرہ کی چاروں دیواروں میں ایسے طاقچے اور کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں جو اپنی قدامت کی خود شہادت دے رہی ہیں۔ یہ مقبرہ بھی اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا مدفون سولھویں صدی عیسوی یا اس سے پہلے زندہ تھا لہٰذا اگر ہیر اور رانجھا کا کوئی وجود تھا اور ان میں سے اگر ایک فرد بھی اس مقبرہ میں دفن ہے تو ان کے زمانے کی قدامت کم از کم اکبر کے عہد تک حتمی طور پر ثابت کی جا سکتی ہے۔

* * *

اب قیمتیں گر رہی ہیں

"احساس" :۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بقیہ صفحہ ۴۳

چچا فضلو اپنا کام ختم کرکے ناشتہ کرنے گھر لوٹا۔ جہاں چوکھٹ ہی پر اسے اپنی بیوی نظر آئی جو نہایت ہمدردانہ انداز میں لبوں پر تبسم بکھیرے اپنی نشیلی آنکھوں میں اس کے لئے سارے زمانہ کا پیار سمیٹے اس کی منتظر تھی۔ چچا فضلو نے آج عجیب بیباک نظروں سے اس کے گدرائے ہوئے جسم کو گھورا۔ وہ شرما گئی۔

فضلو نے چپ چاپ ناشتہ کیا۔ لیکن اس کا ذہن ہزار ہا خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا:

"یہ میری غلطی ہے۔ مجھے اپنے کو اتنا ہلکان نہیں کرنا چاہیئے۔ میں بھی تو انسان ہوں۔ مجھے بھی سیر و تفریح کی اتنی ہی ضرورت ہوسکتی ہے جتنی کہ دوسروں کو۔ آخر اتنی ذمہ داری سے کیا حاصل؟ بھلا یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ دوسرے تو چھٹی کے دنوں میں آرام کریں اور میں ناحق اپنے کو کام میں پھنسائے رکھوں۔ آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یقیناً کوئی ضرورت نہیں۔ اتنا اچھا موسم اور کام بھی نہیں۔ کم از کم مجھے ایسے میں ایک اچھی سی دعوت کرکے اپنے ہونے والے داماد کو تو بلانا چاہیئے۔ جانے کیا سوچتا ہوگا وہ بھی!" چچا فضلو آج زندگی میں پہلی بار اس طرح سوچ رہا تھا۔ آج اسے موسم کی دلفریبی کا احساس ہوا تھا ۔۔۔۔ اور شاید اپنی طویل راتوں کی بے ہنگم تنہائیوں کا بھی احساس! اس کی بیوی کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

آخری لقمہ چباتے ہوئے اس کی آنکھیں کسی اندرونی مسرت اور شادمانی سے چمکنے لگیں۔ اس نے ادھ چبا نوالہ جلدی سے نگلا، اور بجلی کی تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے انتہائی رومانی انداز میں اپنی گم گشتم بیوی کو دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹوں کو گھورا، جیسے زندگی کا تمام تر احساس مال گوداموں کی ذمہ داری سے 'چوکیداری کرنے سے چھٹ کر اب ان ہونٹوں میں آگیا تھا۔ اس نے ان ہونٹوں کو مس کیا ۔۔۔۔ دھیرے سے ہولے سے۔ پھر وہ پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"چل اُٹھ، جلدی سے تیار ہوجا۔ ہم بھی میلہ دیکھنے جائیں گے ہاں! تو اتنے تیار ہو میں باہر تجربہ پینٹنگ کستا ہوں"

اس کی بیوی عجیب بے یقینی سے اسے گھورنے لگی یہاں تک کہ چچا فضلو نے اپنی شادی کا زری دار جوڑا نکالا جو جانے کتنے ہی سالوں سے لکڑی کے بکس کی زینت بنا ہوا تھا۔ پھر مل مل کر نہایا، اور صاف ستھرا ململ کا کرتہ پہنا۔ شادی کا ریشمیں پجامہ نکالا، سرسوں کا تیل لگاکر بال کاڑھے اور بھر شان سے رنگین پگڑی سر پر رکھ کر اس کا پلو شانے پر درست کرنے لگا۔ پھر طلے کے کام کی ہوئی شادی کی صدری پہنی اور سٹھوار کا خاص جہلم کا جوتا پہن کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر بولا:

"ارے تو اب تک تیار نہیں ہوئی؟"

اور اس کی بیوی سوچ رہی تھی برسوں سے اس گاؤں کی حدود میں کوئی 'انقلاب' نہیں آیا تھا، آج کیسے آگیا؟ ۔۔۔۔ "ابھی ہوتی ہوں" وہ دھیرے سے گنگنائی!! (خیال ماخوذ)

★

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط:۔

(۱) ماہِ نو میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

صحت مند جلد کی قدرتی
خوبصورتی کے لئے
اصل خوبصورتی کا انحصار صحت مند جلد پر ہے
رکسونا صابن آپ کی جلد میں جذب ہو کر نہ صرف اسے صاف
کرتا ہے بلکہ یہ صحت بخش بھی ہے۔ نیز رکسونا میں
کیڈل بھی ہوتا ہے جو اُن قدرتی تیلوں کا ایک خاص مرکب
ہے جن سے آپ کی جلد لطافت و جاذبیت حاصل کرتی ہے
اپنی جلد کی حفاظت
رکسونا
صابن سے کیجئے
Rexona
رکسونا

RP. 15—183 UD

ماہِ نو، کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۰ء

افق تا افق:

ہماری موسیقی

(ایک مغربی نقاد کی نظر میں)

"کیا آپ کو ہماری موسیقی پسند ہے؟ کیا آپ واقعی ہماری موسیقی کو پسند کرتے ہیں؟" برصغیر پاک و ہند میں کئی لوگ مغربی ناقدان فن سے یہ سوال پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دراصل وہ پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ آپ لوگ ہماری موسیقی کو سمجھتے بھی ہیں یا نہیں جس کا ظاہر ہے کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ بات یہ ہے کہ ہماری روایات اِن باتوں میں بہت حصہ لیتی ہیں۔ کیونکہ زندگی ہو یا تاریخ اپنے آپ کو ایک مخصوص رویہ یا ردِ عمل کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ لہٰذا جب ہم گانا سنتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ ہم اس کو سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ ہم اس پر ذرا بھی سوچ بچار نہیں کر رہے ہوتے۔ اہل یورپ مغربی موسیقی کی کسی نادر تخلیق کو ایسے ہی سن لیتے ہیں جیسے وہ کوئی ادق چیز ہونے کے باوجود مانوس ہی ہو۔ اس کی وضع ہماری توقعات کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم کسی نئے فن کار سے دوچار ہوتے ہیں اور وہ رواجی یا روایتی طور طریق سے انحراف کر کے ساز یہ میں کوئی نئی دھن یا گر برتتا ہے، آواز میں کوئی اور تیور، غیر مانوس تالیف یا تان پلٹے سے کام لیتا ہے تو ہم سوچے بغیر نہیں رہ سکتے اور ہماری سوجھ بوجھ کھوسی جاتی ہے۔ ہم موسیقی کے اس نمونے کو اس لئے پسند نہیں کرتے کہ ہم اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ موسیقی پسند کی جاتی ہے، سمجھی نہیں جاتی۔ یہ صحیح نہیں ہم اس میں کوئی بات ڈھونڈتے ہیں اور اس کو پا کر اس کا پورا پورا احساس بھی کرتے ہیں۔ سارا عمل ایک کیفیت ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ اس کا تجزیہ نہ کیا جا سکے۔ خواہ ہم شعوری طور پر ایسا نہ کر رہے ہوں۔

ایک اور بڑی دقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سوال نئے پرانے کا نہیں بلکہ اور ہی قسم کی موسیقی کا ہو جس کی وضع اور متلازم اثرات ہمارے لئے بالکل اجنبی ہوں۔ اگرچہ ہماری اپنی موسیقی یکساں قسم کی ہے پھر بھی اس میں قومیتوں کا فرق موجود ہے۔ ایک ملک کے لوگ کسی دوسرے یورپی ملک کی موسیقی کو سن کر خیال کرتے ہیں کہ اس کے بعض حصے موسیقی کی فطری کیفیت کی عکاسی نہیں کرتے، پھر بھی مغربی موسیقی کی یکرنگی برقرار رہتی ہے۔ لیکن جونہی ہم مغربی ممالک کے تہذیبی رچاؤ، مقابلہ و کشمکش، سائنسی طور طریق اور چست و چاق رہنے کے تقاضوں سے گزر کر مشرق کے امن و سکون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جہاں انسان کی زندگی اس کے اپنے ہی لئے ہوتی ہے یا بڑی حد تک اس کے اہل و عیال کے لئے نہ کہ ملک و قوم کے لئے، جہاں انسان واقعی زندگی بسر کر سکتا ہے، جہاں حقیقت کا سراغ نہ تحلیل و تجزیہ سے ملتا ہے نہ باہمی مفاہمت میں۔ اور روحانی غذا گولیوں میں لپٹی لپٹائی نہیں ملتی تو ہماری سوجھ بوجھ کچھ کام نہیں کر سکتی کہ ہم ایسی موسیقی کی طرف کیا رویہ اختیار کریں جو کافی پھیلی ہوئی ہونے کے باوجود ہیجانی ہوتی ہے۔

ایسا ہی ایک اجنبی سا انداز ہمیں اپنے ہی قرون وسطیٰ کے گوناگوں، کثیر الاصوات آہنگ میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں سوال مقام کا نہیں بلکہ وقت کا ہے۔ کیونکہ ہمیں اپنی تہذیب و تمدن کے پورے چار سو سال پھلانگ کر ایک اور ہی وضع کو اپنانا پڑتا ہے۔ ہم اسالیب کی بحث و تکرار کو فراموش کر کے حسن کے ایسے مظاہر سے روشناس ہوتے ہیں جو مدتیں گذری پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے۔ ہم حیران ہوتے ہیں کہ آج وہ کاریگر کہاں ہیں جنہوں نے نغمہ و آہنگ کے ایسے شاندار محل تعمیر کئے تھے۔ ان کی کامیابی کا راز کیا تھا۔ اور وہ زندگی کیا تھی جس کی انہوں نے اپنے فن میں عکاسی کی تھی۔ وہ ہمیں بھولی بسری امیدوں اور کھوئی ہوئی خوشیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ اس موسیقی سے ایک مذہبی انسان یکلخت اُس حقیقت کو بھانپ لیتا ہے۔ جو حدود و تعین سے ماورا ہے۔ یہی عجیب شناسائی ہے جس کا احساس ہمیں برصغیر پاک و ہند کی موسیقی سے ہوتا ہے۔

لیکن ان ابتدائی قسم کے عوامی گیتوں کی روح اور وضع اور اسلوب کو سمجھنے کے لئے تو اور بھی زیادہ پروازِ تخیل کی ضرورت ہے۔

میرا مطلب ہے تالیفی موسیقی (HARMONY) کے برعکس مفرد قسم کی موسیقی (MELODY) جس کا سمجھنا ان لوگوں کے لئے تو اور بھی دشوار ہے جو اس سادہ موسیقی کا تصور تالیفی موسیقی ہی کی بنیاد پر کرنے کے عادی ہیں۔ وہ اس کو تالیفی موسیقی کے بغیر قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ یہ مسئلہ واقعی بہت ٹیڑھا ہے۔ کیونکہ تالیفی موسیقی کی بناء پر مرتب کیا ہوا عوامی گیت تو تالیفی بنیاد کے بغیر یورپی سامعین کو یوں لگتا ہے جیسے وہ پارہ پارہ ہوتا جا رہا ہو۔ اُس تصویر کی طرح جس میں تناظر کا فقدان ہو۔

تالیفی و مفرد موسیقی میں ایک اور زیادہ گہرا رشتہ بھی ہے جس میں تالیف و ترتیب محض ظاہری آرائش ہی نہیں ہوتی جس کو ہم جب چاہیں اس پر چسپاں کر دیں بلکہ اس پر اثر انداز ہونے والا ایک نہایت جاندار عنصر ہے۔ دُھن کیا ہے۔؟ ایک موسیقانہ جملہ، ایک پیرا، ایک باب۔ ظاہر ہے کہ جملے میں اہم الفاظ بھی ہوتے ہیں اور غیر اہم بھی۔ یہ محض لغت کے الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح دھن میں بھی اہم اور غیر اہم سُر ہوتے ہیں۔ اور ان کی موزونیت یا معقولیت کا دارومدار تمام تر ان کے نظم و ترتیب پر ہوتا ہے۔ لیکن وہ اصول جن پر دُھنوں کی اہمیت مبنی ہوتی ہے، وہ مفرد اور تالیفی موسیقی میں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

تالیفی موسیقی میں سب سے واضح بات یہ ہے کہ نظم و ترتیب کی بعض صورتیں دوسری صورتوں سے زیادہ خوش آہنگ ہوتی ہیں۔ جو صورتیں زیادہ خوش آئیند ہوں مغنی ان پر زیادہ زور دیتے ہیں اور دوسرے مجموعوں سے یونہی سرسری طور پر گذر جاتے ہیں۔ تالیفی موسیقی کی روح رواں یہی اہم اور سرسری سُر ہیں۔ اور اس میں سامعہ کی تربیت کچھ اس طرح کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ سرسری سُر اہم سروں کی جگہ لینے جائیں اس طرح جو لہریں قلموں مجموعے یا تانیں پیدا ہوتی ہیں وہ اس سر کو زیادہ وضاحت یعنی اہمیت عطا کرتے ہیں جس پر وہ مرکوز ہوں۔

مفرد موسیقی کا مابہ الامتیاز اکہرے سروں کا سلسلہ ہے جس میں دُھن کا آہنگ محض اونچا نیچا ہوتا رہتا ہے یعنی اس میں زیادہ اتار ہوتا ہے یا چڑھاؤ۔ اس کے معنی ہیں ایک خاص ہموار سطح کا تعین جس پر دُھن مجموعی طور پر قائم رہتی ہے۔ اور جس کے مقابلے میں زیادہ نمایاں حصے۔ اونچے ہوتے ہیں یا نیچے۔ لہذا مفرد موسیقی کے قواعد ان اونچی نیچی سطحوں کے مابین فاصلہ سے متعین ہوتے ہیں اور ایک سطح سے دوسری سطح تک گریز کی جاتی ہے۔ بعد میں یہ روش مستحکم ہو کر روایت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ درمیانی سُر یا وہ سُر جو ان دونوں نمایاں مقامات سے دور رہوں، کم یا زیادہ اہمیت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ گویا سارا تالیفی گیت ان ہی اہمیتوں کے تنوع پر مبنی ہوتا ہے۔

چونکہ تالیفی موسیقی جہاں جی چاہے دھن کے کسی بھی سُر پر زور دیتی ہے، اس لئے تالیفی دُھن کا رجحان یہ ہوگا کہ وہ آہنگ کے بہت ہی زوردار مقامات کی نہج پر چلے اور ان کی بحرانی کیفیتوں کو ابھارے۔ ایسی موسیقی کی اہمیت اس تصادم کا نتیجہ ہوگی جو مفرد موسیقی کے لاابالیانہ پن اور تالیفی ربط و ضبط سے پیدا ہو۔ ان دو رجحانات کی باہمی مفاہمت ہیئت میں چستی اور وحدت پیدا کرے گی کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کو مطلق العنان ہو کر اپنی راہ اختیار کرنے سے باز رکھیں گے۔

اس کے برعکس مفرد موسیقی کا قانون خود اس کی ذات میں مضمر ہے۔ اور اسے صرف اپنے اصول کو واضح کرنے ہی کی ضرورت ہے۔ اور بس۔ نہ کہ یہ اس کا کسی اور سے تصادم ظاہر کرے۔ اگر آہنگ کے اصولوں سے تجاوز نہ کیا جائے تو کسی ایک طرح کو دوسرے پر ترجیح دینا کچھ ایسا قابل لحاظ نہیں۔ اس طرح ہم بہ آسانی تنوع اور جزئیات کی تفصیل کی طرف رجوع کر سکتے ہیں جس سے دھن بجائے خود نمایاں نہیں رہتی اور سارا زور کیفیت پر جا پڑتا ہے۔ تالیفی موسیقی کا وصف امتیازی ہے رچاؤ، تربیت۔ اور مفرد موسیقی کا جوہر خالص لوچ اور ہلکی پھلکی نفاست۔

ہمارے لئے یورپ کی قدیم موسیقی کو سمجھنا دشوار نہیں لیکن برصغیر پاک و ہند میں صدہا سال کی جمع شدہ، بے شمار روایات ہمارے اور وہاں کی دھنوں کی ادائیگی اور تحسین کے مابین سد راہ ہیں۔ ہم اس موسیقی کو سمجھنے سے قاصر ہیں جس میں ہم خود حصہ نہ لیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ کوئی مغنی بھی اس موسیقی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر اسے یقین ہو کہ یہ روایات فی نفسہٖ دلچسپ ہیں اور ان کی تہہ میں حقیقتہً فن بھی کارفرما ہے۔ یہاں کی اعلیٰ ترین موسیقی کو سمجھنے میں سب سے بڑی مشکل اس کا مذہبی عنصر ہے۔ موسیقی کی کوئی عام فہم زبان نہیں اور اس زبان کا ادراک اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب کہ اس کا موضوع وہ ہو جو ہر سمجھدار شخص اپنی ہی ذات تک محدود رکھتا ہے۔ مذہبی احساس کی وسعت اور

گہرائی ہر ملک میں مختلف ہوتی ہے۔ یورپ اور برصغیر کے مذاہب کی روحانیت سے تعرض کئے بغیر ہم ایک کو عملی اور دوسرے کو فکری قرار دے سکتے ہیں۔ یورپ، خصوصاً انگلستان میں ایسے مذہب کو کچھ ایسا وقیع خیال نہیں کیا جاتا جو اچھی زندگی بسر کرنے میں مدد نہ دے۔ برصغیر میں تمام تر مذہب کی نوعیت پر زور دیا جاتا ہے یعنی یہ کہ اس میں عرفان اور پرواز تخیل کا کتنا عنصر ہے جس سے اعلیٰ زندگی قدرتی طور پر صادر ہوتی ہے۔ لہٰذا یورپ میں جو موسیقی زیر بحث موسیقی سے قریب ترین معلوم ہوتی ہے وہ موسیقی ہے جو سنکے سنٹسٹس (CINQUECENTISTS) موسیقاروں کے یہاں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک خاص زاویۂ نگاہ مثلاً مذہبی تصور ایک خاص قسم کی موسیقی کو جنم دیتا ہے۔

برصغیر نے جتنی مفرد موسیقی کو رواج دے کر بھلا دیا ہے اتنی یورپ نے سیکھی بھی نہیں! برصغیر میں تے اور تال کا ایک باہ نہیں کئی کئی با گوناگوں شکلوں میں سنجوگ ہوتا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس موسیقی کا نظری حصہ بھولے بسرے نظاموں کا ایک جمگھٹا بن کر رہ گیا ہے۔ وراثت سن کے باعث اس کا احترام زمان ومکان کے حجابات سے عین ذات پر انکا توجہ، وہ القان جو دور حاضر کو ازلی دور خیر سے وابستہ کرتا اور بہترین روحانی بلندیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان سب عناصر نے مل کر برصغیر کی موسیقی کو ایک منفرد تشخص عطا کر دیا ہے۔ اور ایسے ناموں اور صفات کی یاد محفوظ کر رکھی ہے جو ایک مدت سے بیگانۂ معنی ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ان کے اکثر نظریوں کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اساطیری حصہ کو سمجھ کو سکیں۔ اسی طرح عملی پہلو کو لیا جائے تو فی البدیہہ نغمہ سرائی ایک ہی دن یا ایک ہی فرد کی عین حیات میں تیار نہیں ہوئی بلکہ بول چال کی طرح یہ ساری قوم کے جبلی موروثی احساس کا نتیجہ ہے۔

اس ہی کا تعلق ایک اور خصوصیت سے بھی ہے۔ بہ کہ اس موسیقی میں بولوں یا سروں کو لکھ کر یا دداشت کو گنانے کا جتن نہیں کیا جاتا۔ درحقیقت یہ صدہا سال کا ریاض ہی ہے نہ کہ یادداشت جس نے برصغیر کے موسیقاروں کو ان متنوع طریقوں کا ایک بے پایاں خزانہ عطا کر دیا ہے۔ اور وہ اس سے جھٹ اپنی ہی کوئی دھن وضع کر لیتے ہیں۔ یہ بدیہہ آفرینی وہ کرشمہ ہے جو ایک رجزیہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جیساکہ وہ تمام فنون جو پشت در پشت منتقل ہوتے چلے آ رہے ہوں کہتے ہیں کہ اگر ہم "اولڈ ٹرنک روڈ" پر سفر کریں تو ہم براہ راست انجیل کے "باب پیدائش" میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم ان صدہا سال قدیم ترانوں میں ہومر کے رجزیہ نغمہ سراؤں کا والہانہ آہنگ پاتے ہیں۔ یہ موسیقی قدیم ہے۔ لیکن لعینہ یونان کے انمٹ ریحان شباب کی طرح نہ کہ ٹروبا ڈور نوا سنجوں کی سکہ بند موسیقی کی طرح جو قواعد وضوابط کے شکنجے میں اس طرح جکڑی ہوئی تھی کہ اس دور کو، موسیقی کا دوسرا عہدِ طفولیت قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔

موسیقی اور بول چال جغرافی حیثیت سے ایک ہی نہج اختیار کرتے ہیں۔ یہ دونوں الگ تھلگ معاشروں میں گمبھیرتا پیدا کر کے بالآخر آپس میں گھل مل جاتے ہیں اور ایک مجموعی، ہمہ گیر بہاؤ پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ راگوں کے سینکڑوں نام اس حقیقت کو نمود دیتے ہیں کہ دھنیں ہر اعتبار سے بولیوں ہی کی طرز وروش اختیار کرتی ہیں۔ الگ الگ درباروں نے بھی موسیقی میں ایسی ہی گمبھیر اور بھرپور کیفیت پیدا کی ہے۔ اب جبکہ خلوت، جس پر فکری موسیقی پروان چڑھتی رہی ہے، کی بجائے جلوت کا بازار گرم ہے اور قصباتی یا درباری فضا ناپید یا نسبتہً کم ہو گئی ہے، کوئی مغنی اپنے فن پر چنداں فخر محسوس نہیں کر سکتا۔ پھر بھی یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ موسیقی ہر بوالہوس کی حسن پرستی سے بیزار ہو کر دنیا سے مفقود ہو جائے گی۔ بالخصوص ایک ایسی قوم سے جو شعر ونغمہ کی روح سے بدرجۂ اتم سرشار ہے۔

چونکہ زیر بحث موسیقی کی زبان میں مقدار (QUANTITY) کا عمل دخل ہے نہ کہ تاکید (ACCENT) کا اس لئے اس کی تالیں آہنگ کی بجائے وزن پر مبنی ہیں۔ کھلی آوازوں کی کثرت اور وزن کے امتزاج سے موسیقی بڑی حد تک آواز سنگیت رہی ہے نہ کہ ساز سنگیت، اور چونکہ آواز مدھر لہجہ کی یکسانیت پر زور دیتی ہے نہ کہ تند وتیز ہیجانی جذبات پر، اس لئے اس کمی کو طبلے کے بولوں سے پورا کر دیا گیا ہے۔

موسیقی کے اعلیٰ مظاہرے تو کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن جب بھی انسان ان سے دوچار ہو تو ان کے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ بے ساختگی، اور صدیوں قدیم دنیا یا جہانِ دیگر کی یاد آوری ہمیں حسن وکیف کے اس احساس سے سرشار کر دیتی ہے۔

جو کم درجہ فن میں بھی مفقود نہیں ہوتی۔ ان فن پاروں کا موضوع وہی انسان کی فطری خواہشات ہیں اور وہی بیم و امید کے سیدھے سادے احساسات۔ وہی ذکرِ الٰہی کی لامتناہی تکرار اور انسانی محبت کی داستان جس سے طبیعت کبھی سیر نہیں ہو سکتی۔

موسیقی کی نشو و نما کا سلسلہ کبھی رک نہیں سکتا۔ اس فن کے رسیا پرانی راہوں میں نئی پگڈنڈیاں پیدا کرتے ہی رہتے ہیں۔ اس دوران میں بہت کچھ بھول بھی جاتا ہے، ناپسندیدہ عنصر چھٹ جاتے ہیں لیکن فن کا دریائے رواں برابر جاری رہتا ہے۔ برصغیر کی موسیقی کو جو ذرائع اظہار میسر ہیں ان میں نئے حالات کے گوناگوں تقاضوں کے باعث کچھ نہ کچھ کمی بیشی اور کاٹ چھانٹ ضرور ہوگی، اس کے ترچھے ٹیڑھے کونے ہموار ہو جائیں گے اور جن امور کی واقعی ضرورت ہے، وہ زیادہ سادگی، صفائی اور خوش اسلوبی سے ادا کئے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں فرسودہ پابندیاں اور قواعد و ضوابط کبھی سدِ راہ نہیں ہو سکتے۔ زندگی کی طرح فن بھی اپنی آزادی کی راہیں تلاش کر ہی لیتا ہے۔

سنوارنے نکھارنے کا یہ عمل شروع ہو چکا ہے اور کئی ایک باتیں چھٹ بھی چکی ہیں۔ یہ ہے تو افسوسناک لیکن اصلاح کا راستہ صرف ایک ہے: اول نئے حالات کو قبول کر لیا جائے۔ پھر ان سے بے نیاز ہو کر موسیقی کو تخلیق کیا جائے۔ اور بعد میں نئے حالات ہی سے ان میں زندگی کی روح پھونکی جائے۔ وہ موسیقی جو انسانوں کے حقیقی احساسات اور تقاضوں پر مبنی نہ ہو وہ کوئی موسیقی نہیں۔ یہ کہنا کہ راگ راگنیاں اور تالیں بالکل اسی قدیم حالت میں رہیں جس میں یہ پہلے تھیں، اسی قدر راہِ راست سے دور ہے۔ جتنا یہ کہنا کہ بیسویں صدی کی شاعری چاسر کی زبان یا بنگلا میں محبت کا گیت صدہا سال پرانی زبان میں لکھا جائے۔ (لے۔ ایچ۔ ایف۔ سٹرینگ ویز)

"سرحد کا پہلا اردو شاعر" ——— بقیہ صفحہ (۲۵)

مخمس کے چند بند

(اس مخمس میں شاعر نے اپنی ہی ایک غزل تضمین کی ہے۔)

آج باندھا سر اپن پر چیرہ لالی الحفیظ
مست آیا از شراب پر تگالی الحفیظ
مال دانائی ہمو نے آکو ڈالی الحفیظ
"اب جو یہ تلوار زلفوں کی نکالی الحفیظ
مت کوئی آکو ملو ہے پائمالی الحفیظ"

جب منے جام محبت اس پیاڑی کا پیا — پیاڑے
روز اول سوں ہمونے غم کوں دل اپنا دیا
کچھ نہیں واقف مرے احوال سوں میرا پیا
"کل مجھے بیمار اپنے نین کا فرسوں کیا
آج مجھکوں پوچھتا ساجن خیالی الحفیظ"

چھوڑ دیا عشق موں ہم نے جہاں کا کام کاج
سخت ہوتا ہے مجھے اب کیا کروں کس سوں [illegible]
جاں بلب سینہ (؟) ہے مجھکوں کچھ نہیں میرا علاج
"کل بھیا مجھکوں، نہیں واقف مرے سوں یار آج
خوب یاری ہم ستیں ساجن نے پالی الحفیظ"

جسم میں تازگی
محافظِ صحت لائف بوائے صابن کی بدولت
لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے فرحت بخش جھاگ جلد پر مسامات
جراثیم آلود میل اور گرد کو الگ کر دیتے ہیں جس سے جسم صاف اور ستھرا ہو جاتا ہے
اور آپ دن بھر ایک لطیف تازگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ اطمینان کر لیجئے کہ آپ
کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے صابن
سے محفوظ رہے۔
LIFEBUOY
SOAP
لائف بوائے صحتمند زندگی کا ضامن ہے
L 50-193 UD

جی! یہ قمیص
گھر میں دُھلی ہے!
یہ سن لائٹ سے
کِسقدر آسان ہے!
سن لائٹ کے کثیر جھاگ کپڑے دھونے کا کام آسان کردیتے ہیں کوٹنے پیٹنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر کپڑے سن لائٹ سے دھوئے جائیں تو ان کی زندگی بڑھ جاتی ہے
سن لائٹ کے کثیر جھاگ نہایت نفاست سے کپڑوں کو سفید اور اُجلا کر دیتے ہیں
سن لائٹ کے خالص جھاگ آپ کے کپڑوں کیلئے بھی نہایت ملائم ہوتے ہیں۔
سن لائٹ کے کثیر جھاگ کی بدولت تھوڑے سے سن لائٹ سے بڑی تعداد میں کپڑے دھوئے جاسکتے ہیں۔ کپڑے آپ خواہ کسی طرح بھی دھوئیں مگر سن لائٹ صابن سے کپڑے زیادہ تعداد میں اور زیادہ صاف دُھلتے ہیں۔
سن لائٹ صابن
پٹخے بغیر کپڑوں کو سفید اور اُجلے دھوتا ہے
SUNLIGHT SOAP
S. 16—103 UD
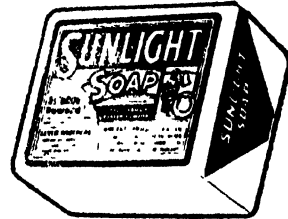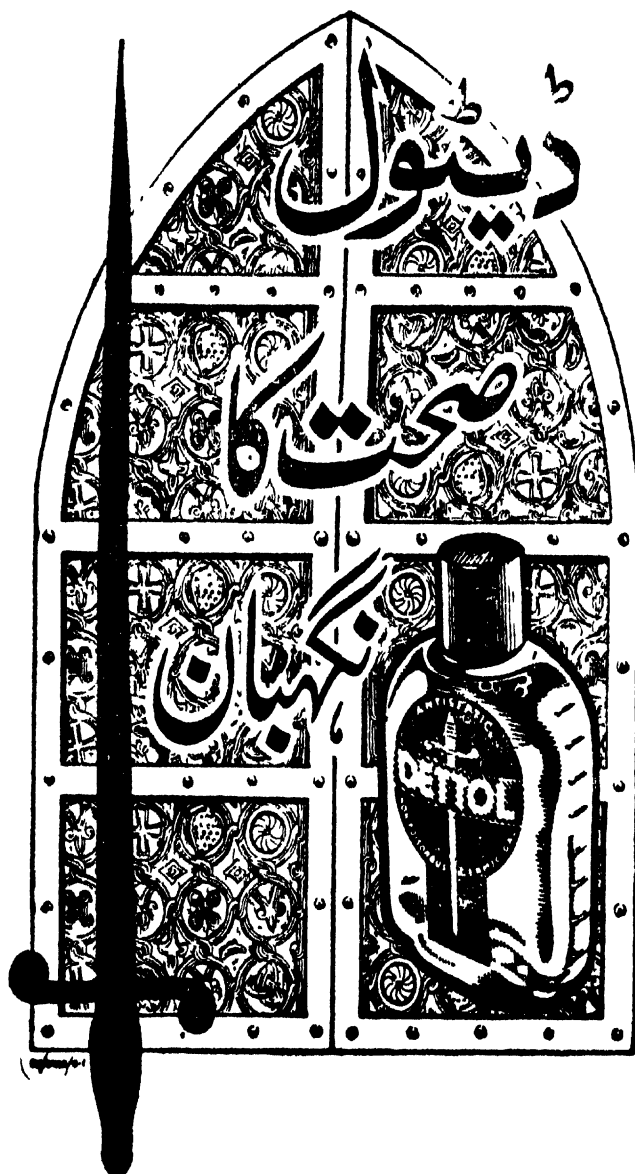
جدید جراثیم کش
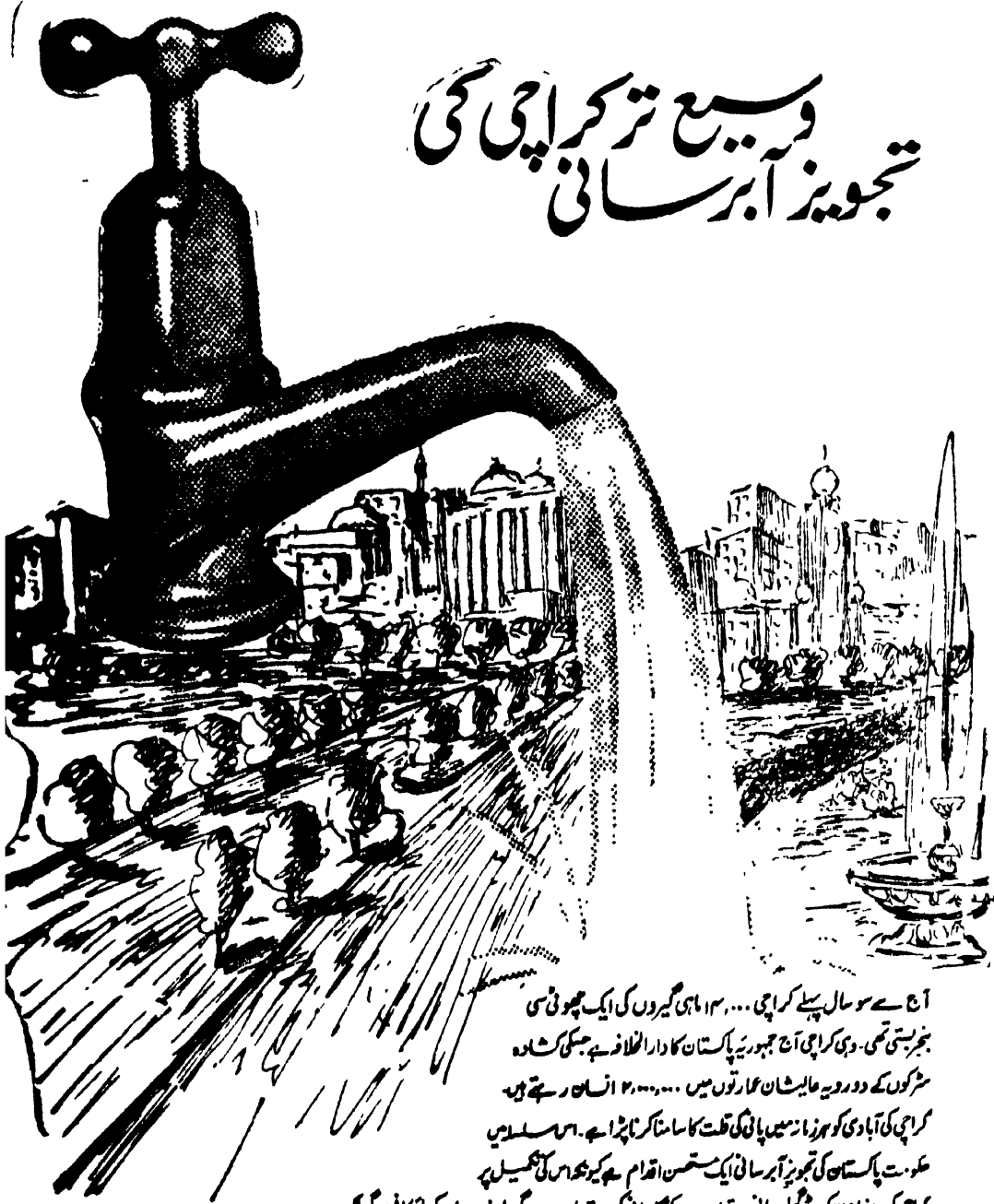
وسیع تر کراچی کی
تجویز آبرسانی
آج سے سو سال پہلے کراچی ... ۱۴ ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی
بنجر بستی تھی۔ وہی کراچی آج جمہوریہ پاکستان کا دارالخلافہ ہے جسکی کشادہ
سڑکوں کے دورویہ عالیشان عمارتوں میں ...،۲۰۰۰ انسان رہتے ہیں۔
کراچی کی آبادی کو ہر زمانہ میں پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس سلسلہ میں
حکومت پاکستان کی تجویز آبرسانی ایک مستحسن اقدام ہے کیونکہ اس کی تکمیل پر
کراچی کو روزانہ ۱۲ کروڑ گیلن پانی دستیاب ہو سکے گا۔ پانی کی یہ مقدار نہ صرف گھریلو ضروریات کیلئے کافی ہوگی بلکہ
اس سے خوبصورت سبزہ زار اور سڑکوں کی دونوں جانب سایہ دار درختوں کو پانی دینے میں بھی مدد ملے گی۔
پاکستان کی ترقی کے ساتھ ساتھ برماشیل کی کامیابی، محنت اور مہم جوئی کی تاریخ میں بھی ملک اور
اہل ملک کی خدمت کے ابواب کا برابر اضافہ ہو رہا ہے۔
برماشیل ترقی پاکستان کا معاون ہے
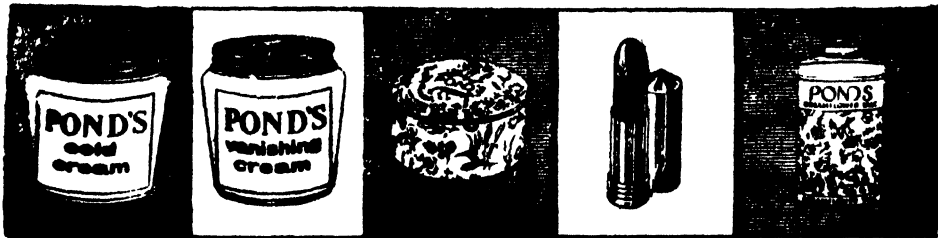
ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ، کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

نوشہرہ میں کاغذ سازی اور ہارڈ بورڈ کا کارخانہ

۱ :

۲ :

۳ :

۴ :
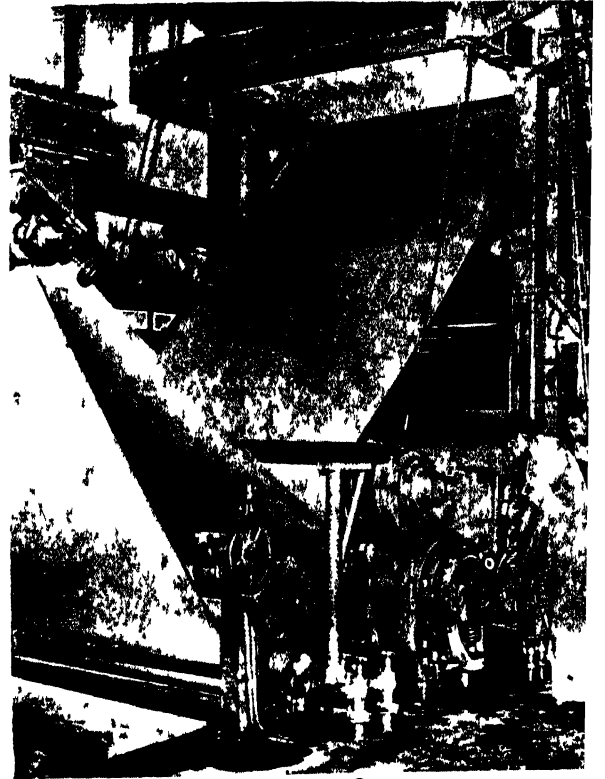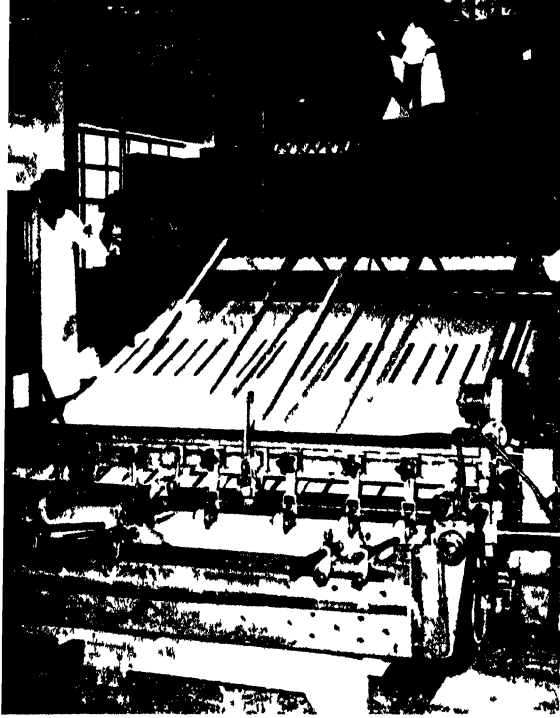
۱— کارخانہ کا بیرونی منظر

۲— ہارڈ بورڈ کی تیاری

۳— مناسب سائزوں میں کٹائی

۴— تیار مال کی پیکنگ

۱۹۵۳–۱۹۵۸ء

کے چیدہ مضامین نظم و نثر کا انتخاب

علم ادب ثقافت

فن افسانہ

ڈرامہ

غزل نظم

تنقید

چند لکھنے والے:

* ڈاکٹر سید عبداللہ * ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
* ڈاکٹر عبادت بریلوی * نذر سجاد حیدر
* محمد حسن عسکری * الطاف گوہر
* عزیز احمد * ممتاز مفتی
* غلام عباس * ابوالفضل صدیقی
* حجاب امتیاز علی * آغا بابر
* شوکت تھانوی * اشرف صبوحی
* شاہد احمد دہلوی * روش خاور
* جگر مرادآبادی * جوش ملیح آبادی
* حفیظ جالندھری * حفیظ ہوشیارپوری
* فراق گورکھپوری * عدم
* شان الحق حقی * ابن انشا
* فضل احمد کریم فضلی * جعفر طاہر
* تابش دہلوی * یوسف ظفر
* قیوم نظر * جمیل نقوی
* عاصمہ حسین * ناصر کاظمی
* ضمیر جعفری * زہرہ نگاہ وغیرہم

رنگین خوبصورت گردپوش

قیمت پانچ روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ۔ کراچی

اقبال اکیڈمی کا عام سالانہ اجلاس

کراچی میں قاضی نذرالاسلام کی ساٹھویں سالگرہ—بیگم وقارالنساء نون کا خطبئہ استقبالیہ

ایران میں یوم اقبال کی تقریبات میں شرکت کے لئے
جناب ممتاز حسن ، نائب صدر اقبال اکیڈمی ، کی روانگی

کام میں خوشی
جسم میں تازگی
محافظِ صحت لائف بوائے صابن کی بدولت
لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے فرحت بخش جھاگ جلد کے ہر مسام سے
جراثیم آلود میل اور گرد کو الگ کر دیتے ہیں جس سے جسم صاف اور ستھرا ہو جاتا ہے
اور آپ دن بھر ایک لطیف تازگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ اطمینان کر لیجیے کہ آپ
کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے صابن
سے محفوظ رہے۔
LIFEBUOY
لائف بوائے صحتمند زندگی کا ضامن ہے
L 18—193 UD

ماہِ نو

جلد ۱۱ ـــــ شمارہ ۵

اگست ۱۹۵۸ء

★

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

★

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے
فی کاپی ۸ر آنے

★

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

اداریہ: آپس کی باتیں ۵

بیادِ شہدائے کربلا: شہیدانِ آلِ محمد (نظم) روشن صدیقی ۷

"سرِ حسینی" (شاہ عبداللطیف بھٹائی) ضیاء الحسن موسوی ۸

تبقریب استقلال: "گردشِ بے مقام ما" (نظم) عبدالرؤف عروج ۱۱

"ساقیا برخیز و در دہ جام را" (ساقی نامہ) رئیس امروہوی ۱۲

غزلیں: جگر مرادآبادی ۱۳

فراق گورکھپوری ۲۳

مقالات: تنگنائے غزل جوش ملیح آبادی ۱۴

اردو زبان کی توسیع (مذاکرہ) ممتاز حسین ۱۷

نظمیں: "سرِ دِل" شیر افضل جعفری ۲۴

فریبِ ازل شاد امرتسری ۲۴

آگ اور پیاس صہبا اختر ۲۵

جھیل؛ مہمان بلراج کومل ۲۵

افسانے: زیرِ دام آہی گیا! ابوالفضل صدیقی ۲۷

روشنیوں کا شہر (ناول کا ایک باب) ابنِ سعید ۳۶

تعارف: منجابری یا منگاپیر ڈاکٹر محمد شفیع ۴۵

فن: مغلیہ مصوری میں فطرت کی عکاسی ایرک سی، ڈکنسن ۴۱

غزلیں: • حفیظ ہوشیارپوری • جمیل نقوی ۵۰

• ادیب سہارنپوری • شیدا گجراتی ۵۱

• طاہرہ کاظمی • ضمیر اظہر • مشتاق مبارک ۳۵ و ۲۶

مصور فیچر: دوسرے جہانوں کا سفر علی ناصر زیدی ۵۳

آپس کی باتیں

آج سے گیارہ سال پہلے یارانِ تیزگام نے اپنے والہانہ ذوق و شوق اور جدّ و جہد سے اس محمل کو جا لیا تھا جس محمل میں لیلائے آزادی جلوہ افروز تھی اور ہماری دیرینہ تمناؤں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تھا۔ لیکن یہ انتہا در حقیقت ہماری آزاد قومی زندگی کی ابتدا تھی۔ اس کے ساتھ ہمارا کاروانِ ملت پھر جادہ پیما ہوا۔ اور یہ لگن لئے ہوئے کہ ہم ستاروں کی آخری منزل کو پالیں گے۔ چنانچہ صبح آزادی کے طلوع سے لے کر اب تک ہماری زندگی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وقف رہی ہے جس کے نشانات جابجا دکھائی دیتے ہیں اور آغاز کے باوجود ان میں انجام کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ ہماری نوزائیدہ مملکت نے اس گیارہ سال کی مختصر مدت میں اندرونی نظم و نسق، خارجی روابط، صنعتی ترقی، تہذیب و ثقافت اور ادب و تحقیق وغیرہ کے میدان میں ایسے مدارج طے کر لئے ہیں جو ایک روشن مستقبل کی خبر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کی ہر سالگرہ ہمارے لئے ایک ولولۂ تازہ کا پیغام لاتی ہے اور شوق و آرزو کی حرارت آفرینی سے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس شمارہ میں بھی یہ دھڑکنیں صاف سنائی دیں گی۔

★

جون کے شمارہ میں اردو زبان کی توسیع و ترقی کے بارے میں ایک مذاکرہ کی طرح ڈالی گئی تھی۔ کچھ کے دلچسپ اور کچھ زبان کا مسئلہ اہم خصوصاً اس نئے ماحول میں جو قیامِ پاکستان کے بعد پیدا ہوا ہے۔ بہت سے قارئین نے اس کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ اور اپنے تاثرات پیش کئے ہیں چنانچہ اب کی ایک اور ناقد، جناب ممتاز حسین شریک محفل ہیں اور بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ اور بھی آگے بڑھے گا اور اپنے ساتھ بعض اہم حقائق و بصائر لائے گا۔ ممکن ہے اس سے مسئلہ پھر بھی نہ سلجھ سکے لیکن گیسوئے اردو کی شانہ آرائی کا مزید اہتمام ضرور ہو جائے گا اور امید ہے کہ ایک ایسی فضا ابھرے گی جس میں زبان و ادب کے مسائل کی گرہ کشائی کی طرف میلان پیدا ہو سکے گا۔ اس قسم کا صحت مندانہ تبادلۂ خیالات فکر و نظر اور علم و ادب دونوں کے لئے مفید ہے اور اگر اس سلسلے کے بارِ خاطر ہونے کا احتمال نہ ہوا تو ہم حتی الامکان اسے جاری رکھنے کی کوشش کریں گے۔

★

اس ہی کے ساتھ غزل کا پرانا مسئلہ بھی چھڑ گیا ہے۔ جو اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود اس ہی طرح نیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک اس صنف سے متعلق زیادہ بنیادی اور خاردار سوالات نہیں چھیڑے گئے۔ محض سرسری نکات کے موافق یا مخالف رائے زنی کرنے سے یہ عقدہ جس میں قومی احساسات اور بھی پیچ پیدا کر دیتے ہیں، اچھی طرح حل نہیں ہو سکتا۔ امید ہے جوشؔ صاحب کے اس موضوع کو متعدد نشری تقریروں میں زیرِ بحث لانے سے زیادہ بلند پیمانے پر نقد و نظر اور تحقیق و انکشاف کا دروازہ پھر وا ہو جائے گا اور ہم اب کی زیادہ وقیع اور فیصلہ کن نتائج پر پہنچ سکیں گے۔

★

سرورق: "ایرانی قلم" کا نمونہ (۱۴۲۰ - ۱۴۱۰ء)
(ایک ایرانی شہزادہ کے دربار میں کلیلہ و دمنہ کے مسودہ کی پیشکش)

شہیدانِ آلِ محمدؐ

روشؔ صدیقی

زہے عظمت و شانِ آلِ محمدؐ   مشیت ہے فرمانِ آلِ محمدؐ
ہوئی دینِ قیّم کی بنیاد محکم   ابد تک ہے احسانِ آلِ محمدؐ
شہادت نے اعزازِ معراج پایا   بہ فیضِ شہیدانِ آلِ محمدؐ
ادا، سجدۂ حق ہوا زیرِ خنجر   عبادت ہے شایانِ آلِ محمدؐ
شمائل میں اوصافِ خُلقِ نبی سے   مشرّف ہیں خاصانِ آلِ محمدؐ
اُبلتے ہیں قدموں سے تسنیم و کوثر   زہے تشنہ کامانِ آلِ محمدؐ

★

تصور میں پھر مشہدِ کربلا ہے   بیادِ شہیدانِ آلِ محمدؐ
اُدھر فسق و بدعت کے تاریک بادل   اِدھر مہرِ تابانِ آلِ محمدؐ
اُدھر بد نہادانِ کوفی و شامی   اِدھر نونہالانِ آلِ محمدؐ
نثارِ رُخِ آفتابِ امامت   نجومِ درخشانِ آلِ محمدؐ
وہ عباسؓ پرچم کشائے شہادت   شجاعِ شجاعانِ آلِ محمدؐ
علی اکبرؓ صف شکن، جلوہ فرما   وقارِ جوانانِ آلِ محمدؐ
وہ قاسمؓ جگر گوشۂ سبطِ اوّلؓ   چراغِ شبستانِ آلِ محمدؐ
ریاضِ امامت کی معصوم کلیاں   متاعِ گلستانِ آلِ محمدؐ

وہ اصحابؓ حضرت، فدایانِ عترت   دل و جاں سے قربانِ آلِ محمدؐ
وہ تصویرِ اخلاص ابنِ مظاہر   جلالِ فدایانِ آلِ محمدؐ
وہ حُر، حق پرستی کی قندیلِ روشن   رُخ افروزِ برہانِ آلِ محمدؐ

★

اٹھا فوجِ اعدا سے نیزوں کا طوفاں   بڑھے شہسوارانِ آلِ محمدؐ
حمیت، شجاعت، صداقت نے بڑھ کر   پڑھا خطبۂ شانِ آلِ محمدؐ
اُدھر بارشِ نیزہ و تیر و خنجر   اِدھر ابرِ نیسانِ آلِ محمدؐ
اُدھر آندھیاں ظلم و بغض و حسد کی   اِدھر شمعِ ایمانِ آلِ محمدؐ
میسّر ہوئی امرِ حق کو بلندی   بنامِ شہیدانِ آلِ محمدؐ
وہ خوشنودیِ ربِّ اعلیٰ کا مژدہ   وہ تکمیلِ پیمانِ آلِ محمدؐ
درخشاں ہے آئینۂ کربلا میں   جمالِ جوانانِ آلِ محمدؐ

★

مقاماتِ تسلیم و صبر و رضا ہیں   قدمبوسیِ خاصانِ آلِ محمدؐ
جسے کشتیِ نوحؑ کہتا ہے قرآں   ہے تمثیلِ پاکانِ آلِ محمدؐ
سوادِ تسلّی کہاں روزِ محشر   مگر ظلِّ دامانِ آلِ محمدؐ
نگہبانِ تقدیسِ بیت الحرم ہیں   غزالانِ بستانِ آلِ محمدؐ
الٰہی درود و سلام و تحیت   بروحِ شہیدانِ آلِ محمدؐ

بہ حُسنِ ادب ہے روشؔ مثلِ جامیؒ
غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ

"سُرِ حسینی"

(شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں تذکرۂ شہداءؑ)

ضیاء الحسن موسوی

سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں جب مغل سلطنت کا سورج ڈھل چلا تھا، دکن میں قطب شاہی دور کا چراغ بجھ رہا تھا اور بقول قائم ریختہ ابھی "غزل طور" نہیں ہوا تھا اور نہ میر و سودا منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے تھے، اس وقت برصغیر کے شمال مغرب اور محمد بن قاسم کی سرزمین میں ایک "شاعرِ جوان" پیدا ہوا جسے دنیا شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے نام سے جانتی ہے اور اس کے ارادت مند اُسے "لال لطیف" کہتے ہیں۔

ہرات سے آئے ہوئے ہاشمی خاندان کا یہ چشم و چراغ عرب و عجم دونوں کی شاعرانہ خصوصیات کا وارث تھا، اس کی شاعری سوز و ساز، رنگ و آہنگ کے ساتھ نور و سرور سے بھی آشنا تھی اور عشق مجازی کے ساتھ عشق حقیقی کے سرچشمے سے بھی اس کو فیض پہنچا تھا۔

ظاہر ہے کہ چشتی سلسلے کے تصوف اور انتساب سیادت دونوں کی بدولت شاہ صاحب محمدؐ و آلِ محمدؐ سے والہانہ محبت رکھتے تھے اور محبت و فدویت، قربانی و جانسپاری کی داستانوں کی گونج ان کے ذہن و خیال میں بسی ہوئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہو کہ انہوں نے المیہ شاعری کے لئے جو سُر اختیار کیا اس کا نام "سُرِ حسینی" رکھا ہے۔

شاہ عبداللطیف کا ایک مرثیہ "شہداءؑ" ان کے مشہور رسالہ میں موجود ہے۔ یہ "سُر کیدارو" میں ہے جس کا طرز اُس وقت کے سندھی مراثی کی طرح دوھوں کا طرز ہے۔ سندھی میں مسدس کے طرز کے مراثی کا آغاز بعد کے ایک شاعر ثابت علی شاہ سے ہوا۔

بعض سندھی مؤرخین ادب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاہ کے اس مرثیے میں ان کے ساتھیوں، احسان لاکی اور فتح فقیر وغیرہ نے بھی کچھ اضافے کئے ہیں مگر جو لوگ شاہ کے لہجے سے آگاہ ہیں ان کی رائے میں اس کا ہر ہر مصرع ان کے مخصوص رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ آخر عمر کے قریب شاہ حج و زیارات کے لئے جانا چاہتے تھے مگر ضعیفی اور ارادت مندوں کے منع کرنے سے انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا مگر جو سیاہ ماتمی لباس انہوں نے زیارت کربلا کے ارادے سے پہنا تھا آخر عمر تک اسے ترک نہیں کیا۔ عمر کے اس حصے میں انہوں نے لوگوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ اور یہ مرثیہ اسی زمانہ کا کلام ہے جب وہ گویا اپنے سفر کے لئے روانہ ہو چکے تھے اور سیاہ پوشی کے ساتھ گوشہ گیری بھی اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ شاہ کے جانشین آج بھی کالی پگڑی اور سیاہ کرتا پہنتے ہیں۔

شاہ کے اس مرثیے میں فقط مصائب و واقعات کربلا کا تذکرہ ہی نہیں ہے جو اس وقت کا عام رنگ تھا بلکہ اس میں ان کا فنکارانہ شعور بھی ہے اور وہ پرسوز احساس بھی جس نے اردو میں انیسؔ و دبیرؔ پیدا کئے۔ شاہ نے اس مرثیے میں شہداء کربلا میں سے حضرت "حُر" کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جو لشکر یزید کو چھوڑ کر امام حسینؑ کی مختصر سی فوج سے آملے تھے اور یقینی موت کے باوجود دنیاوی منفعت کی راہ پر حق و حقیقت کی راہ کو ترجیح دی تھی۔ اس کردار کے انتخاب سے شاہ کی عارفانہ بصیرت اور انداز فکر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ترجمہ خواہ کسی زبان سے کسی زبان میں ہو بہرحال ترجمہ ہے اور پھر نظم کا ترجمہ تو گونگے کے اشارات سے بہت کم آگے بڑھتا ہے، اسلئے شاہ کے مرثیے کا ترجمہ بھی آسان نہیں لیکن قادر الکلام شعراء نے شاہ کے بہت سے کلام کا خاصا اچھا ترجمہ کیا ہے۔ اس کے بعض منظوم ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں اور مجھے توقع ہے کہ شاہ کے مترجمین ان کی اس شاہکار نظم کو بھی اردو نظم کا لباس پہنائیں گے مگر فی الوقت میں اس مرثیے کا مفہوم نثر میں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔
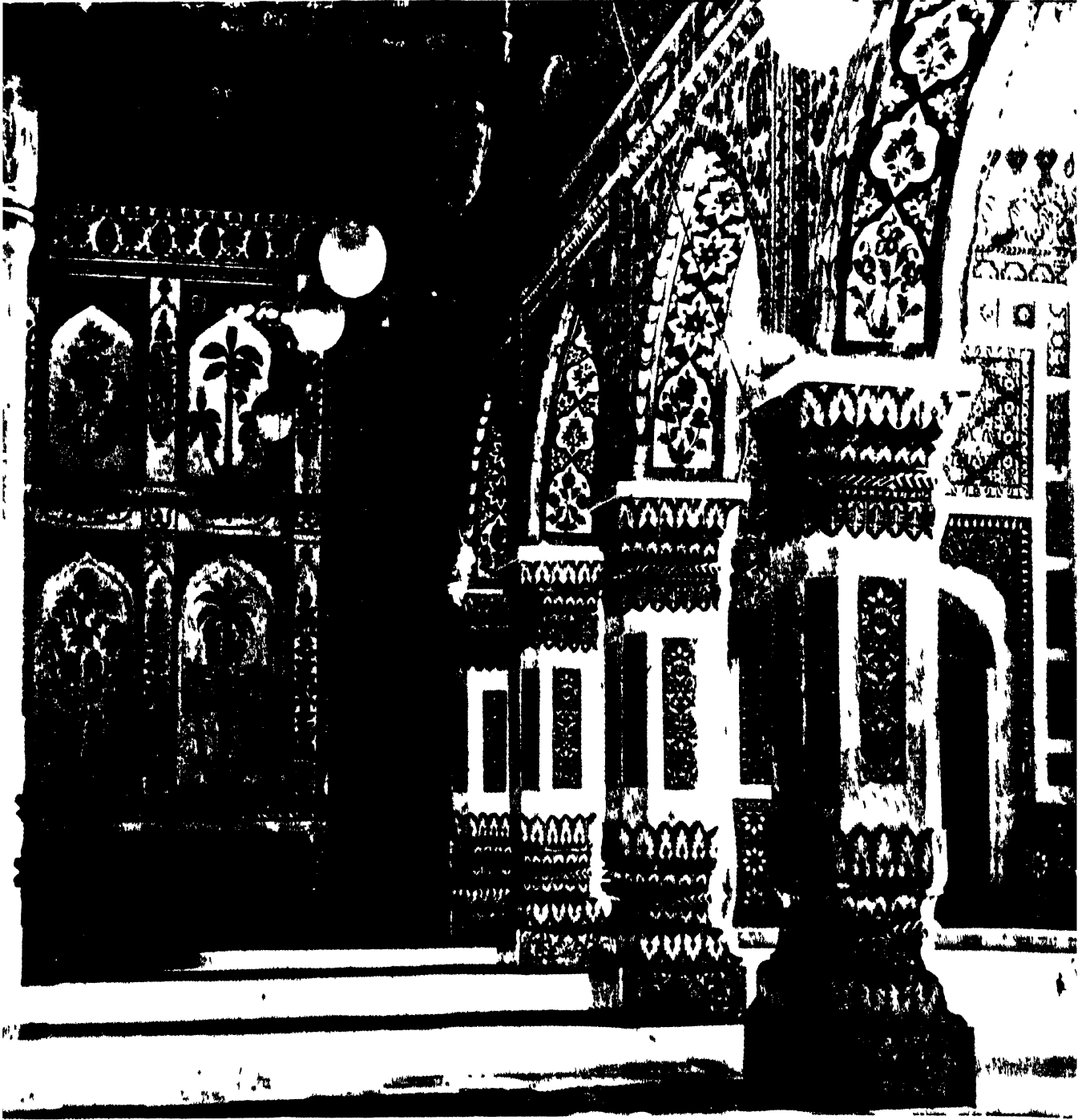
شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کا روضہ
مغربی پاکستان کے اس عارف کامل نے آج سے دو سو سال پہلے
انسانیت و محبت کا جو پیغام دیا تھا وہ آج بھی مشعل راہ ہے

ورسک پر دریا کا بند

مغربی پاکستان میں
کیمیاوی کھاد
تیار کرنے کا
کارخانہ (داؤد خیل)

شہیدانِ کربلا

محرم کا متبرک مہینہ آگیا! "شہزادہ" کی مصیبت کا دن۔ اللہ کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہو کے رہتا ہے اور وہی ہر چیز اور مصلحت کا جاننے والا ہے۔

ماہ محرم پھر آگیا مگر ہمارے امام کہاں ہیں؟ خدایا مجھے "شاہ مدینہ" کے دربار میں پہنچا دے۔ شہزادگان مدینہ، مدینہ سے گئے تو پھر واپس نہیں آئے۔

اے میرے رنگریز بھائی! میرے کپڑے سیاہ اور باوقار ماتمی رنگ میں رنگ دے۔

جب ان شہزادوں کے خون بہانے کا وقت آگیا تو وہ آوارہ وطن ہو کر اپنی قربان گاہ تک پہنچے۔ ان کی بے وقت موت پر مجھے شرم آرہی ہے۔

ان کی شہادت کا رنج گرمیوں کے ایک معتدل دن کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ آہ یزید کا دل خدا کے خوف اور اس کی محبت سے یکسر خالی تھا!

اماموں نے اپنی خوشی سے موت کا سودا کیا۔ ان کی شہادت کی دردانگیزی میں تابانی اور شکوہ ہے۔ خدا والے غم انگیز حادثۂ کربلا کی یاد مناتے ہیں۔

★

اے یزید! علیؓ کے گھرانے اور حسنؓ و حسینؓ کی عداوت کو فراموش کر دے۔ اس سے تجھے کیا حاصل ہوگا؟ تو کبھی خوشی اور مسرت کا منہ نہ دیکھ سکے گا!

یزید کے ساتھی کس قدر بدبخت اور بدانجام تھے جنہوں نے علیؓ کی کل اولاد کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کئے۔

کاش اس معرکہ کی صفوں میں امام حسنؓ بھی موجود ہوتے۔ اگر وہ ہوتے تو حسینؓ کی طرف اس طرح جاتے جیسے شمع کی تلاش میں پروانہ جاتا ہے۔

کیا حسینؓ کو نصرت اور انصار کی ضرورت تھی؟ وہ تو خود زندگی سے بے پروا تھے! مگر جب جنگ کا وقت آیا تو ان کی تلوار کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی اور وہ بے پناہ بہادری دکھا رہے تھے۔ وہ میدان کی طرف یکہ و تنہا جا رہے تھے اور حسنؓ بھی ان کے پہلو میں نہ تھے جو ان کی نصرت اور دیکھ بھال کرتے۔

شہزادوں کی سرزمین دور ہے اور یزیدیوں کا ہجوم ضرب پر ضرب لگا رہا ہے۔ حسنؓ حسینؓ اور ان کی جنگ سے کون آگاہ نہیں؟ سیاہ تیروں کی بارش میں میرے سید و آقا نے ثابت کر دیا کہ وہ جوانمرد اور حق پرست تھا۔

لوگ اپنے گھروں میں، درندے جنگلوں میں اور فرشتے آسمانوں پر امام حسینؓ اور اہلبیت کے غم میں اشک بہا رہے تھے، ان کے مددگار شہید ہو چکے تھے اور پرندے ان کے خون میں لوٹ رہے تھے۔ خدایا میرا ہدیۂ سلام میرے شہزادے کی بارگاہ میں پہنچا دے۔ اگر کچھ ایسے لوگ ہوں جن کی روح اس غم سے اندوہناک نہ ہو تو ان کو اپنی رحمت سے محروم رکھ!

★

بہادر جہاد سے محبت کرتے ہیں اور میدان سے گریز نہیں کرتے۔ جو پاک طینت تھے انہوں نے اپنی جانیں اماموں پر نثار کر دیں۔ جب وہ جہاد کر رہے تھے تو اللہ کا نام ان کے وردِ زبان تھا۔ یہ ان کی دانائی تھی۔ حورانِ بہشت نے ان کا استقبال کیا اور ہار پہنائے۔

خدا کے سچے بندے کربلا میں شیروں کی طرح آئے، چمکتی ہوئی مصری تلواریں لہراتے وہ جدھر گئے وہاں لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اور جب حسینؓ نے میان سے ذوالفقار نکالی تو بہادرانِ عرب کا زہرہ آب ہو گیا۔

حق پرست شہزادے آج کربلا میں جمع ہیں۔ انہوں نے تیروں کی بارش میں بھی میدان سے منہ نہیں موڑے۔ خوش نصیب تھے وہ جو اس گھڑی امام کے ساتھ تھے۔

خدا جس سے محبت کرتا ہے اس کی جان کا نذرانہ قبول کرتا ہے۔ یہی مرغوب سنت الٰہی ہے۔ جو اللہ سے لو لگاتے ہیں ان کا دل خوف سے کبھی نہیں دھڑکتا۔

ان باتوں کا راز میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کچھ نہ کچھ پس پردہ ضرور ہے اور وہ عمیق بھی ہے اور پُراسرار بھی ۔ ۔ ۔ ۔

★

رہوار اور شہسوار چند دن زندہ رہتے ہیں۔ وہ کبھی قلعوں میں فروکش ہوتے ہیں اور کبھی ان کو عرصۂ قتال کی چاہ ہوتی ہے۔

ان کے گھر جنت میں ہیں۔ لو، وہ دیکھو مجاہد جنت میں پہنچ گئے۔ وہ خدا کی جانب سے آتے ہیں اور وہیں لوٹ جاتے ہیں۔ خدایا! ان کے طور طریقے اور ان کی عقل و دانش انوکھی ہے۔

کتنا خوش نصیب تھا وہ حر جو اندھیرے سے نکل کے روشنی میں آگیا اور امام کی صفوں میں شامل ہوگیا! اس نے عرض کیا کہ میں گو دیر سے آیا ہوں مگر میری زندگی میری نہیں، آپ کی ہے اور میں موت کے لئے تیار ہو کے آیا ہوں!

خدا والے اپنی طاقت بھر غم کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ حر بھی اپنی سکت کے مطابق بوجھ اٹھانے پر آمادہ تھا۔ یہ کہہ کے وہ بہادر بھی میدان جنگ میں گیا اور شہید ہوگیا۔ زخموں سے چور، اپنی جان نثار کرکے وہ شہداء میں داخل ہوگیا۔

اُس نے اپنی جوانمردی، اور ہمت کی رُوح کا مظاہرہ کیا۔ وہ شعلۂ عشق کا سچا پروانہ تھا پیغمبرِ خدا اس سے خوشنود و راضی ہوئے۔

اُس نے ان کی حرمت کے لئے جان دی۔ اس کی داڑھی اور اس کے ہونٹ پھولوں کی طرح خون سے رنگین تھے۔

اس کا عمامہ یوں چمک رہا تھا جیسے چودھویں کا چاند۔ خوش نصیب ماں کا فرزند جو سرخ رو ہو کے محمدؐ کی بارگاہ میں گیا۔ صحرا میں جان دینے والے کا نام زندۂ جاوید رہے گا جس کا جسم پارہ پارہ ہوا اور زخموں سے چور چور!

★

اہلِ کوفہ نے امام عالی مقام کو خدا کا واسطہ دے کے لکھا کہ آئیے، ہم آپ کی رعایا ہیں اور آپ ہمارے امیر۔ آئیے اور اپنا خیمہ نصب فرمائیے۔ تخت آپ کا ہے۔ یہ اُن کے جھوٹے دعوے تھے اسلئے کہ انہوں نے یزید کا ساتھ دیا۔

اور بہادر امام ان وعدوں اور واسطوں پر یقین کرکے آیا اور گرفتارِ بلا ہوا۔ اہلِ کوفہ نے نفع کی خاطر اپنا ایمان اور عہد بیچ ڈالا۔

شہادت کی فہرست میں صرف سچے اور بہادر آدمیوں کا نام آتا ہے۔ کوفیوں نے کربلا میں اپنے مہمان کو پانی تک نہ دیا!

علیؑ کے شہزادے کربلا میں حق پر اپنی جان نثار کرکے سو گئے!

اور ایک فاختہ یہ کہتی ہوئی کربلا سے مدینے کی طرف اڑی کہ "اے شاہِ لولاک جلدی کربلا آئیے"

اور گنبد خضراء کا طواف کرتے ہوئے اس نے صدا دی:

"خدارا اٹھئے، جلدی کیجئے۔ میں چمکتے ہوئے خنجر اپنی ان آنکھوں سے دیکھ آئی ہوں!"

★

بتقریب استقلال:

"گردشِ بے مقامِ ما"

عبدالرؤف عروج

بہار آئی در و بام پر چراغ جلے
ارم نژاد، صبا دوست، نازنیں لمحے
ہوا کے دوش پہ اڑتے ہوئے حسیں لمحے
کسے خبر کہ کہاں رنگ و نور برسائیں
عجب نہیں جو اندھیرے، چراغ بن جائیں!

★

طرارے بھرتے ہوئے وقت کی دمکتی لویں
ستارہ وار فضاؤں میں پھیل جاتی ہیں
شہاب رنگ افق کے حسیں دریچوں کو
نمودِ تازہ بہ تازہ سے جگمگاتی ہیں

★

ستارہ کار و ستارہ فشاں نگاہوں تک
عروسِ عصر کی آئینہ کار باہوں تک
کوئی غبار حجابِ رخِ جمال نہیں
ہے عین بانگِ جرس، صوت نے رفیقوں کو
پیامِ صورِ سرافیل ہے رفیقوں کو
فراقِ جادہ و پا شوق کا مآل نہیں،
اسی کو ڈھونڈھ رہا تھا خرامِ اہلِ جنوں
وہی دلوں کی تمنا کا اولیں افسوں
وہ ایک دشت کہ نا واقفِ غزال نہیں

★

یقیں کے نور سے نکھرے ہوئے حسیں خیال
صبا خرام زمانوں کے ہم عناں ہوں گے
طلسم کار بہاروں کے اطلسی پرچم
دمیدہ رنگ فضاؤں میں زر فشاں ہونگے
یہ شاہراہِ تمنّا بڑی طویل سہی
اسی پہ قافلے اپنے رواں دواں ہوں گے

★

فضا تبسم گلنار ہے بہاروں کا
گلال رنگ بنامِ شفق اڑائے چلیں
ہزار گردِ گماں تہہ بہ تہہ سہی لیکن
حجابِ ظلمتِ تقدیر کے اٹھائے چلیں

★

فسونِ شورشِ دیروز مٹتا جاتا ہے
یقیں کے ساز پہ ہر عزم نغمہ خواں نکلا
جنوں کو فرصتِ آسائشِ جمال ملی
تضادِ فکر کو یک رنگیٔ خیال ملی

★

یقین و عزم میں محفوظ ہے جہانِ عظیم
دل و نگاہ میں ڈھلنے کو ہے جمالِ وطن
قدم قدم پہ مہکتی ہے زندگی کی شمیم
پھر اہتمام سے یاروں کا کارواں نکلا

ساقی نامہ:

"ساقیا برخیز و در دہ جام را"

رئیس امروہوی

ساقی! مئے تازہ دے بہر طور
محفل میں چلا ہے بارہواں دور
آزاد وطن کا آگیا بارہواں سال
یہ بارہواں جشنِ جاہ و اجلال
سُن لے مرا مدعا دوبارہ
عظمت کا یہ بارہواں نظارہ
محتاج ہے کب کسی صفت کی
تقریبِ جمیل حریت کی

اس جشن سے جان و دل ہیں خورسند
وہ چند نہیں، دوازدہ چند
اللہ رے جشنِ کامرانی
ہر شخص پہ چھا گئی جوانی
میں رندِ ازل، ہزار سالہ
ساقی! مجھے بارہواں پیالہ
دل کو مرے سرخوشی سے بھر دے
آلام کو بارہ باٹ کر دے

آزادئ قوم کی یہ تقریب
ترتیب ہوئی بہ حُسنِ ترتیب
کب جشنِ جدید حریت ہے
یہ بارہویں عید حریت ہے
تھا جس کی ضیا سے اک جہاں تابہ
اب بارہویں برج میں ہے وہ چاند
تکمیل کا عزم ہر نفس ہے
یہ قوم کا بارہواں برس ہے

ہے سال گرہ، نہیں گرہ دے
اِس رشتے میں بارہویں گرہ دے
ملت ہے جواں تو نوجواں سال
آزادی کا سالِ بارہواں سال
ہر چند کہ رہروِ کہن ہے
اک منزلِ نو میں گامزن ہے
یہ رہروِ یکہ تازِ سادہ
اس قوم کا نوجوان ارادہ

شامل ہے جو رحمت الٰہی
بھٹکے گا نہ راہ سے راہی
ملت کو پیام ضبط و تادیب
آزادئ قوم کی یہ تقریب
ہم وقت کو فتح کر چکے ہیں
دس بارہ برس گذر چکے ہیں
اُف بارہویں سال کا یہ جلوہ
مبہوت ہیں خود عقولِ عشرہ

یہ روز سعید اے جواں مرد!
بارہ میں نہیں ہزار میں فرد
اس ساعت دل کشا میں ہر دم
پھرتا ہے نگاہ میں وہ عالم
جب قوم کا ہر بشر حزیں تھا
آزادی کا سال اولیں تھا
وہ عیسوی سال، چہل و ہفت
چمکا تھا فلک پہ اخترِ بخت
جب امن کا چاند گہنا رہا تھا
اس خاک پہ خون بہ رہا تھا

جب رُوحِ خلوص تھی نہ زندہ
انسان تھا اک شقی درندہ
اے دل! یہ کہاں کا ذکر چھیڑا
چھوڑ اس کو یہ غم کا ہے بکھیڑا
آ جشنِ حیات نو منائیں
آزادی کے گیت مل کے گائیں
دس سال کی خدمتوں کا انعام
رندوں کو عطا ہو بارہواں جام"
ساقی! مئے تازہ دے بہر طور
محفل میں چلا ہے بارہواں دور

غزل

کم نہیں ظلمت بھی کچھ اہلِ نظر کے لئے
کون رہے شب نشیں، نورِ سحر کے لئے

لاکھ چمن زارِ حُسن پیشِ نظر ہوں تو کیا
ہاتھ یہ اُٹھتے نہیں ہر گُلِ تر کے لئے

جوشِ طلب چاہیئے، ہوشِ ادب چاہیئے
بند نہیں کوئی راہ، پائے بشر کے لئے

جس پہ بہت ناز ہے، آہ تجھے بوالہوس
ننگ ہے وہ زندگی، اہلِ نظر کے لئے

رقص میں ہے زندگی، ایک ترے واسطے
وجد میں ہے کائنات اہلِ نظر کے لئے

کم نہ ہوئیں ظلمتیں، اُف رے شبستانِ غم
بجھ گئے لاکھوں چراغ ایک سحر کے لئے

تنگنائے غزل

جوش ملیح آبادی

نارمل حالات میں نفسِ انسانی پر وقتِ واحد میں جذبۂ واحد ہی طاری ہو سکتا ہے اور چونکہ غزل میں جذبۂ واحد کے عوض متعدد و متضاد جذبات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اور چونکہ غزل، جہاں تک کہ مشّاق غزل بافوں کا تعلق ہے، وقتِ واحد میں بنائی اور بُنی جاتی ہے، اسلئے بلاخوفِ ابطال یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزل ایک غلط اور غیر فطری چیز کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر نقطہ ہائے نظر کے لحاظ سے بھی یہی بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ غزل کو فطری صنفِ کلام نہیں کہا جاسکتا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگر یہ قول صحیح ہے کہ شاعری میں اکثر و بیشتر آپ بیتی اور گاہ گاہ جگ بیتی کا کوئی عنصر پایا جاتا ہے کہ نہیں۔ اس بات کا سراغ لگانے کے لئے ہمیں غزل گو کی سیرت و شخصیت اور اس کی غزل کے مضامین کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے کردار اور اس کے کلام میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے یا تضاد یا بالفاظ دیگر ہمیں یہ جانچنا ہوگا کہ غزل گو خود اپنی ذات سے مخلصانہ برتاؤ کرتا ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر ریاضؔ خیرآبادی کو لے لیجئے۔

ریاضؔ کی شہرت کا مدار اُن کے خمریات پر ہے لیکن تمام دنیا جانتی ہے کہ ریاضؔ نے تمام عمر میں شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی نہیں چکھا تھا جسکے یہ معنی ہیں اور اس کے سوا کوئی دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ ریاضؔ کا کلام ان کی سیرت کا آئینہ دار نہیں۔ بلکہ ان کی سیرت کے قطعی برعکس واقع ہوا تھا اس لئے انہوں نے خمریات کے باب میں جو کچھ کہا ہے۔ وہ آپ بیتی میں شمار نہیں کیا جاسکتا جس کے یہ معنی ہیں کہ ریاضؔ خود اپنی ذات سے خلوص نہیں برت سکے اور ظاہر ہے کہ وہ کلام جو سراسر اظہار میں غیر مخلصانہ اور حقائق سے دور ہو وہ فطری کلام نہیں ہو سکتا۔ اگر اس موقعہ پر یہ کہا جائے کہ ریاضؔ کے خمریات آپ بیتی نہیں نہ سہی، جگ بیتی تو ضرور ہے اور کوئی شاعر اگر جگ بیتی کہتا ہے تو اس میں کیا اعتراض کی بات ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا جائیگا کہ فطری شاعر کے کلام میں جگ بیتی آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ نمک میں آٹے کے برابر ہو کے رہ جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی بات ہے کہ مشروبات و ماکولات بالعموم اور شراب بالخصوص ایسی چیز ہے جو جگ بیتی کے ذیل میں نہیں آسکتی۔ اسی لئے کہ اگر آپ کسی کو شہد کھاتے دیکھتے ہیں تو مجرد دیکھ لینے کی بنا پر آپ شہد کے ذائقے سے واقف نہیں ہو جاتے۔ شہد کا ذائقہ تو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اسے چکھا ہو۔ اس طرح وہ شخص جو کسی کو شراب پیتے دیکھتا ہے۔ اس دیکھنے سے اُس پر شراب کا نشہ نہیں چڑھ سکتا اور جو شخص کسی کو شہد کھاتے یا شراب پیتے دیکھتا ہے وہ اُس کی شیرینی، اور اس کے نشے کو اگر شعر میں بیان کرتا ہے تو اس کا شعر حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا اور جو شعر یا جو صنفِ سخن اس قسم کے غیر حقیقی اشعار کا مجموعہ ہو اُسے حقیقی صنف نہیں کہا جاسکتا۔

اسی طرح امیر احمد صاحب مینائی لکھنوی کی غزلوں کو لے لیجئے۔ منشی صاحب ایک مولوی بلکہ متقی قسم کے بزرگ اور خانوادۂ حضرت شاہ ضیا کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا تقدس و تقشف اس قدر بلند و مستحکم تھا کہ اُن کے باب میں ان کا کوئی بدترین دشمن بھی یہ نہیں سکتا کہ زندگی میں انہوں نے کبھی ایک بار بھی زنانِ بازاری کا کوٹھا دیکھنا تو بڑی بات ہے کسی نامحرم عورت یا کسی امرد کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ لیکن ان کی غزلیں دیکھئے تو ان کا تمام کلام بازاری عورتوں کے چونچلوں، بداطوار لڑکوں کے لچھنوں، بھنگڑخانوں کے نعروں اور شاہد پرستی کے غلغلوں سے گونجتا ہوا نظر آتا ہے۔ سر پیٹنے کی بات ہے کہ منشی امیر احمد مینائی اور یہ شعر فرمائیں ؎

حیا بولی اُبھرا ہو جوبن کسی کا
مٹاؤں گی میں چلبلا پن کسی کا

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب ۔۔۔ وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

اور یہ ریاض خیرآبادی یا امیر احمد مینائی ہی نہیں۔ ہمارے تمام غزل گو یہی اندھیر کرتے رہے ہیں، اور وہ راہ راست پر نہیں آئے تو ہمیشہ یہی کرتے رہیں گے۔ کتنی غضب کی بات ہے کہ ایک شخص کبھی شراب نہیں پیتا۔ کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوتا۔ لیکن وہ جب غزل لکھنے بیٹھتا ہے تو شرابی اور عشق پیشہ بن جاتا ہے اس طرح ایک شخص حقیقتاً رند پیشہ اور عشق مشرب ہے لیکن غزل میں وہ مسائل تصوف و ایمان کے دریا بہاتا نظر آتا ہے۔ کیا ہم اس قسم کے کلام کو شاعری کا لقب دے سکتے ہیں؟ اب کیا یہ طرز کلام نفس شاعری اور دنیا کی تمام زبانوں کے تمام شعراء کے منہ پر ایک طمانچے کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا ہے؟

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی نوٹ کر لینے کے قابل ہے یعنی ہماری غزلوں کے کم سے کم اسّی فیصدی اشعار عاشقانہ ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہمارے تمام غزل گو حضرات ماشاء اللہ عشق پیشہ تھے اور ظاہر ہے کہ ہر عاشق کی داستان عشق دوسرے عاشق کی داستان عشق سے مختلف ہوا کرتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر شخص کی داستان عشق سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ عاشق کے عشق میں کہاں تک شدت تھی۔ معشوق کا مزاج کیسا تھا۔ عاشق و معشوق کے ماحول کی نوعیت کیا تھی۔ عشق کی ابتدا کیونکر ہوئی، عشق پروان کیونکر چڑھا اور عشق کامیاب رہا یا ناکام۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس داستانِ عشق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عاشق و معشوق کس دور اور کس خاندان کے لوگ تھے۔ اور اُس دور میں معاشرے کی مخصوص وضع کیا تھی لیکن جب ہم اپنے اساتذہ کی غزلیں پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن سب کی داستان عشق یکساں تھی۔ تمام عاشق اور تمام معشوق ایک ہی مزاج و ماحول اور ایک ہی خاندان کے افراد تھے۔ اُن سب کے عشق کی شدت بھی مساوی تھی۔ اُن سب کا دورِ حیات بھی ایک ہی تھا۔ ان سب کے عشق کی ابتدا و انتہا بھی ایک ہی طرز پر ہوئی تھی۔ وہ سب کے سب ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے۔ ایک ہی دور کے باشندے تھے اور ایک ہی تاریخ اور ایک ہی وقت سب کا انتقال ہوا تھا۔ اُن میں سے ایک غزل گو کی صورت بھی ایسی نہ تھی کہ معشوق اُس پر ریجھتا یا کم سے کم اس کی طرف مائل ہو جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس ہر غزل گو بدقسمتی سے اس قدر بدصورت واقع ہوا تھا کہ معشوق نے اسے منہ نہیں لگایا اور جب وہ سامنے آیا تو اسے دُھتکار دیا ؎

دیکھتے ہی مجھے محفل میں انہیں تاب کہاں
خود کھڑے ہو گئے آتے ہوئے باہر باہر

اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں انہی غزلوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل گو کے معشوق کا کم سے کم ایک عاشق اور بھی ہوا کرتا تھا اور وہ خدا کے فضل و کرم سے اس قدر حسین و جمیل ہوتا تھا کہ معشوق اُس پر جان دیا کرتا تھا اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر غزل گو بزدل اور نحیف و لاغر بھی ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کہ ہمارا ہر غزل گو اس کی شکایت کرتا پایا جاتا ہے کہ رقیب دیو پیکر نے مجھے محفل جاناں سے پیٹ کر نکال دیا۔

الغرض ان تمام حیرت ناک یکرنگیوں اور یکسانیوں کے دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان غزل گوؤں کے عشق کی لاکھوں داستانیں دراصل کاربن پیپر کی اتاری ہوئی نقلیں ہیں اس داستانِ عشق کی جو سب سے پہلے غزل گو نے قلمبند فرمائی تھی۔ آپ ضرور ملاحظہ فرمائیں :-

نمبر ۱ :- پہلا غزل گو قنوطی تھا۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے تمام غزل گو قنوطی ہیں۔

نمبر ۲ :- پہلا غزل گو بازاری عورتوں اور بد اطوار لڑکوں کا عاشق تھا۔ ابتدا سے لیکر آج تک تمام غزل گو بازاری عورتوں اور بدقماش نوخیزوں کے عاشق رہے۔

نمبر ۳ :- پہلے غزل گو نے مجازی عشق کی شراب میں کوثرِ تصوف کی چند بوندیں ملادی تھیں۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے تمام غزل گو شراب عشق مجازی میں کوثر تصوف کی چند بوندیں ٹپکا رہے ہیں۔

نمبر ۴ :- پہلا غزل گو بقولِ خود شرابی تھا۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے تمام غزل گو بقول خود شرابی ہیں۔

نمبر ۵ :- پہلے غزل گو پر سیاسی، معاشری بحرانوں اور مناظر قدرت کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے غزل گویوں پر بھی ان چیزوں کا اثر نہیں پڑ رہا ہے۔ اور آج کل جو چند سیاسی یا مناظری غزلیں نظر آ رہی ہیں۔ دراصل انہیں غزل کا خطاب دیا ہی نہیں جا سکتا۔

نمبر ۶ :- پہلے غزل گو کا معشوق [illegible] بدزبان، شقی القلب، ہرجائی، بد [illegible] [illegible] ہوتا تھا۔

ابتدا سے لیکر آج تک کے غزل گویوں کے معشوقوں کے یہی لچھن رہے اور ہیں ۔

۷ :۔ پہلا غزل گو بزدل، بدصورت اور نحیف البحثہ تھا اور اس کا رقیب بہادر، خوبصورت اور قوی الجثہ تھا ۔

ابتدا سے لیکر آج تک تمام غزل گو اور ان کے رقیب ویسے ہی چلے آرہے ہیں ۔

۸ :۔ پہلا غزل گو جذبۂ حیا و خودداری سے محروم تھا ۔ اور رقیبوں اور دربانوں کے دھکے کھانے اور خود معشوق کے بار بار دھتکارنے کے باوجود بزم جاناں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دربان کی خوشامدیں کیا کرتا تھا ۔

ابتدا سے لیکر آج تک کے غزل گو ماشاء اللہ اس قسم کی مشقیں فرما رہے ہیں ۔

۹ :۔ اور پہلا غزل گو زاہدوں سے نفرت کرتا، دنیا کو فانی سمجھکر ناقابل اعتنا سمجھتا، اپنے جسم کی لاغری کا رونا روتا، اپنی مفلسی پر آنسو بہاتا، قسمت کو کوستا اور ابتدا سے لیکر آج تک کے تمام غزل گو ان تمام معتقدات کا اعادہ فرماتے رہتے ہیں ۔ اس غیر فطری یکسانی اور اس غیر نفسیاتی ہم آہنگی پر غور کرکے کوئی اللہ کا بندہ اب تک یہ سمجھنے کی جسارت نہیں کر رہا ہے کہ اس قسم کا کلام شاعری نہیں، بلکہ شاعری کی نقالی ہے اور نقالی بھی شرمناک قسم کی نقالی ہے ۔ اور اس حیرت ناک صورت حال کو دیکھ کر اب تک کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ہزاروں لاکھوں آدمی، شخص واحد نہیں بن سکتے ہیں ۔ اور کوئی ایسا جید ذہن اب تک پیدا نہیں ہوا ہے کہ اس کا مزاج اور اس کی زندگی کے تمام حالات، لاکھوں افراد کی زندگی اور ان کے مزاج کا مکمل آئینہ دار ہو ۔ اگر یہ قول صحیح ہے کہ شاعری اپنے زمانے کی موزوں اور شیریں تاریخ اور شاعری شخصیت کا ایک گنگناتا ہوا افسانہ اور خود نوشت حیات نامہ ہوتی ہے تو اس قول کی روشنی میں جب ہم اپنے دواوین کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ایک زبردست شرمندگی اور ایک عظیم مایوسی ہمارا احاطہ کر لیتی ہے اور ہمیں یہ جرأت نہیں ہوتی ہے کہ ہم دنیا کی عظیم شاعری اور دنیا کے عظیم شاعروں کے روبرو اپنی غزل کی ادھی پونجی کو پیش کریں جو خوردہ اندیشی و خوردہ فروشی کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے ۔

اگر ہماری غزلوں کو سنکر دنیا کا کوئی نقاد جلیل ہم سے یہ پوچھ بیٹھے کہ آخر آپ لوگ اس کلام کی معرفت ہم سے کہنا کیا چاہتے ہیں ۔ اور آپ کی غزلِ النسان کے دماغ میں فکر کا کونسا دریچہ کھولنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری قومی غیرت اس کا کیا جواب دے گی اور اس کو ہم یہ کیوں کر باور کرا سکیں گے کہ اگر ہمارے غزل گو جوانی سے لے کر بڑھاپے تک ایک ایسے معشوق کا دم بھرتے رہتے ہیں جس کا نام کسی مردم شماری کے رجسٹر میں موجود نہیں ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے اور ایک مصنوعی قسم کا قلب و گداختہ بھی ایک بڑا دوست پیدا کر سکتا ہے ۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان ۔ کراچی)

★

مذاکرہ:

اُردُو زبان کی توسیع

ممتاز حسین

اس مذاکرے کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد باقر نے جو انکشافات کئے ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) خالص اردو ایک بے معنی سا فقرہ ہے :

اوّل تو یہ کہ اس زبان کا "ہیولیٰ عربی فارسی سے تیار ہوا ہے" اور یہی دونوں زبانیں اس کے عناصر ترکیبی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں"۔ دوسرے یہ کہ وہ الفاظ جنہیں اردو کے لوگ خالصتاً اردو کا بتلاتے ہیں اگر انہیں غور سے دیکھا جائے تو ان میں سے کتنے ہی الفاظ خالص اردو کے نہیں بلکہ پنجابی اور متحدہ ہندوستان کی دوسری بولیوں کے ہیں "

پنجابی کو یوں علیحدہ کرنے سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ متحدہ ہندوستان کی کوئی بولی نہیں ہے۔ بہرحال اطلاعاً عرض ہے کہ متحدہ ہندوستان کی انہی بولیوں میں سے ایک کھڑی بولی یا گریرسن کے الفاظ میں مغربی ہندی بھی تھی جو کہ قدیم سے ہندوستان کے دارالخلافہ دلّی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی۔ اردو اسی کھڑی بولی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اردو کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ (BASIC VOCABULARY) — افعال، اشیا کے نام۔ صفات، ضمیر، اور حروف ربط — اسی کھڑی بولی کے ذخیرۂ الفاظ پر مشتمل ہیں، لیکن جس طرح کہ کوئی بھی بولی (DIALECT) اپنے بنیادی ذخیرۂ الفاظ پر قائم رہ کر اس وقت تک زبان (LANGUAGE) کی صورت اختیار نہیں کرتی ہے حتیٰ کہ اس کے بنیادی ذخیرۂ الفاظ میں قابل قدر اور معتد بہ اضافہ نہ ہو۔ اس طرح اس بولی نے بھی اردو کے پیکر میں، کہ وہ ایک طویل تاریخی عمل سے وجود میں آیا ہے، وہ توسیع لغت اختیار کی جسے (EXTENDED VOCABULARY) کہا جاتا ہے۔ ماہرینِ لسانیات کسی بھی زبان کو اس کے بنیادی ذخیرہ الفاظ، افعال کی صورت اور حروف ربط سے پہچانتے ہیں نہ کہ اس بات سے کہ اس کی توسیع یافتہ لغت میں کتنے سو، ہزار یا لاکھ الفاظ عربی فارسی یا دوسری زبانوں سے آئے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ فارسی کا اثر اردو پر غیر معمولی رہا ہے۔ اللہ غریق رحمت کرے ریختہ گویوں کو اس سے انہوں نے نہ صرف الفاظ، مستم ترکیبیں، اضافتیں لی ہیں، بلکہ کہیں کہیں نحوی ترکیب کا قلم بھی لگایا ہے، اور استفادہ ترجمے کی صورت میں تو خیر بے انتہا کیا ہی ہے، لیکن اس سے اس کی اصل حقیقت کو پہچاننے میں دشواری نہیں ہوتی ہے، (ہمارے ریختہ گویوں کے بقول میر وہی اشعار مستند ہیں جن میں افعال اور حروف ہندی کے ہیں نہ کہ فارسی کے) بشرطیکہ ہمارا ذہن لسانیات کے اصول پہ چلے، ورنہ یوں تو یوپی کے پنڈت سمپورنانند بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اردو زبان عرب اور ایران سے آئی ہے نہ کہ ہندوستان کی کوئی ترقی یافتہ بولی ہے۔

رہ گیا کھڑی بولی اور متحدہ ہندوستان کی دوسری بولیوں مثلاً لہندا، ملتانی، سندھی، راجستھانی، برج اور اودھی وغیرہ کے الفاظ کے درمیان مشابہت کا معاملہ تو وہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سارے بولیاں جن میں پنجابی بھی شامل ہے، ایک ہی پراکرت یعنی شورسینی (اتری ہندوستان) پراکرت اپبھرنش (مسخ شدہ) کی مختلف بیٹیاں ہیں۔ ان کے الفاظ اور قواعد کے درمیان مشابہت کا پایا جانا لازمی ہے۔ یہ تو خیر ایک ہی بطن سے پیدا ہو کر ایک ہی دیس میں رہ گئیں۔ مشابہت تو جرمنی اور سنسکرت کے ایسے دور افتادہ خاندانوں کے الفاظ میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن جس طرح کہ اس مشابہت کے باعث جرمنی یا سنسکرت کے آزاد وجود کی اہمیت ختم نہیں ہو جاتی اسی طرح کھڑی بولی جس نے اردو زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے محض اتنی سی بات کی وجہ سے بے معنی نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے خاندان دوسری [illegible] پراکرت اپبھرنش کی دوسری بولیوں کے الفاظ اور قواعد سے مشابہت رکھتی ہے۔ جب ایک ہی خاندان کی مختلف بولیوں کے درمیان [illegible] کی جاتی ہے، تو اس وقت مشابہت سے زیادہ وجہ امتیاز ہی ہے جو اس کی منافرت یا انفرادیت کو دکھاتا ہے [illegible] بولیوں کے درمیان [illegible] ہی ہوا کرتا ہے۔ اسی لہجے کے اختلاف کے باعث ایک ہی پراکرت دس بیس کوس کے فاصلے پر مختلف بھاکاؤں میں بٹ جایا کرتی۔ کھڑی بولی اور پنجابی [illegible]

رق اسی لہجے کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے بہت سے الفاظ اور افعال کا ماخذ ایک ہی ہے، لیکن چونکہ ان کے لہجے کا پھندا جدا جدا ہے اس لئے ایک کھڑی اور دوسری پنجابی ہے۔ پنجابی میں کھاندا ہے تو کھڑی میں کھاتا ہے، پنجابی میں ہو رہے ہے تو کھڑی میں آ رہے ہے۔ چونکہ اردو کا لہجہ کھڑی بولی کا ہے۔ اور وہ اپنی کھڑی کے بنیادی ذخیرۂ الفاظ اور قواعد کو ساتھ لئے ہوئے ہے اسلئے وہ کھڑی کہلاتی ہے۔ اردو کی پاکیزگی اس کھڑی بولی کے قواعد روزمرے اور محاورے، اور لہجے سے متعین ہوتی رہی ہے اور آج بھی اس پاکیزگی کا وہی معیار ہے۔" اردو زبان ایک لہجہ بھی ہے"۔ یہ بات جو انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت میں لکھی ہے سو اسی بھروسے پر کہی ہے۔ یہاں اس امر کا اظہار کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کھڑی بولی کا بھی لہجہ شروع شروع میں آمنا شستہ اور رفتہ نہ تھا جتنا کہ آج ہے اسے اس رتبے تک پہنچانے میں ہمارے ریختہ گو شعراء اور اردو کے لوگ خواص و عوام کو بڑا دخل رہا ہے۔ کیسے ماٹی سی مٹی، جاگہ سے جگہ، تو ہو سے لہو، کیدھر جیدھر سے کدھر جدھر اور کبھو کسو سے کبھی کسی، بنا ہے اس کی منطق کو آج ہم بتلانے سے قاصر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالباً فارسی زبان اور فارسی ادب کی ذہنی تربیت سے ان میں اپنے الفاظ کی صوتی پرکھ کا بھی ایک مذاق پیدا ہو گیا تھا۔ دلی والے گھڑنا بولتے تھے، لکھنؤ والوں نے اسے گڑھنا کر دیا اور یہ جواز پیش کیا کہ گھڑ کی آواز ثقیل تھی۔ گویا یہ ان کی اپنی ہٹ تھی۔ لیکن اس حسن سماعت کی ہٹ دھرمی کے علاوہ، الفاظ کے تلفظ کو بدلنے میں پراکرت کا یہ اصول بھی کارفرما رہا ہے کہ جہاں کہیں سنسکرت یا کسی غیر زبان کا سہ حرفی لفظ تسکین وسط کے ساتھ داخل ہوا اسے متحرک کر لیا، مثلاً دھَرم سے دھَرَم۔ قلْق سے قلَق۔ کارڈ سے کارَڈ۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اردو کے شعراء سنسکرت کے تمام الفاظ کے ساتھ تو اسی قاعدے کی پیروی کرتے ہیں، لیکن عربی کے چند الفاظ کو، اس سے مستثنیٰ بھی کئے ہیں۔ مثلاً وہ طرْح کو طرَح باندھتے ہیں مگر گرْم کو گرْم ہی باندھتے ہیں۔ میں نے اس کا اظہار اس لئے کیا کہ باوجود اس بات کے کہ اردو کے شعراء نے لہجے کے بارے میں کسی خاص اصول کی سختی سے پیروی نہیں کی ہے، تاہم اس کے اصول ہماری زبان میں پائے جاتے ہیں۔ اردو کے حروف تہجی میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی صورت پہچاننے کی خاطر عربی اور فارسی کے کتنے ہی حروف داخل کئے گئے، لیکن ان میں سے صرف چند حروف کی صوتی اہمیت ہماری زبان میں ہے، مثلاً فارسی کا ژ اور ف اور عربی کا قاف اور غ، کہ ان کی آواز کو بھی ہم ان کے مخرج سے ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں (لفظ کوشش ملحوظ خاطر رہے) لیکن عربی کے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ وغیرہ کی آواز نہ تو ہم سے ادا ہو پاتی ہے اور نہ ہم اس کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ وہ تو صرف اس لئے ہیں کہ ہم ان کی مدد سے عربی کے الفاظ کی صورت پہچان سکیں، اور انہیں ہندی کے ہم آواز الفاظ کے ساتھ خلط ملط نہ کر سکیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ہم تسبیح کو تسبی، صحیح کو سہی، اور قاضی نکاح کو نکاہ پڑھتا ہے (ایک صاحب کا کہنا ہے۔ چلئے قاضی ہی ہی کہ اگر نکاح پڑھتے وقت نکاح کی 'ح' اپنے صحیح مخرج سے ادا نہ ہو تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوتا ہے) اب ہمارا نکاح صحیح ہو یا نہ ہو، یہ ایسا اس لئے ہے کہ جس زبان کو کہ ہم بچپن سے بولتے ہیں اس کے صوتی نظام میں ان حروف کی آواز کی ادائیگی اور ان کی پہچان کا کوئی انتظام نہیں ہے، اور گوشت والی زبان یعنی جیبھ کا یہ معاملہ ہے کہ وہ بچپن ہی میں الٹنا پلٹنا اور توڑ مروڑ سیکھتی ہے، بعد میں سیکھنے سے انکار کر دیتی ہے، اور کیا عجب کہ اس کا تعلق گلے کی ساخت سے بھی ہو کہ آدمی، صحرا، جنگل، وادی، پہاڑ، مرغزار اور ریگستان کا جدا جدا ہوتا ہے جس طرح کہ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سی دوسری بولیاں بولنے والے حضرات ش، ق، ادا نہیں کر پاتے ہیں اسی طرح ہم لوگ بھی ح، ص، ع، ض، ط، ظ وغیرہ کو ادا نہیں کر پاتے ہیں۔ پھر ہر زبان کے لہجے کے مخصوص اتار چڑھاؤ، تال، سم، مرکیاں اور نور کہ دھندے ہوتے ہیں۔ ہماری زبان آریائی خاندان کی ہے نہ کہ سامی خاندان کی کہ آخر الذکر کے لہجے کے بھاؤ تاؤ سے ہم زیادہ واقف ہو سکیں۔ ڈیڑھ سو سال سے ہند و پاک کے بابو لوگ انگریزی سیکھ رہے ہیں، لیکن (ACCENT) ان کی زبان پر چڑھ کر ہی نہیں دیتا ہے۔ یہی حال ہمارا عربی الفاظ کے ساتھ ہے اور ہمارا ہی کیا عربوں کا بھی ایرانی اور یونانی الفاظ کے ساتھ رہا ہے (مثالوں کی فہرست بڑی طویل ہے)۔ عربی کے وہ الفاظ جو کہ ہماری زبان میں دخیل ہیں اور ان کا استعمال ہر چھوٹا بڑا خاص و عام کرتا ہے ان پر اعراب ہم نے اپنے چڑھائے ہیں، ہم محبّت کو محبَت، جنازہ کو جَنازہ، میّت کو میَت بولتے ہیں، اور انہیں درست نہ کرنے پر مصر ہیں، کیونکہ جیسا کہ حالی نے بھی سمجھایا ہے "تلفظ کا مسئلہ صرف اعراب کے درست کرنے ہی کا نہیں ہے بلکہ ہر حرف کی آواز کو اس کے مخرج سے ادا کرنے کا بھی ہے۔ جن آوازوں کے ادا کرنے پر کہ ہم قادر نہیں ہیں اگر انہیں ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے، تو پھر تو ہماری وہی صورت بنے گی کہ۔ "زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا"

دوسرے یہ کہ جب کسی دوسری زبان کا لفظ ہم اپنی زبان میں قبول کر لیتے ہیں تو اس کی ادا اپنے لب و لہجے کا ہم جاہتے ہیں ہم [illegible] ہیں اور اسی کو فصیح جانتے ہیں، ہمارا یہی طور طریقہ دوسری غیر زبانوں کے الفاظ کے ساتھ بھی رہا ہے۔ اگر ہم [illegible] میر تقی [illegible]

وغیرہ کو ان کے ماخذ کے مطابق درست کردیں تو وہ پھر ہماری زبان کے الفاظ نہ رہ جائیں گے۔ میں نے لہجے کے معاملے پر جو اتنا وقت صرف کیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مضمون میں ایک سوال تلفظ کا بھی اٹھایا ہے۔ وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ اردو والوں کا یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں کہ عربی فارسی کے دخیل الفاظ کا وہی تلفظ ہماری زبان میں صحیح ہے جو کہ رائج ہے۔ اس کے برعکس وہ انہیں عربی فارسی کی لغات کی مدد سے درست کرنا چاہتے ہیں مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو کو عربی فارسی کے ہیولے سے نکالا ہے، اور اس کی خالصیت سے جو انکار کیا ہے اس میں یہی لم شامل تھا کہ وہ اردو کے الفاظ کا لہجہ عربی فارسی کی لغت سے درست کرنا چاہتے تھے ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

آج دنیا میں خالص زبان کوئی بھی نہیں ہے، اگر ہو گی تو افریقہ کے جنگلوں میں۔ ایسی صورت میں اس صفت کا اضافہ اردو کے ساتھ کیوں کیا جائے۔ کیوں نہ یوں کہا جائے کہ اردو اپنا ایک آزاد وجود رکھتی ہے، اس کی اپنی ایک گریمر اور اپنا ایک مخصوص صوتی نظام ہے، وہ اسی گریمر اور صوتی نظام کے تحت غیر زبانوں کے الفاظ کو رگڑ رگڑ کر اپنی زبان میں داخل کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بتلاؤں اردو کی اردویت اس کے اپنے روزمرے اور محاورے میں بھی ہے، اور ان نئے الفاظ اور ترکیبوں کی ایجادات میں بھی ہے جہاں اس نے ہندی کے ساتھ فارسی یا عربی کو پیوند کیا ہے۔

انگریزوں کی سازش؟ یا اردو میں وضع اصطلاحات کا مسئلہ؟

اب تک ہم یہ سنتے آئے تھے کہ اردو ہندی کا جھگڑا انگریزوں کا پیدا کیا ہوا ہے، انہیں نے اردو کے بالمقابل فورٹ ولیم کالج میں جدید ہندی کو کھڑا کیا۔ اور ایک ہی زبان کے دو ایسے اسلوبوں کو پروان چڑھایا جن سے کہ ان کے دو نام پڑ گئے۔ ایک ہندی دوسرا اردو۔ لیکن اب ڈاکٹر محمد باقر کے توسط سے اس کا علم ہوا کہ انگریزوں کی سازش ہماری زبان کو دو اسلوبوں میں تقسیم کرکے کمزور کرنے کی نہ تھی بلکہ اردو کو سہل اور سادہ رکھنے کی تھی تاکہ وہ عوام میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہو سکے بعلوم نہیں انگریزوں کی اس نیک کوشش کو وہ سازش کا نام کیوں کر دیتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ کیوں نہیں اردو کے لوگ ڈاکٹر صاحب کے حسب منشا اپنی زبان کے قواعد ضوابط اور وضع اصطلاحات کے مختص اصولوں کو بھلا کر، جدید فارسی کی اصطلاحات کو قبول کر رہے ہیں۔ بہرحال ان کی اس خواہش پر تبصرہ تو بعد میں کروں گا۔ پہلے اس انکشافِ سازش کی وہ حکایتِ دلچسپ تو سنئے، جو کہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے :-

"ابتدا میں اردو کا سرمایہ بہت قلیل تھا" (ابتدا میں تو دنیا کی ہر زبان کا سرمایہ قلیل تھا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ جس زبان کا ہیولیٰ عربی اور فارسی جیسی دو بڑی زبانوں سے تیار ہوا ہو، اس کا سرمایہ اس قدر قلیل کیوں تھا؟) "بعد میں وقت کے تقاضوں اور روز افزوں ضروریات کے باعث اس میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوا۔ یہ الفاظ زیادہ تر عربی فارسی سے ماخوذ ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا جبکہ اردو میں یہ الفاظ بڑی کثرت سے استعمال ہونے لگے۔" (ڈاکٹر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اردو پر یہ وقت کب آیا؟)۔ "اس وقت انگریزوں نے اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور انگریزی سے اس کا تصادم دیکھ کر مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اردو جیسی سیدھی سادی (اردو تو ایک ٹیڑھی زبان ہے ع کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے) زبان کو عربی فارسی کے سنگین الفاظ سے گرانبار نہ کریں۔ ساتھ ہی اردو نواز ہندوؤں کو بھی ترغیب دی کہ وہ بھی مسلمانوں سے یہی کہیں کہ اردو کی سادہ وضع برقرار رہنی چاہیئے ورنہ وہ ہندی کا رخ کر لیں گے۔ مسلمان اس بھرّے میں آ گئے۔" (پھر کیوں اردو نواز ہندو ہندی کی طرف چلے گئے؟) "اردو کو سادہ بنا کر عربی فارسی سے قطع تعلق کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج سے تقریباً پچاس سال" (ڈاکٹر صاحب نے بھی کیا وقت تجویز کیا ہے، یہی زمانہ تو علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کے اردو ادب پر چھانے کا ہے) "مسلمانوں نے ذہنی طور پر یہ خاموش اور خطرناک تحریک قبول کر لی کہ اردو میں انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کے کلمات تو اس میں داخل ہوتے رہیں لیکن عربی فارسی کا دروازہ اس پر بند ہو جائے۔ یہ طرزِ عمل اردو کی نشوونما اور توسیع میں بہت حد تک حارج ہوا۔" (متحدہ ہندوستان میں یا کہ پاکستان میں؟) "اردو نے بالعموم عربی فارسی کے کلمات مستعار لینے بند کر دئے ہیں" (گذشتہ دس سال میں عربی فارسی کے جتنے کلمات اردو صحافت میں آئے ہیں، کیا ان کی کوئی فہرست دی جائے) "اردو داں طبقہ عربی فارسی سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اس بے نیازی میں [illegible] انگریزوں کی سازش نے اردو کا اس سرمایۂ الفاظ تک محدود کر دیا ہے جو [illegible]

(اور ان کلمات کا کیا بنا جو کہ انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں سے لئے جا رہے ہیں) اور اب اردو کے لوگ عصر حاضر کے عربی فارسی ادب سے بیگانہ ہونے کے باعث ان کے
ان کلمات سے بے خبر ہیں جو کہ عصری تقاضوں کے باعث وہاں ایجاد ہوئے ہیں۔ مثلاً ایران میں لاؤڈ اسپیکر کے لئے "بلند گو" اور (PAVEMENT) کے لئے "پیادہ"
اور ریفریجریٹر کے لئے "یخ چال" ایجاد کئے گئے ہیں۔ لیکن ہم اپنی بدقسمتی سے ایرانیوں کے ان بیش بہا ایجادات سے مستفید نہیں ہو پاتے ہیں، اس کے برعکس یا تو
لاؤڈ اسپیکر کو لاؤڈ اسپیکر کہتے ہیں یا پھر (غالباً انگریزوں کی سازش کی وجہ سے) اس کے لئے آلۂ جہیر الصوت یا آلہ مکبر الصوت کے ایسے سنگین لفظ استعمال کرتے
ہیں۔ (فارسی کے حق میں عربی سے یہ تعصب کیسا ؟)۔

ڈاکٹر صاحب کو بات تو صرف اتنی ہی کہنی تھی کہ اردو کے وضع اصطلاحات کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر براہ راست جدید ایرانی ادب سے استفادہ
کرو، لیکن چونکہ وہ اپنی بات گھما پھیر کر کہتے ہیں، اور اس کے لئے ایک نظریہ بھی لاتے ہیں اس لئے انہوں نے اردو کی "سادہ وضع" یعنی اپنے اصولوں پر قایم رہنے کی
وضع کو انگریزوں کی سازش قرار دیا۔ اور جو انگریزوں کی اصل سازش تھی انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی، اس کا کوئی ذکر فسانے میں آیا ہی نہیں، اور نہ اس حکایت درد آمیز
میں وہابی سبھائیوں کی اسی سازش کا ذکر ہے کہ اردو کا نہ جوم ہندوستان نہیں بلکہ ایران اور عرب ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کا ذکر ہی کیوں کریں۔ جبکہ وہ خود بھی اسکا
ہیولیٰ عربی فارسی ہی سے تیار کرتے ہیں۔

بہرحال قبل اس کے کہ وضع اصطلاحات کی بات اٹھائی جائے اور ایرانیوں کی جدید اصطلاحات کو اپنی زبان کے مزاج کے آئینے میں پرکھا جائے،
اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالنا ضروری سا معلوم ہوتا ہے کہ کیوں آج نہ صرف اردو کے لوگ بلکہ پاکستان کے سبھی لوگ عربی فارسی سے دور ہیں، اور مغربی
زبانوں کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے تو یہ جانئے کہ اب علوم و فنون کے نقطۂ نظر سے عربی فارسی کی وہ اہمیت نہ رہی جو کہ قرون وسطیٰ میں تھی۔ دوسرے یہ
کہ گذشتہ دو تین سو سالوں میں یورپ اور انگلستان کی زبانوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اگر ہم ان زبانوں سے استفادہ نہیں کرتے ہیں تو پھر اپنی زبان کو ترقی نہیں
دے سکتے ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ سب محکوم ذہنیت کا نتیجہ ہے، احساس کمتری کا لرزہ ہے بہت آسان ہے، اور اس پر ٹھنڈے دل سے سوچنا کہ ہم ہی کیوں، پورا
ایشیا مغرب کا غلام کیوں بنا، ذرا مشکل ہے، اور اس سے زیادہ مشکل یہ سوچنا ہے کہ اب وہ کونسا راستہ ہے کہ ہم ان سے گوئے سبقت لیجائیں۔ اور اگر
بہت نہیں تو اس کے ہمدوش ہی ہو سکیں۔ بہرحال اس سلسلے میں جو شعور کہ عام طور پر ایشیا کے لوگوں میں اپنی پسماندگی کے بارے میں پیدا ہوا ہے وہ یہ ہے
کہ ہم صنعت و حرفت، معقولات، سائنس، اور ٹکنالوجی میں یورپ سے پیچھے رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ جب بھی کوئی ملک ان چیزوں میں پیچھے رہ جاتا ہے تو اسکی
زبان بھی پیچھے رہ جاتی ہے۔ کیونکہ زبان زندگی کے نئے رشتوں، نئے علوم کی ترویج و اشاعت اور زندگی کے مادی وسائل کو فروغ دینے ہی سے ترقی کرتی ہے۔
اسی وقت ہم اپنی نفسیات کو بروئے کار لاتے ہیں، نئے سے نئے خیالات اور نئے سے نئے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں تا وقتیکہ ایشیا کے ممالک
بالخصوص عرب اور ایران اپنے کو ترقی کی اس راہ پر نہ ڈالیں۔ اس کی توقع رکھنی کہ ہماری زبان ان کی زبانوں سے اسی طرح استشراق کا رشتہ قایم کرے گی
جیسا کہ اس نے قرون وسطیٰ میں کیا تھا۔ تاریخ کے تیور کو نہ پہچاننے کے مترادف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم ان سے قریب تر آئیں گے، اور اپنے یار دیرینہ کی غائب
کے علی الرغم آئیں گے لیکن یہ ناممکن ہے کہ ہم وضع اصطلاحات کے معاملے میں اپنے اصولوں کو فراموش کر کے، ان کی تقلید کرنے لگیں یا ان کی اصطلاحوں کو
براہ راست قبول کرنے لگیں۔ عرب اور ایران آج ان دونوں ممالک کے لوگ اپنی زبانوں کا سر رشتۂ استفادہ یورپ کی زبانوں سے باندھے ہوئے ہیں۔
اور ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ تم قرون وسطیٰ کی روایات کے پابند ہو کر ان کی زبانوں سے استشراق کرو، اور انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں کو بھلا دو۔ بھلا
یہ کیونکر ممکن ہے۔ ہم نے مانا کہ ان کا اب سورج گہنا رہا ہے، لیکن ابھی ہمارے انجم میں وہ تابانی کہاں آئی ہے، کہ ہم ان کی زبانوں سے بے نیاز ہو جائیں۔ آج انگریزی
اور دوسری یورپی زبانوں کا سیکھنا اور ان سے استفادہ کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کسی زمانے میں عربی فارسی کا سیکھنا اور اس سے استفادہ کرنا ضروری
تھا۔ یہ ایک غیر ضروری بات جو کہ فوری طور پر اس مبحث سے قدرے خارج ہے۔ اس لئے درمیان میں لایا ہوں کہ ہم وضع اصطلاحات کے موقعے پر اسے
لازم قرار نہیں دے سکتے ہیں کہ جو نئی اصطلاح بنے وہ عربی اور فارسی کے الفاظ سے بنے۔ اگر انگریزی کا کوئی لفظ ہماری زبان پر رواں ہے اور اسے عوام و خواص
سبھی سمجھتے ہیں تو ہم اسی لفظ کو استعمال کریں گے نہ کہ اس کا ترجمہ عربی اور فارسی کی لغات میں ڈھونڈیں گے۔ مثال کے طور پر سائنس اور کیمسٹری کے الفاظ کو لیجئے۔
ہم سائنس کو سائنس ہی کہیں گے نہ کہ علم اور کیمسٹری کو کیمسٹری ہی کہیں گے نہ کہ الکیمیا یا کیمیاگری۔ کیمسٹری کا مفہوم الکیمیا سے مختلف ہے حالانکہ ماخذ ایک ہے

اسی طرح جو سائنس کا مفہوم ہے وہ علم کے لفظ سے ادا نہیں ہو پاتا ہے تاوقتیکہ ہم اس کے ساتھ کسی اور لفظ کا اضافہ نہ کریں، پھر یہ کہ اس قسم کے الفاظ اس قدر عام ہیں کہ اگر ان کا ترجمہ مشکل الفاظ میں کیا جائے تو وہ اپنا مقصد ضائع کر دیں گے۔

بعض حضرات جو ان دونوں ایٹم کے لئے، جوہر اور ایٹمی کے لئے جوہری کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو وہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ ہمارے ادب میں جوہر کا لفظ عرض کے بالمقابل استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ (اور جوہری اسے کہتے تھے جو کہ جواہرات کا کاروبار کرتا تھا) آج جو ایٹم کا تصور ہے اس کا اظہار اس لفظ سے نہیں ہو پاتا ہے، مزید یہ کہ یہ لفظ نہ صرف ہماری زبان پر رواں ہو چکا ہے بلکہ دنیا کی ساری ترقی یافتہ زبانوں میں یکساں طور پر اسی یونانی لفظ کو استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنے یہاں بھی اسی کو رواج دینا چاہئے۔ سائنس کی ساری اصطلاحات کو بین الاقوامی ہونا چاہئے کہ اس سے تبادلۂ خیال میں آسانی ہوتی ہے۔ اگر عرب ہیولیٰ (یونانی ہائل) مادہ (لاطینی) اور اصطرلاب (یونانی) غیر زبانوں سے لے کر اپنے لہجے میں ڈھال لیا کرتے تھے اور آج بھی ایسا ہی کر رہے ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم کیوں نہ اپنے اصول کے مطابق اصطلاحات وضع کریں، اور جہاں ضروری سمجھیں غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنے لہجے میں ڈھال لیں۔

لیکن اگر غیر زبان کا کوئی ایسا لفظ ہے جو کہ ہماری زبان پر رواں نہیں ہو پاتا تو بے شک اس کے ترجمے یا بدل کو ہم عربی فارسی میں بھی دیکھیں گے۔ چنانچہ ادبی اور علمی اصطلاحات کے لئے ہم نے زیادہ تر عربی اور فارسی ہی سے استفادہ کیا ہے اور ابھی تک وہی طریق کار رائج بھی ہے، لیکن یہ طریق کار اشیاء کے ناموں کے ترجموں کے سلسلے میں جائز نہیں ہے۔ جو چیزیں کہ بازار میں بکتی ہیں وہ اپنے ساتھ اپنا نام بھی لاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شے کہ ولایتی ہوگی اس کا نام بھی ولایتی ہی ہوگا۔ بلیڈ زیادہ مقبول ہے بہ نسبت پتی کے، اسی طرح منجن اور ٹوتھ پیسٹ کا بھی اب فرق پیدا ہو گیا ہے۔ ٹوتھ پیسٹ کے لئے منجن کا لفظ استعمال کیجئے تو کوئی نہیں سمجھے گا۔ اور نئے کپڑوں کے تو سارے نام ولایتی ہی ہیں۔ پھر بھی اس کی گنجائش ہے کہ جس طرح ہم ایروپلین کو ہوائی جہاز اور ایروڈروم کو ہوائی اڈا کہتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی دوسری ولایتی چیزوں کو بھی ہم اپنے زبان کے مزاج، آواز کا تنفر، سوزم کا پہلو، ثقالت۔ اور اپنے لہجے کے خراد اور تراش کو فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم کوئی ایسی ترکیب یا اصطلاح قبول نہ کریں گے۔ جو کہ مضحکہ انگیز ہو۔ مثلاً ڈاکٹر صاحب نے جو دو تین نام مختلف اشیاء کے ایرانیوں کی لغت سے پیش کئے ہیں وہ ہمارے لئے سخت مضحکہ انگیز ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم ریفریجریٹر کو ایرانیوں کی طرح "یخ چال" کہیں تو اس کا بڑا مضحکہ ہوگا۔ کیونکہ ہمارے یہاں چالیں مختلف ہیں۔ اگر ایک طرف یہ مشہور ہے کہ کوا چلا ہنس کی چال گیا اپنی چال بھی بھول، تو دوسری طرف ایک بھونچال بھی ہے، قطع نظر اس بات کے کہ "یخ چال" کے سننے سے غالب کے اس مصرع کی تندی جاتی رہے گی کہ۔ لرزتا ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر۔ اسی طرح اگر ہم PAVEMENT کے لئے جس کے لئے فرش کا لفظ بھی استعمال ہو سکتا ہے اور پٹری بھی، ایرانیوں کی طرح پیادہ رو کہنے لگیں تو ہمارے اپنے لوگ پٹری دیکھنے کے بجائے پیادے کو دیکھنے لگیں گے۔ اور ہم جو موٹر کار کو "موٹر" یا "کار" یا "موٹر کار" ہی کہتے ہیں اور ایرانیوں کی طرح "خودکار" نہیں کہہ سکتے ہیں تو اس کا بھی یہی سبب ہے کہ ہمارے یہاں کار موٹر سے چلتی ہے نہ کہ خود سے۔ اب جبکہ ہم صنعت ابہام سے دور ہو چکے ہیں، ایسی ترکیب کیوں استعمال کریں جس میں ابہام ہو۔ ویسے SELF-PROPELLED کوئی ایک کار ہی تو نہیں ہوتی ہے، آجکل تو سبھی انجن خود ہی سے چلتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ، کلاسیکی فارسی سے استفادہ کر چکنے کے بعد اب جدید ایرانی زبان سے ہمیں اتنا ہی لینا ہے جتنا کہ انہیں ہماری زبان سے سیکھنا ہے۔ ہمارا جدید ادب ان کے جدید ادب سے اگر آگے نہیں تو کچھ پیچھے بھی نہیں ہے۔ اور یہی بات ماڈرن عربی داں حضرات جدید عربی ادب کے بارے میں بھی کہتے ہیں۔ پھر ہم اپنے اوپر خواہ مخواہ عربیت اور فارسیت کا جنون کیوں طاری کریں کیوں نہ اپنی ٹھیٹھ زبان اور دوسری علاقائی زبانوں کی مدد سے ایسی اصطلاحات بنائیں جنہیں ہزاری بزاری دونوں سمجھ سکیں۔ ڈاکخانہ، پوسٹ آفس کے لئے اور تار گھر ٹیلیگراف ہاؤس کے لئے اور بجلی گھر پاور ہاؤس کے لئے کیا برا ہے، کہ ہم ایرانیوں اور عربوں سے انہیں انگریزی الفاظ کے مفرس اور معرب الفاظ لیں۔ اردو کی یہ سادہ وضع عین دانشمندی پر مبنی ہے کہ اس نے ترقی اپنی اسی سادہ وضع سے کی ہے۔ ورنہ جدید ہندی کی طرح یہ بھی نامقبول ہو چکتی، اور اس کا وہ بول بالا نہ ہوتا جو کہ آج اردو کی فلموں کی مقبولیت سے ظاہر ہو رہا ہے۔

اردو کے ہیولے کی بات تو بہت ہوئی، لیکن اس سلسلے میں جو ایک ضروری بات کہنی تھی وہ تو میں بھول ہی گیا، اردو، لشکر کے بازار سے چل چلا کر شہر کے بازاروں میں پہنچی تھی، اس نے بیشتر الفاظ غیر زبانوں اور اپنی ہم کنبہ بولیوں سے انہیں بازاروں میں لئے ہیں، جہاں مختلف زبانوں اور بولیوں کے لوگ آپس میں

لین دین اور سود اسلف کرتے، یہ بازاریت اس کی گھٹی میں کچھ ایسی پڑی ہے کہ وہ کسی بھی نئے لفظ کو قبول کرنے سے پہلے، اس کے چالو ہونے کا سوال اٹھاتی ہے۔ آج جبکہ مغربی پاکستان ایک بازار میں تبدیل ہو رہا ہے، مغربی پاکستان کی علاقائی زبانوں کے بہت سے الفاظ آپس کے لین دین اور سودا سلف کرنے سے اس میں راہ پانے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن وہ مقبول اسی وقت ہوں گے جبکہ وہ چالو ہو جائیں گے۔ پنجابی کے نئے الفاظ بھی اردو زبان میں اسی فطری طریق کار سے آئیں گے اور اردو کا لہجہ پا کر ایسا گھل مل جائیں گے کہ عین اردو زبان کے الفاظ معلوم ہوں گے کسی بھی زبان میں نئے الفاظ اسی طرح کے مختلف لیکن فطری طریق کار سے داخل ہوتے ہیں، اور وہ بھی ایک طویل زمانے میں۔ نہ کہ کسی سمجھوتے کے تحت کہ "اگر تم یہ چاہتے ہو تو ایسا کرو" اگر اس قسم کا کوئی سمجھوتہ زبان کے معاملہ میں چلتا ہو تو یہ ہندی کو پت کر کے کب کی وہاں براجمان ہو چکتی، زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ جہاں ساری عصبیتیں ختم ہو چکتی ہیں، وہاں ایک عصبیت زبان کی باقی رہ جاتی ہے، کیونکہ خیالات کے اظہار کے لئے تو کسی اور کی زبان سے بھی کام چل سکتا ہے، لیکن جذبات کا اظہار صرف اپنی ہی زبان میں ہو پاتا ہے۔ اسی لئے اس کی پاکیزگی بھی عزیز ہوتی ہے ایسی صورت میں کسی ایک یا دس بیس الفاظ کے قبول کرنے یا نہ کرنے کی صورت میں فراخدلی کا سوال اٹھانا نہ چاہیئے، کیونکہ آدمی کسی چیز کے دینے میں فراخدل ہوتا ہے نہ کہ لینے میں۔ فراخدلی سے دوسروں کی چیزیں لئے جانے کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ وہ زبان کیا جو اپنا لوہا تخت و تاج کی مدد سے منوائے، اردو تو درویشی میں پلی ہے، اور اسی انکسار و عاجزی کے ساتھ اب تک ترقی کرتی رہی ہے۔ وہ تو بر خود غلط چند سرپھرے تھے جو یہ سوچتے تھے کہ وہ اردو پڑھا کر اپنے ان پاکستانی بھائیوں کو مسلمان بنا رہے ہیں جنکی مادری زبان اردو نہیں ہے، ویسے سرپھرے اب ذرا خال ہی خال ہوں گے۔ ایک ڈاکٹر لوکے بعد دوسرا ڈاکٹر لو نہیں ہوا کرتا۔ ورنہ عام طور پر اردو کے لوگ اسی نقطۂ نظر کے ہیں کہ وہ اپنی زبان کو پاکستان کی دوسری زبانوں اور بولیوں کی مسابقت میں ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں، نہ کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی مغلوب کر کے اس کی ترقی چاہتے ہیں۔ لیکن اگر مغربی پاکستان کی مختلف بولیوں اور زبانوں کے لوگ از خود یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ یہاں کے مختلف قوم قبیلوں کے درمیان اردو زبان ہی کے ذریعہ اتحاد قائم کیا جا سکتا ہے یا یہ کہ اردو ہی اس علاقے کی لنگوا فرینکا ہے اور اسے مغربی پاکستان کی قومی زبان بنانی چاہیئے، تو چشم ما روشن، دل ما شاد، اس میں کسی اینچ پینچ کی کیا بات ہے۔ نیکی کر کنوئیں میں ڈال۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا ہے خواہ اس کا سبب انگریزی زبان کا تسلط ہے، یا کوئی اور سبب ہو تو اردو کے لوگوں کو کیا شکایت ہو سکتی ہے اگر ان کے جائز حقوق کی پامالی نہیں ہوتی ہے۔

اردو یا پاکستانی؟

اگر اس فراخدلی اور صلح جوئی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پھر ڈاکٹر محمد باقر کی اس تجویز پر رائے دینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ کیوں نہ اردو کو پاکستانی کے نام سے بدل دیا جائے، عرض یہ ہے کہ جس طرح پاکستان کی نسبت سے ہر وہ شخص پاکستانی ہے جو کہ پاکستان میں رہتا ہے اسی طرح پاکستان کی ہر وہ زبان اور بولی پاکستانی ہے جو کہ پاکستان میں بولی جاتی ہے۔ چنانچہ اردو اس نسبت سے بغیر کسی کے کہے سنے پاکستانی ہے، ہرچند کہ وہ اور ملکوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے، پھر اسے بغیر کسی مقابلے میں اوّل آئے ہوئے مسٹر پاکستانی کا لقب کیوں دیا جائے۔ اس سے دوسری زبانوں اور بولیوں کے لوگوں کی دل آزاری ہوگی۔ بالخصوص مشرقی پاکستان کے بنگالی بولنے والے حضرات تو اس پر بڑا ہی ہنگامہ کریں گے۔ اور اگر اس کے جواب میں برائے بیعت یہ کہا جائے کہ چلو اس کا نام پاکستانی نہ سہی مغربی پاکستانی رکھتے ہیں تو اس وقت ہم سے بیعت لینے سے پہلے سندھی، پنجابی، ملتانی، پشتو، براہوی، بلوچی، گجراتی، مکرانی بولنے والوں سے مخاطب ہونا چاہیئے، کہ انہیں کی اکثریت ہے اور کسی بھی جمہوری ملک میں اکثریت کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ کرنا چاہیئے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے لئے اس کے نام بدلنے کی تجویز سے یہ کام زیادہ اہم ہے کہ اردو کی سادہ وضع یعنی اس کے بنیادی ذخیرۂ الفاظ، اس کے روزمرے اور محاورے اور اس کے قواعد اور لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی ترقی میں کوشش کی جائے، ہرچند کہ یہ انگریزوں کی سازش ہی کیوں نہ ہو ؎

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

اس سے کم از کم یہ تو فائدہ ہوگا کہ ہم پاکستان کے عوام سے تو قریب رہیں گے ۔

★

غزل

یہ غزل سوتیا چھند کے مطابق کہی گئی ہے۔ اس چھند یا بحر میں میرؔ کی متعدد غزلیں ہیں
جیسے ع "اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا"

فراقؔ گورکھپوری

پوچھ پوچھ کے نام پتہ کچھ سمجھ سمجھ رہ جاتے ہو
ہم بھی فراق نگر جاتے ہیں بولو تم بھی آتے ہو

نین پٹوں میں رہ رہ کر تم چنچل روپ دکھاتے ہو
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھوں تو تم چھپ چھپ جاتے ہو

کالے بادلو اُمڑ گھمڑ دھرتی کی پیاس بجھاتے ہو
راگ ملھار سناتے ہو یا جیون گھن برساتے ہو

ہنس ہنس کے گلرنگ ادا سے ناز سے دیکھ دیکھ کے دھر
مکھڑ پھیر پھیر لیتے ہو کیوں دل کو ڈہکاتے ہو

تم نے دل لینا سیکھا ہے دل رکھنا سیکھا ہی نہیں
تم اور مجھ پر کرم کروگے کیوں مجھ کو جھٹکاتے ہو

آنکھوں سے اوجھل ہو لیکن جھمک جھمک یہ کیسی ہے
میرے من مندر میں اپنی پینجنیا جھنکاتے ہو

بزم طرب کے نام بڑے اور درشن چھوٹے یاد رہے
یارو دور کے ڈھول سہانے کس محفل میں جاتے ہو

اُڑتی پھرتی تھی گلیوں گلیوں جدھر کدھر ماری ماری
روندرہے ہو خاک ہماری جیون مان بڑھاتے ہو

یہ شب ہستی بھرتے ہو جس میں مذہب و ملت کے بہروپ
ایک رات میں دنیا والو کیا کیا سوانگ رچاتے ہو

دُنیا روشن کرنے والو۔ کچھ دُنیا کا حال بتاؤ
دیپ سمان بھری محفل میں جل جل کے بجھ جاتے ہو

اچھا اچھا اے دل والو تم کو کسی سے عشق نہیں
دُبدھے پیدا ہوتے ہیں اتنی قسمیں کیوں کھاتے ہو

میں بھی اسی دُنیا میں ہوں یارو لاکھ بار اس دُنیا کی
سمجھ چکا ہوں رام کہانی تم کس کو سمجھاتے ہو

تم نے چھپ کے چھیڑ دیا ہے کس جھرمٹ سے یہ سنگیت
گونج اٹھی ہے گھاٹی گھاٹی پریم کی بین بجاتے ہو

شکھ کا بھید سمجھنے والا دکھ کا دھوکا کیا کھائے
میرے آنسو دیکھ دیکھ کے من ہی میں مسکاتے ہو

پریم نگر میں کہتے ہیں کل اک ماتم سا برپا تھا
اس ہمسائے میں کچھ تو بتاؤ تم بھی آتے جاتے ہو

دُنیا والو کن جتنوں سے دُنیا عالم کو جگاتی ہے
تم ہو لیسے نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہو

چُپ رہتے ہو میرے آگے یہ تو مانتا ہوں لیکن
بے شبدوں کے جانے کیا کیا تم مجھ سے کہہ جاتے ہو

اس اُجڑی دُنیا کو سجاؤ تب تو کوئی بات بنے
اسے من کے سندر سپنو تاروں کے دیس بساتے ہو

نرجن بن اور رین اندھیری کب سے ہو اس عالم میں فراقؔ
آنکھیں بند کئے بیٹھے ہو من کی جوت جگاتے ہو

★

سرِدول[1]

مشیر افضل جعفری

جواں سال، چونچال، سندر، ہٹھورا

مدھر دیس کا جھلملاتا جٹورا

دلوں کا حسیں چور، گھبرو کنہیا

بھری بار کا مست و مخمور تورا[2]

غزل مند کندھوں پہ نیلی خوشابن[3]

خوشابن میں جھلکے ارم گورا گورا

جوانی پہ اٹھتی امنگوں کے بادل

سجل عمر میں بجلیوں کا نیہورا[4]

رُپہلی ہنسی میں فروزاں چنبیلی

چناں تاب چہرہ، سنہری کٹورا

سحر رنگ ماتھے پہ زلفوں کے لچھے

کنول روپ نینوں میں سوہے کا ڈورا

خنک سوز چن ماہیوں کا تپنگا

جہاں گیر مہرانیوں کا چکورا

---

[1] ادھر کا ایک پیارا نام [2] پنجاب کا مشہور رومانی ڈاکو
[3] ریشمی کنارہ دار لنگی [4] نخرہ۔

فریبِ ازل

شاد امرتسری

ہم تھکے ہاروں کو دامن میں سمیٹے چپ چاپ
تیرگی شب کی نگل جاتی ہے دن کو ہر شام
سوچتی ہے کہ ہو خوابیدہ کھلے بستر پر
اور ہم اپنا سفر چھوڑ کے بے خود ہو جائیں،
اور ہر وادیٔ شاداب کا تیکھا منظر
شب کے ارمانوں کی تکمیل کا ساماں بن جائے

تیرگی شب کی نگلتی ہے ہر اک نقشِ حسیں
خواب گاہوں کے دریچوں کے نشاں مٹتے ہیں
اور ایوانوں کے گوشوں پہ فسوں چھاتا ہے
بام و در سہمے ہوئے دستِ سیہ دیکھتے ہیں
راستے خوف سے چپ چاپ سمٹ جاتے ہیں
شب ہر اک نقشِ حسیں خواب بنا دیتی ہے

تیرگیِ شب کی نگلتی ہے ہر اک شے کو یونہی
بام و در، وادیٔ شاداب، ہر اک نقشِ حسیں
ذہنِ تیرہ کی وسعت پہ نظر گاڑے ہوئے
تند و تاریک خلاؤں میں اٹک جاتے ہیں
خواب گاہوں کے دریچوں کی جھپکتی آنکھیں
برق پاروں کی تمازت کو فِرو کرتی ہیں

زندگی دن کو سفر کرتی ہے منزل کی طرف
ایک دو گام ازل پیچھے سرک جاتا ہے
خواہشِ منزلِ مقصود جواں ہوتے ہی
شب کے بے رحم سیہ ہاتھ میں آجاتی ہے
اور پھر نقطۂ آغاز کا ملتا ہے سراغ
گویا طے کردہ مسافت بھی کوئی شے ہی نہ تھی

آگ اور پیاس*

صہبا اختر

ہر اک بدن سے سمندر گرے پسینے کے

دہکتی ریت کے جلتے ہوئے سرابوں میں
سُلگتی آگ کا اک دجلۂ رواں بن کر
وہی تپاں وہی شعلہ بجاں اُداس خزاں
گذر رہی ہے کڑی دھوپ کا دُھواں بن کر

★

چمن کی راہگذاروں میں آگ پھیل گئی!
وہ آگ جن سے بہاروں کے سائے ڈرتے ہیں
یہ پیلے بھوت خزاں کے یہ زرد رو پتّے!
دلوں میں خاک تو آنکھوں میں راکھ بھرتے ہیں

★

نہ سبز پتّوں کے آنچل نہ رنگ پھولوں کے!
ہر ایک شاخِ برہنہ لباس ڈھونڈتی ہے
اُجاڑ، خاک اُڑاتی ہوئی اُداسی میں!
شگفتِ گل کو نگاہوں کی پیاس ڈھونڈتی ہے

★

مرے اداس کراچی ترے مقدّر میں
کسی حسین کی زلفِ سمن فشاں بھی نہیں
زمیں پہ سایۂ ابرِ بہار تو کیسا
زمیں پہ سایۂ دیوارِ گلستاں بھی نہیں

خزاں نصیب کہاں دن تبائیں پینے کے!

★ کراچی پر اُن دنوں برستی ہوئی آگ سے متاثر ہو کر۔

جھیل

بلراج کومل

رنگوں روشنیوں کا میلہ
میں نے کل شب جھیل میں دیکھا
تاریکی میں کھوتے پربت
کھمبوں کی خاموش قطاریں
کشتی بانوں کی آوازیں
نکھرے پانی کے درپن میں جھانک رہی تھیں

میرے جام سے ٹکرا کر خاموشی گونجی
آنکھیں پُرنم
میں خوش تھا یا جھیل میں اپنے دکھ کا سایہ دیکھ رہا تھا!؟
میں کیا جانوں!؟

مہمان

کل شب ایک سہانا سپنا
میرا مہماں بن کر آیا
لیکن میں تو جاگ رہا تھا
تنہائی کی راہ گذر پہ
تاریکی سے بھاگ رہا تھا
سواگت اس کا میں کیا کرتا
اس کے پیار کا دم کیا بھرتا

میرا مہماں لوٹ گیا ہے
اس کو واپس کون بلائے!؟
کون اس [illegible] کو [illegible]

غزل

طاہرہ کاظمی

نہ غمخوار ہے ذوقِ بادہ پرستی، نہ یادکرم حاصلِ زندگی ہے
تلاشِ سکوں، شورشِ قلبِ مضطر، نگاہوں کا غم حاصلِ زندگی ہے
ترے غم نے بخشی امیدوں کی دولت، نظر کی بلندی تخیل کی عظمت
نہ لوں جس کے بدلے زمانے کی راحت، وہ معراجِ غم حاصلِ زندگی ہے
سلامت رہیں شدتیں آرزو کی مجھے اس تغافل کا شکوہ نہیں ہے
ہے دورِ وفا جس کے محور پہ قائم، وہ قول و قسم حاصلِ زندگی ہے
شبوں کے اندھیرے میں بھٹکی ہیں برسوں، نگاہیں تری رہگذر پر رکی ہیں
جہاں پر جھکے چاند تاروں کی رفعت، وہ نقشِ قدم حاصلِ زندگی ہے
جفائے مسلسل کا شائق ہے یہ دل، اب اس کے لئے آرزوئے کرم کیا
جو خاروں کی سوزش گلوں میں بدل دے، وہ مشقِ ستم حاصلِ زندگی ہے
کہیں تابشِ آرزو نور زا ہے کہیں ہیں تصور میں جلوے فروزاں
یہ ہستی ہے جس سے چراغاں چراغاں، وہ دردِ الم حاصلِ زندگی ہے

غزل

ضمیر اظہر

شہاب اُبھرے ہیں، مہتاب مسکرائے ہیں
ترے خیال میں کیا کیا خیال آئے ہیں
جبھی تو جاذبِ قلب و نظر ہے رنگِ شفق
کہ اس میں تیرے لبوں کے حسین سائے ہیں
بہار تیرے خد و خال سے مزیّن ہے
گل و سمن نے ترے رنگ و بو چرائے ہیں
تری جبیں میں کئی رفعتیں جھلکتی ہیں
تری نظر نے کئی آسماں بنائے ہیں
ہوا ہے یوں بھی کبھی وسعتِ تمنّا سے
ترے فراق میں تیرے پیام آئے ہیں
مہک اٹھی ہے مری شام، میری تنہائی
کچھ ایسے پھول تری یاد نے کھلائے ہیں
عجیب شے ہے تصوّر کا بتکدہ اظہر
ہر ایک روپ کے اس میں ہزار سائے ہیں

افسانہ:

زیرِ دام آ ہی گیا!

ابوالفضل صدیقی

مہینوں تاریک راتوں کے سناٹوں میں پنجوں کے بل جمع ہو ہو کر جس پودے کی ہم نے گویا اپنے خونِ دل سے آبیاری کی تھی اور جسے گویا سر دھڑ کی بازی لگا کر پروان چڑھایا تھا آج اس کے بار آور ہونے کا دن تھا۔ مدتوں کی بنی ہوئی اسکیم آج عملی جامہ پہن رہی تھی۔ دھڑکنیں تیز تھیں، حواس خمسہ حس کی اخیر منزل پر تھے، دل سے ہراس غائب تھا، اعصاب میں کہربائی سرعت کارفرما تھی۔ سرِ شام سے ہماری پارٹی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں شہر بھر میں محلوں محلوں، گھر گھر گشت لگانے کے بعد کہیں بارہ ایک بجے ٹھکانے لگی تھی۔ ایک خفیہ جگہ پر جمع ہو کر پھر مختصر سی میٹنگ ہوئی، مجملاً اپنی اپنی کارگذاری کی روداد بیان کی، اور اخیر رات سب اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔ نیند تو کس مسخرے کو آتی۔ صبح نکلتے ذرا آنکھ جھپکی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہیڈ ماسٹر میرے نیچے دبا پڑا ہے، مضبوط پُر گوشت گردن میرے پنجہ میں ہے اور گھٹنا اس کی پیٹھ پر جما ہوا ہے۔

"بہت خون پیا تھا، زندگی اجیرن کر دی تھی، آج زندہ بچ کر نکل جاؤ گے تو میں نے جانا" میں نے کہا اور دبے ہی دبے ہیڈ ماسٹر نے پورا زور لگا کر گردن موڑی اور پلٹ کر جوں ہی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں میری گرفت جیسے شدید خوف کے احساس سے ڈھیلی ہو گئی اور ہیڈ ماسٹر اچھل کر آزاد ہو گیا ...... میری آنکھ کھل گئی اور میں غیظ و غضب میں زیر و زبر ہو کر جاگا۔ میرا ضمیر ایسا خواب دیکھنے پر مجھے نفرین کر رہا تھا۔ گویا خواب میں بھی ہیڈ ماسٹر سے خائف ہونے پر نادم تھا۔

اور میں اپنے ادب سکھانے والے کی تادیب کے لئے گھر سے چلا ہم سب رنگ لیڈروں کو آج سورج نکلنے سے پیشتر اپنی ایسی مجلس شوریٰ منعقد کرنی تھی۔ معینہ وقت پر تو آنکھ ہی کھلی تھی۔ جلدی جلدی بستر سے جوں کا توں اٹھ کر کوٹ کندھے پر لٹکائے، انگلیوں سے بال درست کرتا ہوا ایک ہاتھ میں سائیکل پکڑ کے گھر سے چل پڑا۔ بمشکل دو سو قدم نکل پایا ہوں گا کہ پچھلے پہیے میں پنکچر ہو گیا اور مجھے مجبوراً اپنی لنگڑی سائیکل رکھنے کے لئے گھر واپس آنا پڑا اور پھر بھاگنے اور لپکنے کے درمیان میں اسکول کی جانب چلا۔

آج اسکول میں قیامت صغرا بپا کرنے کا موعودہ دن تھا اور اس کم بخت پنکچر کے چکر میں مجھے دیر ہو گئی تھی، شعلہ ابھی نوزائیدہ تھا، مجلس شوریٰ کا اجلاس ختم ہو چکا تھا اور مجھ پر غدار، بزدل وغیرہ قسم کا ریزولیشن پاس ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی فنیلہ میں آگ لگنے کی دیر تھی۔

"خوب آئے صبح تڑکے! سبحان اللہ!"

"اجی اب نکلی ہے آپ کی صبح!؟"

"ناشتہ میں دیر ہو گئی ہو گی، ایں، رات کا بھوکا تھا بیچارہ"

"اجی دیکھ لی بہادری!۔ مکار کہیں کا۔ بزدل"

"ارے صاحب ان حضرت کو تو میں بھی کچھ پہچانتا ہوں۔ بس سمجھ لو، گولی سو قدم بندہ پانسو قدم۔"

"چلتی رقم ہیں، ہا، ایسے سہل ہاتھ آنے والے نہیں، سو کر رہ گئے ایں!؟"

"اور سوتا اور مرا برابر ہوتا ہے، کیا کریں بیچارے مجبوری ہو گئی مکار کہیں کا۔"

اور میں نے ساتھیوں کی ان بوچھاڑوں میں ذرا سانس درست کی اور اک ذرا بارسا پا کر جواب دیا "وہ تو اب دیر ہو ہی گئی، خواہ کچھ کہو، غدار بتاؤ یا بزدل کہو۔ اب تو بھائی سبھی کچھ ہیں۔ اگر آنکھ ذرا سویرے کھل جاتی تو آج ہم بھی تم سے کم بہادر نہ ہوتے۔"

ہماری کلاس کے تینوں سیکشنوں نے تیسرے چوتھے پانچویں اور چھٹے درجے کے بچوں کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ ساتویں اور آٹھویں
جماعت کے طلباء ہمارا دستِ راست تھے۔ اور آج سارا اسکول بغیر کتابوں کے تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک پتلا سا جرمن سلور کی شام والا بید تھا، ظہیر، سعید حسنین
اور کاظم کے ہاتھوں میں ہاکی اسٹکس تھیں۔ میرے پہنچتے ہی اودھم مچ گیا۔ پھاٹک پر، میدان میں، برآمدوں اور گیلریوں میں بھاگڑ پڑ گئی اور اسٹرائک کا سماں بندھ
گیا۔ بلبلاتے ہوئے صحرائی کتوں کے غول کی طرح چھوٹے بڑے طلبا دوڑ رہے تھے، چنگھاڑ رہے تھے، زمین آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے، بنچیں اور اسٹول
اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے تھے۔ انقلاب اور لعنتوں کی چنگھاڑوں سے تمام فضا بھری ہوئی تھی، مجمع ہال کی جانب رجوع ہونے لگا۔ چوکیدار سے کنجی لے کر ہال
کھول ڈالا، اور چو طرفہ دروازوں سے ہال کے اندر کو طالب علموں کا طوفان پھوٹ پڑا۔ اور میں اپنی خفت مٹانے کے لئے ڈائس پر پہنچ گیا اور اپنی تمام تر
لسانی قوتیں جمع کر کے اپنی بساط سے کہیں زیادہ زور کے ساتھ نوسو طلباء کے مجمع میں دھواں دھار تقریر کی اور جس ہیڈ ماسٹر نے گھنٹوں کھڑے ہو ہو کر
سکول ڈیبیٹ کی تعلیم دی تھی اور ایکشن اور پوز سمجھا سمجھا کر تقریر کی مشق کرائی تھی اسی کو آج "کس نیا موخت علم تیر از من کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد"
کا مصداق بنا ڈالا۔

پہلے سناٹا ہوا اور پھر مجمع پر آہستہ آہستہ جوش طاری ہوا اور پھر خشونت اور غیظ سے جا ملا۔ لیڈرانِ کرام نے نوجوانوں کے جذبات کو روکا۔ اور
میٹنگ کو نظم و ضبط کی شکل دی۔ تشکیل نے دو تین ریزولیشن پیش کئے جن کے ذریعہ ایک باضابطہ لائحہ عمل سامنے آ گیا۔ اور جب میٹنگ ختم کر کے مجمع ہال سے باہر نکلا تو
سامنے سے ایک کار میں ہیڈ ماسٹر سکریٹری اور چیرمین آتے دکھائی دیئے۔ کار نے بوڑھیکو تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ہارن کی آواز "ہیڈ ماسٹر برباد!" "ظالم" "موذی"
"جلاد" "کافر" کے نعروں میں گم ہو گئی۔ اور پھر غدار ملت برباد، توڑ دو، مار دو، پکڑو، بے ایمان، پھر دھم دھم دھا دھم، چٹا چٹ چھن چھن۔ کار کے
شیشے چکنا چور ہو گئے اور وہ بڑی مشکل سے مڑ کر فرار ہو سکی۔ ہم سب نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے دشمن ہمارے مقابلہ سے شکست فاش کھا کر میدان سے فرار
ہو گیا، دل بڑھ گئے۔ ہمارے بچکانہ خون میں بڑے زور سے ہیجان پیدا ہو گیا طفلانہ ہمتیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔ اور میٹنگ کے پاس شدہ ریزولیشنوں کے مطابق
عملی اقدام شروع کر دیا۔ قرارداد کے مطابق تقریباً ایک ہزار طلباء کا غول چیختا چلاتا سید صاحب مجسٹریٹ ضلع کے بنگلہ پر پہنچا تو اتنے بڑے شیطانی لشکر کو بڑھتے دیکھ کر مجسٹریٹ
اپنی کوٹھی کی بالائی منزل پر چڑھ گیا۔ ہم سے نہایت مشفقانہ لہجے میں شکایات کے متعلق استفسار کیا اور ایک ہزار کے مجمع میں سے میں ہی بڑھ کر اس سے ہم کلام
ہوا۔ میری خفت تو خیر ہال کے اندر تقریر کے بعد ہی ختم ہو گئی تھی اور اس وقت تو سارے مجمع اور شاید مجسٹریٹ پر بھی رعب طاری ہو گیا کیسی خوبصورتی اور زور کے
ساتھ میں نے اپنے مطالبات پیش کئے۔ مجسٹریٹ نے ایک پرچہ پر ہمارے مطالبات نوٹ کئے اور کہا چونکہ آپ کے مطالبات میں ہیڈ ماسٹر کی برطرفی اور
اسکول اسٹاف اور ورکنگ کمیٹی میں تبدیلی وغیرہ کا مطالبہ ہے، لہٰذا آپ لوگ انسپکٹر آف اسکولس کے پاس جائیں۔ مجمع یہاں سے ہٹ کر انسپکٹر آف
اسکولس کے بنگلہ پر پہنچا۔ یہاں باری باری سے ہم سب نے اپنی حسرتیں نکالیں۔ ہیڈ ماسٹر پر کج خلقی، بے ایمانی وغیرہ سب الزامات لگائے۔ سکریٹری کو ان کے
ہاتھ میں کٹھ پتلی بتایا، بیشتر طلباء کے ساتھ درشتی اور بدکلامی سے پیش آنے اور امتحانوں میں بے ضابطہ سختی برتنے کی شکایت کی اور برطرفی کا مطالبہ کیا۔ بہر حال
اختتام پر فریادوں کے نعرے بلند کئے، اور اپنے مطالبات کے پورے ہونے تک کے لئے اسٹرائک کا اعلان کر دیا۔ اسکول نامعلوم مدت کے لئے بند ہو گیا۔

چڑھی ہوئی اتر گئی تھی، اور سر پر خمار طاری تھا۔ ہم میں کے میر جعفر قسم کے خلیفے سرخرو بن کر صاف علیحدہ ہو گئے تھے۔ ابتدائی جماعتوں کے بچوں کو بیدکی
سزا دی جا چکی تھی۔ ساتویں اور آٹھویں جماعت کے نیم لیڈر طلباء کو پبلک کیننگ اور بھاری بھاری جرمانوں سے دبا دیا گیا تھا۔ غرض بغاوت فرو کرنے کے بعد
فاتح حکومت جو کچھ کیا کرتی ہے وہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ مگر ہم سات کے متعلق ابھی تک کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا اور معاملہ زیر غور تھا اور جیسے ہم موت و زیست
کے درمیان ٹنگے ہوئے تھے۔ گھر پر تقریباً روزانہ لعنتیں پھٹکاریں پڑا کرتی تھیں اور کبھی کبھی گوش مالی تک نوبت پہنچ جاتی۔ ہم پنج وقتہ نماز پڑھ پڑھ کر
خضوع و خشوع کے ساتھ دعائیں مانگتے، ہمہ وقت توبہ استغفار کا ورد رکھتے اور وہ سب وظائف پڑھا کرتے جو امتحان کے زمانہ اور نتیجہ کی آمد تک
کورس سے زیادہ شدت کے ساتھ پڑھے جایا کرتے ہیں۔ جب اسکول کو اسٹرائک کے بعد کھلے ہوئے دو ہفتے گذر گئے اور ہیڈ ماسٹر ہمارے معاملہ کو برابر ٹالتے ہی
رہا تو ایک روز والد صاحب قبلہ مجھ کو ساتھ لے کر ہیڈ ماسٹر کے گھر پہنچے، سب ساتھیوں کے سرپرستوں اور ساتھیوں کو بھی ساتھ لے لیا اور ہم ساتوں

فرداً فرداً بہ چشم نم دست بستہ معافی مانگی۔ خشک تیوروں اور سرد انداز سے ہیڈ ماسٹر نے معاف کرنے کا وعدہ کیا اور ہفتہ بھر کے اندر مطلع کرنے کو کہا۔ اور تیسرے چوتھے روز اسکول کا بوڑھا چپراسی ہمارے دروازہ پر رسٹی کیشن کا نوٹس لے کر پہنچا۔ ہمارے باپ کے نام کارگذاریوں کے انعام! جوں ہی کاغذ ہاتھ میں پہنچا ابا جان پہلے تو حسب عادت ہم پر برس پڑے، اپنی موت کی دعائیں مانگیں، بار بار پیشانی ٹھونک ٹھونک کر مجھ کو بددعا دی، خاندان کی عزت خاک میں ملانے والا، داشتوں کا نام ڈبونے والا خطاب دیا۔ اور پھر دونوں مٹھیوں میں میرے دونوں کان بھینچ کر بڑے زور سے میرا سر جھنجھا کر پھینک دیا۔ "گھر سے نکل جا مردود، منحوس شکل دفان کر سامنے سے بے ایمان! — خدا غارت کرے شیطان صورت! — اب ساری عمر ڈنڈے بجاتے پھرنا نالائق!" سہ پہر تک غصہ فرو ہوا۔ سعید کے باپ ملنے آئے، معلوم ہوا کہ ان سب کے ہاں بھی ایسے ہی نوٹس پہنچے ہیں۔ سعید کے باپ سے گفتگو ہوئی تو میری جان میں جان آئی۔ والد صاحب فرما رہے تھے "دیکھئے اس ہیڈ ماسٹر کے دماغ کو واقعی لونڈوں نے چُگ لیا ہے یعنی اس روز ہم خود گئے اور لڑکوں سے معافی بھی منگوا دی اور وعدہ بھی کر لیا پھر آج رسٹی کیشن کا نوٹس بھیج دیا! اچھا معافی نامہ بھیجا ہے!"

"ہوں" سعید کے باپ نے کہا "ہم نے اسٹرائک میں تو یہ سمجھ کر دخل نہ دیا تھا کہ یہ لڑکوں اور ہیڈ ماسٹر کے درمیان معاملہ ہے مگر اب سب معاملے ختم ہو گئے اور یہ ہمارے ناک کے بال نوچ رہا ہے۔"

"اب ایسے کام نہیں چلے گا۔ لڑکوں کے بجائے خود ہمیں میدان میں اترنا پڑے گا۔ اب یہ چیز اسکول کی مجلس عاملہ نہیں عدالت دیوانی اور فوجداری طے کرے گی۔"

چوبیس گھنٹے کے اندر سازش پھیل گئی۔ سعید، شکیل، کاظم، یوسف حسین اور ظہیر کے باپ تو گویا ایک ہی ناؤ میں سوار تھے کیونکہ سب کا رسٹی کیشن ہوا تھا۔ والد صاحب اور ان سب نے مل کر شہر کے اندر کہیں بغض معاویہ اور کہیں حب علی کے سہارے ایک اچھی خاصی پارٹی عمائدین ہیڈ ماسٹر، سکریٹری اور چیرمین کے خلاف صف آرا ہو گئی۔ بات پہلے لوکل اخبارات سے چل کر صوبہ کے مشہور انگریزی اور اردو روزناموں تک پہنچی۔ ان لوگوں نے بیانات اور آڈیکلوں کے ذریعہ منیجنگ کمیٹی کو خوب خوب عریاں کیا، سکریٹری اور چیرمین کی اچھی طرح خبر لی اور ہیڈ ماسٹر کی بدعنوانیوں اور بد اخلاقیوں اور نالائقیوں کی تو ایک نئی فہرست ہر الیشوع میں نکلتی۔ پھر بھی جب نوٹس واپس نہ لئے تو براہ راست ڈائرکٹر آف ایجوکیشن اور گورنر تک وفد بنا کر پہنچے اور جب وہاں سے بھی کچھ تساہل ہوا تو اسکول کے آئین کی رو سے ہر مسلمان کو حساب دیکھنے کا حق تھا لہذا ایک بہشتی سے ہیڈ ماسٹر کے خلاف غبن اور خیانت مجرمانہ کا دعویٰ عدالت فوجداری میں کرا لیا اور عدالت دیوانی میں اپنی جانب سے استقرار یہ دعویٰ کیا کہ رسٹی کیشن خلاف قانون وانصاف قرار دیا جائے۔ ان دعووں کے بعد ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ حکام ضلع اور عمایدین شہر بیچ میں پڑے، ہیڈ ماسٹر کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ہمارے سرپرست اتنا شدید اقدام کر جائیں گے۔ معاملات نہایت تلخ صورت اختیار کرنے لگے۔ بہشتی کا استغاثہ نہایت سنگین تھا اور ہیڈ ماسٹر پر نہایت کھردری قسم کی ضرب۔ پریس کی بدبو اپنی جگہ پر علیحدہ تھی۔ ہیڈ ماسٹر کی حمایت میں سکریٹری اور چیرمین تھے اور ہاتھی کی ہاتھی سے ٹکر تھی۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کے یہاں سے نت نئی جواب طلبیاں ہو رہی تھیں۔ عمائدین شہر اور حکام ضلع نے مل کر معاملہ پنچایت میں ڈالا سررشتہ تعلیم کی جانب سے ایک کمیشن کا تقرر ہوا جو اسٹرائک اور اس کے بعد کے تمام واقعات کی تفتیش کر کے رپورٹ دے۔ کمیشن کے روبرو لمبی لمبی شہادتیں اور بیانات ہوئے۔ مقدمات عدالتوں سے واپس لے لئے گئے اور کمیشن نے گول مول رپورٹ دی۔ ہیڈ ماسٹر برقرار رہا اور ہم کو بھی اسکول میں داخل دے دیا گیا۔ رسٹی کیشن کے نوٹس واپس لے لئے گئے۔ ہم ساتوں کا اسکول میں آخیر سال تھا۔ سب کے باپوں نے نصیحت کر دی کہ ہیڈ ماسٹر سے کھٹ پٹ نہ ہونے پائے۔ ادھر ہیڈ ماسٹر بھی ہمارا لوہا مان گیا تھا۔ اور اسی طرح ڈیڑھ سال تک ہم لوگ اسکول میں کاٹ کر میٹرک پاس کر کے اسکول اور ہیڈ ماسٹر دونوں کو چھوڑ آئے۔

پچھلی مجلس درہم برہم ہو گئی تھی اور آٹھ سال بعد یونیورسٹیوں کی بھٹیوں سے نیا فولاد بن کر نکل آیا تھا۔ ظہیر پی سی ایس ہو گیا تھا اور ڈپٹی کلکٹر تھا۔ کاظم محکمہ زراعت کا اعلیٰ افسر تھا۔ سعید [illegible] سپرنٹنڈنٹ ہو گیا تھا اور یوسف [illegible] وکیل تھا۔ حسین اپنا خاندانی آبائی دکان پر بیٹھ [illegible] اور اسکولوں [illegible] شکیل [illegible] مسلم لیگ [illegible] کے سرگرم [illegible]

سلسلہ میں ایک ایک دو دو مرتبہ قید کاٹ چکے تھے اور اب سفید کھدر کا پاجامہ اور کالے کھدر کی اچکن پہنے کھوپڑی پر گاندھی کیپ منڈھے جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے اور ہم بارہ برس دلّی میں رہے بھاڑ ہی جھونکا۔ جتنا ہیڈ ماسٹر نے اسلامیہ اسکول سے پڑھا کر بھیجا تھا بس اتنا ہی پڑھے پڑھائے مسلم یونیورسٹی میں آٹھ برس پڑھ کر پلٹ آئے تھے البتہ بغاوت کے جو جراثیم اسلامیہ کالج سے لیکر گئے تھے وہ اچھی طرح کلچر ہو گئے تھے۔ اور گھر پہنچ کر شہر کے نیم سرکاری نیم قومی لیڈر بن بیٹھے تھے کیونکہ ادھر مسلم لیگ کے سکریٹری بھی تھے اور ادھر آنریری مجسٹریٹ بھی۔

ہم سات میں سے چار پھر جمع تھے، میں، حسنین، یوسف، اور شکیل۔ مگر چاروں کے راستے جدا تھے، حسنین سے کبھی مہینہ دو مہینہ پیچھے بازار میں ملاقات ہو جایا کرتی، یوسف سے کبھی عدالت دیوانی کی جانب جانا ہوتا تو ملاقات ہو جاتی۔ چلتے ہی چلتے علیک سلیک اور ایک دو جملہ ہو جاتا۔ بھائی شکیل کا سال میں چھ مہینہ جیل خانے کے اندر اوسطاً رہنا اور باقی چھ مہینے باہر جیل خانے جانے کی ترکیبوں میں گذرتے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تو میں تو مذاق کے موڈ میں آجاتا، اس کی سیاسی سرگرمیوں پر چوٹیں کرتا "وزیر اعظم بننے میں کتنے تاؤوں کی کسر ہے" دریافت کرتا۔ مگر وہ سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا اور میں کہتا "یار۔ مولوی تو تو بے حد بد اخلاقی کہتا ہے"

اور اس کی گفتگو خشک ہو جاتی۔ ایک بڑے دن کی تعطیل میں ظہیر، سعید اور کاظم جمع ہوئے اتفاق سے بھائی شکیل بھی ان دنوں باہر ہی تھے۔ میرے یہاں ایک دعوت میں سب مدعو تھے، کھانے کے بعد بریانی قورمے کھا کر جب یاران طریقت کی طبیعت ذرا موزوں ہوئی تو ظہیر صاحب کے نطق کے سُر کھلنے لگے۔ اور فرمایا "ارے یارو یہ ہیڈ ماسٹر جہاں کا تہاں آج تک شاہ آباد کا سا کھم گڑا ہوا ہے اور تم چاروں دنیا بھر کی فرصتوں اور فراغتوں میں اتنے مصروف ہو کہ ادھر نظر نہیں اٹھتی۔ اور پھر کاظم اور سعید کی بابت اشارہ کر کے کہا "بھائی ہم لوگ کیا کریں، اول تو اس پوزیشن میں نہیں۔ بندگی بیچارگی، نوکر پیشے، پھر تمہارے شہر سے دور، تمہاری پالیٹکس سے علیحدہ۔ مگر میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ تم چاروں کیا کرتے ہو اور یہ مولوی، یہ شکیل، بڑا سوشلسٹ، کمیونسٹ، جانے بنا پھرتا ہے۔ دنیا بھر کی لن ترانیاں ہانکتا پھرتا ہے اور یہ ایک اپنی قومی درسگاہ ہے، یہ نہیں کہ ذرا اس کی حالت سدھارے۔ اور یہ یوسف جگی وکیل بنا پھرتا ہے۔ بھئی قصبہ وکیلوں کو دیکھ کر تو رشک آتا ہے جیبیں بھری ہوتی ہیں، زبان آزاد ہے، ضمیر بے لگام ہے۔ ذرا دیر میں سیاہ کو سپید، سپید کو سیاہ کر دکھائیں، مگر یہ نہیں کہ اپنی ایک اسلامی درسگاہ ہے اس کی بابت توجہ کریں۔ اور میاں حسنین، آپ، آپ شاید ننانوے کے پھیر میں رہتے ہیں۔ پھر میری بابت اشارہ کیا اور آپ، آپ بے فیت کے حولدار ٹھہرے، آنریری مجسٹریٹ، اور مسلم لیگ کے سکریٹری، آپ شائد اونچی پالیٹکس کے قائل ہیں؟" اور اس کے مونہہ سے کاظم نے بات لے کر کہا "بھئی چیئرمین کے توجُہ لوزندہ ہوتے ہیں نسبہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہیڈ ماسٹر نے اس کی ممی بنا کر رکھدی ہے، اور سکریٹری بھئی اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔ بھلا یاد تو کرو جب ہم سب نویں کلاس میں تھے اس وقت ہم نے اسی ہیڈ ماسٹر اور اسی ورکنگ کمیٹی کے خلاف اسٹرائک کرائی تھی، اور آج تک اسکول کا وہی نظام چل رہا ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے دو ممبر مرے تو ان کے بیٹے ہو گئے۔ جیسے باپ کی میراث ہے سعید نے میری جانب اشارہ کیا اور کہا خیر وہ حسنین، وہ تو تجارت کرتا ہے اور یوسف وکیل ہے، مصروفیت بھی ہے۔ اور کام بھی اسی قسم کے ہیں مگر یار تم کیا کرتے رہتے ہو؟"

شکیل نے بات کاٹ کر کہا "میں بتاؤں، آپ، آپ حضرات کے میکش دن کے ناتی"۔ اب آپ کی مصروفیتیں سنئے۔ صبح سے دوپہر تک اناڑی مجسٹریٹی فرماتے ہیں یعنی وکیلوں اور اہل معاملہ کی چاپلوسیاں سنتے رہتے ہیں اور شام کو مجسٹریٹ ضلع اینڈ کمپنی کی چاپلوسی کرنے تشریف لے جاتے ہیں، یعنی خوشامدیں لادلاد کر اتارنا۔ جھوٹی سچی تجویزیں لکھ لکھ کر توشۂ آخرت سمیٹتے ہیں، اور اتوار کے اتوار شکار کھیلنے جایا کرتے ہیں۔"

اور ظہیر نے کہا "یہی تو میں کہتا ہوں کہ یا تو یہ عالم تھا کہ اسکول کی بیخ و بن اکھیڑ دینے پر تلے ہوئے تھے کسی زمانے میں یا آج یہ حالت ہے کہ تم چاروں ماشاءاللہ سب کچھ کر سکتے ہو اور کان میں تیل ڈالے بیٹھے ہو۔ اور بھائی ہم کیا کریں کسی قابل نہیں۔ اگر تمہاری پوزیشن میں ہوتے تو آج ایسا انقلاب برپا کرتے کہ یا تو اسکول کالج ہی بن کر رہتا ورنہ پھر۔۔۔

"اجی جب یہ چاروں اسکول کے لونڈے تھے تو جذبۂ انتقام اور مادۂ غیرت زیادہ تھا" کاظم نے کہا۔
سعید نے کہا "یہی تو میں کہتا ہوں، ان چاروں کی غیرتیں نہ معلوم کہاں اڑ گئی ہیں، ہم تو کبھی چھٹے چھمائے جب یہاں آنکلتے ہیں تو اسکول

کے اس ازلی نظام کو دیکھ کر ہمارے خون میں جھاگ اٹھنے لگتے ہیں۔ اور بھئی شاباش ہے تمہاری غیرتوں کو۔ اسکول کی چکی جوں کی توں چل رہی ہے اور تم چھاتی پہ مونگ دلوا رہے ہو۔"

اب ظہیر شکیل کی جانب متوجہ ہوا۔ "نہیں جی، مجھے تو اس شکیل پر آتا ہے۔ بھلا آپ سے پوچھئے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ بکرے کی سی یہ لمبی داڑھی رکھ لی ہے، سر سے پاؤں تک کھدر منڈھ لیا ہے، اور یہ موٹا سونٹھا ہاتھ میں لے لیا ہے اور ساری عمر جیل کی روٹیاں کھانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ تم جیسے بہت سے خادم ملک کے لئے موجود ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچتے ہو کہ اسکول کے ٹرسٹی بورڈ میں مناسب نوجوان داخل ہوں اور ورکنگ کمیٹی کی تشکیل ایسی ہو جو موجودہ تعلیم کے رجحان کو سمجھ سکے، روایاتی بوڑھے اسکول کے قیام پر جو داخل ہوئے ہیں تو آج تک نہ مرنے کا نام لیتے ہیں نہ نکلنے کا۔"

"ہاں سنا ہے کہ ہیڈ ماسٹر اقوار کے اتوار سکریٹری اور ورکنگ کمیٹی کے کچھ ممبروں کو گھر بلا کر ربڑی کباب کھلا دیتا ہے اور چیرمین اور کچھ ممبر کی جی حضوری سے احمق بناتا ہے۔ اپنے آپ نہ انتظام کر سکتا ہے، نہ پڑھانے لکھانے کی کوئی ایسی خاص قابلیت ہے اور سات سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہے۔ چار چپراسی اور بنگلہ ہے اور کیا کیا لوازمات" سعید نے کہا اور پھر شکیل کی جانب متوجہ ہوا "اور آپ لیڈری فرماتے ہیں، ملک کی اصلاح کی فکر میں گھلتے ہیں۔ لیڈر ہیں قومی لیڈر" اور ظہیر نے لقمہ دیا "جی ہاں آپ لیڈر واقع ہوئے ہیں۔ یقین مانیا یہ دس نمبریوں سے زیادہ پولیس کو پریشان کرتے ہیں۔ اور آجکل لیڈری بھی کیا کہئے کیا ہے۔ ہم کو تو دن رات انہیں سے پالا ہے۔" ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

شکیل نے جواب دیا "بے ایمان گدھو، تم مجبور ہو ایسی باتیں کرتے ہو۔ ذلیل روٹیوں سے پل رہے ہو نا، کہیں یہ بھی معلوم ہے کہ نہ معلوم میں کیسے اس شہر میں پڑا ہوا ہوں۔ یہ حسنین اور یوسف، یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ پچھلے لیگ اور کانگریس کے الکشنوں کے مقابلوں میں میری پوزیشن کتنی خراب کر دی ہے، آج تک آوارہ کتے میری شکل دیکھ کر بھونک پڑتے ہیں گلیوں میں لونڈے تالیاں پیٹا کرتے ہیں۔ بھلا میں اور اسلامیہ کالج کے متعلق کوئی بات! مجھ پر تو بھائی کفر کے سینکڑوں فتوے لگ چکے ہیں۔ ان تینوں سے کہو۔" میری جانب اشارہ کیا "یہ صاحب آنریری مجسٹریٹ، مسلم لیگ کے سکریٹری، خاندانی رئیس اور پشتینی خان بہادر۔" اور پھر یوسف کی جانب اشارہ کیا "آپ ماشاءاللہ وکیل، ابن وکیل۔ عدالت پر حاوی قانون کے چیلے، پبلک پر چھائے ہوئے۔ کیا نہیں ہیں" اور پھر حسنین کی جانب اشارہ کیا "اور حسنین میاں، ملک التجار، بازار کی رونق کے شہزادے، اور تو کچھ نہیں، جاؤ یہ تینوں کھڑے ہو جائیں کمربستہ ہو کر اور میں ایسی اسکیم بنا کر دوں جو ٹرسٹی بورڈ، سکریٹری شپ اور چیرمین تک ہی پہ چھا کر نہ رہ جائیں۔ جنوری میں سہ سالہ انتخاب ہو رہے ہیں۔ اگر اس وقت بھی کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہے تو سمجھ لو کہ ان مردوں پر تین سال کے لئے اور ہاتھ پڑ گئی۔ اور شاید پھر اس کے بعد تیسری کمیٹی میں ہیڈ ماسٹر کی پانچ سالہ توسیع کی مدت بھی ختم ہو رہی ہے۔ اس کا سوال اٹھے۔ بس ورکنگ کمیٹی میں ٹھکانے کے آدمی جو پہنچ جائیں اور اپریل تک سب مشینری بدل ڈالو"

ظہیر نے کہا "یار مولوی۔ تو بات بڑے پتہ کی کہتا ہے۔ تم تینوں یہ پرزے جھاڑ کر اٹھ بیٹھو اب کی مرتبہ"

"بھئی مجھ سے کہا بیکار ہے، میں میدان میں تو آ نہیں سکتا البتہ اندر ہی اندر جوڑ توڑ ایسے لگا دوں گا کہ ہم ہی ہم دکھائی پڑو گے ٹرسٹی بورڈ سے لیکر چیرمین تک۔ لو اب اپنی پارٹی ترتیب دو۔" شکیل نے کہا۔

آئین کے مطابق جو مسلمان یکمشت دو سو روپیہ کی رقم سکول فنڈ میں دیتا وہ تین سال کے لئے ٹرسٹی منتخب ہو جاتا ہے۔ "تھوڑا بہت خرچ کر و جیب سے اور اپنے اثر کے ٹرسٹی ہم جاؤ بورڈ دا داخل۔ ٹرسٹیز پر قبضہ ہوتے ہی سمجھ لو کہ آگیا اسکول ہاتھ میں" سعید نے کہا اور شکیل نے لقمہ دیا "ہاں میں تو نہ معلوم کب سے بھونک رہا ہوں، پچھلا الکشن ہاتھ سے نکال دیا، خواہ مخواہ کا جمود ہے بس۔"

نئے انتخاب کا وقت آیا ہماری پارٹی بڑے زور شور کے ساتھ اٹھی۔ شکیل نے اپنی ناکام سیاست کے پورے پورے ہتھکنڈے ہماری پشت پر آ کر استعمال کئے۔ خوب خوب جوڑ پھیر کئے، پرانوں اور نئیوں کا ایسا اکھاڑہ پہلے کا ہے کو ہی دیکھنے میں آیا ہوگا، خود شکیل اب تک پس پردہ تھا، مگر جب وہ سامنے آیا تو پچھلے آدمی درجن کفر کے فتوے پھر سے چمک اٹھے۔ مگر ہم نے بجائے رائے عامہ کے ڈھائی سو روپیہ اسکول فنڈ میں دے کر

بورڈ آف ٹرسٹیز میں شامل کر ہی لیا۔

بورڈ آف ٹرسٹیز میں شامل ہو کر مجلس عاملہ کے انتخاب کے وقت شکیل نئے روپ میں آیا۔ کل ورکنگ کمیٹی بیس افراد پر مشتمل تھی، جس میں گیارہ محض شکیل کی سیاسی قابلیت کے زور سے ہماری پارٹی میں آپہنچے۔ میں چیئرمین منتخب ہوا، تمام اسلامیہ اسکول کے نظم و نسق میں انقلاب رونما ہو گیا، جن جگہوں پر لمبی سفید اور سرخ داڑھیوں والے بزرگ بیٹھا کرتے تھے ان پر داڑھی مونچھ صفاچٹ کوٹ پتلون والے نظر آنے لگے اور تقریباً نصف درجن تو ایسے قدیم بت ٹوٹ گئے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔

تین ماہانہ اجلاس ہو چکے تھے اور اپریل کے پہلے ہفتہ میں چوتھا اجلاس تھا جس میں ہیڈ ماسٹر کی ینجب۔ لہ توسیع کا ریزولیشن یقینی پیش ہونا تھا۔ اس خصوص میں ہماری اپنی پارٹی کے گیارہ ممبروں میں سے تین ممبر اختلاف کر رہے تھے۔ شکیل انہیں مدتوں سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسٹر کی تعطیل کے ساتھ چند چھٹیاں اور مل گئی تھیں اور تعطیل کے آخیر دن مجلسِ عاملہ کا اجلاس تھا۔ ظہیر، سعید اور کاظم تعطیل میں گھر آئے تھے۔ پوری چکڑی جمع تھی اور تمام چھٹیاں ہم ساتوں کو اسی تگ و دو میں گذری تھیں اور شکیل کا تو یہ عالم تھا کہ دن رات برابر تھے، خواب و خور حرام تھا، رات کے کسی بھی حصہ میں کہیں کنویسنگ کرتا پایا جا سکتا تھا، اپنے اپنے دائرہ اثر میں ظہیر، سعید اور کاظم بھی چپکے چپکے کام کر رہے تھے، حسنین، یوسف اور میری تو کچھ پوچھئے ہی نہیں جس صبح کو کمیٹی ہونے والی تھی اس رات کو حسنین کے یہاں ہم سب ایک مخصوص دعوت میں جمع تھے۔ شکیل کی طبیعت آج ذرا جولانی پر تھی — ہیڈ ماسٹر کے خلاف وہ ان تینوں ممبروں کو ہموار کر چکا تھا۔ کھانے کی میز پہ باتوں کی جھڑی لگائے پڑا تھا۔ امپیریلزم، کمیونزم، اور نہ معلوم کون کون ازم، خود ہی سوال خود ہی جواب، بولنے کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ اور اخیر پہ انقلابی فلسفے پر بڑی پر زور تقریر سی کرنے لگ گیا۔

ظہیر نے کچھ اکتا کر بات کاٹی "یار شکیل تو نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا، یہ کھدر منڈھ کر اور داڑھی چھوڑ کر" اگر مسلم لیگ میں ہوتا تو بڑے کام کا آدمی تھا مسلمانوں کے لئے" یہ شکیل نے طنزیہ سنجیدگی سے برجستہ جواب دیا" اور اگر تمہاری طرح ڈپٹی کلکٹر ہوتا یا ان کی طرح آنریری مجسٹریٹ اور مسلم لیگ کا سکریٹری دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہوتا تو گورنمنٹ اور مسلمانوں دونوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہوتا۔ ایں؟" ایک قہقہہ پڑا، ظہیر نے جھینپ اتارتے ہوئے شکیل کی پیٹھ ٹھونک کر کہا "خیر کچھ بھی ہو ہے ہمارا بھائی پکا لیڈر بس کاٹے کا منتر نہیں۔ دیکھو جی کاظم، وہ بڈھے میاں نہ میرے ہاتھ آئے اور نہ یوسف کے اور اس نے نہ معلوم کان میں کیا منتر پھونک دیا کہ بس چٹکیوں میں رام ہو گئے۔

یوسف نے لقمہ دیا" ہاں بھائی۔ وہ تو کچھ انہیں کا کام تھا، ایسا شیشہ میں اتارا کہ حیرت ہو گئی۔ آج شام کو پرانے چیئرمین اور نہ معلوم اور کون کون انہیں کے گریڈ کے باپ دادا قسم کے بوڑھے جمع ہو کر پہنچے، خدا رسول قرآن حدیث سب ہی واسطے دئے مگر انہوں نے صاف جواب دے دیا۔"

میں نے کہا" ارے میاں ایک وہی کیا، شروع سے ظہیر ہم لوگ تو یہاں پر تھے نہیں کیا کیا تفاصل بیان کروں؟ شکیل نے بورڈ آف ٹرسٹیز بنا کر پھر جو مجلس عاملہ کی تشکیل میں کام کیا ہے۔ واہ! طبیعت خوش ہو گئی۔ کہ اب سائنٹفک انداز اگر سیاسیات میں اختیار کیا جائے تو ملک جنت ہو جائے اور قوم فرشتہ۔"

"ہوں ہم سمجھ گئے۔ چٹ کر گیا مولوی (شکیل) ہیڈ ماسٹر کو" حسنین نے کہا

ظہیر نے کہا" ارے یار اب تک پر دائی چلتی ہے تو کھنڈ پڑی کلاتی ہے۔ یاد کرو تیسری سے آٹھویں تک سب ہی کی روزانہ مرمت ہوا کرتی تھی۔"

"مگر ہم ساتوں تھے بھی تو نہایت شریف النفس اور نیک بخت" شکیل نے کہا

" ارے یار کچھ ہماری ہی چکڑی شریر نہ تھی۔ اسکول میں ہم سے پیچھے، رشید، رضی حیدر اور زاہد جیسے نیک اور سید ھے حضرات تھے جن کے آگے شیطان زانوئے ادب تہ کرتا۔ اور ہم سے آگے صفدر، بشیر، نصیر اور ظریف جیسے شریف اور اللہ والے بزرگ تھے، جن سے ابلیس سبق لیتا۔ مگر یار وہ تو اسکول بھر کی شرارتوں کا ہم ہی ساتوں کو ذمہ دار ٹھہرا تا تھا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ ہر قتل کا ایک گناہ قاتل پر اور دوسرا قابیل کی گردن پہ رکھا جاتا ہے، اسکول بھر میں کہیں بھی کوئی شرارت ہو، ہمیں خواہ دور کا بھی واسطہ نہ ہو مگر ہم پہ ہو رہی ہے۔ اور کچھ نہیں ادھر ادھر آتے کہیں اک ذرا جھلک نظر پڑ جائے اور مالو دو چار بیت انتظاماً پڑ گئے خواہ مخواہ"

"اور وہ یاد نہیں اس سال، اور کچھ بن نہ آئی تو ہم ساتوں کے ششماہی امتحان کے رزلٹ شیٹ پر چال چلن کے خانہ میں (FAIR) لکھ دیا۔"

"ہاں یار اور دیکھو کتنے اچھے نمبر تھے ہمارے، کسی کی ہمت رزلٹ شیٹ گھر دکھانے کی نہ ہوئی۔"

"اور وہ بھول گئے۔ اسکول بھر کے نوسو طلباء میں سے کوئی شرارت کرے، کسی کا پبلک کٹنگ ہو مگر ہم پر ملاحیاں ضرور پڑتیں خواہ معاملہ سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا۔"

"اور انگریزی کے جواب مضمون والا قصہ یاد ہے نویں جماعت میں؛ میرا مضمون شکیل تمہیں یاد ہوگا کتنا اونچا تھا؟ اور انعام دلوایا اس نالائق عرفان کو جس کے مضمون میں تین چار تو گرامر کی غلطیاں تھیں۔" "جی ہاں خوب یاد ہے۔ ویسے یہ بات نہیں ہے کہ وہ ہمیں اسکول کے زمانے میں مارا کرتا تھا، ہماری تذلیل کیا کرتا تھا، چھٹیاں کاٹ لیا کرتا تھا۔ خواہ مخواہ ہمارے چال چلن خراب لکھ دیتا تھا، یہ تو خیر بچپن کی باتیں ہیں۔ اور ہمیں ان کے ضمن میں نہیں سوچنا چاہیئے، اب ہماری پوزیشن لیڈر والی ہے اور ہم قوم کے امین ہیں۔ یہ اتنا بڑا قومی ادارہ ہمارے ہاتھ میں ہے اور پچھلی مجلس عاملہ اور چیرمین سیکریٹری کے زمانہ سے عادتیں بگڑی ہوئی ہیں، اور میاں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہماری مخالف پارٹی کا پروردہ آدر وہ ہے لہذا ہم نہیں رکھتے۔"

میں نے کہا "مگر یار شکیل جب سے میں چیرمین ہوا ہوں کام بہت قاعدہ میں کر رہا ہے۔ اور مجھے جھک کر سلام کرتا ہے ایک حرکت پر مجھے بعد کو افسوس بھی ہوا۔ اس عید پر مجھ سے ملنے گھر آیا، میں نے گھنٹہ بھر تو منتظر رکھا، دیوان خانہ میں مونڈھے کے اوپر بیٹھا سوکھتا رہا۔ گھنٹہ بھر بعد نکلا تو بجائے گلے ملنے کے ہاتھ ملایا، اور کھڑے ہی کھڑے دو تین منٹ انگریزی میں بات کی اور رخصت کر کے اندر چلا آیا۔" سب نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور حسنین نے کہا "یار یہ تم نے برا کیا، جو کوئی گھر ملنے آئے اس سے اخلاق کے ساتھ ملنا چاہیئے۔"

"سب بیکار ہے۔ نری منافقت" شکیل نے جواب دیا "میں پوچھتا ہوں عید تو ہر سال ہوتی ہے۔ اب تک کسی عید کو ہیڈ ماسٹر صاحب ان سے ملنے کیوں نہیں آئے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ ان سے نہیں بلکہ چیرمین سے ملنے آئے۔ لہذا جو برتاؤ ایک ماتحت کے ساتھ ذرا بورژوا کریٹ قسم کے (BOSS) کو کرنا چاہیئے انہوں نے کیا۔"

"نہیں جی میرا مطلب یہ تھا کہ عید کے دن سبھی آتے ہیں چھوٹے بڑے۔ اور مسلمان سے مسلمان برابر ہے"

"میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ امسال چیرمین ہونے کے بعد مسلمان ہوئے، اس سے پہلے مسلمان نہ تھے یا ہیڈ ماسٹر ان کے چیرمین ہونے کے بعد مسلمان ہوئے؟ ظاہر بات ہے کہ وہ ماتحت افسر والا سوال رہ جاتا ہے اور تم نے ٹھیک کیا جو اس طرح برتاؤ کیا۔"

"اجی وہ اب خواہ عید ملنے آئیں یا بقر عید، یاروں پر رنگ چڑھنے والا نہیں، چھوڑ نہیں سکتے ہم انہیں۔"

"کل ہی کمیٹی میں ریزولیشن پاس ہوتے ہی سیکنڈ ماسٹر کو چارج دلواؤں گا" میں نے کہا اور شکیل نے یوسف سے مخاطب ہو کر میری بات کی مزید تصدیق چاہی۔

"ارے یوسف تم نے قواعد و ضوابط دیکھ لئے ہیں کچھ اپیل وپیل یا پہلے سے نوٹس وغیرہ کی تو صورت نہیں پیدا ہوتی؟"

"بھئی وہ تو کھلی بات ہے۔ اپیل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کمیٹی کی کثرت رائے کے فیصلہ پر چیرمین کے دستخط ہوں گے اور بس یہی چیز اخیر اور قطعی ہے۔"

"مگر ایک قانونی نکتہ رہ جاتا ہے، ایجوکیشنل کوڈ کے تحت بغیر ایک مخصوص مدت کے نوٹس کے علیحدگی عمل میں نہیں آسکتی۔"

"مگر علیحدگی یا برخاستگی کب ہے؟" یوسف نے بات کاٹ کر کہا "دیکھئے اسکول کے کانسٹی ٹیوشن میں یہ چیز ہے کہ ہر پانچ سال بعد ہیڈ ماسٹر کو مجلس عاملہ کی کثرت رائے سے توسیع ملنا چاہیئے۔ اگر کمیٹی توسیع نہیں دیتی تو اس میں اپیل یا مرافعہ کی کیا گنجائش ہے؟ البتہ اگر بغیر کسی معقول وجہ کے برطرف کیا جائے گا تو ڈائریکٹر تعلیمات یا وزیر تعلیم تک معروضہ پیش کیا جا سکتا ہے۔"

"ہوں، میں سمجھ گیا۔ اور یہ تو گویا ہر پانچ سال بعد کمیٹی ان کا نئے سرے سے تقرر کر دیتی ہے۔" میں نے کہا "ویسے میں نے پچھلے دو تین ماہ سے اکاؤنٹ بھی بہت کھنگالے، کیونکہ شہر میں تو ہر قسم کی افواہیں تھیں کہ غبن ہے، مگر اکاؤنٹ بالکل صاف ہے۔" شکیل نے کہا "یار یہ شہر تیں بھی

ہم ہی لوگوں کی پھیلائی ہوئی تھیں۔ سب الکشن اسٹنٹ۔ آج اسکول پر ہم قابض کیسے ہو جاتے؟" ظہیر نے کھانے سے ہاتھ کھینچ کر کہا "دیکھو یار، باتوں ہی باتوں میں پیٹ سے اوپر کھا گئے۔ اور مولوی یار تو تو ہضم کر جائے گا یہاں ....."

"ہاں یار اب میں چلوں گا۔ یہ تو مرغا تھا، تو کل ہیڈ ماسٹر کو ہضم کر جاؤں گا" شکیل نے کہا اور فرمائشی قہقہہ پڑا۔ ظہیر نے کہا "تو اب سوقت رات میں کہاں جا رہے ہو؟"

شکیل نے جواب دیا "یہاں پہلی چیز تو ایک اصولی کام ہے یعنی جس صبح کو الکشن ہو اس سے قبل رات میں فرداً فرداً ہر ووٹر سے ملنا چاہیئے۔ دوسری چیز وہ دونوں ممبر ہیں، ہمارے ساختہ پرداختہ اور ہم زبان، لیکن ذرا ہیڈ ماسٹر کو علیحدہ کرنے کے معاملہ میں پس و پیش کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی مسلمان کو روزی سے اتارنا ـــ ہوں۔ اور کوئی بات نہیں ہے، ابھی جا کر ٹھیک کئے دیتا ہوں، ویسے خلاف نہیں جا سکتے۔"

میں آج بہت صبح بیدار ہوا۔ آج سے بارہ سال پہلے بھی آج کی سی ایک صبح طلوع ہوئی تھی، اور اس صبح کا جو خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوتے رہ گیا تھا آج اس کی تعبیر سامنے تھی...... مجھے اسٹرائک کا دن یاد آ گیا۔ بارہ سال پیشتر والا قیامتِ صغرٰی لے کر طلوع ہونے والا دن کسے معلوم تھا کہ اس کام کی تکمیل کے لئے آج کی ساعت قدرت کی جانب سے مقرر تھی۔ پُر اشتیاق نگاہوں سے آج کی ورکنگ کمیٹی کا ایجنڈا دیکھنے لگا۔ اور یہ ایجنڈے کی پہلی مد ہیڈ ماسٹر کی توسیع سے متعلق تھی۔ خوشی اور جوش کے مارے میرا دل اچھل رہا تھا۔ کمیٹی کا وقت ٹھیک گیارہ بجے تھا مگر میں دس بجے تک تیار ہو گیا۔ بہترین ٹراپیکل سوٹ پہنا، بار بار آئینہ کے سامنے تن تن کر اور پہلو بدل بدل کر رعب دار پوز دیکھے، جیسے کوئی نوجوان فوجی کپتان کسی مہم پر جاتے ہوئے دیکھتا ہوگا۔ کپڑے بدل کر ناشتہ کیا اور گیرج سے کار نکلوا کر خود اسٹیرنگ پر جا بیٹھا۔ اسکول کے پورٹیکو میں ہیڈ کلرک اور چپراسی استقبال کو کھڑے تھے۔ بڑی شان کے ساتھ ان کے جلو میں جھومتا اینڈتا ہال میں داخل ہوا۔ ورکنگ کمیٹی کے تمام اراکین اپنی نشستوں میں تھے۔ اور بہت سے پبلک کے لوگ پچھلی نشستوں پر۔ اور میں نے ڈائس پر پہنچکر غائر نگاہ سے جائزہ لیا تو ظہیر، سعید اور کاظم کے چہرے پبلک کی نشستوں میں سب سے پچھلی سیٹوں پر سے جھانکتے نظر آئے۔ اب میں نے اپنے ہاؤس کو پڑتالا۔ اور اپنے دائیں بائیں کی سیٹوں کا جائزہ لیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ کل اٹھارہ ممبران حاضر تھے، نو میرے دائنے بازو پر اور نو ہی بائیں بازو پر۔ اور وہ بڑے میاں جو ہیڈ ماسٹر کو نکالنے کے خلاف تھے غائب ہیں اور شکیل بھی نہیں ہے۔ کارروائی شروع ہونے میں آٹھ منٹ رہ گئے اور شکیل، اور ان کے وہ بڑے میاں غائب رہے تو مجھے یک گونہ خلفشار سا ہوا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پھر بھی سناٹے کی حد تک سکون تھا۔ سامنے بلندی پر لگے ہوئے کلاک کی ٹک ٹک بڑی واضح سنائی دے رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر کی توسیع کے مؤید اراکین میرے بائیں ہاتھ کی نشستوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ ذرا سہمے سہمے سے، آج بیس سال پرانا چھ سات سو روپیہ ماہوار کا تنخواہ دار میری ایک جنبشِ قلم پر درہم برہم ہونے والا تھا۔ "بھلا اتنی تنخواہ اب کی جگہ کوئی گورنر بھی نہیں دے سکتا" میرے دل میں خیال آیا اور میں نے فخر کے ساتھ جیسے اپنے مضبوط بازوؤں پر ہاتھ پھیر کر سینہ پھیلایا، گردن آپ ہی آپ خم کھا گئی اور میں پہلو بدل کر اپنی بلند و بالا کرسی پر ذرا ترچھا ترچھا سا ہو گیا۔ میٹنگ کی کارروائی شروع ہونے میں اب تین منٹ رہ گئے تھے۔ اور مجھے شکیل پر غصہ آ رہا تھا، "اس بوڑھے کھوسٹ کے چکر میں خود بھی ہاتھ سے گیا!" ایجنڈے کی پہلی مد بھی یہی ہے اور آج اس میٹنگ کا ہر کام بہت ضابطہ اور آئین کے بالکل مطابق ہونا چاہیئے۔ پھر اپنے ان نو میں بھی دو اراکین ایسے تھے جنھیں بڑی کوشش اور اتار چڑھاؤ کے بعد شکیل ہیڈ ماسٹر کے خلاف استعمال کرنے کے لئے تیار کر سکا تھا۔ ڈر لگتا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں نہ معلوم ان کے مونہہ سے کیا نکلے اور مجھے ان دونوں پر شکیل کی موجودگی کے بغیر ذرا بھی بھروسہ نہ تھا، ورنہ بظاہر نو اور نو کے توازن میں میرا کاسٹنگ ووٹ کافی تھا۔

گھڑی نے ٹن ٹن گیارہ بجائے اور سکریٹری نے بآوازِ بلند ایجنڈا پڑھا۔ ساتھ ہی ایک کلرک دوڑتا ہوا آیا اور اس نے مخل ہو کر آہستہ سے مجھ سے کہا "سرکار وہ شکیل صاحب گرفتار ہو گئے۔ راستہ میں ایک تقریر کے سلسلہ میں ان کا وارنٹ تھا، دو تین دن سے پولیس تلاش میں تھی۔"

"اچھا، گرفتار! ایں!!" میں نے مخصوص انداز میں کہا اور اس نے پھر کہا "ہاں سرکار، آپ کے یہاں آنے کے بعد سعید صاحب اور کاظم صاحب نے چپکے سے مجھے ان کی تلاش میں دوڑایا تھا اور وہ مجھے مع ان بڑے میاں حاجی صاحب کے راستہ میں آتے مل گئے، تانگے پر ہی بھی اگلی سیٹ پر ٹنگ گیا۔

بازار سے تانگا نکل کر جوں ہی ہسپتال کے قریب پہنچا راستہ میں ایک تھانہ دار اور چار سپاہیوں نے روک لیا، مجھکو اور حاجی صاحب کو تانگے سے اتار دیا، اور شکیل صاحب کو وارنٹ دکھا کر اسی تانگے پر واپس لے گئے کوتوالی"۔

"پھر تم حاجی صاحب کو کیوں نہ ساتھ لے آئے"۔

"سرکار میں نے ان سے بہت کہا مگر وہ بغیر شکیل صاحب کے تیار نہ ہوئے اور پلٹ گئے"۔ کلرک نے کہا۔ میں نے اپنے چہرہ پر بڑھتے ہوئے انتشار کو روکا۔ حالات کا جائزہ لیا تو آئین کی رو سے التوا اور گریز فرار کی بھی گنجائش نہ تھی کیونکہ کورم پورا تھا اور جلسہ کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ پھر یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ تین اراکین جو ضدا تذبذب میں تھے کہیں پھر نہ جائیں یا اٹھ کر ہی چل نہ دیں۔ یہ اندازہ کر کے کہ تمام مجمع میں یہ خبر گشت کر رہی اور چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، میں یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور ہاؤس اور پبلک کے سامنے اپنی پوری لسانی قوتیں مجتمع کر کے ہیڈ ماسٹر کے خلاف نہایت پُر جوش اور پر زور تقریر کی اور اسی ڈائس پر اسی ہال کے اندر بارہ سال پچھلی تاریخ دہرا دی۔ تمام ہاؤس مرعوب ہو گیا۔ سب حاضرین حتیٰ کہ ہیڈ ماسٹر کے ہمدرد پارٹی والے بھی ایک مرتبہ کو ہل گئے۔ حالانکہ اسکول اسٹاف کے کسی ممبر کو میٹنگ میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جس طرح اپنے زمانہ میں ہیڈ ماسٹر کی آہٹ پا کر ہم لوگ کسی الماری، پکھے، یا کوریڈر کی آڑ لیکر دبک جایا کرتے تھے، اسی طرح ہیڈ ماسٹر گیلری کے اندر ایک گھونگھٹ کی آڑ لئے اپنی بوڑھی تقدیر کا فیصلہ سننے کو چھپا کھڑا تھا، اور یہ گھونگھٹ ڈائس کے عین سامنے تھی۔ یوسف آج اسکول کمیٹی کے آئین پر خوب تیار ہو کر آیا تھا۔ اسی نے ریزولیشن کی تحریک کی اور توسیع نہ دینے کی رائے دی حسنین نے برجستہ تائید کی اب معاملہ رائے شماری کی کسوٹی پر آ گیا۔ نو ہاتھ ہیڈ ماسٹر کے توسیع دینے اور نو ہی توسیع نہ دینے کے لئے اٹھے۔ مجھے اطمینان ہوا، یوسف اور حسنین کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، شکیل کی عدم موجودگی کے باوجود ان دونوں ممبران نے ہمارے ساتھ ہاتھ اٹھائے تھے جو ہیڈ ماسٹر کو نکالنے کے خلاف تھے۔

اور پھر سناٹا ہو گیا موت کا سا سناٹا! ہیڈ کلرک نے شمار کر کے منٹ بک پر روئداد لکھی نو کے مقابلہ پر نو۔ معاملہ میرے ووٹ پر تل گیا۔ روئداد لکھنے کے بعد ہیڈ کلرک نے کاسٹنگ ووٹ لکھنے کیلئے میری جانب منٹ بک بڑھائی۔ اور میں نے قلم اٹھا کر محاکمہ کے لئے بڑھایا۔ ایک گہرا سانس لے کر اک ذرا ٹھہرا۔ نگاہ سامنے اٹھ گئی گیلری میں ہیڈ ماسٹر کھڑا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں اس وقت بھی مرلی بوڑھا بدن ضابطہ کا اسٹیچو بنا ہوا تھا۔ گردن کا خم، اور ابرو کا چڑھا چڑھا انداز جوں کا توں۔ آنکھوں میں سے بیک وقت سحرا اور اعجاز کے شرارے اور پھول سے چھن رہے تھے۔ جھریوں دار پیلا مٹیالا چہرہ بدستور جلال و جمال کا آئینہ دار تھا۔ سفید چاندی سے دمکتے بالوں والا سر جیسے کا تیسا نہ جھک سکنے والی گردن پر بلند تھا اور تمام وجود پر ویسا ہی شاہانہ اطمینان کا لبادہ تھا۔

میرا قلم کاغذ کے اوپر کچھ دیر ہوا میں ڈنگا ڈولتا رہا۔ مخالفین کے خانہ کی جانب گیا اور بغیر کاغذ پر ٹکتے ہوئے جیسے پلٹ آیا اور ذہنی رستخیز میں نگاہ کاغذ سے ہٹ کر پھر سامنے گئی اور ہیڈ ماسٹر جوں کا توں سامنے آ گیا۔ نگاہ جھک گئی اور قلم جیسے مقناطیسی قوت سے مؤیدین کے خانہ پر جا کر ٹک گیا!

★ غزل

مشتاق مبارک

حسن و جوانی کے جب قصے چھڑ جاتے ہیں یاروں میں
نغمے ہی نغمے جاگ اٹھتے ہیں ہر بربطِ دل کے تاروں میں

کہنے والے جو بھی کہیں اب عشق ہمارا کام نہیں
ہم نے سنا ہے ذکر ہمارا ہوتا ہے مہ پاروں میں

•

کس کو سنائیں کون سنے گا جو کچھ ہم پر بیت گئی
دل میں تھا ارمان گلوں کا دامن الجھا خاروں میں

کیف افزا نظاروں کا حاصل ہیں تمہارے ہی جلوے
تم جو نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے کیف حسیں نظاروں میں

•

لالہ رخوں کی یاد کبھی جب آتی ہے تنہائی میں
ہوتی ہے محسوس اچھوتی ٹھنڈک سی انگاروں میں

نظروں کو جب کوئی جھکا کر پرسشِ غم فرماتا ہے
آ جاتی ہے جان مبارک سچ مچ غم کے ماروں میں

•

(ناول کا ایک باب)

روشنیوں کا شہر

ابن سعید

"سی۔ اے۔ ٹی! کیٹ، کیٹ معنی بلی!" ——— "آر۔ اے۔ ٹی! ریٹ، ریٹ معنی چوہا!"

"——— لے آواز اونچی کرکے۔ بلی کے بچے! ———"

ایک لامتناہی گونج جو گرد سے اَٹے ہوئے اس ہال میں پھیلی ہوئی تھی: ملی جلی بے سری آوازوں کا ایک مبہم کورس جو کبھی کبھی ایک بلند گونج بن کے رہ جاتا اور پھر کبھی کبھی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو کے رہ جاتا! ———

اس ہال میں گرد و غبار سے اَٹے ہوئے لاتعداد نیچے نیچے ڈیسک رکھے ہوئے تھے۔ ان کی سطح نیلی روشنائی کے دھبوں اور چاقوؤں سے کھودے ہوئے حروف اور نقش و نگار کی بدولت بالکل بدرنگ اور کھردری ہو کے رہ گئی تھی، اور ان ڈیسکوں کے ارد گرد پھٹے ہوئے کناروں والی میلی، داغ دار دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ جب کبھی گرمی کے موسم میں چھت میں آویزاں جھالردار پنکھے چوں چوں کا ورد شروع کر دیتے اور پنکھوں کی ہوا گرم لُو سے جھکولوں کی طرح تمام ہال میں گردش کرنی شروع کر دیتی، تو ان بدرنگ، میلی، داغ دار دریوں کے یہ کنارے پھڑپھڑانے لگتے جیسے وہ یوں ایک بے وجہ احتجاجی شور بلند کرنے پر تلے ہوں، اور ان دریوں پر آلتی پالتی مارے، بے تنظیم قطاروں میں، کم عمر لڑکے بیٹھے ہوئے مسلسل کسی نہ کسی سبق کا ورد کرتے رہتے:۔

"سی۔ اے۔ ٹی! کیٹ معنی بلی!"

"——— آر۔ اے۔ ٹی!" ———

ان لڑکوں کی صورتیں کم عمری میں ہی مسخ ہو گئی تھیں اور ان کے چہروں کی رنگتیں گدلی گدلی زرد زرد تھیں۔ اور ان کے کپڑوں میں ہمہ وقت ایک بوسیدہ بوسیدہ بدبو سی رہتی، جو دریوں کے تعفن کے ساتھ مل کر ہال کی فضا کو اور بھی بوجھل بنا دیتی۔ ان لڑکوں کی آنکھیں بے نور اور بجھی بجھی سی تھیں جو غالباً اس بے سروسامانی کا پتہ دیتیں جو ان لڑکوں کو اپنے ورثے میں ملی تھی اور جس سے ان لڑکوں کے گھرانوں کی کئی پشتیں بخوبی واقف تھیں۔ وہ بے سروسامانی ہی ان لڑکوں کا اصل منبع اور مسکن تھی، اسی بے سروسامانی میں ہی وہ جنم لیتے، پلتے، بڑھتے۔ میونسپل کمیٹی کے قائم کردہ سکولوں میں گرد اور غلاظت سے اَٹی ہوئی دریوں پر آلتی پالتی بیٹھ کر "سی۔ اے۔ ٹی، کیٹ! اور آر۔ اے۔ ٹی!" کا سبق سینکڑوں بار دہراتے، اور پھر اُس اندھا دھند، بے تحاشہ ریلے میں گم ہو کے رہ جاتے جس کا نام دلی تھا، جس کا نام ہندوستان تھا، جس کا نام ایشیا تھا۔

کبھی کبھی کوئی لڑکا اپنے چہرے کے معصوم خد و خال اور بھولی بھولی آنکھوں کی بدولت باقی تمام جم غفیر سے جداگانہ نظر آتا اور اپنے تن کے کپڑوں کی بوسیدگی کے باوجود، اپنے چہرے کی رنگت کے پھیکے پن کے باوجود، ایک طرح کی جاذبیت لئے ہوتا اور سکول ماسٹر اس لڑکے کو اپنے ڈیسک کے سب سے قریب حصہ میں بچھی ہوئی دری پر جگہ دیتے، وہ کہتے۔ "دیکھو۔ زید۔ بکر۔ عمرو! تم یہاں بیٹھا کرو۔ ہاں پڑھو تو بیٹا۔ "سی۔ اے۔ ٹی!" ——— اور وہ بھولی بھولی سہمی ہوئی نظروں والا کچھ خوف زدہ ہو جاتا، وہ سوچتا کہ نہ جانے اس کو اپنے ساتھیوں سے ممتاز جگہ پر کیوں بٹھایا گیا ہے اور نہ جانے سکول کا ہاف ٹائم ہوتے ہی اس کے ہم جماعت لڑکے اس کے گھٹے ہوئے سر پر دھولیں کیوں جمانے لگتے ہیں۔ اور نہ جانے یہ ماسٹر صاحب جو سب کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اس سے کبھی کبھی مسکرا کے بات کیوں کرتے ہیں۔ اور ماسٹر صاحب کہتے:——— بیٹا تم سکول کی چھٹی ہو جانے کے بعد جماعت میں ٹھہرے رہنا، میں تم کو آج کا سبق پھر پڑھاؤں گا، محنت کرو، ورنہ فیل ہو جاؤ گے! ——— اور اگر وہ زید، بکر یا عمرو (جو کوئی بھی وہ ہوتا!) اس بات پر کچھ خائف ہو جاتا تو ماسٹر صاحب اور حربے استعمال کرتے، وہ اپنی بید کی لمبی چھڑی کو لچکا لچکا کر اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے۔

"سنی تھی تاوہ بات، جو تیرا باپ کہہ گیا تھا کہ ہڈی پسلی ہماری اور گوشت پوست تمہارا، کھال ادھیڑ کے رکھ دیتا ہے یہ میرا مولابخش!"
مولابخش ماسٹر صاحب کا سب سے لمبا، سب سے مضبوط، سب سے ظالم بید تھا اور وہ اس قسم کے لڑکوں پر کئی پشتوں سے استعمال ہو رہا تھا! شاید، بکر یا عمرو کا باپ بھی اس بید کی چوٹ سے واقف تھا، اور اگر پرائمری سکول کے زمانے میں کوئی لڑکا دو ایک مرتبہ بھی مولابخش کی مار سے واقف ہو جاتا تو وہ تمام عمر کے لئے اس تجربہ کو یاد رکھتا۔

"تو ا ۔۔۔" ماہل نے اپنے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے گلاس کو اپنی انگلیوں سے نچاتے ہوئے کہا۔ "تو میری دوست، آئیلین! میں تو لڑکوں کی اس پود میں سے ہوں جنھوں نے انگریزی کا پہلا سبق پھٹی ہوئی 'دا غدار' پھڑ پھڑاتے ہوئے کناروں والی دریوں پر بیٹھ کر مولابخش کی لچک کے سائے میں پڑھا تھا۔ اور اسی لئے، میری عزیز دوست آئیلین، میرا تمہارا ساتھ آج شام میوزیم میں کوونٹری (COVENTARY) کے نئے گرجا کی جدید طرز کی کھڑکیاں دیکھتے وقت نہیں ہوا تھا بلکہ اب سے بہت پہلے، ہوا تھا، جب کہ میں کنگ ریڈر کی مدد سے انگریزی پڑھنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور تم غالباً دو چوٹیاں لٹکائے معصومیت کے ساتھ اپنی اماں کے ایپرن سے لگی پھرتی ہوگی!"

آئیلین، جو بار کے قریب ایک اونچے سے سٹول پر بیٹھی اپنے ٹانگیں ہلا رہی تھی، جیسے وہ اس سانولی رنگت والے اجنبی کی کہی ہوئی اتنی بہت سی باتیں ایک ملاقات میں پورے طور پر سمجھنے سے معذور ہو، مسکرا مسکرا کر ماہل کی آنکھوں میں گھورنے لگی، اس نے کہا۔ "تم شاید اتنی بہت سی بیئر پینے کے عادی نہیں ہو!"

ماہل نے جھنجھلا کر کہا: "یہی تو تم مغربیوں کی بدقسمتی ہے، تم لوگ ہر بات کا، ہر مسئلہ کا جواز تلاش کرنے لگتے ہو، اور یوں اس چیز کی اصل اہمیت اور قرب کو فراموش کر دیتے ہو، اور اسی لئے تم شاید آواگون کے اس دقیق مسئلے کو سمجھنے سے معذور ہو، اور تمہاری منطق یہ سمجھنے سے انکار کرتی ہے کہ جبکہ میری اور تمہاری ملاقات محض آج شام میوزیم میں ہوئی تھی تو آخر میں نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ میں برسوں سے تم سے واقف ہوں!"

آئیلین نے کہا: "اسی لئے تو کپلنگ کا خیال تھا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب!"

"میری دوست آئیلین! ممکن ہے کہ کپلنگ اخبار نویس اور شاعر اچھا خاصہ رہا ہو لیکن مشرق کو سمجھنے میں جس قدر اندھے پن کا ثبوت اس نے دیا تھا، اس کا مقابلہ شاید ہالی وڈ کے فلم ڈائرکٹروں سے تو ہو سکے، اور تو کسی سے ہو نہیں سکتا!"

آئیلین جھلا اٹھی، ماہل کی بے جوڑ، بے تکی باتیں اس کو ایک حد تک دلچسپ ضرور معلوم ہوئی تھیں، لیکن اس کی گفتگو زیادہ تر بے ربط تھی، اور وہ بار بار کوشش کر کے اپنے ذہن کو اس کی باتوں کے تسلسل پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتی، لیکن یہ ان دیکھا تسلسل تو جیسے ریشمیں دھاگے کی مانند تھا، جو بار بار انگلیوں کی گرفت سے آزاد ہو جاتا، اور اسی لئے اب اس کی طبیعت واقعی جھنجھلا اٹھی، اور اس نے بے تعلقی کے ساتھ پب (شراب خانے) میں مجمع لوگوں کو گھورنا شروع کر دیا۔

پب کی فضا، شراب اور سگرٹوں کی بو سے معمور تھی، ایک ہلکی ہلکی دھند چھت سے لیکر لوگوں کے سروں تک چھائی ہوئی تھی، اور جب آئیلین نے اپنے اونچے سٹول پر بیٹھے بیٹھے ان سب لوگوں کا جائزہ لیا تو اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ ایک اونچائی سے کسی وادی کو دیکھ رہی ہو، اور اس وادی میں دھند میں نیم پوشیدہ، نیم نہاں، وہ سب لوگ تھے ۔۔۔ اور اس کو ان سب پر یوں طائرانہ نگاہ ڈالنے میں ایک خاص لذت محسوس ہوئی۔

دو گھنٹے پہلے، آئیلین اس سانولی رنگت والے نوجوان کے وجود تک سے بے خبر تھی، دو گھنٹے پہلے وہ میوزیم میں کوونٹری کی جدید طرز کی کھڑکیاں دیکھنے کی غرض سے گئی، وہ کھڑکیاں جن میں مجرد آرٹ کی مدد سے عجب رنگ برنگے نقوش بنائے گئے تھے، یہ نقوش منتشر بھی تھے اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ بھی، ان کے اقلیدسی نقوش ہیں، ان گنت رنگوں کے امتزاج میں، انسانی زندگی کے جسمانی اور روحانی تجربوں کی ایک کتھا کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی، مجرد آرٹ کے اشاروں اور کنایوں کی مدد سے، ایک عظیم داستان کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور یوں گرجا جیسے قدامت پرست ادارے نے عصر نو کے جدید مجرد آرٹ کے دامن کو سنبھال لیا تھا۔ جیسے وقت اور رسوم اور رواج کے بُعد کے باوجود قدیم اور جدید میں در اصل کوئی خاص فرق نہ ہو، کل اور آج، اور آنے والی کل، یہ سب در اصل ایک ہی چیز ہیں۔ ایک ہی تصور کے مختلف نام ہیں، ایک ہی تسلسل میں سموئے ہوئے ہیں، وقت

پانی کے ایک چشمے کی طرح ہے، جس کے شفاف پانی کی سطح کو جس مقام پر بھی چاہو چھو لو! اس سب گورکھ دھندے سے آواگون کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس مشرقی نوجوان کا شعور بنتا ہے جو اس وقت ساؤتھ کنسنگٹن (SOUTH KENSINGTON) کے ایک پب میں آئیلین سے ایک مسلسل طولانی، بے ربط گفتگو میں مصروف تھا۔ دو گھنٹے پہلے جب وہ میوزیم میں ایک جگہ کھڑی ان کھڑکیوں کے دیکھنے میں محو تھی تو اس نے کنکھیوں سے، اس نوجوان کے قرب کو محسوس کیا تھا۔

آئیلین نے ایک تجسس کے جذبے کے ماتحت، اس اجنبی نوجوان سے خود کو متعارف کرا لیا: "میرا نام ہے، آئیلین! ــــ آئیلین جونز! ــــ اور تمہارا؟"

"میرا نام ماہل ہے! ــــ تم کو یہ جدید آرٹ پسند ہے؟"

"ہاں ــــ غالباً! ــــ مطلب یہ ہے کہ بعض وقت میں سوچتی ہوں کہ یہ سب کچھ ڈھکوسلہ تو نہیں!"

"یوں تو سب آرٹ ہی ڈھکوسلہ ہے، جب تک آرٹ کو کسی صحیح موضوع کی ترویج کے لئے استعمال نہ کیا جائے وہ کچھ ڈھکوسلہ ہی نظر آتا ہے!"

"تمہارے خیال میں ایک گرجا گھر کی کھڑکیاں آرٹ کے لئے صحیح موضوع ہے!"

"ہے بھی، اور نہیں بھی ہے! ــــ واقعہ تو یہ ہے کہ کوونٹری کا گرجا محض عیسائی عبادت گاہ تو نہیں ہے، وہ اس جدوجہد کا بھی تو ایک حصہ ہے جو آج سے سات دس بارہ برس پہلے فاشیت اور جمہوریت کے درمیان ہوئی تھی، اور جس میں کوونٹری کا پرانا گرجا تباہ ہو گیا تھا، اور پھر کوونٹری کا نیا گرجا گھر بن گیا! کوونٹری کے باشندوں کی زندہ رہنے کی خواہش کی ایک زبردست علامت بن گیا اور اسی لئے اب اس گرجا گھر کی مدد کو آرٹ آن موجود ہوا ہے!"

میوزیم میں کوونٹری کی کھڑکیوں کو دیکھنے کے لئے تماش بینوں کا ایک لمبا سا کیو (QUEUE) ہال کے باہر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کیو میں کچھ لوگ جو آئیلین اور ماہل کے قریب تھے، اس بات کے منتظر تھے کہ یہ دونوں حائل تھے، اور باقی تماش بین ان کو گھور گھور کے دیکھنے لگے، اور آئیلین کو ان کے یوں بدمزگی کے ساتھ گھورنے کا احساس ایک دم سے ہو گیا۔ اس نے ماہل سے کہا: "چلو آگے بڑھیں، ہم کیو کے راستے میں حائل ہیں!" اور ماہل بھی چونک پڑا، اور وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میوزیم سے باہر نکل آئے!

"اب ــــ؟ ــــ" ماہل نے متوقع انداز میں، میوزیم سے باہر چلے آنے کے بعد، پوچھا۔

"یہاں قریب ہی ایک پب ہے، جس سے میں تھوڑی بہت واقف ہوں!" ــــ آئیلین نے کہا۔

"چلو وہاں چلیں!"

"ہاں چلو! ــــ"

ــــ اور پھر وہ دو گھنٹے تک مسلسل پب میں بیٹھے رہے!

شام خاصی ڈھل چکی تھی لیکن ایک دھندلی دھندلی روشنی اب بھی لندن پر مسلط تھی جیسے سورج کی آخری کرنیں اس شہر کو خیرباد کہنے سے جھجک رہی ہوں۔ گرمیوں کے موسم میں بہت رات گئے تک یہ ہلکی ہلکی روشنی لندن کی سڑکوں پر، مکانوں پر، زیرِ زمین ریلوں کے ان گنت اسٹیشنوں پر، کئی کئی منزلوں والی دکانوں پر منڈلاتی رہتی، اور خواہ مخواہ لندن ایک پراسرار سا مقام بن کے رہ جاتا، لندن کے وجود کی اس پراسرار کیفیت کو ماہل نے پہلی شام ہی بھانپ لیا تھا، اور اب جب کہ وہ اس اجنبی لڑکی آئیلین کے ساتھ ایک پب میں بیٹھا تھا، لندن کے وجود کی پراسرار کیفیت، اس کو اور بھی شدید طور پر محسوس ہو رہی تھی ــــ اور اسی اجنبی آئرش لڑکی کے وجود کو بھی ضرورت سے زیادہ دلکش بنائے دے رہی تھی۔

"آئیلین! ــــ تم آئرش ہو نا!" ماہل نے پوچھا۔

"ہاں، میں آئرلینڈ کی رہنے والی ہوں، باغی آئرلینڈ کی!"

"باغی آئرلینڈ!"

ماہل کی آئرلینڈ سے واقفیت سرسری تھی۔ ــــ ایک طویل تنازعہ جو تاریخ کے بے گنتی صفحات پر پھیلا ہوا تھا، اور جو کبھی کبھی تشدد کی شکل اختیار

کرجاتا، ایک آزادی کی خواہش جس نے ان دونوں جزیروں کے درمیان، جن کو وہ بچپن سے جغرافیہ کی کتابوں میں ایک ہلکے گلابی رنگ میں ڈوبے ہوئے دیکھتا چلا آیا تھا، ایک گہری اور ناقابل عبور خلیج حائل کر دی تھی' — اور ایک بھولے بسرے فلمی گانے کی یاد:

[IRISH EYES ARE SMILING AT ME] ——— "آئرش آنکھیں مجھے دیکھ کے مسکرا رہی ہیں! ———"

——— نہ جانے یہ آئرش آنکھیں کیسی ہوتی ہیں؟ بڑی بڑی، گہری، شفاف، بھورے رنگ کی پتلیاں، جن میں ایک حسن ہے، دلکشی ہے، ایک محویت اور حیرت کا ملا جلا جذبہ ہے، لیکن بغاوت نام کو بھی نہیں ہے۔ بغاوت کے جذبے میں تو ایک طرح کی نفرت اور سخت دلی کی کیفیت ہوتی ہے اور یہ بڑی بڑی آنکھیں تو محض مسکراتی رہتی ہیں۔

"آئیلین! تم آئرش لوگ انگلستان کے خلاف ہی تو بغاوت کرتے ہو، پھر تم یہاں لندن میں کیوں ہو؟ ———" ماہل نے اپنے بیئر کے گلاس سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔ گلاس میں بیئر کے جھاگ بے تابی کے ساتھ ابل رہے تھے جیسے ان میں کئی سمندروں کی تندی مرکوز ہو کے رہ گئی ہو، اور آئیلین کے گلاس میں سوڈے کے ننھے ننھے بلبلے ایک دوسرے کے ساتھ مسکرا مسکرا کر، آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، جیسے وہ سمندروں کی تندی کے وجود سے قطعی بے خبر ہوں۔

آئیلین ذرا سوچ میں پڑ گئی؛ پھر اس نے رک رک کے جواب دیا: "ہاں یہی تو عجیب بات ہے، ہم آئرش لوگ ہوش سنبھالتے ہی ایک بغاوت کا، نفرت کا، دشمنی کا سبق سیکھنا شروع کر دیتے ہیں، لیکن جب ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ اس بغاوت کے جذبے کو عملی جامہ پہنائیں تو ہم موقعہ ملتے ہی چینل کو عبور کر لیتے ہیں اور لندن اور مانچسٹر اور لورپول اور نیو کاسل میں تلاش معاش شروع کر دیتے ہیں' ——— عجب غیر منطقی سی بات ہے لیکن ہوتا یہی ہے!"

ماہل نے بھی سوچا کہ واقعی اصلیت یوں ہی ہے، کیونکہ چند برس پہلے اس کے اپنے وطن میں یہی ہوتا تھا، چند برس پہلے اس کے اپنے وطن میں بھی لوگوں کے دلوں میں انگلستان کی طرف سے ایک نفرت اور بغاوت کا جذبہ بھرا ہوا تھا، لیکن پھر انگریزوں نے ہی مغربی طرز کی آزادی، مغربی طرز کی قومیت' مغربی طرز کی جمہوریت کا ان لوگوں کو سبق پڑھایا، اور ان کی پرانی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے موئن جو دڑو، تیکشیلا اور اجنتا اور ایلورا کے کھنڈروں کو آثار الصنادید کے محکمے کے سپرد کر دیا' اور تاج محل کے سنگ مرمر کو رئیسوں کی بیٹھکوں کے فرش کی زینت بننے سے محفوظ رکھا' ان کو ایک زبردست پوسٹل سسٹم عطا کیا اور کنگ ریڈز عطا کی! ——— اور پھر یہی لوگ ایک بغاوت کی آگ سینے میں دبائے پھرتے تھے۔ مگر پھر اس آگ کی تپش کو محسوس کرنے کے باوجود جب موقع ملتا پی اینڈ او کے جہازوں میں بیٹھ کر یا بی، او سے اے سی کے طیاروں میں پرواز کر کے، انگریزوں کی اپنی سرزمین پر پہونچ جاتے' اور یہاں لندن کے عجائب گھروں، لائبریریوں اور دریائے ٹیمز کے پلوں اور ہائڈ پارک میں طوائفوں اور ویسٹ منسٹر ایبی میں مدفون ادیبوں اور شاعروں اور مؤرخوں اور "سٹیفورڈ آن ایون" (STAFFORD - ON - AVON) کے شہرۂ آفاق سپوت کے سلسلے میں خواہ مخواہ ایک شدید جذباتیت کا مظاہرہ کرتے پھرتے ——— اور آئیلین ماہل کے دوڑتے ہوئے خیالات سے بے خبر بولتی رہی:

"میں نے سکول چھوڑنے کے بعد ایک بہت بڑی کپڑے کی مل میں پیکنگ کا کام سیکھا، مانچسٹر کی اس فیکٹری میں زندگی بہت کٹھن تھی' اور ہماری شفٹ پر جو عورت سپروائزر تھی اس میں ضرور کسی فاشستی ڈکٹیٹر کی روح تھی۔ خیر پھر بھی میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی ٹریننگ کا زمانہ گزار ہی لیا، اور یہاں چلی آئی اور اب میں اس زبردست سمندر میں قطرہ بن کے رہ گئی ہوں جس کا نام لندن ہے! آکسفورڈ سرکس کے قریب ایک سہ منزلہ اسٹور ہے، اس کے پیکنگ کے شعبے میں میں کام کرتی ہوں، وہ اسٹور واقعی بہت زبردست ہے۔ تم ضرور کسی روز دیکھنے کے لئے آنا ——— ویسے میں رہتی یہاں قریب ہی ایک فلیٹ میں ہوں' ——— !" اور پھر وہ بولتے بولتے رک گئی۔ شاید اس نے ماہل کی آنکھوں کے کھوئے کھوئے انداز کو بھانپ لیا، اور اس نے سوچا کہ غالباً اس سانولی رنگت والے اجنبی نوجوان کا ذہن بیئر کی تندی کی بنا پر، یا پب کی بوجھل فضا کی بنا پر بہت دور بھٹک گیا ہے۔ اور وہ خالی الذہن ہو کر بیٹھ گئی'

ماہل آئیلین کے یوں ایکا ایکی خاموش ہو جانے پر چونک اٹھا' اور ایک کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے معافی مانگنے لگا، آئیلین اس وقت ماہل سے مصروف گفتگو رہنے پر مصر تھی۔ شاید اس کو اپنے اکیلے فلیٹ میں واپس جانے کے خیال سے ہی دحشت ہو رہی تھی، اس لئے وہ مسکرا اٹھی، اور اس کی بڑی بڑی آئرش آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ اس نے کہا: "دراصل ہم آئرش لوگ اپنے بارے میں باتیں کرنے کے بہت شوقین ہیں۔"

ماہل نے کہا: "اپنے بارے میں باتیں کرنے کا تو ہم لوگوں کو بھی بے حد شوق ہے!"

آئیلین نے کہا: "بہرحال میں تو اتنی ڈھیر باتیں اپنے بارے میں بتا چکی ہوں۔ اب تمہاری باری ہے!"

مائک نے چاروں طرف نظر دوڑا کے دیکھا تو اس کو پب کی فضا پہلے سے بھی زیادہ، شراب اور سگریٹوں کی بو سے لبریز معلوم ہوئی۔ ایک کونے میں تین ادھیڑ عمر کی عورتیں بیٹھی مسلسل آپس میں کھسر پھسر کئے جا رہی تھیں، شراب کی تندی سے ان کے چہرے پر ایک مصنوعی سرخ جھلک آئی تھی اور باتیں کرتے وقت ان کے ناک کے نتھنے بے وجہ طور پر پھڑکنے لگتے۔ بار کے کاؤنٹر کے ایک سرے پر دو نوجوان مرد ایک کم عمر سی لڑکی کو گھیرے کھڑے تھے اور بارٹینڈر اُن کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور تمام پب میں ایک لامتناہی گونج مسلط تھی ۔۔۔ انسانی آوازوں کی ملی جلی مبہم گونج، جیسے بہت سے نوعمر لڑکوں کو ایک ہال میں اکٹھا کر دیا گیا ہو اور جیسے وہ سب لڑکے ماسٹر صاحب کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر آپس میں باتیں کرنے اور شور مچانے میں مشغول ہوں!

مائک نے سوچا کہ اس کا اپنا ذہن کسی بھی بات پر مرکوز ہونے سے قاصر تھا، وہ تو بار بار نہ جانے کہاں بھٹک جاتا۔ اس نے کہا: "میری دوست آئیلین اگر میں بھی تمہاری طرح ایک سانس میں بہت سی باتیں کہہ ڈالوں تو شاید تمہاری سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے۔ دراصل اس گرد آلود ہال اور اس انگریزی پب کے درمیان پوری ایک کائنات حائل ہے، اور ویسے میں تو اس کائنات کو ایک جست میں عبور کرنے کو تیار ہوں لیکن شاید تمہارا اینگلو سیکسن (ANGLO - SAXON) وجود اس قدر لمبی مسافت طے کرنے پر آمادہ نہ ہو! ۔۔۔ کیونکہ تم مجھ سے ابھی تھوڑی دیر پہلے میوزیم میں کونٹری کی ٹھٹکیاں دیکھتے وقت ملی تھیں لیکن میں تو ایک صدی سے تم سے واقف ہوں، صدی میں نے اس لئے کہا کہ میرے اجداد میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی تھی اور اپنے بچوں کے ایک ہاتھ میں بغدادی قاعدہ اور دوسرے میں کنگ ریڈر تھما دی تھی! ۔۔۔ اب تم یہ پوچھو گی کہ بغدادی قاعدہ کیا ہوتا ہے، پھر میں کہتا ہوں کہ تم ذرا اس واقعی تضاد پر تو غور کرو، تم جو ایک صدی سے میرے لاشعور میں سمائی ہوئی ہو! ۔۔۔"

شاید گرٹروڈ سچ ہی کہتی تھی کہ یہ کالی رنگت والے لوگ شراب کی شدّت کو نہیں برداشت کر پاتے ہیں! ۔۔۔ پور تھنگ!!"

"ماہِ نو" میں اشاعتِ مضامین سے متعلق شرائط:-

(۱) "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنّف کا نام اور دیگر ضروری حوالہ جات دینا ضروری ہے۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسوّدات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

فن :

مغلیہ مصوّری میں فطرت کی عکّاسی

ایرک۔ سی۔ ڈکنسن

ہمارے گرد و پیش کی محسوس و مرئی دنیا کی جیسی عکّاسی مغربی نقّاشی میں کی جاتی ہے اور جسے ہم "واقعیت نگاری" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس کا پہلے پہل مغلیہ مصوّروں کو قطعی کوئی علم نہ تھا اور یہ بات کچھ ایسی تعجب انگیز بھی نہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہمایوں اپنی جلاوطنی کا زمانہ ایران میں گزارنے کے بعد ۱۵۵۵ء میں واپس آیا تو وہ کچھ ایرانی نقّاشوں کو بھی اپنے ساتھ لایا۔ یہ نقّاش مدّتوں سے دو طرفی نقّاشی کی روایات ہی کے پابند تھے جو ایران میں صفوی عہد کے فنکاروں کی عام روش تھی۔

کچھ عرصہ بعد اکبر کے عہد میں اصلیت نگاری کی طرف رجحان شروع ہوا۔ جو مغل مصوّری میں ایک اہم تبدیلی تھی۔ اس کی پوری کیفیت سمجھنے سے پہلے اس بات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی کہ ایرانی قلم، جو عہدِ صفوی کے اُستادانِ فن کے یہاں مروّج تھا، اس کی علت غائی اور کیفیت کیا تھی۔

ان استادوں کے عمل میں تمام تر تزئین و آرائش پر زور تھا۔ اس لئے اس قسم کے فطری لوازم مثلاً سایہ کاری (SHADING) یا تناظر کے لئے ان میں کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی مختصر تصاویر کی سطح کو محض خانہ دار روغنی تختے تصوّر کرتے تھے جن کے خانوں میں رنگ بھر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سرخ، سبز، لاجوردی یا زرد کی شوخ زنگارنگی جھل جھل کرتی رہتی تھی اور یہ ساری جھلکاری ایک بوقلموں مرصّع کاری کا روپ اختیار کر لیتی تھی۔ تصویر کا ہر حصّہ ایک خاص رنگ سے بھرپور دکھائی دیتا تھا جس پر سائے کا شائبہ نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ لیکن اس میں تعمیراتی نقشہ گری اور دوسری نازک جزئیات خوب بھر دی جاتی تھیں۔ اوپر مرغولوں کی طرح بل کھاتے بادلوں کا چھتر، نیچے زمین کا فرش زمردیں۔ ہو بہو پرستان کا عالم جس کی بہارِ شباب ہمیشہ نصف النہار پر رہتی اور شنگرف، لاجورد اور سنہرے کی ڈلک آنکھوں کو خیرہ کرتی رہتی۔ اس عالم طلسمات میں شہزادے ٹہلے گھلے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مغرب کے عہدِ وسطیٰ کا ایک پرستار گاتھک انداز میں تیار کی ہوئی "کتابِ نماز" کی تزئین کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتا ہے: "اس لوح پھلک کے نہ ہونے سے ہی تقریباً سحر آمیز توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تناظر اپنے سہ طرفی فریبِ نظارہ کے ساتھ فن پر چھا گیا اور معجز نما صداقت کا عنصر ناپید ہو گیا، تو نقّاشی کو کچھ ایسا نقصان پہنچا جو احاطۂ بیان سے باہر ہے۔" یہی رائے من و عن صفوی عہد کی مختصر مصوّری پر بھی صادق آتی ہے، جس کے ناپید ہو جانے پر ہم افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اس گم گشتہ اعجاز کی جگہ مغل مصوّروں نے ایک اور معجزہ کاری کو فروغ دیا۔

تبریز سے ہمایوں، میر سیّد علی اور خواجہ عبد الصمد جیسے استادوں کو اپنے ساتھ لے کر آیا۔ یہ دونوں بہزاد کے شاگرد تھے جسے صفوی دربار کا جوہرِ یکتا کہنا چاہیئے۔ ہمایوں نے ان نقّاشوں کو ایک کام سپرد کیا۔ ایران کے ادبِ عالیہ کی سب سے وقیع اور پُرکشش کتاب "داستانِ امیر حمزہ" کو مصوّر بنانا۔ چونکہ یہ داستان بارہ جلدوں پر مشتمل اور کئی ہزار صفحات کو محیط ہے، اور ہر جلد کو مصوّر کرنا تھا، اس لئے کام کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے ان اُستادوں نے اپنے ساتھ کوئی پچاس ایرانی و ہندوستانی مصوّروں کو بھی ملا لیا اور اس کا آغاز ہو گیا۔

"داستانِ امیر حمزہ" دراصل مغل نقّاشی کی اساس ہے۔ اس ہی عہد میں ایران کی مختصر تصویر کشی کو سامنے رکھا جائے تو یہاں کے کام کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ "ایرانی قلم" میں تزئین برقرار رہتی ہے مگر یہاں خوب کاری کا تناسب غیر واضح بلکہ گڈمڈ ہو کر رہ جاتا ہے گویا کہ اس کا بالعموم نستعلیق موضوع، نقّاش کی قوتِ اظہار سے باہر ہے اور اس کا نتیجہ ایک درہم برہم سی کیفیت۔ پھر ان نقوش میں بے عیب رنگ داری کا جو ذوق دکھائی دیتا تھا، وہ بھی کچھ مرا مرا سا دکھائی دیتا ہے۔ مگر جو چیز ہمارے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان میں اشجار اور دیگر اشیاء میں فطرت و واقعیت پسندی کی لہر آگئی ہے۔

واضح رہے کہ اس وقت ہم الگ الگ بنائی ہوئی مختصر تصاویر کا ذکر نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ہمارا موضوع وہ تصاویر ہیں جو مستقل کتابوں کی آرائش کے لئے سوتی پارچہ پر بنائی گئی ہیں۔ جس کی تقطیع ۲۸½ × ۲۲ کے قریب ہوتی تھی۔ مثلاً "داستان امیر حمزہ" کی تصویر "کرامت حضرت علیؓ" کو ہی لیجئے۔ اس کی تصویری اٹھان ترچھی (ر/) ہے۔ عہد اکبری کے مصوروں کو یہ اسلوب بڑا سہل اور بہ کار آمد نظر آیا کیونکہ ان کے موضوعات یا توؔ "بابرنامہ"، "تیمورنامہ" "اکبرنامہ" کے ولولہ انگیز واقعات تھے یا رومانوی داستانوں کے محیر العقول کارنامے۔ موجودہ مثال میں یہ انداز کچھ دھیلا ہے مگر ایسا کہ منہ سے بول رہا ہو۔

اشجار اور پانی کا جو عمل ان تصویروں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چونکا دینے والی اپج نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولنی شروع کر دی ہیں۔ ایرانی قلم میں اشجار کو بس ایک انبوہ کی صورت میں دکھاتے تھے۔ مگر اب ان تصویروں میں اشجار نے ایک نئی وضع اختیار کر لی پتوں کی اشکال اگرچہ چپٹی اور چپکی چپکی سی ہیں (اور وہ بھی سطح تصویر کے چند حصوں تک محدود، جن کو وہ پوری طرح بھرے ہوئے ہوتے ہیں) لیکن ناظر صاف پہچان سکتا ہے کہ یہ کونسا درخت ہے۔ مگر سب سے زیادہ نظری کیفیت درختوں کے تنوں میں پیدا کی گئی ہے۔ پھر جہاں تک پہاڑوں کا تعلق ہے، مصوروں نے ایرانی و چینی روایات کے مطابق محض چٹانیں پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ کم از کم سایہ کاری کے ساتھ ان کو ایسا ٹھوس پن عطا کیا ہے جو صفوی عہد کی مختصر تصاویر میں بالکل ناپید ہے۔ تزئین کا عنصر بدستور موجود ہے لیکن نقوش میں ایسے تصورات کارفرما ہیں جن کا تبریزی مصوروں کو علم ہی نہ تھا۔ پانی کو سابقہ مشرقی روایات کے برعکس آڑے ترچھے کنڈواں خطوط سے ظاہر نہیں کیا گیا بلکہ بالکل قدرتی طور پر بلبلے اور جھاگ پیدا کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ صفوی تصورات بتدریج محو ہوتے جا رہے ہیں۔ کس حد تک؟ اس کا اندازہ زیر بحث تصویر اور میر سید علی کی بنائی ہوئی تصویر "لیلیٰ مجنوں" کے موازنہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس تصویر میں دو طرفی تصویر کشی کے لوازمات کو بڑی حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۱۵۷۵ء میں مغل دبستان مصوری میں ایک اور اہم دور کا آغاز ہوا جبکہ اکبر کو ایک ایسا ادارہ فن قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جس میں ہندو، مسلمان مصوروں کی یکساں پرورش اور حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ صفوی طرز کا غلبہ جو پہلے ہی روبہ انحطاط تھا اب تیزی سے معدوم ہونے لگا۔ چنانچہ کسی تیمورنامہ کی ایک تصویر "ترک غلام تیمور کے حضور میں" ——— (جس کو دھرم داس کا عمل خیال کیا جاتا ہے) ——— ہمیں نئے مغل اسلوب کی خصوصیات جھلکتی نظر آتی ہیں یعنی ایرانی، ہندی اور مغربی تصویر کشی کا امتزاج۔ اشکال اب گلے بندھے نمونے پر نہیں ہیں جیسا کہ "لیلیٰ مجنوں" میں ہے۔ بلکہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ مصور کو اپنے موضوع سے نفسیاتی دلچسپی ہو گئی ہے اور ساتھ ہی ڈرامائی احساس بھی آچلا ہے۔ زائد قسم کی چیزیں مثلاً عمارتیں اور ملبوسات کو اس خوش اسلوبی سے دکھایا گیا ہے گویا مصوروں نے انہیں ابھی ابھی دیکھا ہے۔ البتہ حاشیہ کی بیلوں سے، جو اکتا دینے کی حد تک بڑی بڑی ہیں، تصویر کا سارا وقار مارا جاتا ہے۔ جہاں بہت سے لوگوں کو دکھایا گیا ہے اور وہ پتھر کی بے جان مورتیاں معلوم ہونے لگتے ہیں، اس کا اثر زائل کرنے کے لئے پیش منظر میں غیر معمولی عمل و حرکت کا کوئی نہ کوئی مظاہرہ دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ ہمیں دو مصاحب ایک چیتے کو، جو سدھایا ہوا اور پالتو ہے۔ اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے دیکھتے ہیں۔ چیتا کچھ اس طرح چپ سادھے، بے حس و حرکت نہیں بیٹھا ہوا ہے گویا وہ واقعی رام ہو۔

تصاویر میں عمارتی ٹیپ ٹاپ سے بڑھتا ہوا شوق ایک اور تصویر سے نمایاں ہے، اور کافی مبالغہ کی حد تک۔ یہ تصویر بھی جس کا عنوان "بانگِ اذاں" ہے، کسی تیمورنامہ کی زینت ہے۔ اس کو دو مصوروں نے تیار کیا۔ لیکن غضب یہ کیا ہے کہ تصویر کے چپے چپے پر جہاں بھی جگہ ملی ہے، کچھ نہ کچھ ضرور بنا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک ایسی تصویر جو "الف لیلوی" وضع کا واقعی نہایت شاندار نقش بن سکتی تھی، ایک شاہکار بنتے بنتے رہ گئی ہے، خصوصاً جب کہ اس میں طنز کی نشتریت بھی پوری طرح کام کر رہی ہے۔ کیونکہ مؤذن تو زور شور سے اذان دے دے کر لوگوں کو نماز اور فلاح کے لئے بلا رہا ہے مگر سننے والوں کی غفلت میں کوئی فرق نہیں آتا! ایرانی مختصر تصاویر کی بعض خصوصیات تو اس میں موجود ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فن کار اس جیتی جاگتی دنیا پر، جو اس کے ارد گرد ہے، کس طرح نظر ڈالتا ہے۔ عمارت کا نقشہ پورا دکھایا گیا ہے جیسے وہ جامد ہونے کی بجائے دور تک کھلتی جا رہی ہو یعنی تناظر کو بخوبی ملحوظ رکھا گیا ہے جس سے عمارت کو دیکھ کر محض ظاہری ٹیپ ٹاپ کا سطحی احساس نہیں ہوتا۔

اکبر کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے مغربی نقاشوں کے فن نے بھی مغل مصوری تک راہ پائی۔ جو قدرت کی عکاسی کے شوق کو تیز تر کرنے کے لئے زبردست

تازیانہ ثابت ہوا۔ مغلیہ مصوّروں کی فطانت سے بعید تھا کہ وہ یورپی نمونوں کی دو خصوصیات کو فوراً نہ بھانپ لیتے : متوازن وحدت اور کل تصویر پر حاوی ایک آہنگ جس کو رنگوں کی انتہائی احتیاط سے اختیار کی ہوئی ترکیب و ترتیب سے ابھارا جاتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مغربی تصاویر سے منظر نگاری کی اہمیت کا احساس بھی ہوا۔ مصوروں کو پہلی بار یہ پتہ چلا کہ مصوری کے تمام زائد لوازمات میں منظر نگاری سب سے اہم اور گراں قدر ہے۔ بساون کی ایک مختصر تصویر میں نہ شکلیں ٹھوس لگتی ہیں بلکہ منظر سے فضا جھلکتی ہے اور ساتھ ہی تناظر بھی۔ منظر نگاری، یوں سمجھ لیجئے، ذیلی ہونے کی بجائے مقدّم چیز بن گئی ہے، یعنی نقش کی علّتِ غائی۔ اس تصویر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نقّاش نے واقعیت نگاری کے میدان میں بڑا جرأت مندانہ اقدام کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ یہ فن کار استاد عبد الصمد کا شاگرد تھا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ شاگرد نے خود کو ان ایرانی روایات سے کسی قدر آزاد کر لیا تھا جو اس کے استاد کو اس قدر عزیز تھیں۔

مغلیہ مرقع نگار اس نئی دعوت کو قبول کرنے میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے اپنے موضوعِ نقش کو دلآویز منظر کے روبرو دکھانا شروع کیا اور اکثر فطرت کی بڑی صحیح عکاسی کے ساتھ۔ فطری تمثال نگاری کا سب سے بڑا کارنامہ "رات کو ہرن کا شکار" ہے۔ جس میں تصوّر کی رعنائی واقعی بے نظیر ہے۔ یہ تصویر آج بھی "بوڈلیئین لائبریری" (آکسفورڈ) کی زینت ہے۔ اگرچہ اس کے محاسن کی جی بھر کے داد دینے کو جی چاہتا ہے، پھر بھی بخوفِ طوالت اس سے قطع نظر کرتا ہوں۔

•

جہانگیر کی نگرانی میں "مختصر مرقع نگاروں" کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان مصوروں نے پیڑوں اور پرندوں کی تصویریں بنانی شروع کیں اور بڑی نفاست و چابکدستی سے۔ ان میں سب سے باکمال استاد منصور تھا، جہانگیر کے چہیتے پھولوں میں سے ایک گلِ لالہ تھا۔ جیسا کہ اس کی توزک کے ان بہت ہی تحسین آمیز الفاظ سے ظاہر ہے: "شمع ہائے لالہ محفل طراز۔"

اس قسم کے شہ پاروں کا بہترین نمونہ استاد منصور کی تصویر "لالۂ احمر" ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس بھی اس پھول کا زبردست شیدائی تھا۔ ایک جگہ اس نے کیا خوب کہا ہے: "گلِ لالہ کی گاڑھی سرخی میں دھرتی ہی کی دبیز سرخی جھلکتی ہے۔" یعنی یہ اتنی گاڑھی سرخی ہے کہ نظر اس سے پار نہیں جا سکتی۔ یہی گاڑھی سرخی ہے جسے استاد منصور نے بڑی کامیابی سے لالہ کے نقوش میں سمو دیا ہے۔

پرندوں کی تصاویر میں "پیلو" (فیل مرغ) کمال درجہ کی صناعی کا مظہر ہے۔ پیلو اپنی دم پھیلائے کھڑا ہے۔ پیچھے یونہی ایک منظر کی جھلک سی ہے۔ محض اشارہ جس سے خشک بے آب و گیاہ صحرا کا بنجر پن نمایاں ہے۔ اس کے محاذی پیلو کی رنگینی اپنے تضاد میں عجیب کیف پیدا کرتی ہے۔ وہ رنگینی جس میں ایک طرف کلغی میں رنگوں کا درجہ بدرجہ اتار چڑھاؤ اور دوسری طرف سر اور گردن پر بڑی جسارت سے برتا ہوا شنگرفی سرخ رنگ۔ استاد منصور کو مختصر تصویر کشی کے ایک ایسے شعبہ میں ید طولیٰ حاصل تھا جس میں کامیابی کے لئے خاص الخاص کمال کی ضرورت ہے۔ یہی امتیازی خصوصیت تھی جس کی بنا پر جہانگیر نے اس یگانۂ روزگار مصوّر کو "نادر العصر" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔

عام امور سے تعلق رکھنے والی تصاویر، فطری عکاسی کے سلسلے میں مزید ترقی کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں بھی بے حد تنوع نظر آتا ہے اور ایک ایسی انسانی دلچسپی بھی جس میں سرکاری درباروں اور شاہانہ جلسوں جلوسوں کے نقشوں کی سج دھج اور رکھ رکھاؤ کا شائبہ تک نہیں۔ یہ سب نقوش مل کر سوسائٹی کے نسبتاً کم درجہ افراد کا ایک سماجی دستاویز پیش کرتے ہیں۔ ہم گوشِ توجہ سے سنیں تو ان مرقعات سے عوام کی انمٹ آوازیں بخوبی سن سکتے ہیں۔ ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ مثلاً جواں سال شہزادہ کسی پیر فقیر کی بارگاہ میں۔ ننگ دھڑنگ سادھو دوپہر کی چلچلاتی دھوپ سے پناہ لینے کے لئے پیڑ کی چھاؤں میں آلکسی سے پاؤں پسارے لیٹا ہوا۔ رات کے وقت مُلّا بحث مباحثہ کرتے ہوئے یا ایک گویا اور اس کی مجلسِ سامعین (یہ ہندو مصوّر بچتر کا عمل ہے)۔

نت نئی نیرنگیٔ حالات نے مصوروں کو، جو درحقیقت فن کار بھی تھے اور شاعر بھی، بظاہر جانے پہچانے معمولی حالات سے اہم و بنیادی امور کو اخذ کرنے میں مدد دی۔ اس متناقض صورتِ حال (یعنی ادنیٰ و اعلیٰ کا بظاہر عجیب و غریب ربط) کا لطیف ترین جوہر تھا جو مشرق

افضی کے اس معجز نما عوامی فن میں آشکارا ہوا جو جاپان کے دبستان یوکی واوے (UKIYOYE) کے نام سے مشہور ہے اور جس کے معنی ہیں "آئینۂ جہانِ گزراں"۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ شروع میں مغل مصوری تمام تر تیموری اور صفوی دبستانوں کے زیر سایہ تھی۔ اس سے آزاد ہو کر اس نے ایک نیا تشخص پیدا کیا جس میں مقامی اور مغربی عناصر نے باہم گھر آمیز ہو کر ایک مرکب وضع اختیار کی مگر مقامی عنصر کا استیلا، جو اس کی تشکیل پر حاکمانہ قدرت رکھتا ہو، کبھی بھی زائل نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود فطرت کی اسی وضع سے استخلاص اچانک یا جھٹ پٹ نہیں ہوا بلکہ اس کے رسوم و قیود سے نجات اس وقت وقوع پذیر ہوئی جب کہ فن کاروں کو اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوا اور وہ نئی سہ طرفی دنیا میں بڑی آسانی و بے تکلفی سے کام کرنے کے اہل ہوئے۔ یہ اعتماد جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں نقطۂ عروج کو پہنچا جبکہ غیر درباری عوامی موضوعات کی نقاشی میں، خصوصاً فطری عکاسی اور خوش طبعی کا خوب حق ادا کیا گیا ہے۔ یہاں بھی "سایہ کاری" میں ضبط سے کام لیا گیا ہے اور پرچھائیں تو بالکل ہی مفقود ہے۔ علاوہ بریں جو مصور چرند و پرند اور پھولوں کی عکاسی کرتے ہیں وہ نہ صرف نہایت کڑی اور احتیاط و دیدہ ریزی کی متقاضی تکنیک میں ید طولیٰ رکھتے ہیں بلکہ ہر چیز کو شاعرانہ نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔

بالآخر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مغل مصوروں نے اس امتزاج سے ایک نہایت اعلیٰ ذریعۂ اظہار پیدا کر لیا تھا جس کی بدولت وہ اپنے عالی مرتبت بالشان مربیوں کے فرمان کی تعمیل کر سکے۔ اور یہ وہ مربی تھے جن کی انتہائی خوشی اس میں تھی کہ ان کے بہت ہی دلآویز اور زندگی کی دھڑکنوں سے معمور ماحول کی روح لطیف مصوری میں کھنچ کر آ جائے اور وہ اس کی تشریح و توضیح کا پورا پورا حق ادا کرے۔

ایک فن شناس موسیو فارے (FAURE) نے ارتقائے فن کی جو نہایت ہی تاثراتی قسم کی تاریخ قلمبند کی ہے اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ "تاریخ عالم میں بعض اوقات نہایت ہی نادر قسم کے لطائف غیبی رونما ہو جاتے ہیں"۔ اس پُر مغز قول کا اطلاق جیسے جمال کی جستجو پر ہوتا ہے شاید ہی اور کسی بات پر ہو جو انسان کے لئے ہر اعتبار سے مایۂ ناز ہے۔ تلاشِ جمال سے مراد فن اور فطرت دونوں میں ہر لطیف عنصر کی سراغ رسانی کا خداداد ملکہ ہے۔ صحیح لگن، جستجو اور ریز چول، فن کار کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ وہ رازہائے فطرت کا محرم بن جاتا ہے اور جب اس کا دل مائل ہو تو ان کا پردہ کشا بھی ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر پھر لطیفۂ غیبی بھی اپنا کام کر جاتا ہے۔ فرمان صادر کرنے والوں نے تو بس فرمان صادر کر دیا اور فنکاروں نے اس زبردست خوبیٔ اتفاق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے تابناک تخلیقی مرقعے پیش کر دئے۔ ان مرقعوں کی آب و تاب آج بھی ایسی ہی تازہ ہے اور اگر ذوقِ جستجو کے ساتھ ذہن بیدار اور چشم بینا بھی وا ہو تو ان کو بخوبی مشاہدہ کر سکتی ہے۔ خواہ یہ شہ پارے نظروں سے دور کسی سرکاری یا نجی نگار خانے میں ہمیں روحانی کیف و مسرت بہم پہنچانے کے لئے محفوظ ہوں۔ (ترجمہ)
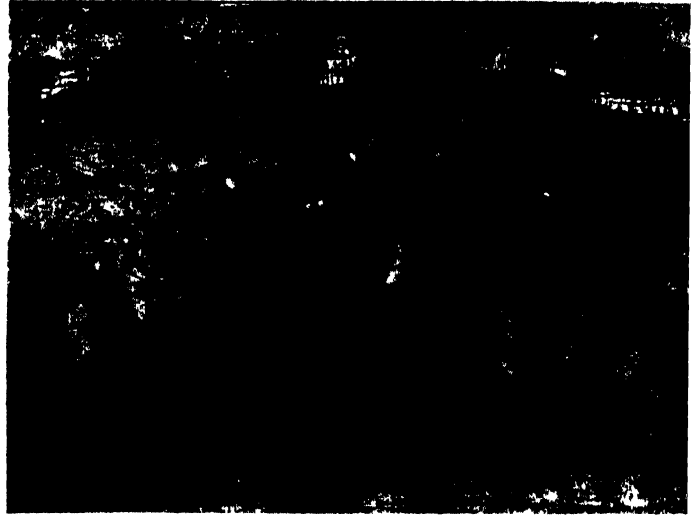
مغلیہ مصوری

۲

۱

۳

۴

۱ : دار (عمل : اساد منصور)
۲ : اونٹوں کی لڑائی (عمل ''ھونہار'')
۳ : چوگاں بازی
۴ : ھاتھوں ئی لڑائی

منجابری
(اسمگا بھر - کراچی)

سنوبوں اور بعو ںدوں ںر اںاںدںی اسںال

رںتلے پتھر ںت ںںی ھوںی ںںرںں او
اں کے ںںںس ںںں و ںںر

ںاں کی ںںں
عام طور ںر
ںد آدم
اوںچی ھںں
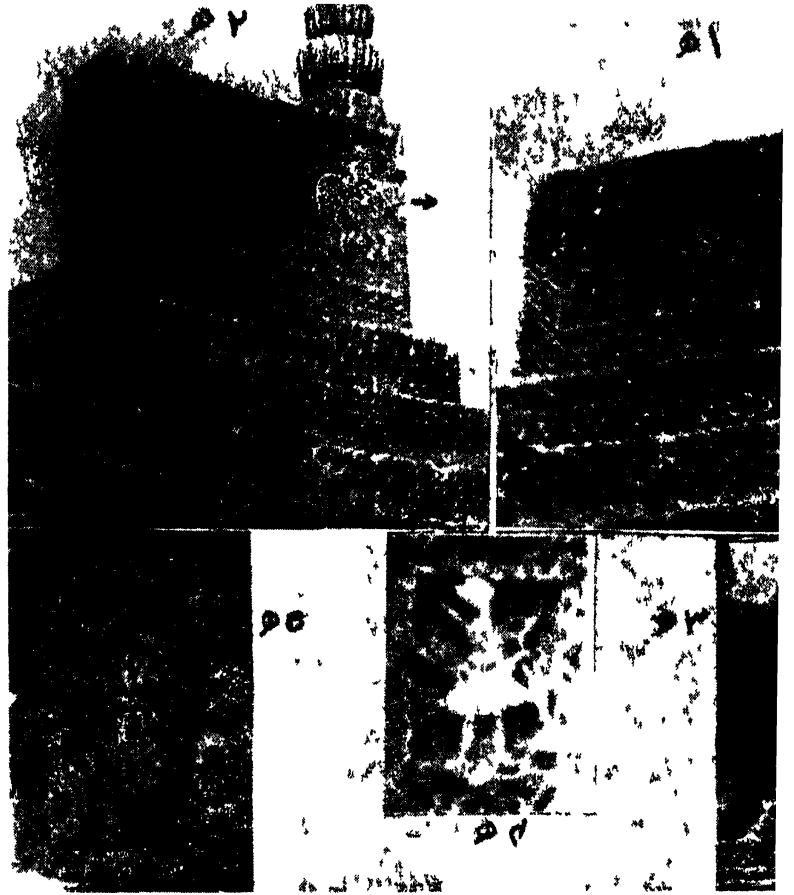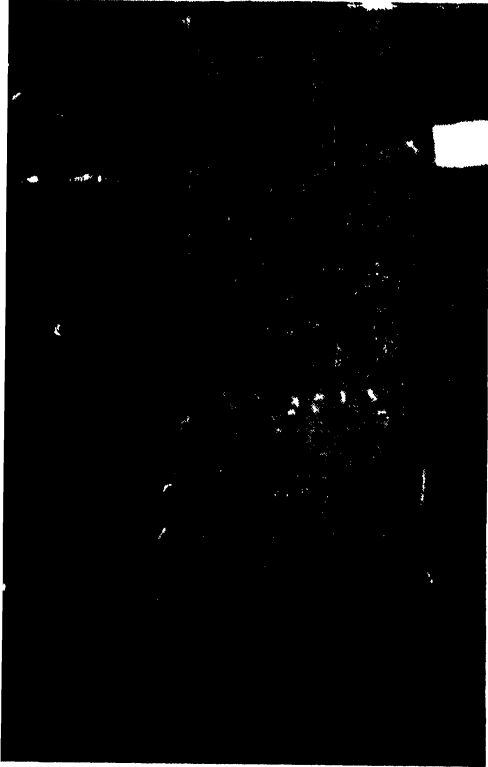
ا پیر'' کا مرار اور متصلہ مسجد

منجابری یا منگاپیر

ڈاکٹر محمد شفیع

کراچی سے دس میل شمال مشرق کی طرف منگا پیر نامی ایک موضع ہے۔ یہ ڈامر کی اس پکی سڑک پر واقع ہے جو کراچی کو بند مراد خاں کے راستہ سے لس بیلہ کے ساتھ ملاتی ہے اور جس پر موٹر گاڑیاں آجا سکتی ہیں۔ شہر سے کوئی چھ میل باہر نکل کر ہم "سندھ انڈسٹریل اسٹیٹ" سے آگے بڑھ جائیں تو دونوں طرف ٹیلوں کے بے آب و گیا چٹیل سلسلے نظر آتے ہیں جن پر کوئی جھاڑ ہے نہ پیڑ۔ لیکن بعض جگہ ٹینیٹ (انجیر کی قسم کا خار دار جنگلی بیر) اور دوسری جھاڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی ۹ میل کے فاصلے پر منگا پیر کی آبادی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ اور جب ہم اس گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ چند گھروں، سڑک کے کنارے واقع دکانوں، ایک مقبرہ اور اس کے ساتھ ہی واقع ایک مسجد پر مشتمل ہے۔ یہ مقبرہ اور مسجد دونوں ایک ٹیلے پر واقع ہیں۔ جو بیلی[1] (صفحہ ۱۸۰) کے اندازہ کے مطابق سطح سمندر سے تقریباً ۶۰ فٹ اونچا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس مقبرہ میں منگھ پیر یا حاجی منگھ سلطان نام کے ایک بزرگ کا مزار ہے۔ اس ٹیلے کے دامن میں سڑک کے دائیں بائیں قبروں کے آثار ہیں۔ اسی ٹیلے کے بائیں جانب دو پختہ حوض ہیں جن میں پانی بھرا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک حوض مردوں کے لئے ہے اور دوسرا عورتوں کے لئے۔ یہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان حوضوں کا پانی کتنے ہی امراض سے شفا بخشتا ہے۔ ان سے چند گز کے فاصلے پر ایک بڑا حوض ہے جس کے گرد چار دیواری کھنچی ہے اور دیوار قد آدم اونچی ہے۔ اس حوض کی تہہ میں غلیظ، سبز رنگ کا بدبودار پانی ہے جس میں کتنے ہی چھوٹے بڑے مگرمچھ ہیں۔ جب میں ۸ / مارچ ۵۸ء کو اس جگہ سیر کے لئے گیا تو گننے پر معلوم ہوا کہ اس میں کل ۲۸ مگرمچھ ہیں۔ اس حوض کے آس پاس باغات ہیں جن میں کھجور اور دوسرے خوشنما اور سر سبز درختوں کے جھنڈ ہیں۔ ان باغوں کے پچھواڑے ایک وسیع میدان ہے جو مغربی پہاڑ تک پھیلا ہے یہ پہاڑ سڑک کے متوازی شمالاً جنوباً واقع ہے۔ اسی طرح دوسری جانب ایک اور پہاڑ مشرق میں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ موضع منگا پیران دونوں پہاڑوں کے مابین، جو لفٹننٹ کارلس کے اندازہ کے مطابق سات آٹھ فٹ اونچے ہیں، ایک وادی ہے۔ (گزیٹیر: ۱۰۱) مغربی میدان میں چند قبریں ہیں جن کی طرف ہم بعد میں رجوع کریں گے۔

سڑک کے مشرق کی طرف تھوڑے ہی فاصلہ پر ہندوؤں کے خالی مکانات اور عبادت گاہیں نظر آتی ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے منگھ پیر کا مقبرہ ہندوؤں، مسلمانوں دونوں کا مرجع تھا۔ شمال کی طرف کم و بیش ایک میدان کے فاصلے پر نئی پرانی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ انہی میں سے ایک کوڑھیوں کا ہسپتال ہے جسے ابھی ابھی تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے پاس ایسے حوض ہیں جن میں قدرتی طور پر گرم گندھک والا، بودار پانی پایا جاتا ہے۔ یہ حوض ان حوضوں سے زیادہ بڑے ہیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں اس مقام پر بسنے والے کتنے ہی مکرانی دکھائی دئے اور بے شمار ایسے لوگ بھی جو ہر طرف سے ان حوضوں میں نہانے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

اب تک ہم نے منگا پیر کے چیدہ چیدہ مناظر پر روشنی ڈالی ہے یعنی اس مقام کے آس پاس، دائیں بائیں، دو پہاڑ، گندھک ملا پانی جو ان پہاڑوں سے بہہ کر آتا ہے، کھجوروں کے درخت، مگرمچھ، منگا پیر کا مقبرہ اور دوسری قبریں۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں جو لوگوں کے لئے اس قدر جاذب توجہ ثابت ہوئی ہیں، نئی ہیں یا پرانے زمانے کے سیاحوں اور مصنفوں نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے ہم سندھی مؤرخ میر علی شیر قانع کی تصنیف "تحفۃ الکرام" کے خود نوشت نسخہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جو

---

[1] A.F. BAILLIE ; KURRACHEE : PAST, PRESENT AND FUTURE, LONDON 1890.

۴ جمادی الاول ۱۱۸۲ھ مطابق ۱۶ ستمبر ۱۷۶۸ء کو مکمل ہوا تھا۔ اس کتاب کے آخری حصہ میں ایک فصل بہ عنوان "طوق منگہ" ہے جس کے تحت قانع لکھتا ہے :-

'طوق منگہ ایک مشہور پہاڑ ہے۔ ایک بزرگ ولی اللہ حاجی منگہ جو شیخ بہاؒ الدین ملتانی کے معاصر تھے، کا مدفن با حضور و صفا اس مقام پر ہے نیک نہاد لوگوں اور برگزیدہ ارباب ہدایت کی دعاؤں کا محلِ اجابت ہے۔ اس پہاڑ سے جو طوق منگہ کے نام سے مشہور ہے، اس کے دامن میں گرم پانی بہہ کر آتا ہے جو دو کنوؤں کی گہرائی کے برابر پہاڑ کے درمیان سے ایک کھائی میں گرتا ہے۔ اس کھائی میں مگرمچھ رہتے ہیں جنہیں "مور" کہتے ہیں۔ ایک مگرمچھ کے مرنے پر دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور وہی طاؤس یعنی مور کا لقب پاتا ہے۔ عقیدت مند لوگ یہاں بھیڑ بکریوں کی نذر لے کر آتے ہیں اور اس جگہ حلال کرتے ہیں۔ گوشت کا پہلا ٹکڑا ان "موروں" ہی کو پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ کھا لیں تو سمجھو نذر قبول ہوئی ورنہ نہیں۔ نیز اس کھائی کے پاس ایک اور چشمہ ہے۔ ان دونوں چشموں کے مابین ایک پتھر ہے۔ اگر گرم چشمے کا پانی اس پتھر پر ڈال کر نیچے سے پیالے یا کٹورے میں جمع کریں تو وہ بالکل ٹھنڈا نظر آئے گا۔ ان چشموں کا پانی زیادہ تر ڈھلان میں بہہ جاتا ہے۔ اس پانی میں بے شمار مگرمچھ جمع ہیں۔ اور خوش آیند باغات پانی کے دونوں طرف واقع ہیں۔ پھر ان دونوں چشموں کے قریب ایک پتھر کا کنواں ہے۔ جس میں ان دونوں چشموں کے پانی کے علاوہ ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہے۔ جس میں "ھنج" نام ایک مگرمچھ ہے۔ اس کنوئیں کو کوزہ حاجی منگہ کہتے ہیں۔ نیز حاجی منگہ کی پہاڑی میں ایک نہر ہے جس کا نام "کندری مخدوم شہباز" ہے۔ اس کا پانی گرم ہے اور اس کے دونوں کناروں پر خوش آیند باغات اور فقرا کے متبرک تکیے ہیں'۔

قانع کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ اس موضع کی عمومی کیفیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ جو کچھ اہم ہے کچھ غیر اہم، بارھویں صدی ہجری کے آخری ربع میں یعنی آج سے دو سو سال پہلے آج کل کے مطابق تھا۔ قانع کے قول کے مطابق حاجی منگہ حضرت بہاء الدین ملتانی (۶۶۶ھ / ۱۲۶۷ء) کے معاصر تھے یعنی حاجی مذکور کا عہد ساتویں صدی ہجری یا تیرھویں صدی عیسوی تک پہنچتا ہے۔ ایک انگریز لفٹننٹ کارکس، جو ہندوستان کی بحریہ میں ملازم تھا اور اس کو ساحل ہند کی مساحت کا کام تفویض کیا گیا تھا، ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں منگہ پیر پہنچا اور اس نے اس مقام کے متعلق ایک مفصل بیان لکھا جس کے بعض اقتباسات "گزیٹر آف انڈیا" میں صفحہ ۱۰۱ اور اس کے بعد درج ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق مگرمچھ ایک جھیل میں —— جس کی لمبائی ۱۵۰ گز سے زائد نہ تھی لیکن چوڑائی ۸۰ گز سے زیادہ نہ تھی اس میں ۸ فٹ سے ۱۵ فٹ لمبے بڑے بڑے مگرمچھ تھے جن کی تعداد ۲۰۰ سے زیادہ نہ تھی۔ اور چھوٹے مگرمچھوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ اسی کے بیان کے مطابق لوگوں نے روایت کی کہ چونے کا وہ ٹیلہ جس پر حاجی منگہ کی قبر واقع ہے، دو ہزار سال سے موجود ہے! اس ٹیلہ کی مغربی جانب ڈھلان ہے۔ اور اس کے نیچے گرم پانی کا چشمہ جاری ہے۔ جو دو حوضوں سے ہو کر ایک "کھال" میں گرتا ہے۔ ان دو حوضوں میں سے ایک میں ایک بڑا اور تقریباً ۱۲ چھوٹے اور ننھے مگرمچھ ہیں۔ بڑے مگرمچھ کو 'مور' کہتے ہیں یعنی طاؤس۔ جو یہاں کے باشندوں کے عقیدہ میں مگرمچھوں کی نسل کا مورثِ اعلیٰ ہے۔ اس حوض کا پانی بالکل صاف اور نیم گرم ہے لیکن دوسرے حوض کا پانی جو اس سے چند ہی گز کے فاصلہ پر ہے، بالکل ہی ٹھنڈا ہے۔

سید لطف اللہ شکر اللہی شیرازی تتوی نے جو سید جمال الدین محدث، سید غیاث الدین منصور دشتکی اور میر صدر الدین محمد شیرازی کی اولاد میں

---

۵۱ ایک پیر کہن سال نے راقم الحروف کو یہ بتایا تھا کہ چار یار یعنی مخدوم جلال جہانیاں و شیخ عثمان مروندی، شیخ فرید اور شیخ بہاء الدین زکریا نے یہاں پہنچ کر منگہ پیر کو دیکھا تھا۔ اور ایک پہاڑ میں، جو اس موضع کے مغرب میں واقع ہے، ایک جگہ ان کے سجدوں کے نشان پتھر پر برقرار ہیں۔ اسی طرح مہسوان کے قریب پہاڑ میں ایک ہی ستون کا بڑا جبوترا ہے کہتے ہیں کہ چاروں دوست یہاں مکاشفہ کے لئے بیٹھے تھے اور یہ ایک بڑا مشہور اور برگزیدہ مقام ہے۔ (تحفۃ الکرام)

۵۲ عوام الناس کے عقیدہ کے مطابق حاجی منگہ کی آمد سے پہلے اس جگہ ایک بزرگ کی قبر تھی جس کی شہرت کی بناء پر لوگ یہاں نذریں پیش کرنے آتے تھے جب حاجی منگو یہاں پہنچے تو یہاں کے درویشوں نے ان کا مضحکہ اڑایا۔ اور شدید سردی کے باوجود گھاس پھونس جمع کر کے اپنے لئے آگ جلانے کی اجازت نہ دی۔ حاجی نے ان کے حق میں بددعا کی اور ان کی شکلیں ایسی مسخ ہوئیں کہ وہ سب مگرمچھ بن گئے!۔

سے تھا، تقریباً سو سال قبل اس موضع کا ذکر کیا ہے۔ وہ دسمبر ۱۷۵۵ء میں ٹھٹھہ سے سفرِ حج پر روانہ ہوا تھا اور اس نے اپنا سفرنامہ موسوم بہ "تحفۃ الناصرین" کراچی میں چھپوالیا تھا۔ اس کتاب کے صفحہ ۶ پر وہ لکھتا ہے کہ وہ ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۷۲ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۷۵۵ء میں شاہ منگھ علیہ الرحمۃ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اس کے بعد بیان کرتا ہے کہ :۔

"پہاڑ سے عجیب قدرتی پانی نکلتا ہے جو ایک جگہ تو گرم ہوتا ہے مگر نہر میں جاری ہو کر سرد ہو جاتا ہے۔ یہ سب اللہ کی قدرت اور اولیاء کی نظر کی برکت ہی ہے جو یہاں مشاہدہ کی گئی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہاں پہاڑ کے پائیں ایک تالاب میں مگرمچھ ہیں جن میں سے ایک 'مور' کہلاتا ہے۔ یہ مگرمچھ دوسروں کے ساتھ جمع ہو کر اکٹھے رہتے ہیں اور وہاں کے زائرین کا دستور یہ ہے کہ وہ بکروٹا ذبح کر کے اس کا گوشت ان جانوروں کو کھلاتے ہیں۔ اگر 'مور' کسی کا بکروٹا کھالے تو وہ شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کی مراد بر آئیگی۔ ورنہ معاملہ مشکوک ہے۔ خبر نہیں یہ اس ملک کا رواج ہے یا مجاوروں نے ذاتی لالچ کے لئے مکروفریب کا جال پھیلا رکھا ہے۔ کیونکہ کسی کتاب میں اس کا ذکر یا سند نہیں پائی گئی۔ مگر یہ سب اسی بزرگ کی کرامات ہے کہ یہ جانور رات دن انسانوں میں رہتے ہیں اور کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔"

یہ تھی اس موضع کی داستان بارھویں صدی سے لیکر چودھویں صدی ہجری کے مصنفین کی تصانیف میں جس سے اس موضع کے بزرگ کا تذکرہ ساتویں صدی ہجری تک پہنچتا ہے لیکن ہم اس موضع کی قدامت کو اس سے بھی پہلے تک پہنچا سکتے ہیں۔

ابن حوقل ۔ (۳۶۶ھ کے لگ بھگ) اور ادریسی (متوفی ۵۶۰ھ ۱۱۶۶ء) اس مقام کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ سندھ کے مقامات میں 'منجابری' نام ایک موضع ہے جو دیبل[1] سے دو پڑاؤ کے فاصلے پر ہے اور ارمائیل کے راستے پر واقع ہے۔ ارمائیل میں جو ادریسی کے بیان کے مطابق نشیب میں واقع تھا، پانی کا تالاب اور چشمے تھے۔ اور آس پاس باغات۔ یہ تمام تفصیلات منگا پیر کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ اس سے یہ بات پایۂ یقین تک پہنچ جاتی ہے کہ ۔ بری اور 'پیر' سے قطع نظر جو لفظ 'منجا' پر اضافے ہیں، منجا اور منگا ایک ہی چیز ہے۔ اور پیر کا اضافہ مرورِ وقت کے ساتھ ہوا۔ جو علاقہ بیلہ کے قصبات کے ناموں میں بہت عام ہے۔ یعنیہٖ 'بری' کی طرح جو اصل نام پر اضافہ ہے۔ کننگھم[3] (۳۳۲) کی رائے میں احتمال یہ ہے کہ 'منجابری' منڈابری یا منڈاوری ہو یعنی شہر منڈ۔ اور یہ لوگ وہی ہیں جن کا فتوح البلدان بلاذری (مطبوعہ لیدن ص ۴۳۵ مع حاشیہ قرأت مند بجائے مید) میں مند کے نام سے ذکر کیا گیا ہے : "قوم من مید الدیبل" یعنی دیبل کے میدوں کی اقوام میں سے۔ چونکہ منجابری کا کلمہ غیر معروف سا تھا اس لئے اس میں تصحیف ہوتی رہی۔ لہٰذا عرب جغرافیہ دانوں کی تصانیف میں یہ مجابری، منخاری، مناتری، منابری وغیرہ کی شکل میں مسطور ہے۔

ہولڈچ (ص ۳۰۹) جس نے سید لطف اللہ شیرازی (۱۷۵۶ء) کی طرح منگہ پیر کو "مگر پیر" کہا ہے اپنے بیان کے آخر میں اس موضع کے متعلق یوں لکھتا ہے کہ :

"مگر پیر کا محلِ وقوع ان پہاڑی دیواروں کے ساتھ جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ گرم پانی کے چشموں کے ساتھ جو اس سے متصل ہیں اور ان باغات کے ساتھ (جو اس نواح میں اس قدر نادر الوقوع ہیں کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی یہاں پر موجودگی عدیم النظیر ہے) نیز ساحلِ دریا

---

[1] "ارمائیل" (لس بیلہ) ملاحظہ ہو تصنیف :

THE GATES OF INDIA, LONDON 1910: COL. SIR THOMAS HOLDICH.

"جنرل ہیگ نے دیبل کے کھنڈرات کراچی کے جنوب کی مشرقی جانب ۴۵ میل اور ٹھٹھہ کے جنوب مغرب میں ۲۰ میل دور قرار دیئے ہیں۔" (ہولڈچ ص ۳۱۰)

[2] 'باڑی۔ واڑی' کے معنی ہندی میں ہیں باغ، احاطہ، یا گوٹ تعلقہ میرپور ساکرو کے جنوب میں ایک جگہ گھوڑا باری جس میں باری کا لاحقہ موجود ہے :

[3] CUNNINGHAM: ANCIENT GEOGRAPHY OF INDIA, CALCUTTA. 1924.

سے نزدیکی اور سب سے بڑھ کر وہ آثار قدیمہ جو فن تعمیر کے سلسلہ میں اس قدر جاذب توجہ ہیں ، بلاشبہ و بلاخوفِ تردید اس امر کو متعین کرتے ہیں کہ یہ موضع وہی منجابری ہے جس کا ذکر ابن حوقل اور ادریسی نے کیا ہے اور جو دیبل سے دو پڑاؤ دُور ہے "

ہو لڈیچ کی یہ تحریر ہمیں اس موضع کے فن تعمیر سے متعلق جاذب نظر آثار کی طرف ملتفت کرتی ہے ۔

اس موضع کے سب سے جاذب توجہ آثار قبریں[1] ہیں جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں ، باغات کے مغرب میں اور سڑک کے دائیں بائیں ریتلے پتھر سے قبریں بنائی گئی ہیں جو سر تا سر خوبصورت نقوش سے آراستہ ہیں۔ ان قبروں کی وضع بہت ہی عجیب اور غیر متعارف ہے۔ ایک یہ کہ مدفن پر پتھر کا مستطیل خالی تعویذ، اس تعویذ کے اوپر اتنی ہی بلندی پر پتھر کی سلیں "ہرم" کی شکل میں ترتیب دی گئی ہیں یعنی اوپر کی ہر سل نیچے کی سل سے چھوٹی اور کم طول عرض کی ہے اور آخر میں ایک بڑے تختۂ سنگ کو عموداً ایک کونے میں نصب کیا گیا ہے ۔ مردانہ قبروں پر یہ پتھر ایسا نظر آتا ہے جیسے پاس کے شمالی کونے میں اونچا ساطرہ ہو ۔ عورتوں کی قبروں میں اس سے کچھ مختلف چیز پتھر کے جنوبی کونے میں پائی جاتی ہے بحیثیت مجموعی ان قبروں کی بلندی انسانی قد سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ، ان سب پتھروں پر اقلیدسی اشکال میں خوب کام کیا گیا ہے ۔ اور بہت عمدہ نقش و نگار اور جالیاں بنائی گئی ہیں ۔ عورتوں کی بعض قبروں پر نیچے کی طرف زیورات کے ابھرواں نقوش بنائے گئے ہیں اور بعض مردانہ قبروں پر اسی طرح جنگی ہتھیاروں ـــــ تلوار ، ڈھال ، بندوق اور دوسرے درانتی سے ملتے جلتے ہتھیار ، چاقو وغیرہ ـــــ کی تصاویر بنائی گئی ہیں ۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک قبر کے بالائی پتھر پر ایک سوار کی تصویر بنائی گئی ہے جس کے گھوڑے نے گویا زرہ بکتر پہن رکھی ہے ۔ اور اس سے کچھ نیچے اسی قبر پر ایک شخص کی تصویر کھینچی گئی ہے جس نے مغلیہ دور سے ملتی جلتی قبا پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں ایک پھول کی منہال لئے ہوئے ہے ۔ جو زمین پر دھری ہے ۔ مسلمانوں کی قبروں پر راقم الحروف نے ایسی تصویریں اور کہیں نہیں دیکھیں اور واقعی بہت ہی نادر ہیں ۔

ان میں سے بعض قبروں کے پتھروں پر کچھ عبارت بھی تحریر ہے لیکن چونکہ یہ زیادہ اُبھری ہوئی نہیں تھی ، نیز دھوپ اور دوسرے اثرات کی وجہ سے اکثر حروف تقریباً مٹ گئے ہیں ۔ دو تین جگہوں پر شمالی جانب بعض قبروں کے بالائی پتھر پر کلمہ طیبہ خط نسخ میں مرقوم ہے ۔ مگر چونکہ پتھر کم چوڑا ہے ۔ اس لئے کلمہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے چار سطروں میں لکھا گیا ہے ۔ اس طرح :

لا الہ ا

لا اللہ

محمد رسو

ل اللہ

اس مقام پر یعنی ان قبروں میں جو کہ منگا پیر کے ٹیلے کی مشرق کی طرف ہیں ۔ صرف ایک قبر کے نچلے پتھر پر نام بھی نظر آتا ہے ۔ یعنی ،

کاتور (؟) ابن حسین (؟)

اُس میدان میں جو اس ٹیلے کے جنوب مغرب میں باغات کے پیچھے ہے ۔ چند قبریں ہیں جو نسبتاً زیادہ اہم ہیں ۔ ان سب پر بہت عمدہ ، لطیف ، نازک اور متنوع نقوش ہیں ۔ ان میں سے کم از کم چار قبروں پر عبارتیں تحریر ہیں ۔ جن سے اس زمانہ کی قبروں کا زمانہ متعین کیا جا سکتا ہے ۔ اسی جگہ ایک مقبرے کا کھنڈر بھی ہے جو ایک چبوترے پر واقع ہے ۔ اس کا گنبد موجود نہیں لیکن تمام اطراف کے سنگین ستون جن پر یہ قائم تھا ، برقرار ہیں ۔ اور ان دونوں قبروں سے متصل دو اور قبریں ہیں جو چبوترے پر بنی تھیں لیکن حسب معمول گنبد اور ستونوں کے بغیر ۔ ان دو قبروں پر جو بالائی پتھر تھے وہ ٹوٹ گئے ہیں ۔ مذکورہ مقبرہ کے ایک ستون پر خط نستعلیق میں ایک فارسی عبارت تحریر ہے جو صرف آدھی پڑھی جا سکتی ہے ۔ اس کی کیفیت یہ ہے :-

---

[1] اس قسم کی قبریں جن پر اشکال مرتسم ہیں ، سندھ کے بعض اور مقامات میں بھی موجود ہیں ۔ وہاں بھی عورتوں کی قبروں پر زیورات کے نقوش ہیں اور ان لوگوں کی قبروں پر جو لڑائی میں فوت ہوئے ہوں ، ہتھیاروں کے نقوش بنائے گئے ہیں ۔ جو لوگ طبعی موت مرے ہوں ، ان کی قبروں پر سوار وغیرہ کا نقش بنایا جاتا ہے ۔

(ایک دو الفاظ جو پڑھے نہیں جاسکتے)

مبلغ پانچ ہزار پانچ سو روپیہ حجر (قبر) صندل ملک وحیدر (؟) ولد ملک ہارون دوھا ولد ملک ہارون پر خرچ آئے۔

مقبرہ کے اندر ایک پتھر پر یہ کتبہ ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ

رب لاتذرنی فردا وانت خیر الوارثین

ایں تربت سلنی (؟ تلہتی ؟) ولد حسن

بتاریخ عاشر جماد (کذا) الاول ۱۱۵۶

دوسرا کتبہ جو اسی جگہ ہے، اس طرح ہے:-

لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ایں قبر (ناخوانا) بولاخاں [1]

برائیں (؟) صہ وصد پنجاہ روپیہ خرچ شدہ (دوسطر ناخوانا)

تیسرا کتبہ بھی جس پر تاریخ بھی درج ہے، یہیں ہے:-

بتاریخ ...... عاشر جمادی الاول (؟) ۱۱۸۶

"امپیریل گزیٹیر" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ اس مقبرہ کا گنبد برقرار تو تھا لیکن ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ قبروں کی تعداد بظاہر چار تھی۔ ان کے پتھر اس وقت اپنی جگہ سے نیچے گر پڑے تھے۔ غالباً اس لئے کہ ان کو کسی مسالہ سے جوڑا نہیں گیا تھا بلکہ ان کو ایک دوسرے پر ٹکا دیا گیا تھا۔

مرتب "گزیٹیر" کے بیان کے مطابق زیادہ مشہور روایت یہ تھی کہ شکستہ مقبرہ ایک شخص سردار خاں کا مدفن تھا جو قبیلہ نمریہ یا نہمڑ و جس کا شمار اس علاقہ اور اس کے شہروں کے بزرگ ترین قبائل میں ہے اور سمہ (یعنی راجپوت) قوم سے متعلق ہے، کی ایک شاخ برفاتی (یا بلفاتی) کا سربراہ تھا۔ یہ شخص ایک موضع اللہ لونا، جو منگھو پیر سے دس میل دور واقع ہے، کی لڑائی میں جوکھیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ لیکن یہی روایت اس نواح کے جوکھیوں میں ماکیر کی ان قبروں کے بارہ میں بھی رائج ہے جو اس وضع وہیئت کے ساتھ وہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس روایت سے بلاشبہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جوکھیا جو بالآخر ماکیر اور سندھ کے ڈیلٹائی خطے پر مسلط ہوگئے تھے برفتیوں کے ساتھ بکثرت برسر آویزش وپیکار رہے۔[2] مؤلف مذکور یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اس مقبرہ میں ۹۱۲ھ - ۱۵۰۶ء یعنی سموں کے عہد کا ایک پتھر بھی ہے۔ لیکن یہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اگر یہ ان پتھروں کے نیچے دب گیا ہے جو دوسرے پتھروں کے نیچے چھپ گئے ہیں، تو یہ ممکن ہے۔ ورنہ جتنی تاریخیں یہاں نظر آئی ہیں وہ ۱۲ ویں صدی ہجری یعنی عہد کلہوڑہ ہی سے متعلق ہیں۔ (ترجمہ)

---

[1] گویا یہ وہی بولاخاں نہمڑو ہے جس کا ذکر مرزا قلیچ بیگ نے اپنی انگریزی میں لکھی ہوئی "تاریخ سندھ" میں کیا ہے۔ "مظہر شاہجہانی" (جو شاہجہاں کی تخت نشینی کے ساتویں سال مرتب ہوئی) مصنفہ یوسف میرک بن ابوالقاسم نمکین کے قلمی نسخے کا کاتب بھی "نہمڑ" کا ہجا یونہی کرتا ہے یعنی ہائے ہوز سے لیکن مرزا قلیچ بیگ کی "تاریخ سندھ" اور امپیریل گزیٹیر میں اس کو نومڑی لکھا ہے یعنی واؤ سے۔

[2] امپیریل گزیٹیر ص ۱۰۴۔

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

ابھی ٹوٹی نہیں دیوارِ زنداں، آؤ دیوانو
کوئی مشکل نہیں جو ہو نہ آساں، آؤ دیوانو

گریباں چاک دیوانوں پہ ہنستے ہیں خرد والے
خرد والوں سے ہوں دست و گریباں، آؤ دیوانو

خرد کی گتھیاں سلجھائیں فرزانوں کے کام آئیں
جنوں کب تک رہے گا ہم پہ بہتاں، آؤ دیوانو

یہاں صحرا سے بڑھ کر وحشیوں کی قدر ہوتی ہے
یہ بزمِ عشق ہے، باساز و ساماں، آؤ دیوانو

دکانِ شیشہ گر سمجھے تھے میخانہ نکل آیا
مکدّر ہو نہ جائے عیشِ مستاں، آؤ دیوانو

یہ فرزانوں کی بستی میں صدائے آشنا کیسی
کوئی دیوانہ ہے شاید غزلخواں، آؤ دیوانو

بھری محفل، وہی اپنا حفیظ اور اس کی تنہائی!
کہیں سے ڈھونڈ لائیں کوئی انساں آؤ دیوانو

جمیل نقوی

ترا حسنِ عشق پیکر اگر آشکار ہوتا
نہ خرد فریب کھاتی نہ جنوں شکار ہوتا

تری بزمِ کن فکاں میں عجب انتشار ہوتا
اگر عشقِ سادہ فطرت نہ حریفِ دار ہوتا

نہ چمن میں آشیانہ سرِ شاخسار ہوتا
نہ خزاں کا خوف ہوتا نہ غمِ بہار ہوتا

کبھی یوں بھی کاش ہم پر اثرِ بہار ہوتا
کہ شرارِ آتشِ گل بھی نظر پہ بار ہوتا

یہی سوچ کر نگاہوں سے اٹھا دیئے ہیں پردے
مرا طرزِ کم نگاہی تجھے ناگوار ہوتا

یہ افق افق نظارے یہ چمن چمن بہاریں
جو مری نظر نہ ہوتی یہ جہاں غبار ہوتا

تری ملتفت نگاہیں جو فسانہ کہہ رہی ہیں
میں فریب کھا گیا تھا اگر اعتبار ہوتا

میں یہ سوچتا ہوں اکثر مری آگہی کا حاصل
غمِ عاشقی نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

جو خزاں کا غم نہ ہوتا تو خدائے رنگ و خوشبو
یہ جہانِ رنگ و خوشبو ترا شاہکار ہوتا

تری آرزو نہ کرتے، تری جستجو نہ کرتے
ہمیں اپنے دل پہ ظالم اگر اختیار ہوتا

مرے دل میں ہے یہ حسرت کہ جمیل میرے غم میں
کوئی اشکبار ہوتا کوئی بیقرار ہوتا

غزل

ادیب سہارنپوری

مری زندگی میں شامل جو نہ تیرا پیار ہوتا
تو نشاطِ دو جہاں بھی مجھے ناگوار ہوتا

مرے شوقِ جستجو کا کسے اعتبار ہوتا
سرِ راہ منزلوں تک نہ اگر غبار ہوتا

میں تجھے خدا سمجھ کر نہ گناہگار ہوتا
اگر ایک بے نیازی ہی ترا شعار ہوتا

اثر ان کی گفتگو میں، تو دلوں میں پیار ہوتا
مرے ناصحوں کا جانا۔ جو بکوئے یار ہوتا

جو ستم زدوں کا یارب کوئی غمگسار ہوتا
تو غمِ حیات اتنا نہ دلوں پہ بار ہوتا

خرد اعتراف کرتی نہ جنوں کے معجزوں کا
گل و یاسمن کا دامن جو نہ تار تار ہوتا

ترے مہر و ماہ و انجم کو گلہ ہے مجھ سے یارب
کہ ہمیں بھی چین ملتا، جو تجھے قرار ہوتا

جو بغیرِ رونمائی کے یہ رنگ ہے تو یارب
دل و جاں پہ کیا گذرتی جو غمِ آشکار ہوتا

نہ سکونِ دل کی چاہت میں تڑپ ادیبؔ اتنا
کسی اور کو تو ملتا۔ جو کہیں قرار ہوتا

★

شیدا گجراتی

ہدفِ برقِ بے اماں ہیں ہم
زندگی کے مزاج داں ہیں ہم

کشتۂ سعیِ رائیگاں ہیں ہم
دکھ بھرے دل کی داستاں ہیں ہم

بے نیازانہ سوئے منزلِ دوست
بیخودی میں رواں دواں ہیں ہم

نغمۂ بے صدا سہی لیکن
لالہ و گل کے ترجماں ہیں ہم

عشق کا دور مختصر ہی سہی
حاصلِ عمرِ جاوداں ہیں ہم

آج بھی عام ہے حدیثِ جنوں
آج بھی روحِ داستاں ہیں ہم

ہم سے پوچھو مزاجِ رنگِ چمن
شاہدِ گل کے رازداں ہیں ہم

جادہ پیما ہے کاروانِ خیال
کیا خبر ان دنوں کہاں ہیں ہم

دل کی بے ربط دھڑکنوں کی قسم
محرمِ سرِّ دلبراں ہیں ہم

لاکھ معتوبِ بارگاہ سہی
پھر بھی عنوانِ داستاں ہیں ہم

سینۂ کائنات میں شیداؔ
خلشِ دردِ بے کراں ہیں ہم

★

میری قمیص
پٹخنا بند کرو...
چٹاخ! چٹاخ! ٹوٹے بٹن تار تار کالر پھٹی آستیں!
میں اس طرح اپنی قمیص دھلوانا نہیں چاہتا۔
سن لائٹ صابن استعمال کیجئے
جی ہاں۔! جب سن لائٹ صابن کافی مل سکتا ہے تو کپڑوں کو اس طرح
کوٹ پیٹ کر دھونے کی کیا ضرورت سن لائٹ کے جلد اثر کرنیوالے
جھاگ سے کونے کونے بغیر میل خود بخود صاف ہوجاتا ہے۔ کپڑے
بھگو دیجئے، سن لائٹ صابن ملئے اور دھو ڈالئے بس آپ کا کام
ختم ہوگیا۔ اپنے تمام کپڑے سن لائٹ صابن سے دھوئیے۔!
یہ آپ کے ہاتھ کی جلد کے لئے بھی مضر نہیں ہے
SUNLIGHT SOAP
سن لائٹ صابن
پٹخے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے

۱۹۵۸ء سائنس کی پوری تاریخ میں اس لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہیگا کہ اس سال انسان مصنوعی چاند بنانے میں کامیاب ہوگیا جو ماہ نخشب سے قطعی مختلف ہے۔ پہلے امریکہ اور پھر روس نے یکے بعد دیگرے کئی مصنوعی سیارچے فضا میں چھوڑے۔ قوت کے استعمال کے بغیر مادی اجسام کو زمین کے چاروں طرف گرداں رکھنا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جسے بجا طور پر دوسرے جہانوں کے سفر کی ابتدا کہا جا سکتا ہے۔ انسان نے جب سے اس خاکدان پر ہوش سنبھالا ہے، وہ چاند اور دوسرے سیاروں کے حسن سے مسحور ہوتا رہا ہے اور اس کی یہ آرزو رہی ہے کہ وہ کسی بھی طور ان تک پہنچ جائے۔

نظام شمسی: کائنات بےشمار ستاروں سے بھری ہوئی ہے۔ سورج بھی ایک معمولی ستارہ ہے۔ نو سیارے اسکے تابع فرمان رہتے ہوئے اسکے چاروں طرف گردش کرتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے ستاروں کے بھی اپنے اپنے سیارے ہونگے لیکن ہماری سب سے بڑی دوربین بھی ہمیں ان کی جھلک دکھانے سے قاصر ہے، اسلئے جب ہم دوسرے جہانوں تک پہنچنے کا کوئی منصوبہ تیار کرتے ہیں تو اسکا تعلق صرف نظام شمسی کے سیاروں ہی سے ہو سکتا ہے۔

نظام شمسی میں اب تک نو سیارے دیکھے جا چکے ہیں۔ سورج کی طرف سے مختلف فاصلوں پر ان کی ترتیب یہ ہے: عطارد، زھرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، بنتون اور پلوٹو۔ یہ سب مختلف رفتاروں کے ساتھ سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ چاند آفتاب کا سیارہ نہیں، وہ ہماری زمین کا سیارہ ہے کیونکہ وہ زمین سے پیدا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف گھومتا ہے۔ اس لئے اسے سیارچہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

دوسرے سیاروں کے کئی کئی چاند ہیں—مریخ کے دو اور مشتری کے بارہ— لیکن ہمیں صرف اپنے چاند اور اپنے ان دو پڑوسی سیاروں سے سروکار ہے جو ہماری زمین کے ادھر ادھر واقع ہیں یعنی مریخ اور زھرہ—زھرہ سورج سے ہماری زمین کی بہ نسبت قریب اور مریخ دور ہے۔اس وقت راکٹ اور مصنوعی سیارچوں کے ماہرین کی نظر ان تین جہانوں پر ہے۔ دیکھئیے ان میں سے کون انسان کی پہلی خلائی منزل بنتا ہے۔ البتہ یہاں بیٹھے بیٹھے بھی ان کی سیر دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

چاند: چاند کا قطر ۲۱۵۸ میل ہے اور وہ تقریباً دو ارب سال قبل ہماری زمین سے الگ ہوا تھا۔ شروع میں وہ قریب تھا لیکن رفتہ رفتہ دور ہوتا چلاگیا۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اس وقت وہ ہم سے تقریباً دو لاکھ انتالیس ہزار میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور زمین کے گرد تقریباً ۲۸ دن میں ایک گردش پوری کرلیتا ہے۔ اسکے

ساتھ ساتھ وہ اپنے محور پر بھی گھومتا ہے یعنی وہاں بھی دن اور رات کا وہی سلسلہ جاری ہے جو ہم زمین پر دیکھتے ہیں۔لیکن اب اسے اتفاق کہئے یا کچھ اور، چاند جتنے عرصے میں ہماری زمین کے چاروں طرف ایک بار گھومتا ہے ، اتنے ہی عرصے میں اپنے محور پر بھی ایک گردش پوری کر لیتا ہے ۔ یہ مدت ۲۸ دن ہے ۔ گویا اس کا دن اور رات ہمارے چودہ چودہ دن کے برابر ہوتے ہیں ۔ اس کا ایک ہی رخ ہماری طرف رہتا ہے ۔ کسی نے آج تک چاند کا دوسرا رخ نہیں دیکھا !

ہوا کی غیر موجودگی : چاند کے جس حصے پر دن رہتا ہے اس کا درجہ٭ حرارت ۲۰۰ درجے فارن ہئیٹ تک پہنچتا ہے یعنی پانی کے نقطہ٭ جوش کے قریب ، اور رات کو اتنی سردی ہوتی ہے کہ پارہ صفر سے ڈھائی‌سو درجے نیچے گرجائے۔ درجہ٭ حرارت کے اس زبردست فرق کی اصلی وجہ یہ ہے کہ چاند پر ہوا موجود نہیں جو ہر سیارے کیلئے بڑے اچھے غلاف کا کام کرتی ہے۔ نہ سردی کو حد سے تجاوز کرنے دیتی ہے اور نہ گرمی کو ۔ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے چاند پر کوئی آواز بھی نہیں سنائی دیگی ۔ وہ تو ایک مردہ دنیا ہے ۔ ویران ، خوفناک اور سنسان ۔ جو لوگ وہاں جائینگے انہیں آپس میں گفتگو کرنے کیلئے وائرلیس سیٹ استعمال کرنے پڑینگے کیونکہ ریڈیائی لہروں کو ہوا کی ضرورت نہیں ۔ ہم زمین پر طلوع و غروب آفتاب کے جو خوبصورت مناظر دیکھتے ہیں وہ بھی ہوا نہ ہونے کی وجہ سے چاند پر مفقود ہونگے ۔

کشش ثقل : چاند پر پانی بھی موجود نہیں ، اس لئے وہاں کسی قسم کی نباتات یاحیات کے موجود ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ چونکہ وہ ایک چھوٹا سیارہ ہے اسلئے اسکی کشش بھی ہماری زمین سے کم ہے، تقریباً چھٹا حصہ ۔ اسلئے وہاں ہر چیز کا وزن کم محسوس ہوگا ۔ چلنے پھرنے میں بڑا ہلکاپن محسوس ہوگا ۔ توازن برقرار رکھنے کے لئے بھاری جوتے پہننے پڑینگے ۔

قمری سطح : چاند کی سطح بھی بڑی بے ترتیب سی ہے — ہم جن علاقوں کو پہلے سمندر سمجھتے تھے ، وہ سب ریگستان ہیں ۔ اگر ایک طرف اٹھارہ ہزار فٹ بلند پہاڑ کھڑے ہیں ، تو دوسری طرف اتنے ہی گہرے غار منہ پھیلائے نظر آتے ہیں ۔ چاند پر شروع میں آتش فشاں پہاڑ عام تھے لیکن اب سب سرد ہو چکے ہیں ۔ ان کے چھوڑے ہوئے دہانے اسقدر فراخ ہیں کہ ہمیں یہاں سے بھی آسانی سے نظر آ جاتے ہیں ۔ چاند کے چہرے کے دھبے یہی سیاہ دہانے ہیں۔ کچھ دہانے اس زمانے کی یادگار ہیں جب چاند پگھلی ہوئی حالت میں تھا اور بڑے بڑے شہاب بلا روک ٹوک اسکی سطح پر گرتے تھے ۔
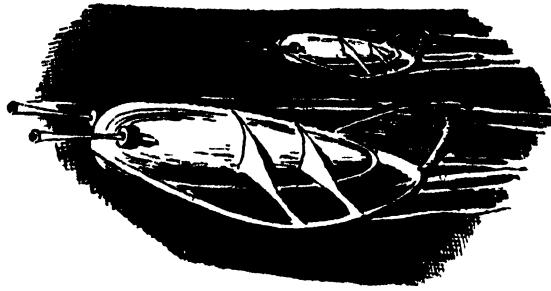
چاند کی ویرانی کے پیش نظر بعض امریکی سائنس‌دانوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہمارے لئے زہرہ اور مریخ کا رخ کرنا زیادہ مناسب رہیگا جہاں حیات کی کوئی توقع ہو سکتی ہے ۔

زہرہ : زہرا نظام شمسی کا دوسرا سیارہ ہے ۔ سورج سے اس کا اوسط فاصلہ ۶۷،۰۰۰،۰۰۰ میل رہتا ہے ۔ یہ چمکدار سیارہ بہت سی باتوں میں ہماری زمین سے مشابہ ہے، اسلئے اسے اکثر زمین کی بہن کہا جاتا ہے ۔ جسامت میں وہ اس سے ذرا چھوٹا ہے ۔ اس کا ایک سال ہمارے ۲۲۵ دن کے برابر ہوتا ہے۔ قیاس ہے کہ اسکا دن ہمارے دن سے بہت لمبا ہوتا ہے ۔ شاید ہمارے تیس دن کے برابر۔

کثیف بادل: زمین سے زهره کا فاصله کم زیاده هوتا رهتا هے- کم سے کم ۲۶٬۰۰۰٬۰۰۰ میل اور زیاده سے زیاده ۱۶۰٬۰۰۰٬۰۰۰ میل رهتا هے - بہترین دوربینوں کی مدد سے بھی آج تک هم اس کی سطح نہیں دیکھ سکے - اسکے چاروں طرف کثیف بادل چھائے رهتے هیں - اس سے ظاهر هوتا هے که زهره پر فضا موجود هے لیکن دونوں فضاؤں کی بناوٹ میں بڑا فرق هے اور اس فرق کی مدد سے هی هم نے زهره کے کچھ حالات معلوم کئے هیں - کرهٔ ارض کی هوا میں دو گیسیں ممتاز حیثیت رکھتی هیں : آکسیجن اور نائٹروجن - ان کے علاوه کچھ ابخرات ، کاربن ڈائکسائڈ اور چند هلکی گیسیں بھی شامل رهتی هیں - ان سب پر آکسیجن حاوی هے - حیات اسی گیس کی مرهون منت هے - یه گیس تیزی سے خرچ هو رهی هے اور کچھ مدت بعد یہاں زندگی دوبھر هو جائیگی - اندازه لگایا گیا هے که جب سے دنیا بنی هے تب سے اب تک آکسیجن کی موجوده مقدار کا دوگنا حصه مختلف عوامل پر صرف هو چکا هے -

آکسیجن کا فقدان: جب هم جدید سائنسی آلات کے ذریعه زهره سے آنیوالی روشنی کا تجزیه کرتے هیں تو پته چلتا هے که وهاں کاربن ڈائکسائڈ میں زهریلی گیس تو افراط سے موجود هے لیکن آکسیجن مفقود هے - گویا اس وقت وهاں وه حالات هیں جو زمین پر شروع میں تھے جبکه حیات کی کوئی شکل یہاں نہیں تھی - امید کی جا سکتی هے که چند لاکھ سال بعد زهره پر بھی آبادی اور حیات کے آثار رونما هو جائیں گے -

درجهٔ حرارت: چونکه زهره هماری به‌نسبت سورج سے ذرا قریب واقع هے اس لئے اُس کا درجهٔ حرارت بھی کچھ زیاده رهتا هے - کثیف بادلوں کا غلاف اسکی سطح کو هر وقت گرم رکھتا هے - اوسطاً وهاں کا ٹمپریچر تقریباً اتنا رهتا هوگا جتنا

یہاں کھولتے هوئے پانی کا هوتا هے - خیال هے که اُسکی سطح پر بہت بڑے بڑے سمندر اور دلدلی علاقے پھیلے هوئے هیں - جیسے ابتدائی دور میں هماری زمین پر تھے -

چاند کی طرح زهره بھی گھٹتا بڑھتا نظر آتا هے - وه ایک صدی میں دو مرتبه سورج کے سامنے سے بھی گذرتا هے - اُسوقت وه دوربین کے بغیر بھی دیکھا جا سکتا هے - سب سے پہلے ان مشاهدات نے هی سورج کا فاصله معلوم کرنے میں هماری مدد کی تھی - زهره کو آئنده ایسے دو اتفاقات جون ۲۰۰۴ء اور جون ۲۰۱۲ء میں پھر پیش آئینگے -

مریخ: مریخ یه نظام شمسی کا چوتھا سیاره هے - سورج سے اس کا فاصله تقریباً ۱۴۲٬۰۰۰٬۰۰۰ میل رهتا هے اور هم سے کم از کم ۳۵٬۰۰۰٬۰۰۰ میل - اس کا ایک سال همارے ۶۸۷ دن کے برابر هوتا هے - یه هماری زمین سے کچھ چھوٹا هے - اس کا دن همارے دن سے صرف چالیس منٹ زیاده لمبا هوتا هے -

مریخ بڑی مدت سے تمام هیئت دانوں کے درمیان بحث کا موضوع بنا هوا هے ، البته سب کے سب اس بات پر ضرور متفق هیں که اگر نظام شمسی کے کسی سیارے پر حیات کی کوئی شکل موجود هے تو وه مریخ هے - زمین کی طرح اسکے

بھی شمالی و جنوبی قطبین ھیں جو کبھی برف سے ڈھکے نظر آتے ھیں اور کبھی خالی یعنی وھاں بھی موسم اسی طرح بدلتے ھیں جیسے زمین پر۔

زمین سے مشابہت: ھیئت‌داں کہتے ھیں کہ مریخ چاند کی طرح بے آب و گیاہ نہیں ھے۔ اسمیں کچھ نہ کچھ فضا ضرور موجود ھے اور یہ بھی یقین کیا جاتا ھے کہ اسمیں کچھ پودے بھی اگتے ھیں۔ اسپر نارنجی رنگ کے بڑے بڑے قطعات بھی دیکھے گئے ھیں جنھیں ھیئت‌داں بھی چالیس پچاس سال پہلے سمندر سمجھتے تھے لیکن اب یہ یقین کیا جاتا ھے کہ وھاں وسیع سمندر نہیں ھیں اور پانی بھی اس برف کی شکل میں ھے جو قطبین پر چھائی ہوئی نظر آتی ھے اور پگھل پگھل کر میدانی علاقوں کو سیراب کرتی ھے۔ باقی علاقے پر ریگستان ھیں، جو نارنجی نظر آتے ھیں۔ نباتات کا بدلتا ہوا رنگ میدانوں کو مختلف رنگتیں بخشتا ھے۔ بعض ھیئت دانوں اور سائنس‌دانوں کے خیال میں مریخ پر زندگی کے آثار موجود ھیں۔ بعض یہ بھی کہتے ھیں کہ وھاں ایسی ذھین مخلوق بھی موجود ھے جو نہایت ترقی یافتہ طیاروں یعنی ,,اڑن طشتریوں،، میں بیٹھکر ھماری زمین کی سیر کرنے آتی ھے۔ خیال ھے کہ وھاں کے وسیع ریگستان اسے پہلے ھی کہا چکے ھیں اسی لئے وہ نارنجی نظر آتے ھیں۔ لوھے کا زنگ اسے نارنجی بنا دیتا ھے۔ اگر ایسا ھے تو پھر وھاں پودے کس طرح اگتے ھیں ؟

ایسے سوالات ابھی تک تشنۂ جواب ھیں۔ البتہ وھاں ایسے حالات کا یقین ھے جن میں حیات پروان چڑھ سکتی ھے۔ ضروری نہیں کہ حیات کی شکل ویسی ھو جو زمین پر ھے کیونکہ جغرافیائی حالات ہر جگہ اپنا اثر دکھاتے ھیں۔

مریخ میں فضائی کی فضا بلندی تقریباً پچاس میل ھے۔ یہ فضا بیحد لطیف اور ھلکی ھے اور اسکی کل مقدار اس ھوا سے بھی کم ھے جو دنیا کی بلندترین چوٹی ,ایوریسٹ، پر چھائی ہوئی ھے۔ اسمیں ابخرات تو ھیں لیکن آکسیجن نہیں۔

چونکہ مریخ ھماری بہ نسبت سورج سے کافی دور ھے اسلئے وھاں سردی زیادہ پڑتی ھے۔ اندازہ ھے کہ دوپہر کے وقت وھاں کا درجۂ حرارت ۵۰ ڈگری فارن ھیٹ تک پہنچ جاتا ھے لیکن سہ پہر سے ھی سردی شروع ہوجاتی ھے جو غروب آفتاب کے بعد بڑھ جاتی ھے۔ رات کا درجۂ حرارت صفر سے غالباً ۱۳۰ درجے نیچے گر جاتا ھے۔ اگر وھاں کسی قسم کی حیات موجود ھے تو وہ گرمی سردی کے اس زبردست فرق کی عادی ھو چکی ہوگی لیکن ھمارے لئے یہ فرق سخت تکلیف‌دہ ثابت ہوگا اور ھمیں اپنے ساتھ ایسا لباس، اقامت گاھیں، غذا اور دوسری اشیاء لے جانی ہوں گی جو وھاں ھمارے قیام کو آرام‌دہ نہیں تو کم از کم ممکن ضرور بنا سکیں *

* * *

پاکستان شاہراہ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر ''ادارۂ مطبوعات پاکستان،، نے مصور کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا ہے۔ جو ملک میں اپنی افادیت اور نفس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ کتابیں ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائی گئی ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی ان اہم صنعتوں پر مختصر مگر مکمل معلومات اعداد و شمار اور اہم حقائق ، عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔

ہر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بارہ صفحے کی نفیس تصاویر سے مزین ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے ہر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذہن نشین ہوجاتی ہے۔

ہر کتاب میں جدید ترین معلومات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں - جن سے ملکی صنعت کی رفتار ترقی کا پورا جائزہ ہر شخص کی نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔
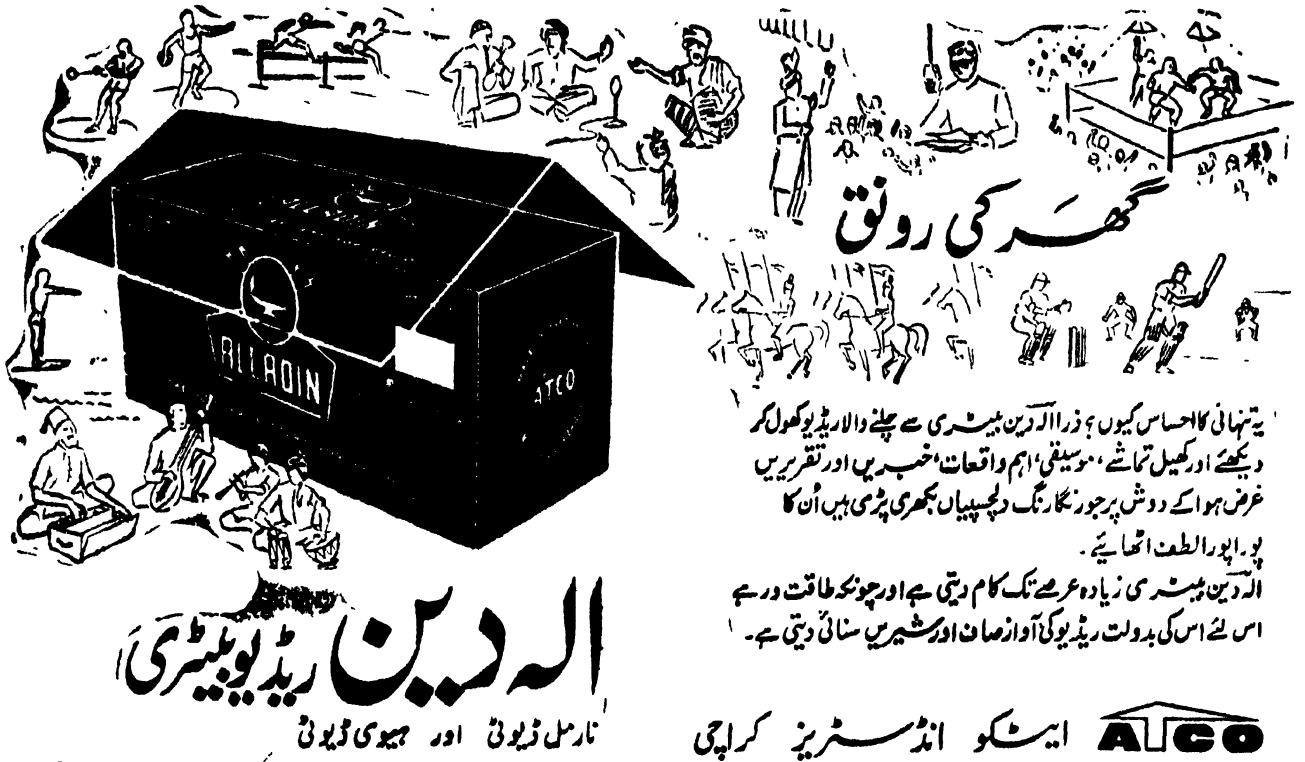
استفادۂ عام کے پیش نظر ہر کتابچہ کی قیمت صرف ۴ آنہ رکھی گئی ہے۔ یہ کتابچے اب تک شائع ہوچکے ہیں :-

- پٹ‌سن کی صنعت
- سمنٹ کی صنعت
- چائے کی کاشت اور صنعت
- کپڑے کی صنعت
- ن ججی کی صنعت
- ماہی گیری
- اشیائے صرف
- ذرائع آبپاشی کی صنعت
- کاغذ کی صنعت
- غذائی مصنوعات

ملنے کا پتہ :

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے

*　*　*

ہندوستان میں جن حضرات کو
"ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی"
کی کتابیں ، رسائل ، بالخصوص
"ماہ نو" اور دیگر مطبوعات
مطلوب ہوں وہ براہ راست
حسب ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں :

استفسارات بھی اسی پتہ پر بھیجے جاسکتے ہیں -

یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی
سہولت کے لئے کیا گیا ہے :

ادارۂ مطبوعات پاکستان

معرفت

پاکستان ھائی کمیشن - شیر شاہ مسجد روڈ
نئی دھلی - (بھارت)

منجانب : ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

پونڈز

خوبصورتی میں دلکش اضافہ کرنے کے لئے

پونڈز کولڈ کریم

پونڈز وینشنگ کریم

پونڈز فیس پاؤڈر

پونڈز لپ اسٹک

پونڈز ٹالکم پاؤڈر

LW ۹ CPI ۵۱۰

ڈیٹول
صحت کا
نگہبان
DETTOL

ان کی تندرستی اہم شے ہے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا سے کھانا تیار کرتی ہوں
اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت زیادہ غذائیت ہے۔ ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن اے کی اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی کے اچھے اور خالص گھی میں ہوتی ہے۔ ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود ہے! آپ کے بچوں کی صحت مند پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان دونوں وٹامن کی موجودگی ضروری ہے
ہمیشہ محفوظ اور پاک و صاف
ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ نباتی تیلوں سے تیار کر کے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور ہوا بند ڈبوں میں بھرا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تازہ اور صاف ستھرا ہے۔ اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں کو صحت مند رکھئے۔
ڈالڈا برانڈ وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے
HVM 13-193 UD

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر : رفیق خاور

چاٹگام ، مشرقی پاکستان : یہاں کے پہاڑی قبائل خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں
(''موگھا'' قبیلہ کی ایک لڑکی)

۱۹۵۳—۱۹۵۸ء

کے چیدہ مضامین نظم و نثر کا انتخاب

علم ادب ثقافت

فن افسانہ

ڈرامہ

غزل نظم

تنقید

چند لکھنے والے:

* ڈاکٹر سید عبداللہ * ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
* ڈاکٹر عبادت بریلوی * نذر سجاد حیدر
* محمد حسن عسکری * الطاف گوہر
* عزیز احمد * ممتاز مفتی
* غلام عباس * ابوالفضل صدیقی
* حجاب امتیاز علی * آغا بابر
* شوکت تھانوی * اشرف صبوحی
* شاھد احمد دھلوی * رفیق خاور
* جگر مرادآبادی * جوش ملیح آبادی
* حفیظ جالندھری * حفیظ ھوشیارپوری * تابش دھلوی * یوسف ظفر
* فراق گورکھپوری * عدم * قیوم نظر * جمیل نقوی
* شان الحق حقی * ابن انشا * عاصمہ حسین * ناصر کاظمی
* فضل احمد کریم فضلی * جعفر طاہر * ضمیر جعفری * زھرہ نگاہ وغیرھم

رنگین خوبصورت گردپوش

قیمت پانچ روپے

اداره مطبوعات پاکستان ـ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ـ کراچی